دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جنوری 2018

نگران اعلیٰ

معراج رسول

قیمت
=/70
روپے

سال نو مبارک



دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جنوری 2018

نگران اعلیٰ
معراج رسول

قیمت
70/= روپے



سال نو مبارک



مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ جمال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد شان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد48• شمارہ 01• جنوری 2018• زرِسالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200• فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول• مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



عزیزانِ من...... السلام علیکم!

یہ سال بھی گزر گیا۔ نئے عیسوی سال کا پہلا شمارہ پیشِ خدمت ہے اور ایک تبدیلی کے ساتھ کہ پچھلے چند ماہ سے نیوز پرنٹ کی بڑھی ہوئی قیمتوں کے سبب ادارہ شدید مالی دباؤ میں تھا۔ بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آنے پر اس ماہ سے قیمت میں اضافہ ناگزیر ہو گیا۔ امید ہے کہ ہمارے معزز قارئین ہماری اس مجبوری کو فراخ دلی سے قبول کریں گے۔ کاغذ کی گرانی کے ساتھ ہر روز آنے والی وحشت ناک خبریں طبیعت میں بھی سخت گرانی پیدا کرتی ہیں۔ تشدد آمیز معاشرتی جرائم پہلے بھی ہوتے رہتے تھے مگر آج ابلاغ کا دور ہے۔ ہر خبر برق رفتاری سے سفر کرتی ہے۔ باپ نے سوتیلی بیٹی سے شادی کرلی، بیوی نے دوست سے مل کر شوہر کو ہلاک کر دیا، بدنصیب بیٹے نے ماں کو قتل کر دیا، شقی القلب لڑکے نے طیش میں اپنے باپ کو مار ڈالا...... یوں لگتا ہے جیسے رشتوں کا تقدس، احترام اور لحاظ یکسر ختم ہو چکا ہے۔ مادی ترقی میں تیزی کے ساتھ مشرق و مغرب میں معاشرتی قدریں بدترین بحران سے گزر رہی ہیں۔ مشترکہ خاندان اور رہائش کا تصور قید کا عنوان پا چکا ہے۔ ہر جوڑا اپنی ڈفلی، اپنا راگ کے اصول پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ اولڈ ہوم آباد ہو رہے ہیں جہاں ہوش رُبا کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ کوئی تنہا مرد یا عورت عمر کی آخری دہلیز پر کسی گوشے میں خاموشی سے جان دے دیتا ہے۔ گھر سے بدبو اٹھنے پر پڑوسی پیش قدمی کرتے ہیں تو دردناک سانحے کا علم ہوتا ہے۔ سب کچھ بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ اس میں ہم سب برابر کے حصے دار بلکہ ذمے دار ہیں۔ معاشرہ، فرد اور افراد سے تشکیل پاتا ہے۔ اگر انفرادی سطح پر ہم مثبت طریقوں کو اختیار کرلیں تو رفتہ رفتہ یہی معاشرے کا مزاج بھی بن جائے گا۔ کیوں نہ ہم آج ہی ابتدا کرلیں...... عہد کریں کہ نئے سال میں ہم نئے اور مثبت انداز میں معاشرتی رویے اختیار کریں گے۔ اپنے لیے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے! اس عہد کے ساتھ چلتے ہیں اس محفل میں جہاں قلم کاری کے گل و خار آپ کے منتظر ہیں۔

کوئٹہ سے سیف خان کے جوابات ”29 نومبر کی ٹھنڈی سی صبح اخبار کے ساتھ ساتھ ہاکر نے جاسوسی و سسپنس کے دو تازہ چمکتے دمکتے شمارے بھی تھما دیے تو حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ ایک زمانہ تھا یہاں وہاں جاسوسی کا نام و نشان اگلے مہینے کی 3 یا 5 تاریخ کو ہی ملتا اور اب یہ حالت ہے کہ پچھلے مہینے کی 28 تاریخ کو ہی ڈیلیور ہو جاتا ہے۔ ادارے کے ان منتظمین کے لیے دل سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ ٹائٹل گرل کا سانولا سلونا حسن اور موٹی گول مٹول ناک توجہ کھینچ رہی تھی۔ محفل ہاؤ ہو میں سب کے سب جانے پہچانے چہرے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ وکٹری اسٹینڈ پہ اس بار ہمارے گول مٹول سے ایڈمن طلعت مسعود کھڑے دانت دکھا رہے تھے۔ بھرا پُرا تبصرہ...... اور مزہ اس لیے بھی دوبالا ہو گیا کیونکہ آپ نے آن لائن شماروں کے حوالے سے نہ صرف میرے موقف کی تائید کی تھی بلکہ اس سے بھی ایک اسٹیپ آگے بڑھتے ہوئے ادارے کو آفیشل ویب سائٹ بنانے کا مشورہ بھی دیا۔ اس پہ توجہ دی گئی تو جاسوسی قارئین کا ایک دیرینہ مطالبہ پورا ہو جائے گا۔ ایمانے زادا شاہ کا تندوتیز شائیں شائیں کرتا تبصرہ کب شروع کب ختم ہوا، کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ اگلے نکڑ پہ سعدیہ قادری صاحبہ اپنے مختصر اور رواں دواں تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ فراز حسین سومرو برادر میرے موقف کی تائید کا بے حد شکریہ...... جیتے رہیں اور مزید بھی محفل کے لیے لکھتے رہیں۔ اگلے چوک پر ڈاکٹر سیما ارشد سے ملاقات ہو گئی۔ شکل کچھ جانی پہچانی سی لگی اور چشموں پہ غور کیا تو جانی پہچانی ڈاکٹر سبا ارشد نکلیں۔ مظہر سلیم ہاشمی کے رنگ باعث تاخیر پہ تبصرے کے ساتھ ساتھ چند واضح نکات کی نشاندہی نے امید ہے رائٹر کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی ہوگی۔ اگلی مرتبہ ادارے سے اپنے نام کی غلطی کا گلہ بھی کیجیے گا اور آتی رہا کریں کہ آپ جیسے قارئین کے دم سے محفل کی رونقیں سوا ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے شاہد ذوالفقار پہ نظر پڑی۔ ان کے ساتھ بھی انہی کی طرح دھان پان سی علیک سلیک ہے۔ آپ کا تبصرہ تینوں جانی پہچانی تحریروں کے گرد گھومتا رہا اس لیے بھی یک ٹک پڑھتا رہا۔ ممتاز محمود نے پہلی انٹری کیا دی۔ ایڈیٹر کے جوابات نے ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیا۔ سرورق پہ کیا گیا تبصرہ...... تبصرے کی جان رہا۔ عبدالودود عامر اور سجاول خان کی پہلی شنوائی ہو رہی ہے۔ امید ہے اگلی انٹریاں دھواں دار ہوں گی۔ اس بار تمام کے تمام تبصرے انتقام، باعثِ تاخیر اور خطا پرور کی تعریفوں سے اٹے ہوئے تھے، ویلڈن اعتزاز وصلی، مظہر سلیم ہاشمی اور کبیر عباسی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ہولناک سائے پڑھی۔ زویا اعجاز نے پہلے پیراگراف کے اختتام سے ہی قاری کو ٹرانس میں لے لیا۔ مختلف کہانیوں کو انتہائی خوبصورتی سے آخری لمحوں میں یکجا کیا گیا۔ کہانی آہستہ آہستہ پرت در پرت کھلتی گئی۔ اس مرتبہ کہانی میں کردار نگاری عروج پہ نظر آئی۔ انعم، مائرہ اور حبہ کے شخصی خاکے انتہائی شدومد سے کھینچے گئے تھے۔ خاص کر مائرہ کے منتقم اور خود سے مکالمے کرتے کردار کے خدوخال اتنی نفاست سے چنے گئے تھے کہ متاثر ہوئے بغیر رہا نہیں گیا۔ انسپکٹر سفیان کے کردار اور کہانی کے اختتام دونوں نے شاکڈ کر دیا۔ اتنے بھرپور رنگ کے لیے ڈھیر ساری مبارکباد۔ ہم قدم کے نپے تلے اور شاندار آغاز نے خوشگوار تاثر کہانی کے آخر تک قائم رکھا۔ روبینہ رشید کو میں اس لیے بھی ترجیحی بنیادوں پہ پڑھتا ہوں کہ ان کی کہانیوں میں ہمیں روایتی روتی دھوتی خواتین کے بجائے مختلف چیلنجز سے نمٹتی خواتین کردار پڑھنے کو ملتے ہیں جو بلاشبہ قاری کے ذہن پہ انتہائی مثبت تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اس بار بھی اسپیشل برانچ کی پولیس آفیسر سارہ کی شخصیت پوری کہانی پہ چھائی رہی۔ بہلول کے ساتھ سارہ کی کیمسٹری...... خطرناک حالات میں بھی ہلکی پھلکی نوک جھونک نے کہانی کا مزہ دوبالا کر دیا۔ زبردست اختتام نے تنے اعصاب ڈھیلے اور پُرسکون کر دیے۔ روبینہ صاحبہ کی کسی قسط وار کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا۔ مظہر سلیم ہاشمی کی کہانی حاسد پڑھ کر احساس ہوا دوسروں کی کامیابیاں بعض لوگوں پہ کتنی شدت سے اثر انداز ہو

سکتی ہیں۔ لکی چکی کی قسمت اچھی تھی یا بُری۔ اس سے دوسروں کی صحت پہ کیا اثر پڑنا چاہیے؟ اس سوال کا درست جواب شاید کئی قابلِ نفریں جذبوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ بہت خوب لکھا ہاشمی برادر۔ حیرت انگیز طور پر ابتدائی صفحات پہ بھی صنفِ نازک کو دیکھ کر دماغ جھنجھنا سا گیا۔ البتہ پروین زبیر صاحبہ کا نام دیکھ کر کہانی تل چٹ کردی کہ وہ جب بھی لکھتی ہیں صفحات کا حق ادا کرتی ہیں۔ دوسری موت میرے اندازے سے بھی زیادہ دھواں دار بھاگتی دوڑتی کہانی ثابت ہوئی۔ البتہ مترجم یا طبع زاد کا اندازہ لگانے سے پھر بھی قاصر رہا۔ (جی کہانی طبع زاد تھی) ولایتی و روایتی کرداروں کی آمیزش نے کہانی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ کہانی بیشک جاسوسی کے ابتدائی صفحات کی شایانِ شان تھی۔"

ناظم آباد سے محمد ادریس احمد خان کی یاد آوری "سرورق بھی کمال تھا جو ذاکر صاحب کا ایک الگ ہی اسٹائل ہے، ان کے لیے بہت سی تعریفیں۔ چٹپٹی نکتہ چینی میں اداریے کے بعد طلعت مسعود سرِفہرست تھے۔ مبارک۔ ناموں کی فہرست میں زیادہ تر نئے قارئین نظر آرہے تھے۔ سب سے پہلے پروین زبیر کی کاوش دوسری موت تھی۔ بہت ہی خوب صورت اور پیار و محبت سے گندھی کہانی تھی۔ خط کا راز بھی اچھا تاثر دیتی کہانی تھی۔ مشکل ہدف، انگارے اور جاگیر کے اسیر اپنا احساس دلاتی تحریریں تھیں۔ مجرم شناس میں شیرف نے کمال عقلمندی سے کام لیتے ہوئے ایک معمولی سے نکتے سے مجرم کو نامزد کردیا جس کا امکان دوسرے نہیں کرسکتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد بھی دلچسپی سے پڑھی جارہی ہے۔ رقیب میں ریمنڈے نے جو گڑھا جوزف کے لیے کھودا تھا، اس کے اس انتقام کے گورکھ دھندے میں خود اس کی بہن مارتھا لپیٹ میں آگئی۔ زرد کتاب بھی اچھی کہانی تھی۔ تڑپ چال پڑھنے میں مزہ آیا۔ آخری صفحات کی کہانیوں میں روبینہ رشید کی کہانی ہم قدم اور زویا اعجاز کی کہانی ہولناک سائے تھیں۔ دونوں ہی اچھے انداز میں لکھی گئی کہانیاں تھیں۔ نئے لکھنے والے جن کو نیا لکھنے والا کہنا شاید زیادتی ہوگی۔ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ ان کی تحریریں دل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہماری طرف سے روبینہ رشید اور زویا اعجاز کو اچھا لکھنے پر مبارک باد۔ کترنیں بھی بہت خوب تھیں جنہوں نے آگاہی کا سبق دیا۔ ہماری طرف سے آپ کی پوری ٹیم اور دوستوں کو بہت بہت سلام۔"

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی تعریف "دسمبر کا جاسوسی 29 نومبر کو ملا۔ سرورق کو بہت خوب صورت طریقے سے سجایا گیا۔ دسمبر پتا نہیں ہمیشہ کیوں زخم ہی لگا کر جاتا ہے۔ سقوطِ ڈھاکا پھر اے پی ایس پھر بڈھ بیر کیمپ اور اب زرعی یونیورسٹی پر حملہ۔ کیا ہم کبھی اس بلا پہ قابو پاسکیں گے۔ بہرحال ہم زبانی دعوے تو بہت کرچکے مگر پچھلے دو ماہ سے مسلسل اٹیک ہورہے ہیں جب تک ہم اپنے اندر موجود کالی بھیڑوں کو نہیں پکڑتے ہم کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ان کے خاتمے ہی میں دراصل دشمن اور دہشت گردوں کی موت ہے۔ اداریہ پڑھا، بجا ہے کہ حرص نے ہمیں اپنی لپیٹ میں بری طرح جکڑ لیا ہے جس کے سراسر قصوروار ہم خود ہیں۔ حکمرانوں کے تو کیا ہی کہنے، ان کی بات کرنا ہی فضول ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے اندر انسانیت ختم ہوگئی تبھی تو مدد کے بجائے فوٹو بناتے ہیں۔ اپنی محفل میں آئے تو طلعت مسعود کی بہترین تبصرہ نگاری نے ان کو کرسیٔ صدارت کا حق دار بنا دیا۔ بہت خوب تبصرہ، مبارک ہو جی۔ ہارٹ کیچر کی بھی اچھی تبصرہ نگاری، روحی بھی بہترین تبصرے کے ساتھ موجود۔ باقی دوستوں ادریس احمد خان، سحر رمشا، ایمانے زارا، عبدالودود عامر، ڈاکٹر سیا ارشد کے تبصرے بیسٹ رہے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی خوب رہے۔ نئے آنے والوں کو ویلکم کرتے ہیں۔ پتا نہیں میری ماں جی اور اسرار ساقی بھائی کدھر غائب ہیں۔ کہانیوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ پروین زبیر کی دوسری موت، بہت عمدہ اور بہترین تحریر، پڑھنے کا مزہ آگیا۔ علی حمزہ پر تقدیر مہربان رہی۔ سعدی نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی پر تقدیر کی مہربانی کہ شہریار کو اپنے کیے گناہوں کا بدلہ چکانے کا موقع ملا اور اس نے خوب چکایا اور بے مثال تلافی کی۔ سید زاہد علی شاہ کی خط کا راز بھی گزارے لائق تھی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی حاسد عمدہ رہی، لکی چکی واقعی میں لکی نکلا۔ تنویر ریاض کی مشکل ہدف بھی گزارہ کرگئی۔ انگارے بھی بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ شاہی کا ایک رقیب ختم ہوتا ہے تو دوسرا آجاتا ہے۔ اب پھر داراب جیلی اس کے آڑے آگئی ہے اب شاہی کی آخر میں کی گئی حرکت کیا رنگ لاتی ہے۔ اگلی قسط میں پتا چلے گا۔ تمکین رضا کی سکے کی چوری مختصر پر اچھی تھی۔ محمد یاسر اعوان کی جاگیر کے اسیر بہت ہی عمدہ تحریر تھی۔ ظلم آخرکار ظلم ہوتا ہے اور وہ مٹ کے رہتا ہے جیسا کہ چوہدری حشمت اور اس کے بیٹے ثاقب کے ساتھ ہوا۔ ادھر شرجیل کو بھی کومل سے سبق مل گیا اور وہ نائلہ کو مل گیا۔ سلیم انور کی مجرم شناس بھی اچھی رہی۔ بھٹی صاحب کی آوارہ گرد میں شہزی بے چارہ سکون سے نہیں بیٹھ پاتا پر اس دفعہ اس کا کارنامہ بہت عظیم ہے۔ ایک ملک دشمن کو جہنم واصل کیا اس نے۔ آخر میں افتاد آپڑی اگلی قسط میں دیکھتے ہیں۔ شاکر لطیف کی رقیب سبق آموز تحریر تھی کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، ریمنڈے نے جولیا کو پانے کے لیے جوزف کے ساتھ جو کیا اب وہی اس کی بہن مارتھا کے ساتھ ہوگا۔ عکس فاطمہ کی زرد کتاب بھی اچھی رہی۔ راسکن نے بیٹی کو بچانے کے لیے سانترے کو مرنے دیا تاکہ اس کے بھتیجے سے جان چھڑا سکے۔ عمران قریشی کی تڑپ چال میں عبیداللہ نے کیا چال چلی تینوں زمینداروں کے ساتھ اور خود بیرونِ ملک جا کر عیاشی کر رہا ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی روبینہ رشید کے قلم سے ہم قدم بہترین تحریر رہی جہاں پر آفیسر سارہ نے اپنی محبت بہلول احمد کو پانے کے لیے خود بھی اس کے ساتھ موت کے منہ میں پھرتی رہی اور آخرکار محبت پالی، ہمارے ملک کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کسی بھی اچھے انسان یا آفیسر کو برداشت نہیں کیا جاتا۔ سرورق کی دوسری کہانی ہولناک سائے زویا اعجاز کے قلم سے لکھی تحریر عمدہ رہی جس میں اپنی بہن کے ایک عمل سے ہونے والی بربادی کو سینے میں لیے انسپکٹر سفیان ہر اس جوڑے کے لیے موت بن گیا جو کورٹ میرج کے لیے منصوبہ بناتا تھا۔ واقعی میں کبھی کبھی کسی کی ایک غلطی پورے خاندان کو تباہ کردیتی ہے پر سفیان کی یہ حیوانیت بھی جائز نہیں ہے۔ کترنیں بھی خوب رہیں۔"

عرفان راجہ کے گوجر خان سے تشکرانہ کلمات "کافی عرصے بعد محفل میں حاضری دے رہا ہوں۔ بس مصروفیات نے اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ نومبر کا سرورق بس گزارے لائق ہی ہے۔ فہرست میں ادارے کے اسٹاف کے اہم ممبران کے ناموں سے متعارف ہوئے۔ محفل کے آغاز میں آپ نے عالمی سیاست کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کیا۔ توصیف آپ کا انداز خوب رہا۔ ادریس احمد خان ہمیشہ کی طرح محفل میں رونق افروز

ہوئے، سلامت رہیں۔ سجاد خان کو ویلکم بیک۔ اور ٹیکسلا کی دل نشین کو بھی دوبارہ جی آیا نوں۔ اشفاق شاہین، سحر رمشا اور ذیشان کاظمی کی آمد بھی خوب رہی۔ میرے شہر سے حفصہ طارق بھی محفل کا حصہ بنیں۔ اچھا تبصرہ تھا۔ سیف خان نے ادارے کو بہت عمدہ مشورہ دیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ آپ لوگ اب کیا ایکشن فرماتے ہیں؟ باقی دوستوں نے بھی خوب انٹری جمائی۔ مردِ آہن از ایچ اقبال ولاور اور ایکس مین کے مابین آنکھ مچولی کا احوال تھا۔ وطن فروشوں کے خلاف وطن سرفروشوں کا ٹکراؤ۔ اعتزاز سلیم وصلی کی پہلی کاوش انتقام۔ عارف حسین مکافاتِ عمل سے نہ بچ سکا۔ جہانزیب نے خوب منصوبہ بندی کی۔ کہانی عمدہ تھی۔ اب ذرا ذکر ہوجائے جاسوسی کی شان ہماری جان انگارے کا۔ اس قسط میں تو اتنا ایکشن تھا کہ ایک ہی نشست میں پڑھی۔ جان ڈیرک کی سالگرہ، شاہ زیب کی دبنگ انٹری اور تباہ کن لڑائی نے بہت لطف دیا۔ اب دیکھیں پلاسٹک سرجری کی بدولت کیا گل کھلاتا ہے۔ سجاول اور خورسنہ کی انٹری بھی خوب جچی۔ مغل جی کا انداز بہت خوب ہے۔ آوارہ گرد اس بار تھائی لینڈ پہنچ گئی۔ جاسوسی کا تہلکہ خیز سلسلہ آتش فشاں یاد آگیا اور وجدان کا ایکشن اور اسٹائل شہزی میں نظر آیا۔ کبیر عباسی سیریز کا اگلا کیس لے کر آئے۔ خطا پرور میں بھی توقع کے خلاف کہانی سے غیر متعلق کردار ہی قاتل نکلا۔ بہت خوب عباسی بھائی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ کہانی سے لطف اندوز ہونے کے لیے جدید علوم برائے سوشل میڈیا سے واقفیت ضروری ہے۔ پہلا رنگ منظر امام نے پیش کیا۔ کہانی کا پلاٹ اچھا تھا لیکن تاثر اچھا نہیں دے پائی۔ کہانی حقیقت سے دور تشنگی کا احساس نمایاں رہا۔ دوسرا رنگ مظہر سلیم ہاشمی کی رنگوں میں پہلی کاوش کے طور پر موجود تھا۔ پلاٹ عمدہ تھا۔ کاشف زبیر مرحوم جیسا اندازِ تحریر لگا۔ نوشین، شاہد اور مسعود انور کا تعلق اچانک نکل آیا۔ بہرحال کہانی جاسوسی کے لوازمات سے خوب آراستہ تھی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی اس بہترین کاوش پر مبارک باد کے ٹوکرے۔ ادارہ نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرکے اچھی تحاریر پڑھنے کے لیے پیش کررہا ہے، ادارے کا شکریہ۔"

فیصل آباد سے عائشہ مرزا کی ناخوشی و بے قراری "چٹپٹی نکتہ چینی کی محفل میں پہلی دفعہ شرکت کررہی ہوں اور اس شرکت کی ایک خاص وجہ ہے۔ جی ہاں، اصل میں، میں جاسوسی کی پرانی قاری ہوں۔ اب اتنی بھی پرانی نہیں۔ یہی 2011ء سے پڑھنا شروع کیا۔ جاسوسی پڑھنے کی لت مجھے میرے پاپا سے لگی۔ اب وہ تو نہیں پڑھتے لیکن میں ان کی جگہ پر پڑھتی ہوں۔ جاسوسی میں طاہر جاوید مغل صاحب کی للکار، میری پسندیدہ تھی بلکہ ہے۔ اب تو میری یادوں میں ہے۔ اس سال تعلیمی مصروفیات اور کچھ مسائل کی وجہ سے میں جاسوسی نہیں لے سکی۔ سال بعد جب دوبارہ جاسوسی منگوایا تو اس میں سے للکار غائب۔ اووف اصدمہ ہی تو لگ گیا تھا۔ پھر بہت سارے بک اسٹالز اور ردی کی دکانیں چھان ماریں مگر للکار نہیں ملی کیونکہ 2013ء کا کوئی شمارہ ہی نہیں ملا۔ غصے میں، میں نے جاسوسی پڑھنا چھوڑ دیا مگر کب تک۔ اب اکتوبر 2017ء سے دوبارہ جاسوسی سے دوستی کرلی ہے۔ آپ سے میں کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے ہر حال میں للکار چاہیے اگر وہ کتابی شکل میں دستیاب ہے تو مجھے بتادیں کہ وہ کہاں سے ملے گی۔ (لاہور کے اردو بازار سے مل جائے گی) اب آتی ہوں دسمبر کے شمارے کی طرف۔ سرورق دیکھ کر ہنسی نکل گئی، یہ دیکھ کر کہ ہاتھ کدھر سے نکل رہا ہے گنجے انکل کا۔ سرورق کے دونوں رنگوں پر لڑکیوں کا قبضہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ روبینہ رشید کی ہم قدم نے شروع سے آخر تک باندھ کر رکھا۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ زویا اعجاز جی کی ہولناک سائے نام ہی ایسا ڈراؤنا تھا تو کہانی تو مزے کی بنتی ہی تھی۔ ویری نائس۔ میرے خیال میں شک ایک ایسی شے ہے جو کسی کی بھی زندگی کو تباہ کرسکتا ہے۔ جبہ صرف شک کی وجہ سے برباد ہوگئی۔ بہت دکھ ہوا۔ ماں کو ساری اولاد سے یکساں پیش آنا چاہیے۔ لیکن آج کل ایسا کم ہی نظر آتا ہے۔ حاسد اچھی تحریر تھی۔ مجرم شناس فضول تھی۔ انگارے اور آوارہ گرد پڑھنے کی کوشش کی تھی مگر سمجھ نہیں آئی۔ یوں کہہ لیں۔ مزہ نہیں آیا۔ اتنی ساری اقساط جو گزر گئی ہیں۔ میں نے دیر کردی اصل میں۔ خط کا راز دلچسپ تھی۔ دوسری موت کو فہرست میں دوسری عورت لکھ ڈالا جی۔ اچھی کاوش جی، پروین زبیر ویلڈن۔ جاگیر کے اسیر واہ کیا نام ہے۔ چھاگئے یاسر اعوان۔"

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کی شمولیت "اس بار جاسوسی کا ٹائٹل خاصا منفرد تھا۔ نسوانی وجود کے سامنے روپے کے لین دین کو ایک نئے انداز سے اجاگر کیا گیا۔ خطوط کی محفل خاصی ہری بھری تھی۔ خط شائع کرنے کا شکریہ۔ کہانیوں میں سکے کی چوری، رقیب، مجرم شناس، مشکل ہدف، انگارے اور آوارہ گرد خوب تھیں۔ باقی پرچا بھی زیرِ مطالعہ ہے۔ امید ہے نئے سال سے جاسوسی میں کچھ اور نئی دلچسپیاں سامنے آئیں گی۔ جاسوسی ڈائجسٹ نے عوام الناس میں لٹریچر کے مطالعہ کا رجحان پیدا کیا۔"

واہ کینٹ سے بلقیس خان کی نکتہ آفرینی "جاسوسی سارے کا سارا پڑھا ورنہ ماں جی کی صحت اتنی گرچکی ہے کہ سر کھجانے کی بھی فراغت نہ ملے۔ اداریہ سب سے آخر میں دیکھا۔ یہ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ امریکا ہمارا دوست ہے۔ وہ تو ہم خود ہی اس سے چپکنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں اور وہ ہمارے پڑوسی کو نوازنے، اکسانے اور ہمیں ٹھنڈے مار پالیسی پر گامزن ہے۔ محفلِ دوستاں میں توصیف علی نے اعلیٰ کارکردگی دکھائی اور پہلی پوزیشن لی۔ ایم سہیل کے مطالبے شاندار۔ بہت دنوں بعد سجاد خان نے حاضری لگائی۔ میں تو ڈر گئی تھی کہ خدانخواستہ لٹک گئے۔ سجاد خان! اپنے ہم شہر نادر سیال کی کچھ خبر ہے؟ انور یوسف زئی اور افتخار اعوان سے دلی تعزیت، دلنشین کی شکایتیں، سحر رمشا اور سید ذیشان حیدر کے سوال و استفسار پھر اپنے پرانے ہم ذوق منیر راجہ کی پہلی کاوش سب ہی دل کو بھائے۔ اشفاق شاہین نے یہ نہیں بتایا کہ کدھر کی سیر کے بعد گھر جارہے تھے۔ اس ماہ کا سپرہٹ تبصرہ حفصہ طارق کا تھا۔ ایمانے زارا بھی دلچسپ لکھتی ہیں۔ شفقت محمود کی شفقت، کوثر اسلام کا خلوص اور رحمان خان نیازی کی کہانی نے بھی متاثر کیا۔ دیگر احباب نے بھی خوب لکھا۔ پرانے کرم فرما یعنی انجم، سحر، اینڈ نیازی بلیک لسٹ میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ آغاز اگرچہ انگارے سے نہیں کیا لیکن ابتدا انگارے ہی سے کروں گی۔ مغل بھائی کی اس یادگار تحریر میں جس کردار نے ہمیں اپنے سحر میں جکڑا ہے وہ انیق ہے۔ خوش مزاج، حاضر جواب، باہمت، باکردار انیق میں جان اٹکی ہے میری، اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے طاہر بھائی۔ خیال رکھیے گا، اور ہاں یہ جان کر کہ دھماکوں میں شیطانی ٹولے کی ہلاکت بھی ہوئی ہے روح سرشار ہوگئی ورنہ میں تو اب تک یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ ہمیشہ بے گناہ لوگ ہی مرتے ہیں۔ آوارہ گرد سب سے آخر میں پڑھی۔ شہزی کا ابتدا ہی میں وزیر جان

کے پیچھے چڑھنا موڈ خراب کر گیا اس لیے چھوڑ دیا بعد میں جب آوارہ گرد کی 43 ویں قسط پڑھی تو مزہ آ گیا۔ پاکیزہ کردار کا مالک شہزادہ احمد خان بہت عزیز ہے ہمیں۔ شہزی پر غصہ بھی بہت آتا ہے بھلا کیا ضرورت ہے پرائے پھڈوں میں پڑنے کی...... پھر مردِ آہن کی طرف ریورس گیئر لگایا۔ نقاب پوش حملہ کر کے کئی لوگوں کو ہلاک اور زخمی کرتے ہیں اور روتی چلاتی سعیدہ کو اٹھا کر لے جاتے ہیں تو اس سے کیپٹن اختر کرنل زنجانی اور جنرل اسد بٹ آلو چھولے بیچ رہے ہوتے ہیں کیا؟ عکس فاطمہ کی بے بسی میں بیٹی اتنی سنگ دل ہو سکتی ہے یقین نہیں آتا۔ انتقام کا جہاں زیب، عارف حسین سے بڑا شیطان نکلا جس نے منصوبہ بندی سے بے گناہ فرحت کو ہوس کی بھینٹ چڑھایا۔ جمال دتی کی اجنبی تحریر نے سر میں درد جبکہ یاسر اعوان کے ثبوت نے دوا کا کام کیا۔ یک ورق، نا آسودہ عاشق، سفید لکیر، آخری سین، داؤ پیچ گزارے لائق تھیں۔ خطا پرور کچھ خاص نہ تھی لیکن کبیر عباسی کی حوصلہ افزائی بھی ضروری ہے۔ کوشش جاری رکھیں۔ سیل اور انٹرنیٹ کی دنیا سے ذرا باہر نکلیں کافی مواد ہے۔ دام کا ریاض اسی انجام کا مستحق تھا۔ منظر امام کی عشق زہرناک پہلا رنگ شمارے کی جان تھا۔ صادق جذبوں والے سچے اور باوقار لوگ ہر ایک کو اچھے لگتے ہیں۔ دوسرا رنگ باعثِ تاخیر ہماری نکتہ چینی محفل کے ساتھی مظہر سلیم ہاشمی کا خوب چڑھا، بہت خوب بہت عمدہ کاوش مظہر سلیم ہاشمی کی۔"

فیصل آباد سے منحہ رمشا کی ہمدمی ' اس ماہ کا شمارہ فلو کے دوران ملا۔ لیکن پھر بھی جلدی جلدی سارا پڑھ لیا آخر تبصرہ بھی تو بھیجنا تھا۔ ایمان نے زارا شاہ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ ایمان نے آپ بہت اچھا لکھتی ہو۔ پہلے صفحات پر موجود پروین زبیر کی دوسری موت...... سسپنس اور تجسس سے بھرپور کہانی تھی۔ ایکشن اور منظر نگاری عمدہ تھی۔ سید زاہد علی شاہ کی خط کا راز بھی بہت عمدہ تھی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی حاسد بھی اچھی رہی۔ ہیکر ڈا اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی خوش فہم تھا۔ کیرول تو چکی سے ہی پیار کرتی تھی۔ محمد یاسر اعوان کی جاگیر کے اسیر بہت اچھی لگی۔ چوہدری صاحب پر تو مجھے یہ شک پہلے سے ہی تھا کہ کاشف کے معاملے میں تو وہی قصوروار ہیں۔ آخر کب تک ثاقب ان سے نظر بچا کر کاشف کو سلو پوائزن دے سکتا تھا۔ ویسے نائلہ جو قید خانے سے نکل کر شرجیل سے ملنے آگئی تھی اگر وہ پہلے ہی پولیس اسٹیشن پہنچ جاتی تو تین سال تہ خانے میں قید نہ رہتی۔ شاکر لطیف کی رقیب بہت اچھی لگی۔ ریمنڈ نے جوجوزف کی زندگی برباد کی تھی اس کی لپیٹ میں خود اس کی بہن ماریتا بھی آ گئی۔ عکس فاطمہ نے بھی زرد کتاب بہت عمدہ لکھی۔ شکر ہے بے چارہ بے گناہ جیروم بچ گیا۔ عمران قریشی کی تڑپ چال بہت الگ اور منفرد کہانی تھی۔ زویا اعجاز کی ہولناک سائے بھی بہت عمدہ رہی۔ لیکن سفیان ضرورت سے زیادہ ظالم اور جابر نکلا۔ آخر میں بھی جوڑے کے پیچھے انہیں مارنے چل پڑا۔ پسند کی شادی کی اجازت تو اسلام بھی دیتا ہے۔ مائرہ بھی اپنے کیے کی سزا بھگت چکی تھی۔ وہ اسے اپنے بارے میں سچ بتا دیتا لیکن ویسے وہ مائرہ سے اتنا بھی چھوٹا نہیں تھا کہ مائرہ اسے پہچان نہ پاتی۔ اسے مائرہ کو مارنا نہیں چاہیے تھا۔ البتہ حبہ پر ترس آیا۔ سرورق کی پہلی کہانی ہم قدم روبینہ رشید نے بہت ہی زیادہ عمدہ لکھی۔ سارہ اور بہلول کے کردار بہت عمدہ تھے۔ بہلول کی زخمی حالت پر بہت ترس آیا۔ بہلول اور سارہ کا ملن بہت اچھا تھا۔"

قصور سے عبدالجبار رومی انصاری کی انکساری ' جیتی جاگتی حسین کول سی لڑکی کی گردن زنی، اُف بے چاری کا کیا قصور تھا اور دوشیزہ کے چہرے پر جو اطمینان جھلک رہا ہے اس سے صاف لگ رہا ہے کہ وہ بے قصور ہے اور عینک مین کی وحشت انگیز شخصیت تو روپے پیسے کی لالچی ہی نظر آ رہی ہے۔ دسمبر کا جاسوسی ٹھیک وقت پر ہی مل گیا تھا۔ چینی نکتہ چینی کی محفل میں دیارِ غیر سے طلعت مسعود کی صدارتی باتیں عمدہ رہیں اور بہت خوب تبصرہ کیا۔ بہت اچھا لگا اور مبارک باد۔ کڑوی سچائی لیے ہارٹ کچر کا تبصرہ بھی اچھا لگا پر ان کا صنفِ نازک کو چوہیا کہنا کچھ عجیب سا لگا۔ ہے تو ازراہِ مذاق ہی مگر کسی کو برا ہی نہ لگ جائے۔ ادریس احمد خان کی پسندیدگی بھی اچھی رہی۔ محہ رمشہ اور ایمان نے زارا کا نوک جھوک پر مشتمل تبصرہ عمدہ رہا۔ عبدالودود عامر کی تجزیہ نگاری بھی اچھی لگی۔ دوسرے خط کے ساتھ فراز حسین سومرو کی آمد بھی اچھی لگی۔ ڈاکٹر سبا ارشد کی رُوداد کے کیا کہنے۔ قینچی، آروں کا ڈر بالائے طاق رکھ کر بھرپور تبصرہ کیا اور خوب کیا۔ بہت اچھا لگا اور منیر راجہ کی خوشی بھی زبردست رہی اور باقی سب نے بھی عمدہ تبصرہ نگاری کی۔ دوسری موت میں علی نے کٹھن حالات سے نبرد آزما ہو کر اپنی الگ ساکھ بنائی اور پھر اپنوں ہی کی سازش کا شکار ہو کر پھانسی کے پھندے تک جا پہنچا۔ ایسے میں شہریار کی آمد نے علی کو نئی زندگی بخش دی اور غم سے چور رانیہ کی زندگی میں بہار آ گئی، بہت عمدہ کہانی۔ محبت ایسے ہی زندگیوں کو بدلا کرتی ہے جیسے خوشنما خورسنہ نے بھرپور محبت دے کر اور دلہن بن کر سجاول کا دل جیت لیا اور اسے بدل بھی دیا۔ دوسری طرف شاہ زیب بھی اپنی سرجری کروا کر ایک بار پھر ڈرائیور بن کر تاجور کے نزدیک آ گیا ہے اور اتنا نزدیک کہ پھر سے محبت جوان ہونے لگی ہے اور اس سے بہت سوں کا بھلا بھی ہوتا نظر آ رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ تاجور کے پیو دین محمد کو شاہ زیب فساد کی جڑ ہی لگتا رہا ہے۔ انگارے زبردست جا رہی ہے۔ جاگیر کے اسیروں کا بھانڈا شرجیل نے پھوڑ دیا اور نائلہ بھی تین سال تک تہ خانے میں قید رہی۔ آخر میں چوہدری حشمت تو آخری چال چل کر راہی ملکِ عدم ہوا، خودکشی کر لی۔ اس کے بیٹے کا انجام عمر قید کی صورت ہوا اور شرجیل اور نائلہ بچپن کے پریمی بھی آخر ایک ہوئے۔ عمدہ کہانی۔ لوجی آوارہ گرد کا دشمن بلکہ وطن کا دشمن وزیر جان بھی بالآخر پانی میں ڈوب کر جہنم واصل ہوا۔ وہ بھی بڑے عرصے سے چھپن چھپائی کا کھیل کھیل رہا تھا۔ اب شہزی تھائی گینگسٹر سے پیچھا چھڑا کر کب امریکا روانہ ہوگا یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا فی الحال تو بھرپور فائٹ اور مارا ماری دیکھنے کو مل رہی ہے۔ سلسلے وار کہانی زبردست جا رہی ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی زبردست رہی اور سارہ کا شروع میں ساتھ دینا کچھ عجیب سا لگا کہ بہلول کے لیے خواہ مخواہ مصیبت میں پھنسی رہی بعد ازاں مزید تعلق سامنے آیا تو سب ٹھیک لگا۔ سرورق کی دوسری کہانی تھی تو سرورق کے عین مطابق لیکن کوئی خاص اچھی نہیں لگی، الجھی ہوئی ایسی کہ سر پیر کا بھی پتا نہ چلا۔ سفیان نفسیاتی مریض اور سیریل کلر کے روپ میں پولیس مین اور انعم تو بے قصور تھی پھر اسے کس بات کی سزا دی، کوئی وجہ بھی نہ ملی اور نفسیاتی مریض سفیان بس خنجر کی پیاس بجھانے کو بے قرار نظر آیا۔ لکی چکی کی قسمت تو جب ساتھ چھوڑے گی تبھی دیکھو گے لیکن کیرول کی محبت میں وہ جی رہا تھا اور چکی اس کی نسبت قسمت کا دھنی ثابت ہوا تھا۔ حاسد مختصر مگر عمدہ کہانی رہی۔"

خیر پور میرس سے فراز حسین سومرو کی توصیف ' سال کا آخری شمارہ 27 کو بک اسٹال پر جا کر خریدا۔ سرورق اور فہرست کو یکسر نظر انداز کر کے

محفل میں چھلانگ لگائی۔ محفل چینی نکتہ چینی میں اپنا خط دیکھ کر انتظار کا پھل میٹھا لگنے لگا۔ طلعت مسعود اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ نمایاں رہے۔ اسلام آباد سے ایمان نے زارا شاہ باعثِ تاخیر اور انتقام پر برہم نظر آئیں۔ کراچی سے ڈاکٹر سبا ارشد کو سیما ارشد بنا دیا گیا تھا جس پر موصوفہ سراپا احتجاج ہیں۔ سجاول خان، عبدالودود عامر اور ممتاز محمود کو محفل میں شرکت پر خوش آمدید۔ پہلے بات کریں انگارے کی۔ شاہ زیب کی نئی پہچان کیا گل کھلاتی ہے۔ تاجور ایک بار پھر داراب فیملی کے نرغے میں۔ دوسری موت تھوڑی طویل مگر اچھی تحریر تھی بقول سعدی، علی اپنے وطن میں مر چکا تھا پھر کیوں اسے پولیس تلاش کر کے لے گئی؟ حاسد بس ٹھیک ہی رہی۔ مشکل ہدف میں لیسن کا فرار ہونا کام کر گیا اور روستیکوف پکڑی گئی۔ ہم قدم از روبینہ رشید بہترین تحریر تھی۔ پڑھتے ہوئے وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ آخری رنگ ہولناک سائے نے الجھائے رکھا۔ کرداروں کی بہتات تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اختتام کس طرح ہوگا پر مصنفہ نے کمالِ فن سے کرداروں سے خوب انصاف کیا۔ آخری شمارہ بیسٹ رہا۔"

پرویز احمد لنگاہ کی جامشورو سے دعائیں ' کراچی میں جاسوسی کے مایہ ناز لکھاری محمود احمد مودی، ابراہیم جمالی اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی سے خوب ملاقاتیں کی ہیں اور اب ان کی کہانیاں پڑھنے کا اور بھی زیادہ اشتیاق ہو گیا ہے۔ بھٹی صاحب کے تو ہر ماہ ہی درشن ہو جاتے ہیں، جمالی صاحب اور مودی صاحب کو بھی لے ہی آئیں۔ بیگم کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالنے کی سوچوں میں غلطاں رین بسیرا پڑھ رہا تھا تو چھوٹے بھائی اکبر نے جاسوسی ایک ہاتھ میں تھمایا اور دوسرے ہاتھ میں بریانی گاجر کا حلوہ پکڑا دیا۔ جاسوسی کا سرسری جائزہ لینے بیٹھا تو انگارے پڑھ کر ہی دم لیا۔ جیسے ہی ہوش آیا تو بیگم شعلہ بار نظروں سے گھور رہی تھی۔ استفسار پر بس اتنا بولی بریانی ٹھنڈی ہو گئی ہے، میں بہت خوش ہوا کہ بیچاری میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ کھانے کو مارے بندھے کھایا اور جاسوسی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اونہہ...... بی ایمان نے خود کو پتا نہیں کیا سمجھ رہی تھیں کہ ایک رات میں پورا ڈائجسٹ پڑھ لیتی ہوں۔ طلعت غنیچے کو وکٹری اسٹینڈ پر دیکھ کر ویسی ہی خوشی ہوئی جیسی آفریدی لالہ کو شہزادہ احمد کو بیٹنگ کرتے دیکھتے ہوتی تھی۔ انگارے ہمیشہ کی طرح کمال، دھمال مالا مال رہی۔ تاجور صاحبہ تیسری بار کسی کے نام لگنے جا رہی ہیں اور بے چارہ شاہ زیب اس بار بھی منہ دیکھ رہا ہے۔ دوسری موت کے کیا کہنے؟ پروین زبیر جب جب آتی ہیں، چھا جاتی ہیں۔ ان کی حاضری پکی کرائیں۔ مظہر سلیم ہاشمی کی حاسد بھی لاجواب رہی۔ آپ کی طرف سے نئے ٹیلنٹ کی سرپرستی کمال ہے اور نئے لوگ بھی لاجواب لکھ رہے ہیں۔ ہاشمی صاحب اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو، ایسے ہی بہترین کام جاری رکھیں۔ زویا اعجاز تو اب سینئر ہو گئی ہیں۔ سنسنی خیز اور جاسوسی سے بھرپور رنگ نے بڑا مزہ کرایا، بیگم کے ہاتھ کی بریانی سے بھی زیادہ۔ روبینہ رشید کی ہم قدم بھی جاسوسی کے شایانِ شان کہانی تھی۔ اگلی بار تبصرہ بھیجوں گا تو سعودی عرب واپسی ہو چکی ہوگی۔ اللہ سے دعا ہے کہ ادارے کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے، آمین۔"

اسلام آباد سے ایمان نے زارا شاہ کی پسند ناپسند " اس سال کا آخری جاسوسی شمارہ ہاتھ آتے ہی خیال آیا جاسوسی کے قاری بنے ہوئے ہمیں بھی ایک سال مکمل ہو گیا۔ اس سے قبل جاسوسی ڈائجسٹ کیا چیز تھی اور اس میں کیا تھا؟ ہم بالکل بے خبر تھے۔ ٹائٹل والی خاتون (جسے بہت سے لوگ حسینہ کہتے ہیں سوری میں نہیں کہہ سکتی) نے کسی قدیمی مغلیہ شہزادی کی یاد دلا دی۔ اداریے میں مدیرِ اعلیٰ آپ نے تو ہماری نبض پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ بالکل ٹھیک کہا، جدید ٹیکنالوجی وسہولیات نے ہمارے اندر سے احساس ہی ختم کر دیا ہے۔ دنیا کا ارتقائی عمل ہزاروں سال قبل شروع ہوا، وہ عروج پر پہنچ کر ہی اختتام کی طرف گامزن ہوگا۔ ہم دراصل اختتام کی شروعات پر کھڑے ہیں۔ دبئی والے پاکستانیوں کو مات دیتے ہوئے ٹاپ پوزیشن سنبھالے نظر آئے، طلعت کو بہت بہت مبارک ہو۔ واقعی بڑا کلاسیکل تبصرہ تھا آپ کا۔ محفل والے آپ کو ویلا نہیں سمجھتے مگر اب دو کیا اب تو ہم آپ کے ایک تبصرے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں! ہارٹ کچر آپ نے ہارٹ نہیں مائنڈ کیچ کرنے کی کوشش کی کیونکہ ہارٹ اب راہوں میں پڑے تو نہیں ملتے نا۔ بہرحال آپ جو بھی ہیں، انکل معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اتنے پرانے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے دکھائی دیے جو ہمارے پاپا کے زمانے میں لکھتے تھے۔ ویسے اس بار اسلام آباد کے بہت سے لوگ شامل رہے، کافی خوشی ہوئی اسلام آبادی بھی اس خوبصورت نشے کا شکار ہیں۔ منحہ شکریہ، ہمارا اکڑ دا کسیلا تبصرہ بھی کسی کو پسند آیا۔ ویسے آپ کی ایکسائٹمنٹ سے تو یہی لگا کوئی تمپیا کا چکر تو ضرور ہے لیکن ہم نے آپ کی ذہانت کو مان لیا...... عبدالودود عامر یقیناً آج میں نے نام درست لکھا ہے خوش آمدید ویسے آپ نے نکتہ چینی پر بھی ایک نظر ڈال لینی تھی نا...... باقی تبصرہ تو بہت اچھا لکھا آپ نے...... اسعد یہ قادری بہت دنوں بعد آئی ہیں۔ اب آتے ہیں سب سے مزیدار تبصرے کی جانب۔ ڈاکٹر سیما ارشد مطلب سبا ارشد آپ کے انداز سے ہی فوراً پہچان لیا۔ تبصرے نے پھر سے نومبر کے شمارے کا مزہ دوبالا کر دیا۔ اس بار محفل کچھ زیادہ اپنی اپنی سی لگی ہے۔ شاید جانے پہچانے لوگ براجمان تھے۔ اچھا اب ذرا کہانیوں پر بات کر لیتے ہیں۔ مغل سر محبت کے بارے میں ایسے لکھتے ہیں کہ محبت پر یقین نہ ہوتے ہوئے بھی کرنا پڑتا ہے اب شاہ زیب کا پلاسٹک سرجری کے بعد نیا روپ و کردار پڑھتے ہوئے یہی محسوس ہوا، محبت اگر ہوتی ہے تو واقعی اندھی ہوتی ہے۔ کہاں ہر طرف موت راہوں پر کھڑی ہے کہاں پکڑ تاجور کے گاؤں اس کے گھر پہنچ چکے ہیں جناب آکٹوپس، تاجور کچھ محبت قسطینا کے لیے بھی چھوڑ دو ظالم۔ سیف کی موت کے ذکر نے پھر سے دکھی کر دیا۔ خورسنہ و سجاول کی کشتی بھی اللہ اللہ کر کے پار لگی۔ اب دیکھتے ہیں تاجور بھی دل کی آنکھ سے پہچانتی ہے یا لوفر سمجھ کر شاہ زیب کو مار پڑواتی ہے۔ ویسے سنا تو یہی ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ہولناک سائے معاشرتی کج روی کا شکار ہونے والوں کی داستان رہی۔ ہمیشہ کی طرح کمال...... لیکن سفیان کا بدلہ لینا کچھ بھایا نہیں۔ ایک قانون کا محافظ ہو کر قانون کو ہاتھ میں لینا مناسب ہرگز نہیں تھا۔ طاقتور وہ کسی اور شعبے کو اپنا کر بھی ہو سکتا تھا مگر شاید نفسیاتی مریض ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اتنے تلخ موضوعات پر لکھنا آسان نہیں ہوتا ہمت ہے آپ کی۔ ویلڈن زویا آپی۔ دوسری موت میں وہ سب لوازمات تھے جو ایک زبردست کہانی کی ڈیمانڈ ہوتے ہیں۔ دلچسپی سے بھرپور تھی اختتام بالکل الگ سوچ رکھا تھا جبکہ ہوا اس کے برعکس۔ سعدی جیسے کینہ پرور دوست کا انجام بھی دکھایا جاتا تو کہانی پرفیکٹ ہو جاتی۔ جاگیر کے اسیر میں وہی روایتی انداز میں جاگیر کی ہوس اور رشتوں کی بے قدری و بے حرمتی نمایاں تھی۔ مظہر سلیم ہاشمی حاسد میں اس بار کچھ جچے نہیں...... آپ سے باعث تاخیر جیسی آؤٹ اسٹینڈنگ کہانیاں ہم ایکسپیکٹ کرتے ہیں۔ تڑپ چال میں آغاز سے ہی ساری کہانی بوجھ لی۔ یہ کافی

گھسا پٹا ٹاپک ہو چکا ہے اب۔ سکّے کی چوری اور مجرم شناس بس ٹھیک تھیں۔ آخر میں رقیب میں جوزف کو غلیظ بیماری کا زہر دینے والے کا انجام ایک دم فٹ تھا۔ ایک مسیحا ہو کر کسی کی جان سے کھیل جانا یہ سوچ کر جھرجھری آجاتی ہے...... لیکن یقینی طور پر ابھی دنیا میں ایسے گھٹیا لوگ بھی موجود ہیں جو ایسی مہلک بیماریوں کو بھی شوقیہ اپنے ساتھ ٹیگ لگواتے ہیں۔ اللہ ہدایت دے۔ روبینہ رشید کی ہم قدم مجھے پسند نہیں آئی۔ سو نو ریمارکس۔''

بہاولپور سے مومنہ کشف کی درخواست ''دسمبر کا شمارہ کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ بھائی سے وصول کیا جو اس نے وقت پر لا دیا۔ کسی پرانی فلم کے اشتہار جیسا سرورق چھوڑ کر چینی نکتہ چینی پہنچی لیکن ہائے افسوس کسی نے بھی مجھے یاد رکھنا گوارا نہ کیا۔ (ارے نہیں بھئی ہماری بہن، ہم نے یاد رکھا ہے) جی مجھے بہت رونا آیا۔ ایک تو میرا اسارا تبصرہ کٹ جاتا ہے اور پھر مجھے کوئی یاد بھی نہیں رکھتا۔ طلعت مسعود آف دی کا تبصرہ بڑا اچھا لگا۔ ویسے اگر جاسوسی آن لائن موبائل پر آجائے تو میں اس کی پہلی خریدار بنوں گی۔ کم از کم بھائی کی منت زاریوں سے تو بچ جاؤں گی۔ ہارٹ کیچر کا نام کتنا عجیب ہے؟ لیکن تبصرہ بڑا ہی اچھا کرتے ہیں۔ سجاول خان اور عبدالودود کو بہت بہت ویلکم۔ کاش مجھے بھی کوئی کہہ دیتا اچھے سے۔ ڈاکٹر سبا ارشد تو ایک ہی کہانی کا پوسٹ مارٹم کرتی نظر آئیں۔ ایمانے آپی کا خط میں بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ بڑا ہی مزے کا ہوتا ہے۔ توصیف علی کی باتیں بھی بڑی پسند آئیں۔ ذوالفقار شاہد مجھے اپنی طرح بڑے معصوم سے لگتے ہیں، ان کو بھی میری طرح کہانیاں تھوڑی تھوڑی ہی سمجھ آتی ہیں۔ اس بار ابتدائی صفحات پر انگلش کہانی نہیں تھی لیکن پروین زبیر کی دوسری موت بہت اچھی کہانی تھی۔ انگارے میری موسٹ فیوریٹ کہانی ہے۔ بے چارہ شاہی شکل بدل کر بھی تاجور کے پیچھے پڑا ہوا ہے جو مجھے زہر لگتی۔ اس سے اچھا تو وہ قسطینا کے ساتھ ہی رہ لیتا۔ سجاول بھی ولن سے ہیرو بنتا جا رہا ہے۔ انیق کو چھڑیں لگنے کا سین بڑا دکھ دیتا ہے۔ مجھے تو رونا ہی آ گیا۔ رنگوں میں ہولناک سائے پڑھی اور میرا تو دماغ گھوم گیا۔ اف اللہ اتنے لوگ تھے کہانی میں، سفیان کو میں ہیرو سمجھتی رہی لیکن وہ تو خونی نکلا۔ چھوٹی کہانیاں مجھے بڑی اچھی لگتی ہیں۔ عکس فاطمہ کی زرد کتاب سب سے اچھی لگی۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ قتل کیسے ہوا لیکن شکر ہے کہ قاتل پکڑا گیا۔ مظہر سلیم کی حاسد پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ ہیرو کتنا بے وقوف تھا جو کیرول کی ہمدردی کو محبت سمجھ کر جلتا رہا۔ ایسے بے وقوف پیار کرنے والے کہاں سے ملتے ہیں؟ (کہیں نہ کہیں مل ہی جاتے ہیں) ٹرَپ چال بھی بہت اچھی کہانی تھی، اینڈ تک پتا نہ چلا کہ مجرم کیسے فراڈ کر رہے ہیں۔ خط کا راز پسند نہیں آئی۔ روزانہ سونے سے پہلے آوارہ گرد کے دو پیج پڑھتی ہوں۔ جب تک مکمل ہوتی ہے نیا جاسوسی آجاتا ہے۔ پلیز اس بار میرا تبصرہ زیادہ کٹ نہ کرنا۔ پلیز پلیز پلیز۔''

وہاڑی سے منشی محمد عزیز مٹے کی خمار پسندی ''جاسوسی سے تعلق کوئی آج سے نہیں ہے بلکہ گزشتہ صدی سے ہے۔ 1993ء سے 1999ء تک بے قاعدگی سے جاسوسی میں حاضری ہوا کرتی تھی۔ پرسوں یعنی 28 نومبر کو ایک شاگرد کے ہاتھوں 2017ء کا آخری شمارہ منگوایا اور سب سے پہلے چینی نکتہ چینی کا سرسری جائزہ لیا۔ طلعت مسعود فرام دبئی ٹاپ پر رہے، مبارک باد۔ دیگر ناموں میں علی پور کے محمد جاوید بلوچ عرف ہارٹ کیچر سے رابطہ رہتا ہے دیگر ناموں میں عبدالجبار رومی انصاری، انجم فاروق ساحلی، ایمانے زارا شاہ، سعدیہ قادری اور ممتاز محمود کے نام جانے پہچانے لگے۔ ابتدائی کہانی دوسری موت سے آغاز کیا۔ سیاست کی الٹی سیدھی چالوں کے پس منظر میں علی حمزہ اور احسان جیسے نجانے کتنے جوان رُل جاتے ہیں۔ محترمہ پروین زبیر نے اپنی اس تحریر میں امریکا کے ساتھ ساتھ کینیڈا کے شہر کی سیر بھی کروا ڈالی۔ ہم م م م...... یہ میرے خیال میں محترمہ کا تکیہ کلام ہے۔ اس تحریر کا انجام خوش کن تھا اور شہریار کا جذبہ قابلِ ستائش کہ جس نے اپنے اور اپنے والد کے گناہوں کا کفارہ بڑی خوب صورتی سے علی کو موت کے چنگل سے نکال کر دیا۔ مظہر سلیم ہاشمی کچھ حاسد قسم کی تحریر لے کر حاضر تھے۔ سکّے کی چوری میں ہوشیار پولیس آفیسر نے بالآخر اصل مجرم کینی کو پکڑ ہی لیا۔ مجرم شناس میں بڑبولا پن کے باعث مکی نے خود کو پھنسا ڈالا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ پہلے تولو پھر بولو۔ ٹرَپ چال ایک چالاک اور مکار روایتی زمیندار کی کہانی، جس نے اپنے مہرے عبیداللہ عرف بیدو کے ذریعے ایک عجیب و غریب چال کے ذریعے اپنے دشمنوں کی جائداد زمین بھی اپنے نام کروالی اور بیدو بھی خوش۔ سرورق کی پہلی کہانی ہم قدم بھی سیاست کی الجھی چالبازیوں سے چکر کاٹتی ہوئی تھی۔ سارہ اور بہلول کی محبت کے ہم قدم بالآخر اصل مجرموں کو بے نقاب کر ہی ڈالا اور سارہ نے اپنی محبت بالآخر حاصل کر ہی لی۔ ہولناک سائے، زویا اعجاز صاحبہ، کل کی تبصرہ نگار، آج کی کامیاب لکھاری کے طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ خوش گوار قسم کی حیرت ہوتی ہے، ان کی تحریریں پڑھ کر۔ انسپکٹر سفیان نواز کو اس طرح کا نفسیاتی مریض بنانے میں اس کے گھریلو حالات ذمّے دار تھے اور گھریلو حالات کی ذمے داری زیادہ تر خاتونِ خانہ پر ہوتی ہے اور نواز بے چارہ تو ویسے بھی دیارِ غیر میں تھا۔ اگر کنول اپنے گھر اور بچوں کی تربیت کا خیال رکھتی تو شاید یہ کہانی جنم نہ لیتی۔ بہرحال ایک بہترین تحریر زویا اعجاز کے قلم سے، مبارک باد کی مستحق ہیں۔''

لاہور سے اشفاق شاہین کی تبصرہ نگاری ''جاسوسی اس بار بھی بروقت مل گیا۔ ٹائٹل بھی عجیب سا تھا۔ سمجھ سے باہر۔ چینی نکتہ چینی پر پہنچے، طلعت مسعود بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ایمانے اور ڈاکٹر سبا ارشد کے خطوط محفل کا خاصہ تھے۔ بہترین تبصروں کے ساتھ، باقی احباب کے خطوط و تبصرے بھی بہترین ٹھہرے اور ممتاز محمود کو جاسوسی میں جی آیاں نوں۔ اسی استقبالیے میں، میں اپنا خط تو بھول ہی گیا۔ محکمہ ڈاک کی کارستانیوں سے چینی نکتہ چینی تو کیا، لیٹ کمرز میں بھی شمولیت سے محروم رہ گیا۔ بہت دکھ ہوا۔ چلتے ہیں تبصرے کی طرف۔ حسبِ معمول انگارے کی طرف دوڑ لگائی۔ سجاول بامراد ٹھہرا۔ خورسنہ آخر مان ہی گئی۔ بھیس بدل کر شاہ زیب پھر سے تاجور کے لیے اس کے گاؤں کی چاکری بخوشی کر رہا ہے لیکن وہاں بھی اب حالات اس کے لیے سازگار نہیں لگ رہے۔ تاجور کے حوالے سے بہت خوش فہم شاہ زیب اور دارابی بھی میدان میں ہیں۔ اب آخر میں بے قرار ہو کر تاجور سے ملاقات کے لیے جا پہنچا دیکھیے کیا ہوتا ہے آوارہ گرد، وزیر جان کے چنگل سے کسی طرح رہائی ملی پھر شہزاد کا دشمن ہی کی گاڑی میں چھپ کر وزیر جان تک پہنچا، بغیر کسی خاص پلاننگ کے، یہ جانتے کے باوجود کہ وہ کتنا بڑا گینگسٹر ہے، اس پر ہاتھ ڈالنا اور کام تمام کر ڈالنا، بلنڈر لگا۔ منوج کمار کی انٹری بھی ہوئی۔ دیکھیے اس کی پٹاری سے کون سا سانپ نکلتا۔ ہم قدم روبینہ رشید کا پہلا رنگ کمال رہا۔ سارہ، بہلول اور تیمور کے کردار اپنی جگہ زبردست اور یہ بھی کہ فتح بالآخر حق سچ کی ہی ہوتی ہے۔ ہولناک سائے...... زویا اعجاز بہت زبردست، خوفناک انداز، کسی لمحے بھی سفیان کے چہرے پر رحم نظر نہیں آیا، قانون کو ہاتھ میں لے کر اقدام کرنا، یہ بھی

غلط قدم بہرحال خوفناک رنگ تھا۔ دوسری موت پروین زبیر نے خوب لکھا۔ علی کے ساتھ جو بھی ہوا، یا کروایا گیا، انجام کار تو یہی سمجھ میں آیا کہ پیسے والوں اور بڑے سیاست دانوں کے لیے قانون کچھ نہیں۔ علی، رانیہ کا کردار بہت خوب رہا۔ مختصر کہانیوں میں مظہر سلیم ہاشمی کی حاسد بہت پسند آئی۔''

بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس کی مثلث کھاریاں سے ''جاسوسی کا نیا شمارہ... جو 2017ء کا آخری تھا۔ دسمبر کی ایک گرم دوپہر میں اپنے سسرالی شہر لاہور سے خریدا تھا۔ سرورق کو دیکھ کر بالکل اسی طرح جھٹکا لگا جس طرح بے چارے کراچی والوں کو بجلی کے آنے سے لگتا ہے، ارے اتنی جلدی آگئی مبارک ہو۔ سرورق پر موجود گنجے بھائی جان عینک لگائے شاید کوئی تقریر کر رہے ہیں جبکہ سرورق کی خوف صورت حسینہ انہیں کانی آنکھ سے داد دے رہی ہے، واہ واہ، کیا بات ہے، بہت اچھے انکل کیا تقریر ہے جبکہ خوف صورت حسینہ کی ناک کے بالکل نیچے غالباً کرپشن کا کھیل کھیلا جا رہا جو آج کل ہمارے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے نیچے اوپر تک کرپشن ہی کرپشن۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس بار سرورق ایویں تھا سوری ذاکر صاحب۔ ابتدائی تبصرے پر اس بار بہت دور سے آئے ہوئے طلعت مسعود صاحب براجمان تھے اور ساتھ ہی ساتھ کمی بھی کر رہے تھے۔ بھیا مسعود صاحب زیادہ کمی کمی نہ کریں۔ بھیا ہارٹ کیچر صاحب آپ بھی مجھے کوئی جوگی ہی لگتے ہیں۔ دوشیزہ کی شیش ناگ ورگی زلفیں تو فیر کوئی جوگی ہی پہچان سکتا ہے۔ ادریس بھائی ہم بھی کسی زمانے میں بڑے مردِ آہن تھے۔ غلطی سے اریشہ بخاری سے پنگا لے بیٹھے تھے۔ آپ نے اور رمضان پاشا نے ساتھ نہیں دیا تھا۔ راحیل احمد اور تفسیر عباسی، بابر بھی بھاگ گئے تھے۔ ایسے میں، میں بھلا مردِ آہن کیا کرتا، وہ تو سر جی کا بھلا ہو مجھے مردِ آہن بنا دیا۔ عبدالجبار رومی صاحب کی کہانی بڑی دردناک تھی، آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر موجزن ہو گیا، رومی بھیا بڑا دکھ ہوا آپ کی کہانی پڑھ کر۔ بھیا ایک ملاقات کر کے ہی غائب ہو گئے۔ انجم فاروق صاحب بہت اچھے زبردست بھیا، لگتا ہے آپ کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔ اس لیے خط بھی آپ کی طرح کمزور ہے۔ میرے دادا کے شہر فیصل آباد سے متحرمہ مشا خاصا مشکل نام ہے۔ ذرا نام تبدیل نہیں کر سکتیں آپ یقین کریں نام لیتے وقت منہ بھی ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور یقین کریں ایمانے زارا کی طرح آپ کو میرا ابھی تبصرہ پسند آیا کرے گا۔ بے شک آپ سر جی سے پوچھ لیں۔ ایمانے زارا صاحبہ اچھا لکھنے کے لیے اچھی سوچ اور اچھا دماغ چاہیے ہوتا ہے اور آپ غالباً سمجھ دار کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور تو ویسے بھی کافی سمجھ دار ہیں۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ سجاول خان صاحب خوش فہمی ہے آپ کی، حسینہ آپ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دراصل بھینگی تھی۔ آپ خوش فہمی کا شکار ہو گئے۔ سعدیہ قادری صاحبہ آپ سرورق کو غور سے نہیں دیکھتیں کیا آنکھیں خراب ہیں یا کوئی مسئلہ ہے بی بی کسی ڈاکٹر سے رابطہ کریں۔ شاید کوئی افاقہ ہو، ویسے سرورق کو غور سے دیکھا کریں صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ فراز حسین سومرو صاحب ایک تو غلطی کرتے ہیں اور پھر اوپر سے معذرت بھی کرتے ہیں۔ ناں ناں یہ نہیں چلے گا چلیں کان پکڑ کر مرغا بن جائیں۔ سر سومرو صاحب سے خود بولیں ناں نہیں تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ ڈاکٹر سبا ارشد صاحبہ آپ کس چیز کی ڈاکٹر ہیں۔ آنکھوں کی ڈاکٹر تو لگتی نہیں آپ ورنہ سرورق کی بُڑھیا کو حسینہ دل نواز نہ کہتیں، مسئلہ یہ ہے ناں کہ آپ بھی عورت ہیں اور سرورق کی بھی...... واہ واہ زبردست! شاہد ذوالفقار صاحب کیا زبردست یونگا خط لکھا ہے آپ نے بھایا خط پر توجہ دیا کریں۔ ممتاز محمود صاحب یہ جاسوسی میں آپ کی پہلی انٹری ہے آپ کی انٹری فیس کہاں ہے ویسے بھی یہ بڑوں کی محفل ہے بچوں کا بھلا یہاں کیا کام، آنا ہی ہے تو بچے اپنا فیڈر ساتھ لے کر آؤ۔ منیر راجہ صاحب بھئی بھی خوش نہ ہوں خوشی کے مارے کہیں گر گئے تو چک پڑ جائے گی اگر چک پڑ گئی تو کمر جھک جائے گی اگر کمر جھک گئی تو پھر اسلام آبادی یہی بولیں گے کبڑا عاشق ای ارے۔ توصیف علی صاحب زیادہ خوشی کا اظہار نہ کریں نظر لگ جائے گی اگر آپ کو نظر لگ گئی تو گھر والوں کو پریشانی ہوگی اور پھر گھر والوں کی پریشانی پر آپ کو ایسا جھٹکا لگنا ہے کہ تبصرے والا جھٹکا آپ کو بھول جائے گا اور آپ نے ہائے ہائے کرنا ہے اس لیے ذرا سنبھل کر۔ سہیل صاحب رائے اپنی اپنی خیال اپنا اپنا آپ کی رائے کا سر جی نے احترام کیا اور خط شائع کر دیا اب ذرا پیارے سے بچوں کی طرح سر جی کا شکریہ ادا کریں۔ سر جی یہ تو تھا چند دوستوں کے خطوط پر معصومانہ سا تبصرہ۔ اب ذرا ہو جائے رائٹرز کی تحریروں پر نشتر زنی۔ سب سے پہلے دوسری موت پڑھی اس میں کوئی شک نہیں پروین زبیر صاحبہ ایک کہنہ مشق رائٹر ہیں ان کی ہر تحریر خوب صورت اور پیاری ہوتی ہے اس کی بہترین مثال دوسری موت۔ ہمارے ملک کی گندی سیاست نے کیسے علی جیسے معصوم لوگوں کو داغ دار کر دیا ہے ویل ڈن پروین زبیر صاحبہ ویل ڈن۔ کہانی نے شروع سے لے کر آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ دوسرے نمبر پر اپنے ہر فن مولا اور من موجی روح کی کہانی اپنے شغلِ اعظم کی تحریر کردہ انگارے پڑھی۔ طاہر جاوید مغل صاحب آغازِ سفر سے لے کر اب تک سسپنس اور جاسوسی میں اتنی کہانیاں اور سلسلے لکھ چکے ہیں کہ ان کو خود بھی پتا نہیں کیا کچھ لکھ دیا ہے۔ یہ ہوتا ہے رائٹر جس کو یہ بھی پتا نہ ہو اس نے کیا کچھ لکھ دیا ہے۔ تاوان سے لے کر انگارے تک۔ زبردست بہت اچھے طاہر بھائی، خدا آپ کی عمر لمبی کرے آمین۔ تیسرے نمبر پر لفظوں کے کھلاڑی جادوگر سیاں ہم تو ان کی کہانی کا انتظار کرتے ہیں جبکہ ان کے مریض صحت یابی کے لیے ان کا انتظار کرتے ہیں۔ آوارہ گرد بہت اچھی جا رہی ہے، لکھتے رہیں۔ پہلا رنگ ہم قدم روبینہ رشید کا تحریر کردہ وہی جرم اور قانون کا کھیل۔ سر جی یقین کریں روبینہ رشید کی کہانی نے کچھ متاثر نہیں کیا۔ سوری روبینہ رشید صاحبہ۔ دوسرا رنگ زویا اعجاز کا سر جی زویا اعجاز کو میں رائٹر ہی نہیں سمجھتا۔ اپنی اپنی رائے کی بات ہے۔ زویا اعجاز کو صبیحہ بانو، پروین زبیر، بشریٰ رحمان، ناہید سلطانہ اختر، بانو قدسیہ اور بہت سی بلند پایہ رائٹرز کی طرح کا بننے میں ابھی بہت وقت لگے گا۔ (یقیناً وہ اس درجے تک بھی پہنچیں گی کیونکہ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں) محمد یاسر اعوان صاحب کی ایک اچھی تحریر جاگیر کے اسیر واقعی ایک معیاری اور خوب صورت تحریر تھی۔ اس بار منظر امام کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ مظہر سلیم ہاشمی حاسد، سید زاہد علی شاہ خط کا راز، تنویر ریاض مشکل ہدف، تمکین رضا سکّے کی چوری، سلیم انور مجرم شناس، شاکر لطیف رقیب، عکس فاطمہ زرد کتاب جبکہ آخر میں عمران قریشی ٹرَپ کی چال جاسوسی کے لحاظ سے اچھی اور معیاری تحریریں تھیں۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

محمد اقبال، کراچی۔ ہما انصار کوٹری۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ جمشید احمد، حیدر آباد۔ حرا افتخار، کراچی۔ صبا پرویز حیدر آباد۔ جنید رشید کراچی۔



نابکار مجرم

امجد رئیس

دہشت گردی اور قتل کی واردات کا ابہام دو مختلف اداروں کا تصادم......

ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانے میں ہی عافیت و آشتی چھپی ہوتی ہے... لیکن عجلت پسند اور سہل پرست اکثر اس عافیت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے... بنا سوچے سمجھے وہ کر گزرتے ہیں جس کا انجام صرف ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے... منفی طرزِ عمل اختیار کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے راستے میں کوئی بھول بھی آسکتی ہے... جو بھٹکا سکتی ہے... اپنی طرف سے انہوں نے بہترین منصوبہ سازی کی تھی... واردات کا ہر پہلو مکمل اور کامیاب ترتھا... نہ جانے کہاں بھول ہوئی... جو پکڑ کی زد سے بچ نہ سکی... تجسس اور تھرل سے بھرپور ناول کی شاندار تلخیص...

جرم کے تعاقب میں جان لڑا دینے والے سراغرسانوں کی ناقابلِ فراموش کارکردگی......

کال آدھی رات کے بعد آئی تھی۔ ہیری بوش، تاریک لیونگ روم میں بیدار تھا۔ کال، اس کے سپروائزر کی جانب سے تھی۔ ہوی سائیڈ اسپیکنگ میں یہ ہیری بوش کی نئی جاب تھی اور شاید اس روز اس کی ضرورت آن پڑی تھی۔

”ہیری، تم جاگ رہے ہو؟“

”جی ہاں۔“

”کون پیانو بجا رہا ہے؟“

”نیویارک میں ”جاز اسٹینڈرڈ“ لائیو پروگرام ہے۔ ....فرینک مورگن پرفارم کررہا ہے۔“

”فرینک اِز گڈ......لیکن مجبوری ہے۔ فرینک سے تمہیں دور کرنا بُرا لگ رہا ہے۔“

بوش نے ریموٹ کی مدد سے موسیقی تمام کردی۔ ”کیا مسئلہ ہے لیوٹینٹ؟“

”تم اور اگناسیو پہنچو، ہالی ووڈ کو ضرورت ہے۔ مرڈر کیس ہے۔“

”کہاں؟“

”مَلّل ہالینڈ، ڈیم دیکھا ہے؟“

”ہاں، ایک مرتبہ گزرا ہوں وہاں سے۔“ ہیری نے جواب دیا اور چھوٹی سی

نوٹ بک پر تاریخ اور لوکیشن لکھی۔ ”کچھ اور؟“

”کچھ زیادہ نہیں...... کوئی اس آدمی کو وہاں لایا اور کھوپڑا اڑا دیا...... دو گولیاں سر میں۔“

ہیری نے اگلا سوال کرنے سے پہلے لکھ لیا۔ ”مقتول کون ہے؟“

”ڈویژن کوشش کر رہا ہے۔ ممکن ہے جب تم پہنچو...... اس وقت تک شناخت ہو جائے۔“ لیو نے جواب دیتے ہوئے لوکیشن کے بارے میں مزید تفصیل بتائی اور کہا۔ ”ہیری کال کرنی پڑے تو میری نیند کی پروا مت کرنا۔“

”اوکے، میں اپنے پارٹنر کو فون کر کے نکلتا ہوں۔“

اس نے فون بند کر دیا اور اپنے پارٹنر اگنا سیو فیرا س کا نمبر ملایا۔ ہیری کا نیا پارٹنر اگنا سیو، ہیری سے بیس برس جونیئر تھا۔ ثقافتی پس منظر بھی جدا تھا، ہیری جانتا تھا کہ پارٹنر کے ساتھ ہم آہنگی میں وقت لگے گا۔

اگنا سیو فون کی وجہ سے بیدار ہوا اور جلد ہی الرٹ ہو گیا۔ وہ پُرجوش معلوم ہو رہا تھا۔ یہ مثبت علامت تھی۔ مشکل یہ تھی کہ اسے ڈائمنڈ بار سے آنا تھا۔ یہ سفر ایک گھنٹے کا تھا۔ ہیری کو معلوم تھا کہ وہ پہلے سے جائے واردات پر پہنچ جائے گا...... اس نے ضروری معلومات فراہم کر کے فون بند کر دیا۔

ہاتھ کوٹ کی آستینوں میں ڈالتے وقت اس نے آئینے پر نظر ڈالی۔ چھپن برس کی عمر میں وہ فٹ نظر آ رہا تھا جبکہ اس کے ساتھ کے دوسرے سراغ رساں درمیان سے گول ہو چکے تھے۔ اس نے تیاری میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ آخری شے گن تھی۔ ہولسٹر دائیں کولھے پر تھا۔ ہیری نے بائیں ہاتھ سے کیبر الٹرا کیری نکالا۔ تیزی سے چیک کیا اور انگلیوں پر نچا کر بائیں ہاتھ سے ہی ہولسٹر میں فٹ کر دیا......

ہیری بوش تیار تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

لیو ٹیننٹ کو کیس کے بارے میں خاص علم نہیں تھا۔ البتہ وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ ہیری کا گھر کرائم سین سے قریب ہے۔ ہیری نے ”کوہنگا“ اور بارہم کے بعد فری وے ایک سو ایک پکڑا اور سیدھا ہالی ووڈ ڈرائیو کے پڑوس میں جا پہنچا۔ وہاں ذخیرۂ آب کی پہاڑیوں پر قیمتی بنگلے موجود تھے۔ تاہو ڈرائیو پر وہ پہاڑیوں میں مزید اندر گیا اور مُل ہالینڈ کی مشرقی حد پر نکل آیا۔ یہاں دو نشان بنے تھے۔ ”نو پارکنگ“ دوسرا ”اوورلک کلوزڈ، ایٹ ڈارک۔“ تاہم دن ہو یا رات، ان نشانات کو نظر انداز کرنا روز کا معمول تھا۔ وہ جائے واردات پر پہنچ چکا تھا۔ وہاں پہلے ہی کئی گاڑیاں موجود تھیں۔ فارنسک وین، تفتیشی اہلکار، پولیس کارز (نشان زدہ اور غیر نشان زدہ دونوں) زرد ٹیپ نے کرائم سین کو گھیرا ہوا تھا۔ ہیری نے گاڑی روکی اور اتر گیا۔ زرد ٹیپ کے حلقے میں ایک پورشے کیریرا کھڑی تھی۔ پورشے کا سامنے والا ہڈ کھلا ہوا تھا۔ گاڑی کے گرد ٹیپ کا ایک اور حلقہ تھا۔ ہیری نے اندازہ لگایا کہ پورشے مقتول کی ملکیت ہوگی۔

ایک پٹرول آفیسر نے اس کا نام اور بیج نمبر دیکھا جس کے بعد ہیری جھک کر زرد ٹیپ کے حلقے میں چلا گیا۔ وہ کرائم سین کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں پورٹیبل روشنیوں کے درمیان مقتول کی باڈی دکھائی دے رہی تھی اور متعلقہ اہلکار اپنا کام کر رہے تھے۔ ایک ٹیکنیشن وڈیو کیمرے کے ساتھ موجود تھا۔

”ہیری، یہاں......“ ایک آواز آئی۔ ہیری نے گردن گھمائی۔ ڈبلیو جیری ایڈگر غیر نشان زدہ کروزر کے پاس کھڑا تھا۔ ہیری نے رخ اس کی جانب کر لیا۔ کسی وقت ہالی ووڈ ڈویژن میں وہ ہیری کا پارٹنر ہوا کرتا تھا۔ اس وقت ہیری ہومی سائڈ ٹیم کا لیڈر تھا۔ تصویر پلٹ گئی تھی...... اب ایڈگر لیڈر تھا۔

”میں انتظار کر رہا تھا...... لیکن تم؟“

”ہاں، میں۔“

”تم کیس پر تنہا کام کرو گے؟“

”نہیں، میرا پارٹنر پہنچ رہا ہے۔“ ہیری نے جواباً کہا۔

”اوہ، نیا پارٹنر...... گزشتہ برس، ایکو پارک کیس کے بعد......“

”ہاں...... یہاں کیا صورت حال ہے؟“ ہیری نے قطع کلامی کی۔ وہ ایکو پارک کے حوالے سے ایڈگر یا کسی اور سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ توجہ موجودہ کیس پر مرکوز رہے۔ ہومی سائڈ اسپیشل میں ٹرانسفر کے بعد یہ اس کا پہلا کیس تھا اور وہ بخوبی آگاہ تھا کہ بہت سی نگاہیں اس کی کارکردگی پر ہیں۔ مزید یہ کہ ان میں کچھ اس کی ناکامی کے آرزومند بھی ہیں۔

وہ کروزر کے ٹرنک کی طرف متوجہ ہو گیا جس پر مقتول کی اشیا بیگس میں رکھی تھیں۔ ہر آئٹم الگ منی بیگ میں تھا۔ والٹ، کی رِنگ (نام کے ٹیگ کے ساتھ)، کرنسی کی گڈی اور ایک بلیک بیری سیل فون...... فون ابھی تک آن

تھا۔ سبز بتی فلیش کر رہی تھی لیکن مالک کال کرنے یا وصولیابی کے لیے اس دنیا سے گزر چکا تھا۔

ہیری نے منی بیگ اٹھایا جس میں شناختی ٹیگ محفوظ تھا...... ٹیگ کو روشنی کی طرف کر کے جائزہ لیا۔ اس پر ایک آدمی کی چھوٹی سی تصویر تھی۔ سیاہ آنکھیں، سیاہ بال...... وہ کیمرے کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ سینٹ اگا تھا کلینک فار ووومین کا کارڈ تھا۔ نام کی جگہ ڈاکٹر اسٹینلے کینٹ لکھا تھا۔ ہیری نے نوٹ کیا کہ کارڈ بطور ”کی“ کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا...... ”سوائپ کی۔“ اس قسم کی ”سوائپ کی“ مخصوص دروازے کھولنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

”لاش کب دریافت ہوئی تھی؟“ ہیری نے سوال کیا۔

”دس گھنٹے گزر گئے ہیں۔“ جواب ملا۔ ”مجھے بتایا گیا کہ وہاں میڈونا کا مکان ہے، یا تھا۔“ ایڈگر نے سو گز کے فاصلے پر بلند مینشن کی طرف اشارہ کیا۔ ”پٹرول کار گیارہ بجے کے قریب گھوم کر آئی، اس وقت گیارہ بج رہے تھے، جب پورشے پر نظر پڑی۔ اس قسم کی پورشے کا انجن عقب میں ہوتا ہے...... سامنے کی طرف ہڈ کھلا ہوا تھا۔ پٹرول کار کے آفیسر باہر آئے۔ پورشے سے کچھ فاصلے پر انہوں نے باڈی دریافت کی۔ لاش کا چہرہ زمین کی طرف تھا...... پیچھے سے سر میں دو گولیاں ماری گئی تھیں۔ سیدھا سادہ مرڈر ہے۔“

”یہ اسٹینلے کینٹ ہے؟“ ہیری نے ٹیگ چٹکی میں پکڑا۔

”ٹیگ اور والٹ کے مطابق یہی ظاہر ہوتا ہے۔ عمر بیالیس سال۔ رہائش، ایرو ڈرائیو کے کونے پر۔“

ہیری سر ہلاتے ہوئے تفصیلات نوٹ کر رہا تھا۔

”ہم نے لائسنس پلیٹ نمبر کی معلومات کمپیوٹر سے لی ہیں۔ گاڑی K اینڈ K میڈیکل کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔“

”کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اگر تم یہ کیس میری جگہ لے لو۔“ ایڈگر نے کہا۔ ”ویسے بھی میری تین پارٹنر کی ٹیم مکمل نہیں ہے...... ایک کورٹ میں الجھا ہوا ہے، دوسرا کومین آف اینجلز کیس میں اٹکا ہوا ہے۔“

ہیری بوش کے علم میں تھا کہ ہالی ووڈ میں ہومی سائڈ اسکواڈ، روایتی دو پارٹنرز کی جگہ لے چکا ہے۔ اس نے باڈی کے اطراف افراد کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں، یہ سادہ شوٹنگ کیس ہے...... مختلف معاملہ ہے۔ تم یہ کیس لو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”گُڈ۔“ ہیری نے کہا۔ ”کسی نے کار کو دیکھا ہے؟“

”نہیں، تمہارا انتظار ہو رہا تھا۔“

”کوئی مقتول کے گھر پہنچا ہے؟“ ہیری نے سوال کیا۔

”ابھی تک نہیں۔ پہلے ہم کرائم سین سے فارغ ہونا چاہتے تھے۔“

ہیری کو اندازہ تھا کہ ایڈگر، ہیری کو وہاں دیکھ کر چونکا تھا۔ وہ آر ایچ ڈی کے آدمی کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ بات عیاں تھی کہ وہ کیس ”روبری ہومی سائڈ ڈپارٹمنٹ“ کے سپرد کرنا چاہتا تھا اسی لیے اب تک وہاں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ جہاں یہ بات پریشان کن تھی وہیں باعثِ طمانیت بھی تھی کہ ہیری اور اس کے نئے پارٹنر کے لیے کیس پر کام کرنے کے لیے تمام چیزیں تقریباً فریش تھیں۔ کیسز کے معاملے میں ڈپارٹمنٹ بدمعاملگی کی پرانی تاریخ کا حامل تھا۔ لاس اینجلس پولیس ڈپارٹمنٹ (LAPD) کے جغرافیائی اعتبار سے سترہ ڈویژن تھے۔ ہر ایک کا اپنا اسٹیشن، ڈبلیو بیورو اور ہومی سائڈ اسکواڈ تھا۔ طولانی کیسز میں ڈویژنل اسکواڈز پہلی ترجیح تھی۔ سیاسی، سلیبریٹی یا میڈیا سے متعلق کیس کی گیند ہومی سائڈ اسپیشل کے کورٹ میں آتی تھی، اس کا تعلق RHD سے نہیں تھا۔ ایسے کیس عموماً دشوار اور صبر آزما ثابت ہوتے تھے۔

اس نے لاش کے قریب افراد کی گنتی کی۔ کُل پانچ اہلکار تھے۔

”ہاں، تو کرائم سین پر سب سے پہلے تم نے قدموں کے نشان تلاش کیے ہوں گے۔“ وہ آواز کو ہموار نہ رکھ سکا۔

”ہیری۔“ ایڈگر کی آواز بھی کھنچ گئی۔ ”کراسس قریب ہے، یہاں سیکڑوں لوگوں کا آنا جانا ہوتا رہتا ہے...... قدموں کو تلاش کرنا بے معنی تھا۔ مزید یہ کہ یہ پروفیشنل شوٹ ہے۔ گن، کار اور شوز...... قاتل صفائی سے کام کر کے بہت پہلے صاف نکل گئے۔“

ہیری بوش نے سر ہلایا۔ وہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں۔“ ہیری نے کہا۔

کچھ دیر بعد ایڈگر رخصت ہو گیا۔ ہیری نے پورشے کا رخ کیا۔ اس کے خیال میں ایڈگر نے آر ایچ ڈی سے کسی کو نہیں بلایا ہوگا بلکہ یہ حرکت آر ایچ ڈی میں سے کسی نے کی تھی...... اس نے دستانے چڑھائے اور ڈرائیونگ سائڈ کا

دروازہ کھولا۔ اس نے اندر نظر دوڑائی۔ پسنجر سیٹ پر ایک بریف کیس پڑا تھا۔ بریف کیس لاک نہیں تھا۔ ہیری نے اسے کھول کر دیکھا۔ چند فائلیں، ایک کیلکولیٹر، چند پیڈ، پین اور کاغذات۔ ہیری نے اسے بند کر کے وہیں رہنے دیا۔

بعدازاں ہیری نے گلو باکس کھولا۔ پہلے جو ٹیگ اور کلپ اس نے دیکھا تھا ویسے ہی چند اور کلپ وہاں رکھے تھے۔ ہیری نے باری باری ان کا جائزہ لیا۔ ہر ایک بیج مختلف مقامی اسپتالوں نے جاری کیا تھا۔ سب پر وہی تصویر تھی اور نام...... اسٹیلے کینٹ۔ ہیری نے بیجز کے پیچھے دیکھا...... بیشتر پر ہاتھ سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک ان الفاظ کو دیکھتا رہا۔ زیادہ تر کا اختتام ایل اور آر پر ہوا تھا۔ ہیری کے اندازے کے مطابق یہ لاک کمبی نیشن تھے۔

اس نے پھر گلو باکس میں ہاتھ ڈالا...... مزید کی کارڈ اور بیج نکل آئے۔ اسے قدرے حیرت کا سامنا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ مقتول کے قبضے میں لاس اینجلس کے ہر اسپتال کے 'کی کارڈ' اور سیکیورٹی کمبی نیشن موجود تھے۔ پہلا خیال اسے یہ آیا کہ اسٹیلے کینٹ اسپتالوں میں کسی ہیرا پھیری میں ملوث تھا۔ اس نے ہر چیز واپس گلو باکس میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ پھر سیٹوں کے نیچے ناکام تلاشی لی اور گاڑی سے اتر کر کھلے ہوئے ٹرنک کی طرف آ گیا۔ ٹرنک زیادہ بڑا نہیں تھا اور خالی پڑا تھا۔ ہیری نے فلیش لائٹ میں غور سے دیکھا۔ ٹرنک کی تہ پر قالین تھا جس کے چار کونوں پر ایک جیسے نشان تھے۔ نشان ظاہر کر رہے تھے کہ وہاں کوئی چار ٹانگوں یا پہیوں والی چوکور وزنی شے موجود رہی تھی۔ کوئی باکس بھی ہو سکتا تھا۔ جسے دورانِ واردات نکال لیا گیا۔

''ڈیٹیکٹیو؟''

ہیری نے مڑ کر پٹرول مین کو دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''وہاں ایف بی آئی کی ایجنٹ آئی ہے۔ وہ اندر آنا چاہتی ہے؟''

''وہ کہاں ہے؟'' ہیری نے سوال کیا اور اس کی رہنمائی میں چل پڑا۔ وہ زرد ٹیپ کے دوسری طرف اپنی گاڑی کے کھلے دروازے کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ تنہا تھی۔ چہرہ مسکراہٹ سے عاری تھا۔ اسے پہچان کر ہیری کا سینہ جل اٹھا۔

''ہیلو ہیری۔'' اس نے ہیری کو دیکھ لیا تھا۔

''ہیلو راشیل۔'' وہ بولا۔

☆☆☆

ہیری کو ٹھیک طرح یاد نہیں تھا کہ وہ کتنے عرصے بعد ایف بی آئی اسپیشل ایجنٹ راشیل والنگ کو دیکھ رہا تھا۔ ایک وقت تھا، جب کوئی دن راشیل کے خیال کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ رات کے اس پہر مرڈر سین پر وہ دوبارہ آمنے سامنے ہوں گے...... اس نے جین پر آکسفورڈ شرٹ اور گہرے نیلے رنگ کا بلیزر زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس کا حسن اب بھی متاثر کن تھا۔ لگتا تھا کہ ہیری کی طرح اسے بھی کال کر کے اٹھایا گیا تھا۔ اگرچہ ہیری ہوش کال کے وقت بیدار حالت میں تھا۔ راشیل کا سپاٹ چہرہ بتا رہا تھا کہ ہیری کے ساتھ آخری تلخی اسے یاد ہے۔

دونوں آخری بار ایکو پارک پر ملے تھے۔ وہ ایف بی آئی کے کسی خفیہ ٹیکٹیکل انٹیلی جنس کی نمائندہ تھی۔ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ یہ کیا چیز ہے، نہ ہیری نے جستجو کی کہ ایف بی آئی کا مذکورہ یونٹ کام کیا کرتا ہے؟ ایکو پارک کیس میں ملاقاتیں، کیس سے پہلے کے رومانس کا حاصل تھیں۔

اس وقت وہ مقصد سے آئی تھی اور ہیری بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ معلوم کرے گا کہ ایف بی آئی کا مذکورہ یونٹ کس مقصد کے لیے ہے۔

''کیا میں کرائم سین دیکھ سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں، آ جاؤ......'' ہیری نے زرد ٹیپ کو اوپر کیا اور مثبت جواب دیا۔ وہ اندر آ کر رک گئی۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ ہیری کی رہنمائی کا حق تسلیم کرتی ہے۔ وہ راشیل کو لے کر آگے بڑھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اگر میں باڈی دیکھ لوں تو امکان ہے کہ رسمی شناخت بتا سکوں گی۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں موجود فائل دکھائی۔

''اس طرف آؤ۔'' ہیری نے کہا۔ موبائل یونٹ کی فلورسینٹ روشنی میں لاش نارنجی مٹی پر پڑی تھی۔ پہاڑی کا کنارہ محض پانچ فٹ دور تھا۔ نیچے ذخیرۂ آب، جس کے پرے شہر کی روشنیاں تاریکی میں لاکھوں جگنوؤں کے مانند جھلملا رہی تھیں۔

میڈیکل ایگزامنر نے لاش کو سیدھا کر دیا تھا۔ چہرہ زخمی ہو گیا تھا۔ لیکن میگکس پر جو فوٹو ہیری نے دیکھے تھے، وہ پہچان سکتا تھا کہ لاش اسٹیلے کینٹ ہی کی تھی۔ کھلی ہوئی شرٹ میں سے اس کا بالوں سے بے نیاز سینہ نظر آ رہا تھا۔ ایگزامنر نے آلۂ جراحی کے ذریعے ایک جگہ کٹ لگایا ہوا تھا۔ مقصد

جگر تک پہنچنا تھا۔ جگر کی حدت سے تعین کیا جا سکتا تھا کہ قتل کس وقت ہوا۔

''ایوننگ ہیری۔'' ایگزامنر جو فیلٹن نے کہا۔ ''نہیں بلکہ گڈ مارننگ کہنا زیادہ درست ہے...... میرے خیال میں تمہارا اپنا پارٹنر اگناسیو ہے؟'' جو فیلٹن نے راشیل کی طرف دیکھا۔

''ہاں، میں اسی کے ساتھ ہوں۔ یہ اسپیشل ایجنٹ راشیل والنگ ہے...... ایف بی آئی......'' ہیری نے کہا۔ جو فیلٹن نے مشکوک نظروں سے ہیری کو دیکھا۔

راشیل نے آگے بڑھ کر پوزیشن بنائی اور فائل سے آٹھ بائی دس کی رنگین تصویر نکالی۔ یہ چہرے کا کلوز اَپ تھا۔ اس نے احتیاط سے تصویر اور لاش کے چہرے کا موازنہ کیا۔

''اسٹیلے کینٹ۔'' وہ بڑبڑائی۔

ہیری سر ہلا کر لاش کے دوسری جانب چلا گیا۔ ''ڈاکٹر جو، اب تک کہاں پہنچے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''کوئی مقتول کو یہاں لایا تھا یا خود آیا تھا اور مقتول بعد میں۔ وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال مقتول کو گھٹنوں کے بل بٹھایا گیا۔'' جو نے مقتول کی پتلون کے گھٹنوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''پھر کسی نے اس کے سر میں پیچھے سے دو گولیاں ماریں...... وہ نیچے گرا اور چہرہ زخمی ہو گیا۔ تاہم وہ گرنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ گولیاں سر میں ہی ہیں...... غالباً اعشاریہ بائیس کی ہوں گی۔''

''موت کا وقت؟''

''لیور ٹمپریچر کے مطابق، آٹھ بجے کے لگ بھگ۔'' جو نے جواب دیا۔

ہیری کے لیے یہ جواب غیر متوقع تھا۔ آٹھ بجے تاریکی چھا جاتی تھی اور لوگ گھروں میں ہوتے تھے۔ وہ جگہ ایسی تھی کہ دھماکوں کے ساتھ بازگشت کی گونج لازم تھی۔ لیکن کسی نے پولیس کو کال نہیں کی اور لاش بھی پٹرول کار نے دریافت کی...... تقریباً تین گھنٹے بعد۔

''میں جانتا ہوں، تم کیا سوچ رہے ہو۔'' جو نے کہا۔ ''دھماکوں کی آواز...... ممکنہ طور پر وضاحت کی جا سکتی ہے۔ دوستو...... اسے ذرا پلٹو......'' جو نے مدد طلب کی۔

ہیری کھڑا ہوتے ہوئے ذرا سا ہٹ گیا۔ باڈی کو واپس پلٹ دیا گیا۔ ہیری اور راشیل کی نگاہیں چار ہوئیں۔ پھر دونوں کی نظریں لاش کے سر میں گولیوں کے زخم پر رک گئیں۔ سیاہ بال خون آلود تھے۔ عقب سے سفید قمیص پر خاکی اسپرے کے چھینٹے دکھائی دے رہے تھے۔ ہیری نے طویل کیریئر میں اَن گنت کرائم سین دیکھے تھے۔ اس وقت سفید شرٹ پر جو چھینٹے وہ دیکھ رہا تھا، وہ خون کے نہیں تھے۔

''یہ خون نہیں ہے؟''

''ہاں، یہ خون نہیں ہے۔'' جو نے کہا۔ ''یہ پرانا کوکا کولا سیرپ ہے...... بوتل کے پیندے میں بچا ہوا کولا۔''

ہیری کے کچھ کہنے سے پیشتر راشیل بول پڑی۔ ''یہ سائلنسر کی شکل ہے۔ پلاسٹک کی ایک لیٹر بوتل کا منہ گن کی نالی میں پھنسا کر یا ٹیپ لگا کر فائر کرنے سے آواز دب جاتی ہے۔ کیونکہ آواز کی لہروں کو کھلی فضا میں پھیلنے کا موقع نہیں ملتا...... بوتل کا بچا ہوا مشروب بھی ٹارگٹ کی طرف جاتا ہے۔''

جو نے ہیری کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ ''ایک اور چیز قابلِ توجہ ہے۔'' جو نے مقتول کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ہیری نے جھک کر دیکھا۔ ہاتھوں کی درمیانی انگلی میں سرخ رنگت کے رنگ تھے...... پلاسٹک کے رِنگ۔

''یہ کیا ہے؟'' ہیری بوش نے سوال کیا۔

''فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' جو نے جواب دیا۔

''میں بتاتی ہوں۔'' راشیل نے پیشکش کی۔ ''یہ ٹی ایل ڈی رِنگ کہلاتے ہیں...... تھرمل لوی نیسنٹ ڈوزی میٹری۔ یہ وارننگ ڈیوائس ہے، جو قبل از وقت خطرے کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ رِنگ ریڈی ایشن کی موجودگی کو محسوس کر کے وارن کرتا ہے کہ آپ ریڈی ایشن کی زد میں ہیں۔'' وہ ہیری سے مخاطب تھی۔ اس کے انکشاف نے کچھ دیر کے لیے وہاں سکوت طاری کر دیا۔

''ایک اور بات بتاؤں۔'' وہ بولی۔ ''اگر رِنگ اس طرح پہنا جائے کہ اس کا سفید حصہ اندر کی جانب ہو...... جیسے مقتول کی انگلیوں میں ہے...... یعنی ٹی ایل ڈی اسکرین اندر کی جانب ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ رِنگ پہننے والا ریڈیو ایکٹو مواد کو ہینڈل کرتا رہا ہے۔''

''او کے، سب لوگ پیچھے ہٹ جائیں۔'' ہیری نے کہا۔

راشیل کے علاوہ سب نے فاصلہ اختیار کر لیا۔

''رک جاؤ، خطرے کی بات نہیں ہے۔'' راشیل نے ہاتھ اٹھایا۔ تاہم کوئی سابقہ پوزیشن پر واپس نہیں آیا۔

''اگر تابکاری کا خطرہ موجود ہوتا تو ٹی ایل ڈی رِنگ

کا اسکرین سیاہ ہو جاتا۔ یہ قبل از وقت وارننگ کی علامت ہے۔'' راشیل نے اطمینان دلایا۔ ''اس کے علاوہ یہ دیکھو۔'' اس نے اپنی جیکٹ کو ایک طرف ہٹایا۔ اس کی بیلٹ کے ساتھ پیجر نما ایک چھوٹا سا باکس منسلک تھا۔ ''یہ تابکاری کو مانیٹر کرتا ہے۔'' راشیل نے وہاں موجود افراد کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ''خطرے کی صورت میں یہ سائرن کی طرح بجنے لگتا اور بھاگنے والوں میں، میں سب سے آگے ہوتی...... اوکے، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے...... کول ڈاؤن۔''

ہیری، راشیل کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ کہنی کے قریب سے پکڑا۔ ''یہاں سے ہٹو، ایک منٹ بات کرنی ہے۔''

وہ بدمزہ ہو گیا تھا۔ ماحول راشیل کی سمت شفٹ ہو رہا تھا۔ بالفاظ دیگر ایف بی آئی کی طرف۔ ہیری، کرائم سین پر اپنا کنٹرول کھونا نہیں چاہتا ہے۔

''راشیل، تم یہاں کیا کر رہی ہو...... کیا معاملہ ہے؟''

''تمہاری طرح، میں نے بھی رات میں کال وصول کی تھی۔''

''یہ جواب تسلی بخش نہیں ہے۔''

''میں یقین دلاتی ہوں کہ میں یہاں تمہاری مدد کے لیے آئی ہوں۔''

''ایسا ہے تو مجھے تفصیل بتاؤ...... یہ بھی بتاؤ کہ تمہیں بھیجا کس نے ہے؟''

راشیل نے دائیں بائیں دیکھا پھر ہیری پر نظر ڈالی اور زرد ٹیپ کی دوسری جانب اشارہ کیا۔ ''وہاں چلیں؟''

وہ زرد ٹیپ کے دائرے سے باہر آ گئے۔

''دیکھو، جو میں بتا رہی ہوں۔ یہ ایک کانفی ڈینشل میٹر ہے۔ اسٹینلے کینٹ کا نام پہلے سے لسٹ پر تھا۔ جب تم یا تمہارے لوگوں نے اس کا نام کمپیوٹر میں نیشنل کرائم انڈیکس کے لیے ڈالا تو واشنگٹن ڈی سی میں سرخ جھنڈی لہرانے لگی اور ایف بی آئی کے ٹیکنیکل انٹیلی جنس نے مجھے کال کی۔

''وہاٹ؟ کیا وہ دہشت گرد ہے؟''

''نہیں، میڈیکل سے تعلق رکھتا ہے۔ فزیشن...... اور ایک ایسا شہری جو قانون کا احترام کرتا ہے۔''

''پھر ایف بی آئی، رات میں یہاں کیا کر رہی ہے...... تابکاری کے رِنگ...... کیا کہانی ہے...... اور اس کا نام کون سی لسٹ پر تھا؟''

راشیل نے ہیری کے سوالات نظرانداز کر دیے۔

''ہیری، مجھے یہ بتاؤ کہ کوئی اس کے گھر گیا یا اس کی بیوی سے ملا؟''

''ابھی نہیں۔ ہمارا پلان تھا کہ پہلے کرائم سین......''

''فوراً نکلو۔'' راشیل نے کہا۔ ''سوالات راستے میں کر لینا۔''

''گاڑی میں چلاؤں گا۔'' اس نے راشیل کی فورڈ مستانگ کی طرف اشارہ کیا...... ''ایک منٹ رکو۔'' وہ ایڈگر کی کرودر کی طرف چلا گیا۔ جہاں مقتول کی اشیا پلاسٹک کے منی بیگز میں کرودر کے ٹرنک پر رکھی تھیں۔ ہیری نے وہاں متعین سارجنٹ سے کہا۔ ''سنو، میں مقتول کے گھر جا رہا ہوں۔ میرا پارٹنر اگناسیو پہنچنے والا ہے...... ہم دونوں میں سے کسی کے آنے تک حالات پر نظر رکھنا۔''

سارجنٹ نے سر ہلایا۔ ہیری نے سیل فون نکال کر اگناسیو کا نمبر ملایا۔ وہ بیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ ہیری نے اسے مختصر ہدایات دیں۔ فون بند کیا اور چلتے چلتے آنکھ بچا کر ٹرنک پر رکھی مختلف اشیا میں سے ''کی رِنگ'' اٹھا کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ مستانگ تک پہنچا تو راشیل پسنجر سیٹ پر تھی۔

ہیری نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ ''کون تھا؟ پریذیڈنٹ سے بات کر رہی تھیں؟''

''میرا پارٹنر تھا۔ میں نے اسے کہا ہے کہ وہیں گھر پر ملے۔''

ہیری نے انجن اسٹارٹ کرتے ہی سوالات شروع کر دیے۔ ''اگر وہ دہشت گرد نہیں تھا تو کس قسم کی لسٹ پر اُس کا نام تھا؟''

''بحیثیت میڈیکل فزیسٹ وہ تابکاری مواد تک براہِ راست رسائی رکھتا تھا۔'' راشیل نے کہا۔

راشیل کا جواب سن کر ہیری کے ذہن میں ان تمام اسپتالوں کے نام ابھرے جن کے ٹیگس اس نے پورشے کے گلوبکس میں دیکھے تھے۔

''یہ مواد کہاں تھا...... اسپتالوں میں؟''

''ہاں، ایسا ہی تھا۔ کیونکہ بنیادی طور پر یہ مخصوص تابکاری مواد کینسر کے علاج میں استعمال ہوتا ہے۔''

ہیری نے سر ہلایا۔ ''راشیل میں کیا مِس کر رہا ہوں؟ مجھے سمجھاؤ۔''

''اسٹینلے کینٹ رسائی رکھتا تھا لیکن دوسرے لوگ بھی دلچسپی رکھنے کے باوجود تابکاری مواد سے دور تھے اور ان کی دلچسپی کی وجہ کینسر کا علاج نہیں تھا۔''

''دہشت گرد؟''

''بالکل ٹھیک۔'' راشیل نے کہا۔

''کیا اسٹینلے آزادانہ نقل و حرکت کرتا رہا۔ اسپتالوں میں سیکیورٹی سسٹم تو ہو گا یا نہیں؟''

''حفاظتی نظام کے باوجود رخنے رہ جاتے ہیں۔ خصوصاً ایسے لوگوں کے لیے جن پر اعتماد کیا جاتا ہے، ایسے افراد اندر کے آدمی ہوتے ہیں، جیسے اسٹینلے کینٹ۔''

ہیری سوچ رہا تھا کہ یقیناً اسٹینلے شک سے بالاتر تھا کہ اس نے کارڈز کے پیچھے کمبی نیشن تک لکھ رکھے تھے۔

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' ہیری نے کہا۔

''سیکیورٹی مضبوط ہو یا کمزور...... تم رسائی کے لیے کیا کرتے؟''

''ظاہر ہے، ایسے شخص کو تلاش کرتا جو ایسے نظام کو خوب جانتا ہے۔'' ہیری نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔''

''یعنی تم کہنا چاہ رہی ہو کہ......''

''نہیں، ابھی نہیں...... ابھی میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔''

''کیا تم اسٹینلے کینٹ کو جانتی تھیں؟'' ہیری نے اچانک ایک مختلف سوال کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ اندھیرے کا تیر تھا۔ ہیری ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے سوال پر راشیل نے مدھم حیرت کا اظہار کیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ہیری آگاہ تھا کہ جواب میں اسے جھوٹ سننا پڑے گا۔

''نہیں، میں کبھی اُس سے نہیں ملی۔''

ہیری نے گاڑی روک دی۔ ''گھر آ گیا۔''

گھر کے اندر اور باہر تاریکی کا راج تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کوئی رہائش پذیر نہیں ہے۔

''کیا کر رہے ہو؟ یہ اس کا گھر نہیں ہے۔ وہ دوسرے بلاک......'' اچانک اس نے ہونٹ سی لیے۔ تاہم تاخیر ہو چکی تھی۔ ہیری چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ''تم میرے ساتھ صاف گوئی کا مظاہرہ کرو گی یا گاڑی سے اترو گی؟''

''دیکھو ہیری، میں نے بتایا تھا کہ کچھ معاملات......''

''پلیز راشیل، اتر جاؤ...... میں خود سنبھال لوں گا۔''

''تمہیں سمجھنا چاہیے۔'' راشیل نے پھر کوشش کی۔

''دِس اِز ہوی سائنڈ۔ بائی ہوی سائنڈ۔''

''میں ایک فون کروں گی اور تمہیں اس کیس کی تفتیش سے ہٹا دیا جائے گا۔'' راشیل نے پینترا بدلا۔

''خوب...... شاید تم ہیری بوش سے پہلی مرتبہ مل رہی ہو۔ فوراً کال کرو، مجھے ابھی...... آج رات، میرے ہی کیس پر سے ہٹاؤ گی۔ ڈو اِٹ ناؤ۔'' ہیری نے جھک کر ہاتھ بڑھایا اور راشیل کی سائڈ کا ڈور کھول دیا۔

راشیل نے ہاتھ بلند کر کے پسپائی اختیار کی۔ ''آل رائٹ۔'' اس نے کہا۔ ''کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''سچ، پورا سچ!''

☆☆☆

''تم اس کو جانتی تھیں۔ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ کیا وہ دہشت گرد ہے؟''

''میں نے کہا تھا، نہیں۔ وہ فزیسٹ ہے۔ قانون پسند شہری ہے لیکن وہ واچ لسٹ پر تھا۔ کیونکہ اگر تابکار مادہ غلط ہاتھوں میں جاتا ہے تو عوام کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے۔''

''کیا مطلب ہے؟ وہ کیسے؟''

''مختلف طریقے ہیں۔ انفرادی...... اور اجتماعی دونوں۔ پچھلی مرتبہ ٹیکس کیونگ ڈے پر ایک روسی لندن میں پولونیم کے ذریعے ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ ایک انفرادی ٹارگٹ تھا۔ وہ ایک معمولی نشانہ...... غالباً پولونیم کا ٹیسٹ۔ (تابکار عنصر) کینٹ کی رسائی جس مواد تک رہی تھی، وہ بڑے پیمانے پر تباہی مچا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی ''مال'' یا سب وے یا اور کوئی پُرہجوم جگہ۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ تابکار مادّے کی کتنی مقدار استعمال کی جاتی ہے اور اسے ڈلیور کرنے والا ڈیوائس کس قسم کا ہے۔''

''ڈلیوری ڈیوائس؟ مطلب ڈرٹی بم/بومب؟''

''ہاں، بومب کی شکل ممکن ہے...... نوعیت مختلف ہو سکتی ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہے کہ وہ یہاں نہیں رہتا؟''

راشیل نے انگلیوں سے اپنی پیشانی مسلی...... جیسے ہیری کے سوالات نے سر درد پیدا کر دیا ہو۔ ''کیونکہ میں پہلے بھی اس کے گھر آ چکی ہوں۔ یہ گزشتہ برس کے اواخر کی بات ہے۔ اس وقت میرا پارٹنر بھی ہمراہ تھا۔ ہم نے اسے اور اس کی بیوی کو اس پیشے سے منسلک خطرات سے آگاہ کیا تھا۔ ہمیں یہ ہدایت ہوم لینڈ سیکیورٹی ڈپارٹمنٹ کی جانب سے ملی تھی، اوکے؟''

''اوکے۔ لیکن یہ ایف بی آئی کے پُراسرار ٹیکنیکل ونگ کا روٹین چیک نہیں تھا...... نہ ہی ہوم لینڈ سیکیورٹی کی معمول کی کارروائی۔ خطرہ کیوں محسوس کیا گیا؟ دھمکی کس کو

ملی تھی؟"

راشیل نے نشست میں پہلو بدلا۔ "کوئی مخصوص خطرہ نہیں تھا...... یہ محض احتیاطی تدابیر تھیں۔ سولہ مہینے قبل کسی نے گرینس برو میں ایک کینسر کلینک سے بائیس چھوٹی ٹیوبس چرالی تھیں۔ ٹیوبس میں، ریڈیو آئیسوٹوپس "سیسیم 137" موجود تھے۔ ہمیں نہیں پتا کہ چرانے والا کون تھا اور مقصد کیا تھا...... تاہم یہاں لاس اینجلس میں جوائنٹ ٹیررازم ٹاسک فورس نے اسی قسم کے مختلف مواد کی سیکیورٹی جانچنے کا فیصلہ کیا۔ مقامی اسپتالوں کے متعلقہ افراد سے رابطہ کرکے انہیں الرٹ کیا گیا۔ نیز حفاظتی اقدامات بڑھا دیے گئے...... کیا اب چلیں؟" آخر میں راشیل نے خواہش ظاہر کی۔

"ٹاسک فورس نے تمہارے ونگ کو اشارہ کیا اور آخر میں ذمے داری تم تک آن پہنچی؟"

"ہاں، میں اور میرا پارٹنر وفاقی ایجنٹ تھے۔ ہم اسٹیلے کینٹ اور دوسرے افراد سے ملے۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کا نام ہمارے کمپیوٹرز میں ٹمٹمایا تو مجھے کال کیا گیا۔"

ہیری نے گاڑی اسٹارٹ کرکے ریورس کی۔ "تم نے شروع میں ہی مجھے آگاہ کیوں نہیں کیا؟"

"کیونکہ گرینس برو کے واقعے کے بعد کوئی موت یا مشکوک صورتِ حال سامنے نہیں آئی تھی۔ کوئی اور وجہ بھی ممکن ہوسکتی ہے اسی لیے مجھے احتیاط اور صوابدید کے ساتھ حرکت کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔"

"کیا گرینس برو سے غائب ہونے والی سیسیم 137 بازیاب کرلی گئی تھی؟"

"نہیں، مثبت استعمال کے لیے اس کی خاصی قیمت تھی۔ افواہ اُڑی کہ وہ بلیک مارکیٹ میں فروخت ہوچکی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم پُریقین نہیں تھے اور مجھے آنا پڑا۔"

ہیری نے خاموشی اختیار کرلی۔ ایک منٹ سے پہلے وہ صحیح بلاک میں صحیح مکان کے قریب تھے۔ دونوں گاڑی سے باہر آگئے۔ یہ مکان بھی تاریک تھا۔ ہیری داخلی دروازے پر پہنچا...... باریک جھری بتا رہی تھی کہ دروازہ کھلا ہے۔

"دروازہ کھلا ہے۔" ہیری نے سرگوشی کی اور گن نکال لی۔ راشیل کی گن بھی ہاتھ میں تھی۔ دونوں گن بدست، چوکنے انداز میں خاموش اور تاریک مکان میں داخل ہوگئے۔ ہیری نے دیوار پر ہاتھ پھیر کر سوئچ آن کردیا۔ وہ خالی لیونگ روم میں کھڑے تھے۔ کسی گڑبڑ کے آثار نہیں تھے۔ راشیل نے مسز کینٹ کو پکارا اور سرگوشی میں ہیری کو بتایا کہ وہاں بچے نہیں ہیں۔ اس نے ایک بار پھر آواز بلند کی۔ تاہم سناٹا قائم رہا۔

دونوں ایک دوسرے سے دور ہوگئے اور محتاط انداز میں آگے بڑھنا شروع کیا۔ ہیری نے ایک اور سوئچ آن کردیا۔ گھر خالی دکھائی دے رہا تھا۔ تاہم چند منٹ بعد انہوں نے ماسٹر بیڈ روم میں مسز کینٹ کو دریافت کرلیا۔ وہ بستر پر عریاں حالت میں بندھی پڑی تھی۔ منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ راشیل بستر کی طرف اور ہیری باتھ روم کی طرف گیا۔ اس نے باتھ روم اور کلوزٹ چیک کیا اور بستر کے قریب آگیا۔ مسز کینٹ کو عجیب انداز میں باندھا گیا تھا۔ دونوں ہاتھ اور ٹانگیں پیچھے لے جاکر کلائیاں اور ٹخنے جکڑ دیے گئے تھے۔ ریڑھ کی ہڈی معکوس حالت میں خم کھا گئی تھی۔ باندھنے کے لیے ٹائیاں استعمال کی گئی تھیں۔ راشیل نے جیبی چاقو سے بندھن کاٹے اور چادر اوپر ڈال کر جسم ڈھک دیا۔ کمرے میں پیشاب کی بُو نمایاں تھی۔

"زندہ ہے؟"

"ہاں۔" راشیل نے جواب دیا۔ "شاید بے ہوش ہے۔" راشیل نے عورت کی کلائیاں اور ہاتھ مسلنے شروع کیے۔ جن کی رنگت بندش اور کم دورانِ خون کے باعث جامنی ہورہی تھی۔ ہیری نے ہال وے میں آکر پیرامیڈیکس کے حصول کے لیے نمبر ملایا۔ دس منٹ کا وقت بتا کر وہ واپس بیڈ روم میں آگیا۔ ایک زندہ گواہ کی موجودگی میں اسے طمانیت کا احساس ہورہا تھا۔ یہ نہایت اہم اور امید افزا تھا کہ مسز کینٹ جلد از جلد گفتگو کے قابل ہوجائے۔ اس نے کراہنا شروع کردیا تھا۔

راشیل اسے تحفظ کا احساس دلا رہی تھی۔ مسز کینٹ تناؤ کا شکار تھی۔ دو اجنبی افراد کو وہاں دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ راشیل نے ایف بی آئی کی آئی ڈی دکھاتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟"

"کیا؟ کون...... میرا شوہر کہاں ہے؟" اس نے اٹھنا چاہا۔ معاً اسے برہنگی کا احساس ہوا۔ اس نے چادر مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ لی۔ راشیل نے ہیری کی جانب دیکھا، جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیسے ہینڈل کیا جائے۔

"مسز کینٹ، تمہارا شوہر یہاں نہیں ہے۔" ہیری نے کہا۔ "میں ڈیٹکٹو ہیری بوش ہوں۔ لاس اینجلس پولیس ڈپارٹمنٹ اور یہ ایف بی آئی ایجنٹ راشیل ہے۔ ہم جانتا

چاہ رہے ہیں کہ تمہارے شوہر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟“

عورت نے ہیری، پھر راشیل کو دیکھا۔ وہ راشیل کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے یاد ہے، تم یہاں پہلے بھی کسی کے ساتھ آئی تھیں اور ہمیں سمجھایا تھا...... کیا یہ وہی......“ وہ خاموش ہو گئی۔

”مسز کینٹ...... ایلی سیا، رائٹ؟ ایلی سیا ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں لیکن بہت ضروری ہے کہ تم حوصلے اور سکون کا مظاہرہ کرو۔ اس طرح ہم کم وقت میں زیادہ بات کر سکیں گے۔“ راشیل نے اسے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً پہلے تم لباس پہننا پسند کرو گی۔“

ایلی سیا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اوکے، ہم لیونگ روم میں انتظار کر رہے ہیں۔ تاہم پہلے یہ بتا دو کہ تم زخمی تو نہیں ہو؟“

ایلی سیا نے نفی میں سر ہلایا۔ تاہم اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور وہ کم گوئی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ”انہوں نے تشدد نہیں کیا تھا، مجھے ڈرایا تھا اور بے لباسی کا مطالبہ کیا تھا۔“ ہیری غیر محسوس انداز میں ایلی سیا کی آنکھیں پڑھ رہا تھا۔

”اوکے۔“ راشیل بولی۔ ”تم پہلے لباس لے لو۔ پیرا میڈیکس کے آنے پر ہم تمہاری جسمانی حالت پھر بھی دیکھیں گے۔“

ایلی سیا کینٹ بوکھلاہٹ میں چادر لپیٹے بستر پر ہی کھڑی ہو گئی۔ ہیری نے میٹرس پر نمی کا دھبا دیکھا۔ اس پر جو بیتی تھی، وہ بہت نہیں تو کسی حد تک خوفناک تھی...... بوجہ مثانے کا کنٹرول ختم ہو گیا تھا۔ وہ بستر سے اتر کر کلوزٹ کی طرف گئی اور لڑکھڑا گئی۔ ہیری نے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

”تم ٹھیک ہو؟“

”ہاں، چکر آ گیا تھا۔ کیا وقت ہو گیا؟“

ہیری نے بیڈ کی دائیں جانب ڈیجیٹل کلاک کو دیکھا لیکن اس کا اسکرین تاریک تھا۔ وہ بند ہو گیا تھا یا اس کا پلگ نکلا ہوا تھا۔ ہیری نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور ایک بجے کا اعلان کیا۔ مسز کینٹ کا جسم جیسے اکڑ گیا۔ ”او مائی گاڈ...... گھنٹے گزر گئے۔ اسٹینلے کہاں ہے؟“

ہیری نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا کیا۔ ”تم لباس پہنو، پھر ہم بات شروع کرتے ہیں۔“

وہ ناہموار چال کے ساتھ کلوزٹ پر پہنچی اور اس کا پٹ کھولا۔ پٹ کی بیرونی سطح پر قدِ آدم آئینہ لگا تھا۔ پٹ گھوما تو لمحہ بھر کے لیے ہیری نے اپنا عکس دیکھا۔ اپنی ہی آنکھوں میں اس نے اجنبی عنصر محسوس کیا۔ آنکھوں میں کون سی کیفیت تھی...... اپنے گھر سے نکلتے وقت اس نے آئینہ دیکھا تھا تو آنکھیں نارمل تھیں۔ اب بے چینی تھی یا خوف تھا یا کچھ اور۔ یہ قابلِ فہم ہے، اس نے سوچا۔ وہ ہزاروں مرڈر کیسز میں شامل رہا تھا لیکن یہ کیس کسی اور طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

ایلی سیا کینٹ، سفید رنگ کا لباس نکال کر باتھ روم میں چلی گئی۔ راشیل خواب گاہ سے نکلی اور ہیری نے بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے ماسٹر بیڈ روم چھوڑ دیا۔

”کیا خیال ہے تمہارا؟“ راشیل نے لیونگ روم میں آ کر سوال کیا۔

”گڈ لک۔“ ہیری نے کہا۔ ”گواہ موجود ہے۔ کچھ نہ کچھ مدد ملے گی۔“

”ہاں، امید ہے۔“

”میں ذرا گھر کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔“ ہیری باہر نکل گیا۔ ہر کمرے کے ساتھ اس نے عقبی ورانڈا اور گیراج بھی دیکھا۔ اس نے کوئی خاص بات محسوس نہیں کی۔ سوائے اس کے کہ دو گاڑیوں کی گنجائش والا گیراج خالی پڑا تھا۔ اگر پورشے کے علاوہ بھی کوئی گاڑی تھی تو اس وقت وہ وہاں نہیں تھی۔ ہیری نے فارنسک ٹیم بھی طلب کر لی۔

بعد ازاں اس نے اپنے سپروائزر لیوٹیننٹ کو کال کر کے بیدار کیا اور اب تک کی تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ دہشت گردی کے ممکنہ زاویے اور فیڈرل ایجنٹس کی دلچسپی بھی گوش گزار کر دی۔

”ہونہہ...... یوں معلوم ہوتا ہے، مجھے چند کالز کرنی پڑیں گی۔“ لیوٹیننٹ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

ہیری کے علم میں تھا کہ لاس اینجلس پولیس کا اپنا ہوم لینڈ سیکیورٹی آفس ہے لیکن اس کا موازنہ ایف بی آئی کے سیکیورٹی آفس سے ممکن نہیں تھا۔ لاس اینجلس کے آفس میں زیادہ تر بڑبولے تھے اور ہوم لینڈ سیکیورٹی کا ہیڈ کیپٹن بیڈلی تھا جو ابھی تک بیورو کے مقابلے میں اپنی بہتر کارکردگی ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا۔

ہیری واپس لیونگ روم میں آیا تو راشیل سیل فون پر مصروف تھی اور ایک آدمی وہاں موجود تھا، جسے ہیری نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا، عمر چالیس سے اوپر تھی۔ اسے پہچاننے کے لیے ہیری کو بیج یا وردی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایف بی آئی کا آدمی تھا۔ ہیری کے لیے اس کے تیور اور انداز ہی شناخت کے لیے کافی وشافی تھا۔

”تم غالباً ڈیٹکٹیو ہیری بوش ہو۔“ اس نے کہا۔ ”میں راشیل کا پارٹنر جیک بریز ہوں۔“

ہیری نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ عام سی بات تھی لیکن جس انداز میں اس نے خود کو راشیل کا پارٹنر ظاہر کیا تھا وہ بات کچھ خاص تھی۔ بغیر کہے وہ کہہ گیا تھا کہ اب سینئر پارٹنر جاب پر ہے۔ اگر راشیل کا نقطہ نظر دوسرا ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”سوری۔“ راشیل نے فون بند کیا۔ ”اسپیشل ایجنٹ انچارج کا فیصلہ ہے کہ تین ٹیمیں ان اسپتالوں میں جائیں جہاں ہاٹ لیبز ہیں اور جہاں اسٹینلے کینٹ مقتول ہونے سے پہلے وزٹ کر چکا تھا۔“

ہیری کے علم میں تھا کہ وہ سرچ کا دائرہ محدود کر کے سینٹ اگاتھا کلینک فار وومین پر مرکوز کر سکتا ہے۔ اس اسپتال کا آئی ڈی ٹیگ اسٹینلے کے پاس تھا۔ راشیل اور بریز اس امر سے لاعلم تھے۔ ہیری نے فیصلہ کیا کہ فی الحال ان کو لاعلم رکھنا ہی بہتر ہے۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ تفتیش کا اختیار ایف بی آئی کی جانب جھک رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم ایک کلیو اس کے پاس محفوظ رہے۔

”ایل اے پی ڈی کا کیا ہو گا؟“ اس نے ایک مختلف سوال کیا۔

”ایل اے پی ڈی؟“ بریز گویا اچھل پڑا۔ ”ہیری، تم اپنی بات کر رہے ہو؟ یہی سوال کیا تم نے؟“

”ہاں، ٹھیک سمجھے ہو۔ میں اس قضیے میں کہاں کھڑا ہوں؟“

بریز نے معانقے کے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ ”تم کیس میں ہو...... ہمارے ساتھ ہو۔“ اس نے یوں کہا جیسے وعدہ کر رہا ہو۔ اس نے تصدیق طلب نظروں سے راشیل کی طرف دیکھا لیکن وہ دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ایلی سیا، اپنا حلیہ درست کر کے آئی، تب ہیری کو پہلی بار اس کے حسنِ جہاں سوز کا ادراک ہوا۔ اس نے وہی سفید لبادہ زیبِ تن کیا ہوا تھا۔ اس کے حسین چہرے پر دکھ کا سایہ تھا۔ ایلی سیا نے بریز کی موجودگی محسوس کی۔ بریز نے اپنا تعارف کرایا۔ تاہم ایلی سیا کی آنکھوں میں الجھن برقرار تھی۔ اگرچہ پہلے اس نے راشیل کو پہچان لیا تھا، وہ کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

”میرا شوہر کہاں ہے؟“ اس نے گویا مطالبہ کیا۔

راشیل اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ بریز کرسی لے کر قریب آ گیا۔ ہیری کھڑا رہا۔ اس قسم کے حالات میں اسے آرام دہ نشست سنبھالنا پسند نہیں تھا۔

”مسز کینٹ۔“ ہیری نے آغاز کیا۔ وہ کیس پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ”میں ہومی سائڈ ڈیٹکٹیو ہوں۔ میرے پاس اچھی خبر نہیں ہے۔ مجھے دلی افسوس ہے۔ رات چند گھنٹے قبل ہمیں ایک باڈی ملی ہے جو آپ کے شوہر کی ہے۔ ہمیں حقائق کا سامنا کرتے ہوئے تیزی سے مجرموں تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم سب افسردہ ہیں اور پوری طرح مستعد بھی......“

ایلی سیا کا سر ڈھلک گیا۔ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کا بدن لرز رہا تھا پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کی توجہ سفید لبادے پر سے ہٹ گئی۔ جسے راشیل نے کھلنے سے بچایا۔ بریز نے پانی کا گلاس مہیا کیا۔

ہیری، ایلی سیا کو دیکھ رہا تھا۔ کیریئر کے دوران اس نے کتنی ہی بار یہ خبر سنائی تھی لیکن کبھی بھی اس کا عادی نہیں بن سکا تھا۔ اسے یہ ایک مکروہ فعل معلوم ہوتا تھا۔ خود اس کے ساتھ چالیس برس قبل ایسا ہوا تھا جب اس نے اپنی ماں کے مرڈر کی خبر سنی تھی۔

کچھ دیر کے لیے وہاں سکوت کا عالم رہا۔ پیشتر اس کے کہ کوئی نیا سوال اٹھتا، دروازے پر دستک ہوئی۔ پیرا میڈیک اسٹاف پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنے ساز و سامان کے ساتھ مسز کینٹ کی جانب متوجہ ہوئے۔ ہیری، بریز اور راشیل کے ساتھ کچن میں آ گیا۔

”تم لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟“ ہیری نے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ تم لیڈ کرو۔“ بریز نے کہا۔ ”کہیں ضرورت محسوس ہوئی تو ہم بھی شامل ہو جائیں گے۔ اگر تمہیں یہ پسند نہیں......“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں لیڈ کرتا ہوں۔“ ہیری نے راشیل کی طرف دیکھا۔ تاہم راشیل نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہیری لیونگ روم میں آ گیا۔ طبی عملہ ایلی سیا کے ٹخنوں اور کلائیوں پر کسی قسم کی کریم کی مالش کر رہا تھا۔ ایک فشارِ خون جانچ رہا تھا۔ گردن پر بینڈیج بھی نظر آ رہی تھی۔ سیاہی مائل جامنی رنگ کلائی اور ٹخنوں پر کم ہو گیا تھا۔ فون کی جھنجھناہٹ پر وہ واپس کچن میں آ گیا۔ دونوں ایجنٹ وہاں نہیں تھے۔ ہیری نے تجسس محسوس کیا۔ وہ دونوں گھر کے کس حصے میں کیا تلاش کر رہے ہوں گے۔

کال اس کے پارٹنر اگناسیو کی تھی۔

''کیا باڈی وہاں موجود ہے؟'' ہیری نے سوال کیا۔
''نہیں کرائم سین کلیئر ہے۔ فارنسک کا کام بھی تقریباً ختم ہو چکا ہے۔'' اگناسیو نے بتایا۔ ہیری نے اسے کیس کی پروگریس کے بارے میں آگاہ کیا اور ایف بی آئی کے بارے میں بھی کچھ باتیں گوش گزار کردیں۔ ہیری نے اسے ہدایت دی کہ اطراف میں موجود مکینوں کے دروازے بجانا شروع کردے۔ شاید کوئی اطلاع ہاتھ آجائے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا امکان بعید تر ہے۔ کسی نے 911 پر کال نہیں کی تھی۔
''ہیری، رات کے اس پہر۔'' نوجوان اگناسیو ہچکچایا۔
''ہاں، شروع ہو جاؤ۔'' ہیری نے بے دھڑک کہا۔ کسی اطلاع کا امکان ہے تو ابھی ملنی چاہیے...... بجائے اس کے کہ بعد میں انکشاف ہو۔ وہ کچن سے نکلا تو پیرامیڈیکل ٹیم روانہ ہونے والی تھی۔ ان کے مطابق مسز کینٹ جسمانی طور پر صحت مند تھی سوائے معمولی زخم اور خراشوں کے۔
راشیل ایک بار پھر ایلی سیا کے ساتھ بیٹھی تھی اور بریز کرسی پر ٹکا ہوا تھا۔ کافی ٹیبل شیشے کی بنی تھی جس کے ایک طرف ایلی سیا بیٹھی تھی۔ ہیری میز کے دوسری طرف ایلی سیا کے عین بالمقابل کرسی پر جم گیا۔
''مسز کینٹ۔'' اس نے کہا۔ ''تمہارے صدمے اور ناقابلِ تلافی نقصان کو ہم سمجھ رہے ہیں لیکن وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم سستی دکھانا نہیں چاہتے۔ یہ دنیا پرفیکٹ نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو گفتگو ہم چند روز بعد شروع کرتے۔ تم بھی سمجھ سکتی ہو کہ یہ ایک ارجنٹ معاملہ ہے۔ یہاں آج رات تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟''
ایلی سیا نے اثبات میں سر ہلا کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔
''وہ دو آدمی تھے۔'' اس نے اشکبار آنکھوں سے بولنا شروع کیا۔ ''دستک پر میں دروازے پر گئی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں دروازہ بند کرنے والی تھی کہ وہ دونوں اچھل کر سامنے آگئے۔ ان کے پاس ایک چھری تھی۔ انہوں نے مجھے دبوچ کر چھری میری گردن پر رکھ دی اور گلا کاٹنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ میں ان کی ہدایات کے مطابق عمل کروں۔'' ایلی سیا خاموش ہو گئی۔
''تمہیں وقت یاد ہے؟'' ہیری نے سوال کیا۔
''تقریباً چھ بجے تھے، جھٹپٹا تھا۔ میں ڈنر کی تیاری کر رہی تھی۔ اسٹینلے اکثر سات بجے آتا ہے۔'' شوہر کے ذکر پر اس کی آنکھیں پھر اشکبار ہو گئیں۔ ہیری چاہتا تھا کہ سوالات کے دوران میں وقفہ نہ آئے۔ کیونکہ پیرامیڈیک والے اسے سکون کی گولی دے گئے تھے جس کے اثرات نمودار ہونے کی صورت میں جوابات بھی متاثر ہوتے۔
''مسز کینٹ، ان کا مطالبہ کیا تھا؟''
''میں سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ مجھے بیڈروم میں لائے اور کپڑے اتروا دیے۔ پھر ان میں سے ایک نے سوالات شروع کردیے۔ خوف نے مجھے خوف زدہ کردیا۔ انہوں نے مجھے تھپڑ مارے اور شور مچایا۔ انہیں معلومات درکار تھیں۔''
''کیسی معلومات؟''
''ہر بات مجھے یاد نہیں...... مجھ پر دہشت طاری تھی۔''
''مسز کینٹ سوچو، یاد کرو...... اس طرح ہمیں قاتلوں تک پہنچنے میں مدد ملے گی۔''
''انہوں نے مجھ سے گن کے بارے میں پوچھا اور یہ کہ وہ کہاں رکھی......''
''ایک منٹ۔'' ہیری نے ٹوکا۔ ''ایک ایک کرکے بتاؤ، اس نے گن کا پوچھا، تم نے کیا جواب دیا؟''
''میں نے کہا ہمارے پاس گن ہے۔ اس نے پوچھا کہاں رکھی ہے؟ میں نے بتایا کہ بستر کے ساتھ دراز میں۔''
''تمہیں خوف محسوس نہیں ہوا کہ وہ تمہیں ہلاک کر دیں گے...... تم نے گن کا کیوں بتایا؟'' ہیری نے سوال کیا۔
''میں برہنہ حالت میں بے بس بیٹھی تھی۔'' ایلی سیا نے نگاہ نیچے کرکے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ''میں پہلے ہی پُریقین تھی کہ وہ ریپ کے بعد مجھے ماردیں گے۔ بتانے یا چھپانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔''
ہیری نے سر ہلایا۔ ''اور انہوں نے کیا معلوم کیا؟''
''انہیں گاڑی کی چابیاں مطلوب تھیں۔ میں نے بتا دیا چابیاں کہاں ہیں۔''
''وہ تمہاری کار کی چابیوں کی بات کر رہے تھے؟''
''ہاں۔''
''میں نے دیکھا تھا، گیراج خالی ہے۔''
''وہ کار لے گئے ہوں گے، میں نے گیراج کے دروازے کی آواز سنی تھی۔''
دفعتاً بریز کھڑا ہو گیا۔
''کیا تم کار کے بارے میں بتا سکتی ہو...... اور لائسنس پلیٹ نمبر؟''
''کرائسلر 300۔ نمبر مجھے یاد نہیں۔ میں انشورنس فائل میں دیکھ سکتی ہوں۔''
بریز نے ہاتھ اٹھا کر اسے حرکت کرنے سے روک دیا۔ ''ضروری نہیں ہے۔ میں معلوم کرلوں گا۔ ایک کال کرنی پڑے گی۔'' وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ ہیری نے اگلا سوال کیا۔ جواب سن کر اسے قدرے حیرت ہوئی۔
''کیمرا؟''
''ہاں، میرے شوہر کا کیمرا جو کمپیوٹر کے ساتھ ہوتا ہے۔ جسے میں نے کیمرے کے بارے میں بتایا تھا، اس نے اپنے ساتھی کو کسی اور زبان میں کہا اور وہ کیمرا لینے چلا گیا۔''
اس مرتبہ راشیل اٹھ کھڑی ہوئی اور ہال وے کا رخ کیا۔
''راشیل کسی چیز کو مت چھیڑنا...... کرائم سین کی ٹیم پہنچ رہی ہے۔''
راشیل نے ہاتھ ہلایا اور غائب ہو گئی۔ اس وقت بریز کی صورت دکھائی دی۔ ''بولو (BOLO) نے چھان بین شروع کردی ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔
''کیا؟'' ایلی سیا کچھ نہیں سمجھی۔
''مطلب...... بی آن دی لک آؤٹ (BOLO)۔'' ہیری نے سمجھایا۔ ''وہ تمہاری کار تلاش کرلیں گے...... تم کیا بتا رہی تھیں؟''
''پھر انہوں نے مجھے تکلیف دہ انداز میں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ باندھنے کے لیے انہوں نے میرے شوہر کی ٹائی استعمال کی تھی پھر اس آدمی نے جو کیمرا لایا تھا...... میری پکچر بنائی۔'' وہ پھر چپ ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرے پر ذلت آمیز شرمندگی کی جلن۔ ہیری نے اگلا سوال چند سیکنڈ بعد کیا۔
''فوٹوگراف؟''
''ہاں، بس...... پھر وہ چلے گئے۔ جو انگریزی بول رہا تھا اس نے آہستہ سے مجھے بتایا کہ میرا شوہر مجھے بچائے گا اور وہ چلے گئے۔''
خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا پھر ہیری نے سوال کیا۔
''وہ فوراً چلے گئے تھے...... مطلب تمہیں چھوڑنے کے بعد وہ گھر سے نکل گئے تھے؟''
''نہیں، ان کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔ گیراج کا دروازہ کھلنے، بند ہونے کی آواز آئی۔ شاید پھر وہ گھر سے نکل گئے۔''
بریز نے مداخلت کی۔ ''کچن میں، میں نے سنا تھا کہ انگریزی بولنے والے نے کسی اور زبان میں ترجمہ کیا تھا؟''
''نہیں، میں نہیں سمجھ سکی۔ کوئی عجیب ہی زبان بول رہے تھے وہ۔''
''تم نے شروع میں کہا تھا کہ انہوں نے ماسک پہنے ہوئے تھے۔ کس قسم کے ماسک؟'' ہیری نے سوال کیا۔
ایلی سیا سوچ میں پڑ گئی۔ ''پل اوور کے مانند...... جیسے ڈاکا زنی کرتے ہوئے فلموں میں دکھاتے ہیں۔''
''اونی، اسکائی ماسک؟''
ایلی نے اثبات میں سر ہلایا۔
''ٹھیک ہے یہ بتاؤ کہ ماسک میں آنکھوں کے لیے ایک افقی سوراخ تھا یا دونوں آنکھوں کے لیے الگ الگ دو سوراخ تھے؟''
''میرا خیال ہے...... ہاں علیحدہ سوراخ تھے۔''
''منہ کے لیے الگ سوراخ تھا؟''
''ہاں، ایسا ہی تھا۔'' ایلی سیا نے مثبت میں جواب دیا۔
''گڈ، مسز کینٹ...... تمہاری فراہم کردہ معلومات بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ کوئی ایسی بات، جو میں نے نہیں پوچھی ہو؟'' ہیری نے سوال کیا۔
''میں کچھ نہیں۔''
ہیری نے وضاحت کی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ ایلی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔ تاہم یہ انکار ہیری کو قائل نہیں کرسکا۔ اس نے کہانی کو دہرایا۔ یہ اس کی ٹرائی اینڈ ٹرو انٹرویو تکنیک تھی جس میں وہی معلومات نئے زاویوں کے ساتھ سامنے آتی ہیں...... یہاں ایلی سیا کے ساتھ اس تکنیک کا سب سے دلچسپ اور اہم ترین نیا زاویہ جو سامنے آیا، وہ ای میل اکاؤنٹ تھا۔ انگریزی بولنے والے نے ایلی سیا سے اس کے انٹرنیٹ اکاؤنٹ کا پاس ورڈ مانگا تھا۔
''اسے کیا ضرورت تھی؟''
ایلی سیا نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ صرف جواب دے رہی تھی۔
فارنسک ٹیم کے پہنچنے پر ہیری نے گویا بہ زبان خاموشی انٹرویو کا اعلان کردیا۔ فارنسک ٹیم نے خوابگاہ کا رخ کیا۔ ہیری بھی کمرے میں آگیا اور ایک کونے میں جاکر

اپنے پارٹنر کو فون کیا۔ اگناسیو کی جانب سے کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں ملی...... ہیری نے اسے کہا کہ اسٹینلے کی گن کی ملکیت، نام اور قسم چیک کرے۔ ہیری کو شک ہو رہا تھا کہ اسٹینلے کینٹ کو اسی کی گن سے ہلاک کیا گیا تھا۔ اس نے فون بند کیا تو راشیل کی کال آئی۔ وہ اور بریز کمپیوٹر روم میں تھے۔

''یہ دیکھو ذرا۔'' ہیری کے وہاں پہنچنے پر راشیل نے کمپیوٹر اسکرین کی جانب اشارہ کیا۔ ہیری ڈیسک کا چکر کاٹ کر اسکرین کے سامنے آیا۔ ایلی سیا کا ای میل اکاؤنٹ کھلا ہوا تھا۔

''میں نے بھیجی گئی میل فائل کھولی تھی۔ یہ اس کے شوہر کو چھ بج کر ایک منٹ پر بھیجی گئی ہے۔ ایلی سیا کے اکاؤنٹ سے اس کے شوہر کو...... سبجیکٹ کی جگہ لکھا ہے۔

ہوم ایمرجنسی: فوراً پڑھو!

ای میل کے متن کے ساتھ ایلی سیا کا برہنہ فوٹو منسلک ہے جس میں وہ بستر پر بندھی پڑی ہے۔ صرف فوٹو ہی کسی کو بھی بدحواس کرنے کے لیے کافی ہے۔ آگے پیغام یوں لکھا ہے:

تمہاری بیوی خطرے میں ہے۔ جہاں تک تمہاری رسائی ہے...... وہاں سے تمام سیسیم کسی محفوظ بکس میں مُل ہالینڈ ڈیم کی نشان زدہ لوکیشن پر آٹھ بجے تک لے آؤ۔ ہم تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔ کسی کو بتایا یا کال کی تو نتائج کے ذمے دار تم خود ہو گے۔ فی الحال تمہاری بیوی محفوظ ہے۔ کوئی ہوشیاری دکھائی یا تاخیر کی تو بیوی تمہیں ٹکڑوں میں ملے گی۔''

ہیری نے پیغام دو مرتبہ پڑھا۔ اسٹینلے کینٹ نے کیسی دہشت محسوس کی ہوگی...... وہ بخوبی اس کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

''یہ پیغام اسٹینلے کے گھر سے روانہ کیا گیا جس نے لکھا ہے، انگریزی اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ جملوں کا انداز دیکھو۔ آخری سطر مطلب تو بتا رہی ہے لیکن غلط لکھی گئی۔ "to many" کو "too meny" لکھا گیا ہے۔'' راشیل نے کہا۔

ہیری دیکھ رہا تھا کہ راشیل کا اعتراض درست ہے۔

''شوہر نے پیغام PDA (پرسنل ڈیجیٹل اسسٹنٹ) پر وصول کیا ہوگا۔ جیسے پام پائلٹ ہوتا ہے۔''

ہیری نے اتفاق کیا۔ ''ہاں، وہاں سے ایک بلیک بیری سیل فون ملا ہے...... جس پر منی کی بورڈ موجود ہے۔''

تینوں خاموش ہو گئے۔ ہیری کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ بالآخر وہی بولا۔ ''مجھے ابھی ابھی یاد آیا کہ وہاں ایک آئی ڈی ایچ، سینٹ اگاتھا کلینک کا بھی تھا۔''

بریز چونک اٹھا۔ ''ایک اہم بات تمہیں اب یاد آرہی ہے۔'' اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' راشیل نے مداخلت کی۔ ''سیسیم خصوصاً گائنی سے متعلق کینسر کے علاج میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم کلینک کو شامل کر لیتے ہیں۔''

''بہتر ہے، وہیں سے شروع کریں۔'' ہیری نے تجویز دی۔

☆☆☆

سینٹ اگاتھا کلینک، ہیلمر میں تھا۔ جو سان فرنینڈو ویلی کا شمالی کونا تھا۔ رات کے وقت سناٹا تھا۔ ہیری نے تیز رفتاری میں کوئی عار نہیں محسوس کیا۔ بریز ساتھ تھا۔ راشیل، ایلی سیا کے ساتھ رک گئی تھی۔ بریز متواتر سیل فون پر مصروف تھا۔ ایک کے بعد دوسری کال۔ ہیری سمجھ رہا تھا کہ وزنی فیڈرل مشین میدانِ عمل میں کودنے کے لیے گیئر تبدیل کر رہی ہے۔ اس کے لیے یہ ایک الارمنگ پوزیشن تھی۔ ای میل کی دریافت نے ایف بی آئی کے تجسس میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔ بریز فون بند کر کے ہیری کی جانب متوجہ ہوا۔ ''میں نے ''ریٹ ٹیم'' اگاتھا کلینک روانہ کر دی ہے۔ وہ چیک کریں گے کہ مذکورہ مادہ وہاں موجود ہے یا نہیں۔''

''ریٹ ٹیم؟''

''ریڈیولوجیکل ایک ٹیم۔'' بریز نے وضاحت کی۔

''وقت نہیں لگے گا؟''

''میں نے پوچھا نہیں، لیکن ان کے پاس چاپر ہے۔'' بریز نے کہا۔

ہیری متاثر ہوا۔ ''کیا صرف ریٹ ٹیم؟'' ہیری نے سوال کیا۔

''نہیں۔ تمام سلنڈرز فائرنگ پر ہیں...... JTTF، FEMA...... RAP، DOE،NRC بھی۔''

''یہ حروفِ تہجی کا سوپ ہے۔ ''فیما'' کیا ہے؟'' ہیری نے کہا۔

''فیڈرل ایمرجنسی مینجمنٹ ایجنسی...... مزید یہ کہ ہوم لینڈ سیکیورٹی نے واشنگٹن ڈی سی سے نظر رکھی ہوئی ہے۔ وہاں کے ساحل سے لے کر یہاں تک کے ساحل تک تمام وسائل جھونک دیے گئے ہیں۔'' بریز نے بتایا۔

ہیری، RAP، DOE،NRC اور تمام دیگر میں

سے ہر ایک کا مطلب نہیں جانتا تھا۔ تاہم وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ سب کا تال میل فیڈرل ایجنسی سے ہے۔

''اسے نیشنل کرائسس بتایا یا سمجھا جا رہا ہے۔ بہرحال یہ بتاؤ کہ قلم کون چلا رہا ہے؟''

''ہر کوئی اور کوئی بھی نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ وفاقی سطح پر ہلچل ہے۔ اگر کلینک سے سیسیم نکل چکی ہے تو اسے جلد از جلد بازیاب کرنا ہے۔ قبل اس کے کہ تباہی کا دروازہ کھلے اور واشنگٹن سے سارا نزلہ ہم پر گرے۔''

ہیری نے سر ہلایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بریز کے بارے میں اس کا اندازہ غلط تو نہیں۔ بظاہر اس کی دلچسپی کام ختم کرنے میں تھی۔ وہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

''ایسی صورتِ حال میں ایل اے پی ڈی کا کیا کام ہے؟'' ہیری نے محتاط انداز اختیار کیا۔

''بالکل ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ تم کیس پر رہو گے۔ ہمارے اور تم لوگوں کے مابین پل قائم ہو چکا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں کا اپنا ہوم لینڈ سیکیورٹی آفس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دائرے سے باہر نہیں ہوں گے۔ ہمیں تمام وسائل بروئے کار لانے ہیں۔''

ہیری نے اسے دیکھا۔ ''تم پہلے بھی ہمارے ہوم لینڈ آفس کے ساتھ کام کر چکے ہو؟''

''ہاں، ایک آدھ بار معلومات کا تبادلہ ہوا تھا۔''

ہیری نے سر ہلایا۔ تاہم اس نے محسوس کیا جیسے بریز کے دو چہرے ہیں یا پھر وہ جس پل کی بات کر رہا ہے، اس کے بارے میں مکمل طور پر لاعلم ہے۔ ''مسز کینٹ کے گھر میں تم نے بتایا تھا کہ میرے بارے میں تفتیش کی گئی تھی۔ کیا یہ کام تم نے تنہا کیا تھا؟''

''ہیری ہم اس وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ اس موضوع کو مت چھیڑو۔ اگر تمہیں ناگوار گزرا تھا تو میں معذرت خواہ ہوں۔''

''فائن، کیا یہ کام تم نے تنہا کیا تھا؟'' ہیری نے سپاٹ لہجے میں وہی بات دہرائی۔

''دیکھو، میں بتا دیتا ہوں کہ میں نے راشیل سے معلوم کیا تھا کہ ایل اے پی ڈی کی جانب سے کون آرہا ہے۔ اس نے تمہارا نام لیا تھا۔ جس کے بعد میں نے چند فون کالز کی تھیں اور مجھے تمہاری صلاحیتوں کے بارے میں علم ہوا۔ ایکو پارک کیس میں کوئی تنازعہ کھڑا ہوا تھا اور راشیل کے ساتھ تمہارے اختلافات بھی رہے...... اب تم ہوی سائنڈ اسپیشل میں ہو۔ او کے؟''

''اس کے علاوہ؟''

''ہیری......''

''اس کے علاوہ؟''

بریز نے گہری سانس لی۔ ''اور یہ کہ تمہارے ساتھ کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً جب فیڈرل گورنمنٹ ملوث ہو۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔''

ہیری سمجھ گیا کہ بیشتر معلومات راشیل نے فراہم کی تھیں۔ وہ کچھ بدمزہ ہوا کہ راشیل نے اس کے بارے میں اس حد تک بتایا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ بریز نے سب کچھ نہیں اگلا۔ اس کے تعلقات اعلیٰ اوپر تک ہیں...... اس بات کے وزنی امکانات تھے کہ ہیری کے بارے میں ایک موٹی فائل موجود ہو...... فائل نہیں بلکہ مرڈر بک۔

ہیری نے کچھ وقفہ دیا اور موضوع بدل کر نیا سوال اٹھایا۔ ''سیسیم کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''سیسیم۔ یورینیم اور پلاٹینیم کی بائی پروڈکٹ ہے۔'' بریز نے کہا پھر اس نے چرنوبل کے حادثے سے آغاز کیا اور ایٹمی تجربات کی طرف آیا۔

''سائنس سے کوئی مطلب نہیں ہے نہ پروا ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''مجھے یہ بتاؤ کہ ہم کیا ڈیل کرنے جا رہے ہیں؟''

بریز نے سوچنے کے لیے چند لمحات لیے پھر بولا۔ ''ہم جس چیز کی بات کر رہے ہیں، اس کا سائز پنسل اریزر جتنا ہوتا ہے۔ یہ اسٹین لیس اسٹیل کی ٹیوب میں ہوتی ہے جس کا سائز اعشاریہ پینتالیس کیلبر کی گولی کے کارتوس جتنا ہوتا ہے۔ گائنی کے مخصوص علاج کے دوران اسے عورت کے جسم میں مخصوص اور متاثرہ مقام پر مخصوص وقت کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کا ڈوز بڑا سریع الاثر ہے۔ خاص ڈاکٹر ہی یہ کام کرتا ہے جیسے اسٹینلے کینٹ...... ''اون کولوجی'' ڈپارٹمنٹ اسپتال کے ''ہاٹ سیف'' سے سیسیم لے کر مریضہ کے جسم میں منتقل کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر نے یہ کام کم سے کم وقت میں کرنا ہوتا ہے کیونکہ تابکار مادّے کی زد سے بچنے کے لیے اس کے پاس کوئی حفاظتی انتظام نہیں ہوتا۔ تم میرا مطلب سمجھے؟''

''ہاں، لیکن کیا یہ ٹیوبز بذاتِ خود ڈاکٹر کو تحفظ فراہم نہیں کرتیں؟''

''نہیں، کیونکہ صرف سیسہ ہی گاما شعاعوں کا راستہ

روک سکتا ہے اور ہاٹ سیف میں سیسے کی پرت ہوتی ہے۔ یا پھر ٹرانسپورٹیشن کے دوران میں استعمال ہونے والے ڈیوائس میں سیسہ ہوتا ہے۔''

''اوکے...... دنیا میں اس کا پھیلاؤ کتنا خطرناک ہے؟'' بریزنے سوچ کر جواب دیا۔

''اس کا انحصار تین باتوں پر ہے۔ اول مادّے کی مقدار کتنی ہے، دوم لوکیشن اور سوم ڈلیوری سسٹم۔ سیسیم کی زندگی تیس سال میں نصف رہ جاتی ہے۔ عموماً ایسے دس مراحل کے بعد خطرہ نابود ہوتا ہے۔''

''تم مجھے الجھا رہے ہو؟''

''مطلب ہر تیس برس بعد تابکاری نصف ہوتی رہتی ہے۔ اگر تم اس کی مناسب مقدار کسی جگہ پر رکھ دو مثلاً سب وے اسٹیشن یا کسی بلڈنگ میں...... پھر اس جگہ کو تین سو سال کے لیے بند رکھنا پڑے گا۔''

حقیقت جان کر ہیری دنگ رہ گیا۔ ''لوگوں کا کیا بنے گا؟''

''یہ اس بات پر منحصر ہے کہ کتنی مقدار کہاں رکھی جاتی۔ اس کی شدت انسان کو ختم کرنے کے لیے چند گھنٹے سے زیادہ نہیں لیتی۔ انسانی جان سے زیادہ خطرناک بات بعد ازاں پھیلنے والی دہشت کی لہر ہے...... خوف......''

اسی خوف کے باعث لاس اینجلس پہلے جیسا نہیں رہے گا...... ہیری سر ہلا کر رہ گیا۔

سینٹ اگاتھا کلینک وہ سیکیورٹی چیف سے نہ مل سکے۔ اس کے دن مخصوص تھے۔ تاہم نائٹ شفٹ سیکیورٹی سپروائزر موجود تھا۔ دورانِ انتظار انہوں نے ہیلی کاپٹر کی آواز سنی...... ہیلی کاپٹر سامنے کی جانب لان میں اتر گیا۔ ریڈیالوجیکل ٹیم کے چار اراکین حفاظتی لباس اور فیس گارڈ کے ساتھ باہر آئے۔ گروپ لیڈر کا نام رائن تھا۔ رائن کے ہاتھ میں ریڈیشن مانیٹر تھا۔

نائٹ سیکیورٹی آفیسر کا نام ایڈ رومو تھا۔ وہ بار بار ریڈیالوجیکل ٹیم کے خاص لباس اور حلیے کو دیکھ رہا تھا۔ بریزنے اپنا تعارف کرا کے چارج سنبھال لیا۔ ہیری کو کوئی تردد نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جس پچ پر کھیل ہو رہا ہے، اس پر فیڈرل ایجنٹ ہی سرعت کے ساتھ نتائج حاصل کر سکتے ہیں...... بریزنے مدعا بیان کرتے ہوئے ایڈ رومو سے کی کارڈ ڈیٹا کا ریکارڈ بھی طلب کیا۔ آیا پچھلے چوبیس گھنٹے میں کوئی ہاٹ لیب میں گیا تھا یا نہیں......

رومو ساکت تھا۔ اچانک افتاد نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ وہ مسئلہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا معاملہ ہے؟'' بالآخر اس نے زبان کھولی۔

بریزنے اس کی طرف قدم بڑھایا۔ ''بتا چکا ہوں، ہمیں ہاٹ لیب چیک کرنی ہے...... وہاں لے چلو یا کسی اور کو بلاؤ۔''

''مجھے ایک کال کرنی پڑے گی۔'' رومو نے کہا۔

''گڈ، جلدی کرو۔ تمہارے پاس دو منٹ ہیں۔ اس کے بعد ہم تمہارے اوپر سے گزر جائیں گے۔'' بریز کا رویّہ مستقل جارحانہ تھا۔ ایڈ رومو سیل فون نکال کر ایک طرف ہو گیا۔ بریزنے مسکرا کر ہیری کی طرف دیکھا۔

دس منٹ بعد وہ لوگ ایڈ رومو کی قیادت میں ایلیویٹر کے ذریعے کلینک کے تہ خانے میں اتر رہے تھے۔ رومو کا باس کلینک کے لیے گھر سے نکل چکا تھا۔ تاہم بریز کو انتظار کی تاب نہیں تھی۔ رومو کی کارڈ استعمال کر کے لیب میں آ گیا۔ لیب میں سناٹا تھا۔ اس نے انوینٹری شیٹ، ڈیسک پر پھیلائی اور لیب لاگ برآمد کر کے مطالعہ شروع کیا۔ ہیری نے نوٹ کیا کہ چھوٹا سا ویڈیو مانیٹر ڈیسک کے اوپر دیوار میں نصب تھا۔ اس کا مقصد سیف کا منظر پیش کرنا تھا...... بریز، رومو کے ساتھ ہی ڈیسک پر جھکا ہوا تھا۔

''وہ یہاں آیا تھا۔'' بریزنے اعلان کیا۔

''کب؟'' ہیری نے استفسار کیا۔

''کل شام ڈھلے سات بجے...... رات شروع ہو رہی تھی۔''

''کیا ویڈیو مانیٹر نے ریکارڈ کیا ہے؟'' ہیری نے اوپر دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ رومو نے سر اٹھایا۔

''نہیں، یہ صرف مانیٹر ہے۔ ڈیسک پر موجود شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ سیف کھولنے والا کیا کر رہا ہے۔''

رومو نے لیب کی دوسری جانب اشارہ کیا۔ جہاں بڑا سا فولادی دروازہ موجود تھا۔ دروازے پر تابکاری مواد کی نشاندہی کے لیے موٹے الفاظ میں وارننگ لکھی تھی۔

ہیری نے دیکھا، دروازے پر کمبی نیشن لاک پش بٹن کے ساتھ تھا اور مقناطیسی کی کارڈ کے لیے جھری بھی بنی ہوئی تھی۔

''ریکارڈ بتا رہا ہے کہ اس نے ایک ٹیوب نکالی تھی۔'' بریز، رومو کے ساتھ لاگ دیکھ رہا تھا۔ بربنک میڈیکل سینٹر میں ایک مریض کے لیے اس ٹیوب کی ضرورت تھی...... انوینٹری میں اب اکتیس ٹیوبز ہونی چاہئیں۔''

''وقت کم ہے۔ ہمیں ہاٹ لیب کا فزیکل چیک اَپ کرنا ہے۔''

''اسپتال کی مرضی کے بغیر تم اسے نہیں کھول سکتے۔'' جواب آیا۔

''مسٹر رچرڈ، یہ عام صورتِ حال نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ سیف خالی پڑا ہے...... یہ امریکی قوم کے تحفظ کا معاملہ ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیں۔ ہمیں اندر جانا ہی ہے۔ پچیس منٹ تک انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ ریڈی ایشن ٹیم ہمارے ساتھ ہے...... جلدی فیصلہ کریں۔''

دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

''ایڈ، ڈیسک کی لیب سے مجھے کال کرو۔'' رچرڈ کی آواز آئی۔ ''اس کا لاک کھولو...... پھر نچلی بائیں دراز کھولو۔''

''اوکے۔''

''دراز میں جو بائنڈر ہے۔ اسے کھولو...... بائنڈر میں کمبی نیشن لسٹ ہے جسے ہر ہفتے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔''

بریزنے گزشتہ ہفتے کا کمبی نیشن تلاش کیا۔

''اوکے، سیف میں کونسا کمبی نیشن ہے؟''

''کی کارڈ دو بار استعمال کرنا پڑے گا اور کمبی نیشن

''اوکے، ناؤ......'' رومو نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' بریزنے جواب دیا۔ ''ہمیں سیف روم کے اندر فزیکل چیک کے بعد تصدیق کرنی ہے۔ کمبی نیشن بتاؤ؟''

''میرے پاس نہیں ہے۔''

''کس کے پاس ہے؟''

''سیکیورٹی چیف۔''

''اسے اسپیکر پر لاؤ۔'' بریزنے کہا۔

''وہ راستے میں ہے۔''

''اسپیکر آن کر کے فون کرو۔''

رومو نے ہدایت پر عمل کیا اور جواب آیا......

''دس از رچرڈ رومو۔''

رومو شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی حیثیت صفر ہو گئی تھی۔

''ڈیڈ، میں ہوں...... ایڈ رومو۔ یہاں ایف بی......''

بریزنے بات کاٹ دی۔ اور رچرڈ کو تعارف پیش کیا۔ پھر پوچھا۔ ''آپ کتنی دور ہیں؟''

''پچیس منٹ۔''

بھی دوسرا...... چھ...... چھ...... چھ۔“

بریز نے دوموسے کی کارڈ لیا، کارڈ لے کر اس نے رائن کے حوالے کر دیا۔ ”اوکے، جاؤ...... ڈور کبو چھ۔ ایک۔ آٹھ۔ چار ہے۔ باقی تم سن چکے ہو۔“

”میں اور طر جائیں گے۔“ رائن نے کہا۔

طر نے ریڈی ایشن مونیٹر سنبھالا اور ایک منٹ کے اندر وہ روم میں داخل ہو چکے تھے۔ دروازہ انہوں نے اندر سے بند کر دیا۔

ہیری نے ایک بار پھر دیوار میں نصب مانیٹر پر نگاہ ماری اور اس کی خامی پکڑ لی۔ اگر کوئی سیف کے سامنے آتا تو کیمرا یہ نہیں دکھا سکتا تھا کہ مذکورہ شخص سیف کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ رائن کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ وہ سیف اور مانیٹر کے درمیان حائل ہو گیا تھا اگر کسی نے کینٹ کو دیکھا بھی ہوگا تو نہیں جان سکا ہوگا کہ وہ اندر سے کیا نکال لایا ہے۔

دو منٹ کے اندر دونوں آدمی باہر آ چکے تھے۔ رائن اور طر نے باہر آ کر فیس گارڈ ہٹا دیے تھے۔ ہیری سمجھ گیا کہ وہ کیا خبر لائے ہیں۔

”سیف خالی ہے۔“

بریز نے سیل فون نکالا۔ قبل اس کے کہ وہ نمبر پنچ کرتا، رائن نے آگے بڑھ کر اسے ایک کاغذ کا ٹکڑا پکڑا دیا۔

”بس یہی کچھ سیف میں تھا۔“

ہیری نے بریز کے کندھے پر سے جھانکا۔ بریز آواز کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔

”میری نگرانی ہو رہی ہے اگر میں نے یہ کام نہیں کیا تو وہ میری بیوی کو ہلاک کر دیں گے...... بتیس ٹیوبس...... خدا مجھے معاف کرے۔ میرے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔“

☆☆☆

ہیری بوش اور فیڈرل ایجنٹس خاموش کھڑے تھے۔ ماحول میں دہشت کی لہر سرایت کر گئی تھی۔ یہ لہر اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ کینٹ نے سیسیم جن کے حوالے کی، انہوں نے کینٹ کو مل ہالینڈ ڈیم کی مخصوص لوکیشن پر ختم کر دیا۔

”سیسیم کی یہ مقدار کتنا نقصان پہنچائے گی؟“ بریز نے افسردگی سے ہیری کو دیکھا۔

”سائنسی افراد سے معلوم کرنا پڑے گا لیکن میرا خیال ہے کہ نامعلوم افراد مطلوبہ سیسیم حاصل کر چکے ہیں...... جاب ازڈن...... جن کے قبضے میں سیسیم ہے، ان کا پیغام عیاں ہے۔“

”ایک منٹ۔“ ہیری کی پیشانی پر سلوٹ نمودار ہوئی۔ ”کینٹ کے ریڈی ایشن بزنگ تابکاری ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ وہ اتنی سیسیم لے گیا اور وارننگ ڈیوائس نے الارم نہیں دیا؟“

”اس نے یقیناً ”پگ“ استعمال کیا ہوگا۔“ بریز نے کہا۔

”کیا؟“

”یہ بکس نما چیز ہوتی ہے جس کے ذریعے سیسیم کو ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال منتقل کیا جاتا ہے۔ کینٹ نے ایک ٹیوب ظاہر کی تھی اور سب کی سب لے گیا۔“

ہیری کو پورشے کا کھلا ہوا ٹرنک یاد آیا جس کی کارپٹ فلورنگ پر وزنی چیز کے پایوں کے نشان رہ گئے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ ان نشانات کا مطلب کیا تھا۔ بدترین صورتِ حال کے بارے میں ایک تصدیق سامنے تھی۔

بریز نے سیل فون نکالا۔ ہیری بھی اپنے پارٹنر سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے اگناسیو کا نمبر ملایا۔ وہ ایک کونے میں چلا گیا۔ اگی کے استفسار پر اس نے سیسیم کے غیاب کے بارے میں بتایا۔

”مذاق کر رہے ہو؟“

”نہیں۔“ ہیری نے کہا۔ ”کیا تم ابھی تک وہیں پر ہو؟“

”ہاں، ایک گواہ مل گیا ہے، لڑکا ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو...... کوئی پڑوسی؟“

”نہیں، کوئی میڈونا کا دیوانہ ہے۔ وہاں میڈونا کا بنگلا ہے...... بلکہ تھا۔ وہ اب وہاں نہیں رہتی۔ میں وہاں بھی گیا تھا۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ واپسی پر میری نظر اس لڑکے پر پڑ گئی جو درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسے قابو کر لیا ہے...... بیس سال عمر ہے۔ کینیڈا سے آیا ہے۔ اس غلط فہمی میں کہ میڈونا یہاں رہائش پذیر ہے...... وہ یہاں منڈلاتا رہا ہے۔ اس نے میڈونا کے سابقہ بنگلے کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی تھی۔“

”کیا وہ شوٹنگ کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟“

”وہ تو انکار کر رہا ہے لیکن مجھے یقین نہیں کہ وہ سچ بول رہا ہے۔“

”تم نے کہا وہ چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیوں؟ وہ فرار ہو سکتا تھا۔ کیونکہ لاش تین گھنٹے بعد دریافت ہوئی تھی؟“

”ہاں، ہضم نہیں ہو رہا۔ شاید وہ خوف زدہ ہو گیا ہو کہ

لاش کے آس پاس پکڑا گیا تو اسے ہی ملزم گردانا جائے گا۔“

”ممکن ہے، ایسا ہو۔“ ہیری نے کہا۔

”اسے پکڑ کے رکھو...... کم از کم ہمارے پاس یہ الزام ہے کہ وہ بغیر اجازت کسی کی پراپرٹی میں گھسا تھا۔“

”ہاں، بے فکر ہو جاؤ۔“ اگناسیو نے کہا۔

”ڈاؤن ٹاؤن لے جا کر اسے کمرے میں مقید رکھو۔ اگناسیو، سیسیم کے بارے میں کسی سے بات نہ کرنا۔“ ہیری نے فون بند کر دیا اور بریز کی کال ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ہیری نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے باس سے بات کر رہا ہے۔ بات ختم کر کے اس نے ہیری کو بتایا کہ وہ ہیلی کاپٹر پر جا رہا ہے۔

”میں نے سنا تھا کہ تمہارے پارٹنر نے کسی گواہ کو پکڑا ہے؟“

ہیری کو تعجب ہوا کہ بریز خود فون پر مصروف تھا۔ اس نے کیسے اس کی بات سن لی۔

”ہاں لیکن وہ بظاہر ایک غیر اہم چیز ہے۔ لڑکا ہے...... کینیڈا سے میڈونا سے ملنے آیا تھا۔ بہرحال میں جا کر اسے کریدتا ہوں۔“

بریز نے سر ہلاتے ہوئے اپنا بزنس کارڈ ہیری کو پکڑا دیا۔

”کوئی بھی کام کی بات سامنے آئے، مجھے فون کر لینا۔“

ہیری نے کارڈ لے کر جیب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

ڈرائیونگ کے دوران میں اس نےران کارٹر کی سی ڈی لگائی۔ موسیقی کے دوران اس کی سوچ کا دھارا رواں رہتا تھا۔ کیس تیزی سے فیڈرل بیورو کی طرف جھک رہا تھا۔ فیڈرل ایجنٹس، قاتلوں کے بجائے سیسیم کے تعاقب میں تھے۔ دونوں باتوں میں نازک سا فرق تھا۔ ہیری کے خیال میں اسے اپنی توجہ مرڈر انویسٹی گیشن پر مرکوز رکھنی چاہیے تھی...... قاتلوں کو تلاش کرو...... سیسیم از خود ہاتھ آ جائے گی۔ وہ بڑبڑایا۔

پارکر سینٹر، پولیس ہیڈ کوارٹر کی پارکنگ میں گاڑی لگا کر وہ تیسری منزل پر آیا۔ روبری ہومی سائڈ وہیں پر تھا۔ وہاں سے اس نے پارٹنر کو کال کی۔ پارٹنر نے بتایا کہ وہ اسپیشل انویسٹی گیشن ڈویژن میں ہے۔ اس نے بتایا کہ لڑکے کا نام جیسی مٹ فورڈ ہے۔ وہ ہیلی فیکس کینیڈا سے آیا تھا...... آوارہ گرد معلوم ہوتا ہے۔ ہیری نے چند سوالات کے بعد فون بند کر دیا۔ ایک عدد کافی کا مگ خالی کیا اور اپنی ڈیسک کی طرف چل دیا۔ ڈیسک پر منی پلاسٹک ایوی ڈینس بیگ نظر آ رہے تھے۔ ایک بیک پیک بھی تھا۔ ہیری نے سب سے پہلے بیک پیک کی طرف ہاتھ بڑھایا جس میں کپڑے اور دوسری عام استعمال کی اشیا تھیں...... چارلس ڈکنز کی کتاب ”بلیک ہاؤس“ ٹوتھ پیسٹ، برش، یہ اشیا بتا رہی تھیں کہ ان کا مالک کسی خاص حیثیت کا حامل شخص نہیں ہو سکتا۔ اس نے باقی چیزوں پر نظر ڈالی۔ کینیڈین پاسپورٹ، دبلا پتلا والٹ، کرنسی، چابیاں اور ایک فولڈڈ شیٹ...... یہ ”ستاروں کے گھر“ کا نقشہ تھا۔ ہیری نے ہالی ووڈ جھیل کے اوپر مل ہالینڈ ڈرائیو کی سائٹ کا جائزہ لیا۔ کرائم سین کے بائیں جانب سیاہ دائرہ تھا۔ دائرے کے اندر نمبر 23 لکھا تھا۔ دائرے کے گرد روشنائی والے قلم سے ایک دائرہ بنایا گیا تھا۔ ہیری نے نقشے کا انڈیکس چیک کیا۔ نمبر 23 کے سامنے لکھا تھا: ہالی ووڈ میں میڈونا کا گھر۔

جیسی مٹ فورڈ کے علم میں نہیں تھا کہ میڈونا اب وہاں نہیں رہتی۔ انڈیکس سو فیصد درست نہیں ہو سکتا کیونکہ انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے کچھ ستارے رہائش بدل دیتے ہیں۔ اس نے سیل فون نکالا، کچھ سوچ کر واپس جیب میں رکھ لیا اور انٹرویو روم نمبر دو کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

جیسی بہ اعتبار عمر بیس سال سے بھی کم نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال سیاہ اور گھنگھریالے تھے۔ رنگت گوری...... ناک کے نتھنے میں سلور رنگ پڑا تھا۔ وہ الرٹ لیکن بھڑکا ہوا تھا۔ چھوٹے کمرے کی چھوٹی ٹیبل پر دوسری جانب بیٹھا تھا۔ کمرے میں پسینے کی ہلکی سی بو تھی۔ اسے پسینہ آ رہا تھا۔ یہ ضروری تھا۔ ہیری نے ہال وے میں تھرمو اسٹیٹ چیک کیا تھا۔ اس کے پارٹنر اگناسیو نے درجہ حرارت بیاسی پر سیٹ کر دیا تھا۔

”کیسے ہو، جیسی؟“ ہیری نے دوسری خالی کرسی سنبھالی۔

”یہاں گرمی ہے...... تم میرے وکیل ہو؟“

”نہیں، میں ڈیٹکٹیو ہوں...... ہومی سائڈ۔ میرا نام ہیری بوش ہے۔ میں اس کیس پر کام کر رہا ہوں۔ تم سمجھ رہے ہو۔ تم جائے واردات کے قریب چھپے ہوئے تھے۔“ ہیری نے لیگل پیڈ نکالا۔ وہ لڑکے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھ چکا تھا۔ اگناسیو نے اچھی حرکت کی تھی...... لڑکا الجھن میں تھا...... خوف زدہ اور پریشان۔

''میں نے اسے کہا تھا کہ میں بات نہیں کروں گا۔ مجھے وکیل چاہیے۔'' جیسی کا اشارہ اگناسیو کی طرف تھا۔ وہ اسے میکسیکن سمجھ رہا تھا۔

''وہ کیوبن، امریکن ہے، جیسی۔'' ہیری نے کہا۔ ''وکیل صرف امریکی شہریوں کو مہیا کیے جاتے ہیں۔'' ہیری نے جھوٹ بولا۔ لڑکے کی کم عمری اور صورتِ حال کے پیشِ نظر اسے اندازہ تھا کہ جیسی اس بات سے لاعلم ہوگا۔

''لڑکے تم نے خود کو مصیبت میں ڈال لیا ہے۔'' ہیری نے بات جاری رکھی۔ ''کسی گرل فرینڈ یا بوائے فرینڈ کا پیچھا کرنا اور بات ہے لیکن کسی سلیبریٹی کا معاملہ دگر ہے...... یہ سلیبریٹی ٹاؤن ہے۔ ہمارا اپنا طریقہ کار ہے۔ مجھے نہیں معلوم تم کینیڈا میں کیا کرتے ہو لیکن یہاں تمہارے لیے بڑی مشکل کھڑی ہوگئی ہے۔''

''لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ میڈونا وہاں نہیں رہتی۔ لہٰذا مجھ پر اسٹاکنگ کا کیس نہیں بنتا۔ زیادہ سے زیادہ ٹریس پاسنگ۔''

''نہیں، نیت اور ارادہ فیصلہ کرتا ہے۔ تمہاری نیت کے مطابق تم صحیح جگہ پر تھے۔ تمہارے پاس نقشہ بھی تھا جس پر تم نے نمبر 23 کو نشان لگایا ہے۔ قانون اس کو دوسری نظر سے دیکھتا ہے۔''

تھوڑی مزاحمت کے بعد جیسی نے ہتھیار ڈال دیے۔

''اگر تم سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تعاون کرو تو صورتِ حال اتنی خراب نہیں ہوگی۔'' ہیری نے کہا۔

جیسی نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

''لیکن میں نے میکس...... س...... وہ کیوبن کو بتایا تھا کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔''

ہیری نے لمبا قہقہہ دیا اور کہا۔ ''مجھے پروا نہیں ہے کہ تم نے اسے کیا کہا۔ بچے، اب تمہاری ڈیلنگ میرے ساتھ ہے اور میرے خیال میں تم کچھ چھپا رہے ہو۔''

''میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے ہاتھ جوڑے لیکن ہیری متاثر ہونے والا نہیں تھا۔ لڑکا نوعمر تھا اور جھوٹ بول کر دوسروں کو قائل کرسکتا تھا۔ ہیری نے دباؤ برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔

''جیسی، یہ بات جان لو کہ میرا پارٹنر یہاں نیا ہے۔ اگرچہ وہ اپنا کام اچھا کرتا ہے لیکن میں اس وقت سے کام کررہا ہوں، جب تمہارے والدین بھی غیر شادی شدہ ہوں گے اور اب تک مجھے صرف جھوٹوں سے واسطہ پڑا ہے جیسا کہ اس وقت۔''

''نہیں، میں......''

''تمہارے پاس تیس سیکنڈ ہیں۔ اس کے بعد میں تمہیں کسی کاؤنٹی لاک اَپ میں ڈلوا دوں گا۔ وہاں تمہیں ایسے افراد ملیں گے کہ تمہیں کینیڈا یاد آجائے گا...... میں مطلب سمجھ رہے ہو؟''

جیسی کے ہاتھ میز پر رکھے تھے۔ وہ ہاتھوں کو گھور رہا تھا۔ گھڑی کا سفر جاری تھا۔ بیس سیکنڈ گزر گئے۔

''او کے، جیسی......'' ہیری کھڑا ہوگیا۔

''رُکو، رُکو!''

''کس لیے؟ یہ مرڈر انویسٹی گیشن ہے۔ تیار ہو جاؤ۔''

''آل رائٹ، میں بتاتا ہوں۔ میں نے سب کچھ دیکھا تھا۔''

ہیری نے اس کی آنکھوں کو پڑھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''اگر تم نے سچ بیانی سے کام لیا تو یہاں سے ایک آزاد فرد کی حیثیت میں نکل سکتے ہو۔''

''میں سمجھ گیا۔'' وہ بولا۔

''ہاتھ آگے کرو۔'' ہیری نے کہا اور اس کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ جیسی فوراً کلائیاں مسلنے لگا۔ ہیری کو یاد آیا کہ بندھن کٹنے کے بعد ایلی سیا نے بھی یہی حرکت کی تھی۔

''آرام محسوس ہورہا ہے؟''

''ہاں۔'' جیسی نے کہا۔

''مجھے بتاؤ کہ کہاں سے آئے ہو اور تم نے جائے واردات پر کیا دیکھا؟''

جیسی نے سر ہلا کر بیس منٹ تک اپنی کہانی سنائی۔ کہانی کے مطابق جب وہ میڈونا سے ملنے کی کوشش میں ہالی ووڈ ہالینڈ پہنچا تو تاریکی پھیل گئی تھی۔ وہ تھک چکا تھا۔ میڈونا کے مکان میں سناٹا تھا۔ طویل سفر کے بعد اس نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے توقع تھی کہ پاپ سنگر شاید رات تاخیر سے گھر پہنچے گی۔ اس نے گھر کے قریب جھاڑیوں میں ایک جگہ منتخب کرلی۔ تھکن کے باعث اسے نیند آگئی تھی۔ اس کی بیداری کی وجہ آوازیں تھیں۔

''کیسی آوازیں؟ آوازیں کتنے فاصلے سے آرہی تھیں؟''

''شاید سو میٹر۔ پھر آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ میں نے دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے تین کاریں دکھائی دیں۔ ایک پورشے تھی۔ دوسری گاڑیوں کو میں پہچان نہیں سکا لیکن وہ

پورشے سے بڑی تھیں۔

''تم نے وہاں آدمیوں کو دیکھا؟''

''نہیں، اندھیرا زیادہ تھا پھر مجھے اندھیرے میں سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ آواز کے ساتھ ہی دو فائر ہوئے۔ فائر کی معمولی چمک میں ایک آدمی نظر آیا۔ وہ گھٹنوں کے بل تھا پھر اندھیرے میں، میں کچھ نہیں دیکھ سکا۔''

ہیری نے سر ہلایا۔ ایک سوال اس کے دماغ میں رینگا۔ لیکن اس نے سوال ملتوی کردیا۔ ''گڈ جیسی، تم اچھے جا رہے ہو۔ ہم اسی حصے کو دوبارہ دہراتے ہیں۔ تم سو رہے تھے۔ اچانک آوازوں نے تمہیں جگایا۔ تم نے تین کاریں دیکھیں، رائٹ؟''

''ہاں۔''

''او کے گڈ۔ تمہیں آوازیں دوبارہ سنائی دیں۔ تم نے پھر دیکھا اور فائرنگ سنی، رائٹ؟''

''رائٹ۔''

ہیری جانتا تھا کہ جیسی وہی کچھ بول رہا ہے جو وہ سننا چاہتا ہے۔ اسے لڑکے کو ٹیسٹ کرنا تھا۔ ''گن فائر کی چمک میں تم نے دیکھا کہ متاثرہ شخص گھٹنوں پر گرا، رائٹ؟''

''نہیں، بالکل ایسا نہیں تھا۔''

''پھر کیا تھا؟''

''میرے خیال میں وہ پہلے سے ہی گھٹنوں پر تھا جو کچھ ہوا بہت تیزی سے ہوا۔''

ہیری نے سر ہلایا۔ جیسی نے پہلا ٹیسٹ پاس کرلیا تھا۔

''او کے گڈ پوائنٹ۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے فائرنگ کے وقت یا اس سے پہلے کیا سنا؟''

لڑکا سوچ میں پڑ گیا...... پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں سمجھ نہیں سکا تھا۔''

''او کے، یقین نہیں ہے تو قیاس مت کرو۔''

''کوئی چیخ کر بولا تھا...... لیکن آواز میں دھماکے کے باعث ابہام پیدا ہوگیا تھا۔''

''اس نے جو کچھ کہا، تمہیں یاد آجائے گا...... یہ بتاؤ کہ لہجہ کیسا تھا؟''

''لہجہ؟ نہیں، میں کافی دور تھا اور میں نے ایک ہی لفظ سنا تھا۔''

ہیری سوچ میں پڑ گیا۔ اسے احتیاط کے ساتھ گہرائی میں جانا تھا۔ تفتیش کے لیے وہ ایک لفظ بہت اہم تھا۔

''او کے، جیسی پھر کیا ہوا؟''

''فائرنگ کے بعد کوئی گاڑیوں کی طرف بھاگا۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہ اسے پورشے کے قریب لایا۔ پورشے کا ٹرنک کھلا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کا ٹرنک بھی کھولا۔''

''جب وہ حرکت پذیر تھا تو دوسرا آدمی کہاں تھا؟''

جیسی گڑبڑا گیا۔ ''میرے خیال میں وہ مر گیا تھا۔''

''نہیں، میرا مطلب ہے...... وہ دوسرا اُجڑا آدمی۔ وہ دو تھے اور ایک مقتول...... تین گاڑیاں۔ یاد کرو۔'' ہیری نے تین انگلیاں بلند کیں۔

''میں نے صرف ایک آدمی دیکھا تھا جس نے فائرنگ کی تھی۔'' جیسی نے کہا۔ دوسرا گاڑی سے نہیں نکلا تھا۔ اس کی گاڑی پورشے کے پیچھے کھڑی تھی۔''

''وہ دوسرا آدمی ایک مرتبہ بھی گاڑی سے باہر نہیں آیا؟''

''نہیں، فائرنگ کے بعد اس کی گاڑی نے یوٹرن لیا اور وہاں سے چلی گئی۔ ہیری ایک بار پھر خیالات میں کھو گیا...... جیسی کا بیان دشواری پیدا کررہا تھا۔ ایلی سیا سے ایک آدمی سوال کررہا تھا اور دوسرے آدمی کو ترجمہ اور احکامات دے رہا تھا۔ ہیری نے اندازہ لگایا کہ گاڑی سے باہر نہ آنے والا آدمی وہ تھا جو انگریزی میں ایلی سیا سے بات کرتا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، آگے چلو......''

''اس نے پورشے کے کھلے ہوئے ٹرنک میں سے کچھ نکال کر اپنی گاڑی کے ٹرنک میں رکھا اور اسے بند کردیا۔ جو کچھ بھی تھا وہ وزنی لگ رہا تھا۔''

ہیری سمجھ گیا کہ مذکورہ شخص نے ریڈیو ایکٹو مادہ ٹرانسپورٹ کرنے کے لیے پورشے میں سے ''پگ'' نکالا تھا۔

''پھر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔''

''اس کے سوا تم نے کچھ نہیں دیکھا؟'' ہیری نے سوال کیا۔

''میں قسم کھاتا ہوں اور کچھ نہیں۔''

''تم نے جس آدمی کو دیکھا، اس کا حلیہ بتاؤ؟''

''مشکل ہے۔ سر پر ہُڈ تھا اور سویٹ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ ہُڈ کے اندر اس نے اسکائی ماسک پہنا ہوا تھا۔''

''تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟''

جیسی نے شانے اچکائے۔ ''ایسے ہی...... شاید یہ

خیال غلط ہو۔“

”اس کا قد کیسا تھا؟“

”اوسط قد...... شاید پستہ قد۔“

”کیسا دکھائی دیتا تھا؟“ یہ معلومات اہم تھیں۔

”نہیں، میں نہیں اندازہ لگا سکا لیکن اس کے چہرے پر ماسک ضرور تھا۔“

ہیری پسپا ہونے پر آمادہ نہ تھا۔

”سفید، سیاہ یا گندمی؟“

”پتا نہیں۔ اس کے پاس ہُڈ اور ماسک تھے۔“

”ہاتھوں کے بارے میں سوچو۔ اس نے ہاتھوں کی مدد سے پورشے کا ٹرنک خالی کیا تھا...... ہاتھوں کا رنگ؟“

جیسی نے چند لمحے سوچا پھر اس کی آنکھیں چمکیں۔

”اس نے دستانے چڑھائے ہوئے تھے۔ دستانے خاصے دبیز اور بڑے معلوم ہو رہے تھے۔“ جیسی نے کہا۔

ہیری نے سر ہلایا۔ ”حفاظتی دستانے!“ معاً اسے خیال آیا کہ اس نے ایلی سیا سے دستانوں کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ تاہم اسے امید تھی کہ راشیل سوال جواب میں مصروف رہی ہوگی۔

ہیری نے خاموشی اختیار کر لی۔ عموماً گواہ کے لیے سوال و جواب کے دوران میں خاموشی خاصی پریشان کن ثابت ہوتی ہے اور وہ خاموشی کے وقفوں کو پُر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن جیسی نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ طویل وقفے کے بعد ہیری گویا ہوا۔ ”اوکے، دو کاریں تھیں۔ پورشے کے پیچھے جو کار تھی اس کے بارے میں بتاؤ۔“

”مشکل ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پورشے کیسی ہوتی ہے۔ لیکن باقی دونوں کاروں کے بارے میں نہیں بتا سکتا...... بہرحال وہ دونوں پورشے سے بڑی گاڑیاں تھیں۔“

”پورشے کے سامنے والی سیڈان تھی؟“

”مجھے ماڈل کے بارے میں نہیں پتا۔“

”نہیں، میں ماڈل کی بات نہیں کر رہا۔ سیڈان کار کی ساخت ہوتی...... مطلب چار دروازوں والی۔ پولیس کار کے مانند۔“

”ہاں، ایسا ہی تھا۔“

ہیری نے ایلی سیا کی غائب شدہ کار کا حلیہ ذہن میں دہرایا۔

”کیا تم کرائسلر 300 کو پہچانتے ہو؟“

”نہیں۔“

”رنگ کے بارے میں بتاؤ۔“

”روشنی اتنی نہیں تھی کہ میں رنگ کی وضاحت کر سکوں...... لیکن رنگ گہرا تھا۔ شاید سیاہ یا گہرا نیلا۔“

”اور دوسری کار؟ جو پورشے کے پیچھے تھی؟“

”یکساں۔ گہرے رنگ کی سیڈان لیکن وہ کچھ چھوٹی معلوم ہو رہی تھی۔“

”آل رائٹ، جیسی، تم کافی مددگار ثابت ہوئے ہو۔“ ہیری نے کہا۔ ”اگر میں تمہیں مختلف کمپنیوں کی سیڈان کاروں کے فوٹو دکھاؤں تو کیا تم پہچان لو گے؟“

”نہیں، میں انہیں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا اور فاصلہ بھی زیادہ تھا۔“ جیسی نے جواب دیا۔

ہیری نے سر ہلایا لیکن اسے مایوسی ہوئی تھی۔ تاہم اس کی کہانی کافی حد تک ایلی سیا کینٹ کے بیان کے قریب تھی۔ دو آدمی وہاں گھسے تھے، ایک نے کینٹ کی کرائسلر اٹھائی تھی۔ بظاہر مقصد یہ تھا کہ پورشے میں موجود سیسیم کو کرائسلر کے ذریعے ٹرانسپورٹ کیا جائے۔

معاً اسے ایک نیا خیال سوجھا۔ ”دوسری کار کس طرف گئی تھی؟“

”وہ یوٹرن لے کر پہاڑی سے اتر گئی تھی۔“

”پھر تم نے کیا کیا؟“

”میں نے...... کچھ نہیں۔ میں اپنی جگہ پر رہا۔“

”تم خوف زدہ تھے؟“

”اچھا خاصا۔“

”جیسی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے لیکن مجھے اس بات کا تجسس ہے کہ تم اتنی دیر تک کیوں وہاں چھپے رہے۔ تم پہاڑی سے اترے نہ تم نے 919 پر کال کی؟“

جیسی نے ہاتھ اٹھائے اور واپس میز پر رکھ دیے۔

”مجھے نہیں معلوم...... میں ڈر گیا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ اگر میں پولیس کی نظر میں آ گیا تو وہ مجھ پر شک کریں گے۔ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ یہ واردات اگر کسی مافیا گروپ نے کی ہے اور وہ جان گئے کہ واردات کا چشم دید گواہ موجود ہے تو وہ سب سے پہلے مجھے ٹھکانے لگائیں گے۔“

ہیری نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تم کینیڈا میں ٹی وی بہت دیکھتے رہے ہو شاید۔ تمہاری عمر کتنی ہے؟“

”بیس۔“

”میڈونا کے گھر پر کیا کر رہے تھے؟ تم عمر میں کافی

چھوٹے ہو اس سے۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں اپنی ماں کی وجہ سے آیا تھا۔“

”وہاٹ؟ تم اپنی ماں کے لیے میڈونا کی اسٹاکنگ کر رہے تھے؟“

”میں اسٹاکر نہیں ہوں۔ میری ماں کی سالگرہ آنے والی ہے۔ میں اسے میڈونا کا فوٹو اور آٹوگراف دینا چاہتا تھا۔“

”تم گلوکار یا موسیقار ہو؟“

”میں گٹار بجا لیتا ہوں۔“

”تم کہاں ٹھہرے ہو؟“

”کہیں نہیں۔ میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔ رات بھی پہاڑیوں میں سو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی، یہاں سے نکل کر کہاں جاتا۔“

”جیسی، ہمیں کچھ وقفہ لینا چاہیے۔ مجھے چند فون کالز کرنی ہیں۔ اس کے بعد بہت ممکن ہے کہ ہم ایک بار پھر نئے سرے سے گفتگو کو دہرائیں۔ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تم پُرسکون رہو...... میں تمہارے لیے ٹھکانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ ممکن ہے، یہ کوئی ہوٹل ہو۔“

جیسی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اس دوران میں تم دماغ پر زور دو...... کوئی نئی بات سامنے آ سکتی ہے۔“

”میں کوشش کر رہا ہوں۔“ جیسی نے جواب دیا۔

ہیری اسے وہاں چھوڑ کر باہر نکل گیا...... اے سی کو اس نے چونسٹھ پر سیٹ کر دیا تھا۔ جلد ہی جیسی کینیڈا جیسی ٹھنڈک محسوس کرنے لگے گا۔ ہیری نے وقت دیکھا، صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ فیڈرل ایجنٹس کے ساتھ میٹنگ چار گھنٹے سے قبل ممکن نہیں تھی۔ اس وقفے میں ہیری کو کئی کام نمٹانے تھے اور جیسی کے ساتھ دوسرا راؤنڈ بھی کھیلنا تھا۔ اگرچہ اسے توقع نہیں تھی کہ دوسرے راؤنڈ میں کوئی نئی اطلاع برآمد ہو سکے گی۔

اسکواڈ روم میں ہیری نے اگناسیو کو اپنی ڈیسک پر دیکھا۔ وہ اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف کار تھا۔

”کوئی نئی بات؟“ اس نے ہیری کو دیکھ کر لڑکے کے بارے میں سوال کیا۔

”نہیں۔ کچھ خاص نہیں...... کوشش جاری ہے۔“ ہیری نے جواب دیا۔

اگناسیو کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ اپنی بہترین جسمانی حالت کے باعث اکیڈمی کی ٹرافی بھی جیت چکا تھا۔ بال چھوٹے اور آنکھوں کی رنگت سبز تھی۔

ہیری اپنی ڈیسک کی جانب چلا گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر لیوٹیننٹ کی نیند خراب کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر اسے اب تک کی تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اگناسیو کی ڈیسک پر آ گیا۔

”مقتول کی گن کے بارے میں بتاؤ؟“

”کمپیوٹر کے مطابق وہ چھ مہینے قبل خریدی گئی تھی...... بائیس کیلبر، اسمتھ اینڈ ویسن۔“

راشیل اور بریز کے وزٹ کے بعد کسی وقت کینٹ نے اپنے تحفظ کے لیے گن خریدی ہوگی، ہیری نے سوچا اور اسی گن نے تحفظ کے بجائے اسے موت کا تحفہ دے دیا۔

☆☆☆

ہیری کافی پینے کے ارادے سے متحرک ہوا تو اسے بریز کا دیا ہوا کارڈ یاد آیا۔ بریز اور راشیل کو جیسی کے انٹرویو کی رپورٹ درکار تھی۔ ہیری نے کچھ دیر قبل لیو کو کینیڈین لڑکے کے بارے میں بتایا تھا۔ لیو نے ہدایت کی تھی کہ نو بجے کی میٹنگ تک لڑکے کے بارے میں خاموشی اختیار کی جائے۔ اسی وقت فیصلہ ہوگا کہ جیسی کے بارے میں منہ بند رکھا جائے یا کھولا جائے۔ اگر ایف بی آئی کی طرف سے ایل اے پی ڈی کو تفتیش سے الگ رکھنے کا اشارہ ملا...... پھر ہیری، جیسی کو معلومات کے تبادلے کے لیے کارڈ کے طور پر استعمال کرے گا۔

ہیری کے نزدیک وہ لفظ یا نعرہ بہت اہم تھا جو قاتل نے فائرنگ کے وقت بلند کیا تھا۔ تاہم جیسی، نام اور لہجہ دونوں سمجھنے سے قاصر تھا۔ ہیری نے اس نقطے کو ذہن سے ہٹایا اور اگناسیو کی ڈیسک پر رکھے مقتول کے بلیک بیری کو اٹھا لیا۔

”باس کیا چاہ رہے ہو؟“ اگناسیو نے سوال کیا۔

”کل چھ بجے اس فون پر کینٹ نے اپنے گھر کے کمپیوٹر سے ایک ای میل وصول کی۔ ای میل میں کیا تھا؟ تم جانتے ہو۔ مجھے اس کا پرنٹ آؤٹ فوٹو کے ساتھ چاہیے۔ فوٹو فون کے اسکرین سے بڑا ہونا چاہیے۔“ ہیری نے مدعا بیان کیا۔

”ابھی لو۔“ اگناسیو مسکرایا۔ ”مجھے اس میل سے ای میل اپنے کمپیوٹر میں بھیجنی پڑے گی پھر اسے کھول کر پرنٹ آؤٹ لے لوں گا۔“

”میں جانتا تھا کہ تم کم عمر ہونے کے باوجود کام کے

آدمی ہو۔" ہیری نے کہا۔ کچھ دیر بعد پرنٹ آؤٹ ہیری کے ہاتھ میں تھا۔

"اور کچھ؟"

"کالز ریکارڈ؟"

"صرف کل کا؟"

"ہاں۔" ہیری نے سر ہلایا۔ "کل دوپہر تک کا ریکارڈ......" وہ جھک کر کمپیوٹر پر اگناسیو کی کارکردگی کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اس نے بلیک بیری کی فون کالز نوٹ کیں...... کے اینڈ میڈیکل، کینٹ کی ملکیت تھا۔ بیری کیلر اس کا شریک تھا۔ انگلیوں کے ساتھ اگناسیو کی زبان بھی رواں تھی۔ ہیری نوٹ پیڈ استعمال کر رہا تھا۔ کینٹ نے چھ بجے کے بعد گھر اوپر تلے دس کالز کی تھیں اور ظاہر ہے کہ کسی کا جواب بھی نہیں ملا تھا۔ یہ کالز اس نے پیغام وصول کرنے کے بعد کی تھیں۔ اس وقت ایلی سیا بستر پر بندھی پڑی تھی۔ دیگر کالز اور پیغامات میں ہیری کے مطلب کا کچھ نہ تھا۔ اس نے ایلی سیا کا فوٹو دیکھا۔ اسے جس انداز میں باندھا گیا تھا، اس کی علت اسے سمجھ نہیں آئی۔ نہ وہ یہ جان سکا کہ کینٹ کو ختم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ وہ ایلی سیا کے فوٹو کو گھور رہا تھا اور ذہن کہیں اور تھا۔

"کیا مسئلہ ہے؟" اگناسیو نے سوال کیا۔

"ذخیرۂ آب کے اوپر کینٹ کو ہلاک کرنے کی وجہ کیا تھی۔ اس نے قاتلوں کا مطالبہ پورا کر دیا تھا۔ پھر یہ خون خرابا؟"

"شاید اس نے دونوں میں سے کسی کا چہرہ دیکھ لیا ہو۔" اگناسیو نے خیال آرائی کی۔

"نہیں، ان کے چہروں پر ماسک تھے۔ جیسی نے بھی تصدیق کر دی ہے۔" ہیری نے اس کی رائے مسترد کر دی۔

"ممکن ہے کچھ نہ ہو...... ان کا منصوبہ ہی یہ ہو کہ مطلوبہ شے حاصل کرنے کے بعد اسے ختم کر دیں گے۔"

"انہوں نے اسے قتل کرتے وقت نعرہ لگایا تھا۔ وہ کیا لفظ تھا۔ یہ جاننا ضروری ہے۔ جیسی کو یاد نہیں آرہا ہے لیکن اسے یاد آگیا تو ہمیں آگے بڑھنے میں بہت مدد ملے گی۔" ہیری نے امید ظاہر کی۔ "یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ اگر ان کا پلان اسی طرح تھا تو انہوں نے اس کی بیوی کو کیوں زندہ چھوڑ دیا...... چہرے نہ دیکھنے کے باوجود ایلی سیا کی حیثیت گواہ کی تھی۔"

اگناسیو خاموش رہا۔

ایف بی آئی کا دہشت گردی کا نظریہ نہ جانے کیوں ہیری کے حلق سے اترنے میں ناکام تھا۔ دہشت گردی کے امکان کو تسلیم کرنے کا مطلب مختلف مذاہب کے شدت پسندوں کی موجودگی کے امکان کو بھی پیشِ نظر رکھنا ناگزیر تھا جبکہ کئی برس سے ایسی کوئی سرگرمی دیکھنے میں کہیں آئی تھی۔ اس نے اپنے پارٹنر کو ہدایت کی کہ وہ مقتول کے بلیک بیری سے کھیلتا رہے۔ ایلی کا فوٹو لے کر وہ اپنی ڈیسک پر آگیا۔

ریڈنگ گلاس لگا کر اس نے دراز میں سے میگنیفائنگ گلاس نکالا اور تصویر پر جھک گیا۔ نامعلوم افراد نے ایلی کو جس مخصوص انداز میں باندھا تھا، اس کے لیے چھ عدد ٹائیاں استعمال کی گئی تھیں۔ مزاحمت کرتی عورت کو اس انداز میں باندھنا خوامخواہ کا دردِ سر تھا۔ کیا ایلی نے مزاحمت نہیں کی تھی؟ کیوں؟ شاید وہ دہشت زدہ تھی؟ باندھنے کے دیگر سیدھے اور آسان طریقے تھے...... کم وقت والا شیں۔ اگر اس قسم کی جکڑ بندی کا کوئی مطلب تھا تو ہیری یہ مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کمان کی شکل میں مڑی ہوئی تھی لیکن یہ کھنچاؤ اتنا شدید نہیں تھا کہ ہڈی ٹوٹ جاتی یا وہ اذیت کے مارے واقعی بے ہوش ہو جاتی۔ اگرچہ اس حالت میں بھی تا دیر بستر پر پڑے رہنا تکلیف دہ تھا۔ ہیری غور کرتا رہا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ ایلی سے مل کر تفصیلی بات کی جائے۔ اس نے نوٹ بک پر چند سوالات لکھے، فوٹو پر آخری نظر ڈالی۔ فارنسک رپورٹ دیکھی۔

ہیری، بریز کے ہمراہ فوراً ہی سینٹ اگاتھا کلینک کی طرف چلا گیا تھا۔ ایلی اور میکنیشو کے ساتھ راشیل وہاں رہ گئی تھی۔ ٹیکنیکل عملے نے وہاں کیا شواہد تلاش کیے، ہیری انہیں دیکھنے کے لیے بے قرار تھا۔ تاہم وہاں ٹائیوں پر مشتمل ایک ہی بیگ ملا جن کی مدد سے ایلی کو کمان کی شکل میں باندھا گیا تھا۔

"بس صرف یہی؟" ہیری نے سوال کیا۔ "تم نے ایویڈینس لاگ چیک کیا تھا؟"

"ہاں، لیکن وہ سب کچھ ساتھ لے گئے تھے۔ مجھے یہی دیا تھا۔"

ہیری نے لاگ پر نظر ڈالی۔ بالوں کے ٹکڑے اور کپڑوں کے مختصر دھاگے، ایویڈینس بیگ میں نہیں تھے۔ ماسٹر بیڈ کے کارپٹ، گیسٹ باتھ، ماؤس پیڈ، آفس کمپیوٹر، کیمرے کا لینس کیپ (جو بستر کے نیچے سے ملا تھا) لاگ بک میں ہر شے لکھی گئی تھی۔ فہرست میں آخری آئٹم پر نظر پڑتے ہی ہیری بوش چونک اٹھا۔

طویل کیریئر میں اس نے اَن گنت اور مختلف نوعیت کے کرائم سین دیکھے تھے۔ قدرت کا بنیادی قانون ہے جب کوئی جرم وقوع پذیر ہوتا ہے، ہمیشہ اپنی نشانی چھوڑ جاتا ہے۔ چاہے وہ نشان کتنا ہی مختصر اور غیر اہم کیوں نہ ہو۔ سوال صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ اس نشان تک کیسے پہنچا جائے۔

لاگ کا آخری آئٹم سگریٹ کی راکھ تھی۔ فی الحال اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ سگریٹ کی راکھ سے کیا حاصل کر سکے گا۔ تاہم اس نے فی الفور فون اٹھا کر سائنٹفک انویسٹی گیشن ڈویژن کا نمبر ملایا۔

"بزسے بات کراؤ۔"

"کون؟"

"ہیری بوش۔"

ایک منٹ کے اندر وہ بز سے بات کر رہا تھا۔

"ہاں، سگریٹ جل کر راکھ ہو چکی تھی۔"

"راکھ کہاں ہے؟"

"وہ...... وہاں ایک فیڈرل ایجنٹ تھی۔ اس کے پاس۔"

"بہت خوب...... میرے کرائم سین کی ایویڈینس تم نے اسے دے دی۔"

"وہ...... دراصل دہشت گردی...... کی...... اس کا کہنا تھا کہ بیورو کی سائنس لیب تمباکو کی نوعیت اور اصلیت جان لے گی۔ جس کے بعد اس ملک کا تعین کرنے میں آسانی ہوگی۔"

"اور تم ہر بات پر یقین کرتے چلے گئے۔" ہیری نے تلخی سے کہا۔

"ہیری ہم سب ایک ٹیم......"

ہیری نے فون بند کر دیا۔

اگناسیو نے استفسار کیا لیکن ہیری نے ہاتھ لہرا کر بات ختم کر دی۔

"رات کی کال کے بعد سے تم سوئے نہیں ہو؟"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ہیری نے کہا۔ "میں نیند کی وجہ سے ایف بی آئی پر برہم نہیں ہوں۔" ہیری نے کافی کا مگ اٹھایا۔

"پھر بھی ان سے الجھنا ٹھیک نہیں ہے، باس۔"

"تم میری فکر مت کرو...... کینٹ ہاؤس کی تصاویر کہاں ہیں؟"

"یہیں ہونی چاہئیں۔" اگناسیو نے ڈیسک پر فولڈر میں فائلوں کو دیکھا اور ایک فائل ہیری کے حوالے کی۔ ہیری نے تصاویر دیکھیں۔ آخر میں اس کی توجہ گیسٹ باتھ کی تین تصاویر پر مرکوز ہوگئی۔ ایک مکمل شاٹ تھا۔ دوسرا زاویہ بنا کے لیا گیا تھا جس میں واٹر ٹینک پر سلگ کر راکھ ہونے والی سگریٹ کا نشان نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔

ہیری نے تینوں تصاویر پھیلائیں اور میگنیفائر نکالا۔ سگریٹ جلنے کا نشان دو انچ کے قریب تھا۔ ٹوائلٹ کا سیٹ کور اٹھا ہوا تھا۔ دونوں میں سے کسی نے ٹوائلٹ استعمال کیا تھا۔

ہیری نے ایک بار پھر ایس آئی ڈی فون ملا کر انگلیوں کے نشانات کے بارے میں پوچھا۔ جواب نفی میں تھا۔ نشانات کہیں نہیں تھے۔ ٹوائلٹ سیٹ کے نشانات صاف کر دیے گئے تھے۔ ہیری اور اگناسیو کچھ دیر مصروفِ گفتگو رہے۔ پھر اگناسیو اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ہیری نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ لیے۔

ذہن میں خیالات کا جنگل تھا۔ قتل ہی کرنا تھا تو ماسک کی کیا ضرورت تھی؟ ماسک لگائے تھے تو کینٹ کو ختم کیوں کیا؟ نیز یہ کہ بیوی کو کیوں چھوڑ دیا؟ شاید ماسک اس لیے لگائے تھے کہ کینٹ غلط فہمی میں رہے کہ وہ اسے مارنا نہیں چاہتے...... لہٰذا اسے تعاون کرنا چاہیے۔ تاہم ہیری اپنے اس مفروضے سے مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ معاً اس نے ذہنی سوال و جواب کا سلسلہ ختم کیا اور کافی پی کر جیسی سے ملنے کے لیے تیار ہوگیا۔ تاہم انٹرویو روم میں جانے سے پہلے اس نے فون نکالا۔ ایکو پارک کیس کے بعد بھی راشیل کا نمبر اب تک محفوظ تھا۔ وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اس نمبر کو کبھی ڈیلیٹ نہیں کرے گا۔

اس نے نمبر ملایا اور ذہنی طور پر تیار ہوگیا کہ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا جائے گا۔ راشیل کی آواز سنائی دی لیکن یہ ریکارڈڈ ہدایت تھی کہ پیغام چھوڑ دیا جائے۔

"میں ہیری بوش ہوں۔ کچھ باتیں کرنی ہیں.... فی الحال سگریٹ کی راکھ واپس کر دو۔ وہ کرائم سین میرا ہے۔"

اس نے پیغام ریکارڈ کرا کے فون بند کر دیا۔

وہ جانتا تھا کہ پیغام سن کر وہ برہم ہو جائے گی۔ شاید نیم پاگل ہو جائے۔ وہ اس بات سے بھی آگاہ تھا کہ اس کی یہ حرکت بیورو سے براہِ راست تصادم کے مترادف ہوگی۔ یہ تصادم ناگزیر نہیں تھا۔ ہیری بہ آسانی کنی کترا سکتا تھا لیکن وہ اپنی افتادِ طبع اور اسٹائل سے مجبور تھا۔

اس نے ماضی کے تعلقات کی پروا نہیں کی تھی۔ نہ مستقبل کی امید کے لیے تصادم سے بچنے کی کوشش کی تھی۔ وہ امید جس کے لیے راشیل کا سیل نمبر اس کے فون کے دل میں محفوظ تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں مارک ٹوئن ہوٹل میں جیسی سے ملاقات کر کے باہر آئے تھے۔ جیسی نام کے معاملے میں کنفیوز تھا۔ اس نے ملتے جلتے کئی نام بتادیے تھے۔

''تم سمجھتے ہو کہ وہ یہاں رکا رہے گا؟''

''کہاں جائے گا؟ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔'' ہیری نے جواب دیا۔ ہیری نے جیسی کو وہاں چارلس ڈکنز کے نام سے ٹھہرایا تھا۔ جیسی اس کے لیے ترکم کا اِکّا تھا۔ اگرچہ وہ قاتل کی پہچان بتانے سے قاصر تھا۔ لیکن جائے واردات پر جو کچھ ہوا۔ تفتیش کنندگان کے لیے جیسی اس کا نقشہ کھینچ سکتا تھا۔ کسی گرفتاری اور مقدمے کی صورت میں جیسی کی کہانی جرم کا بیانیہ بن جاتی۔ جسے پراسیکیوٹر، جیوری کے سامنے استعمال کرسکتا تھا۔ چاہے جیسی قاتل کی پہچان بتانے میں معذور ہی کیوں نہ نکلے۔

اپنے انچارج لیوٹیلنٹ سے مشورے کے بعد یہی فیصلہ ہوا تھا کہ لڑکے کو پوشیدہ رکھا جائے۔ لیو نے لڑکے کے لیے چار دن کا ہوٹل واؤچر منظور کر دیا تھا۔ تصویر صاف ہونے کے لیے چار دن بہت تھے۔ ابھی تو پہلا دن ہی پورا نہیں ہوا تھا۔

ہیری اور اگناسیو، کراؤن وکٹوریا میں بیٹھ گئے...... راشیل کی جانب سے کوئی جوابی ردِعمل نہیں آیا تھا۔ ہیری نے اس کے پارٹنر بریز کا نمبر ملایا اور احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کیا۔

''میں میٹنگ کا مقام معلوم کرنا بھول گیا تھا؟''

''فیڈرل بلڈنگ، ڈاؤن ٹاؤن۔ پندرھویں منزل۔ ٹی آئی یو میٹنگ کے بارے میں پوچھ لینا۔'' بریز نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، نو بجے پہنچ رہے ہیں۔'' ہیری نے عام سے انداز میں کہا۔

''اوہ...... ہاں...... وہ وقت کچھ آگے پیچھے ہو گیا ہے۔''

ہیری مسکرایا۔ ''کیا مطلب؟''

''دس...... دس بجے۔''

''ٹھیک ہے، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''گواہ سے کچھ مدد ملی؟'' بریز نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

ہیری کے لیے اپنے پتے کھولنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

''اس نے واردات دیکھی تھی لیکن فاصلہ زیادہ تھا۔ تاہم اس نے تصدیق کی تھی کہ کئی چیزیں پورشے سے دوسری گاڑی میں منتقل کی گئی تھیں۔ تمام کام ایک ہی آدمی نے سرانجام دیا۔ اسی نے کینٹ کو ختم کیا۔ دوسرا اپنی گاڑی سے نکلا ہی نہیں۔''

''لائسنس پلیٹ؟''

''نہیں، سیسیم غالباً مسز کینٹ کی کار میں لے جائی گئی تھی تاکہ ان کی کار میں سیسیم ٹریس نہ ہو۔''

''اس نے قاتل کو دیکھا؟''

''نہیں۔ اس وقت بھی اس نے اسکائی ماسک پہنا ہوا تھا۔''

بریز کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ ہیری نے اسے نام کے کنفیوژن کے بارے میں بتادیا جو جیسی کو درپیش تھا۔

''بُری خبر ہے۔'' وہ بولا۔ ''تم نے اس کا کیا کیا؟''

''چھوڑ دیا۔''

''کہاں؟''

''ہیلی فیکس کینیڈا۔'' ہیری نے معصومیت سے کہا۔

''بوش تم سمجھ رہے ہو کہ میں نے کیا پوچھا ہے؟''

ہیری نے نوٹ کیا کہ اس نے بوش کا لفظ استعمال کیا تھا...... اور آواز میں بھی تپش تھی۔

''وہ کینیڈا سے آیا تھا۔ آوارہ گرد تھا۔ اس کا کوئی مقامی پتا نہیں ہے...... ہم نے اس کی مطلوبہ جگہ پر اتار دیا جہاں سے اسے کینیڈا جانا تھا۔ کھانے پینے کے لیے کچھ پیسے بھی دے دیے تھے۔'' ہیری نے دیکھا کہ اگناسیو اس کے بے تکلف جھوٹ پر اسے تک رہا تھا۔ ''تمہاری جانب کیا اطلاع ہے؟'' ہیری نے استفسار کیا۔

''ہوم لینڈ نے چاپرز کا فلیٹ روانہ کیا ہے۔ جدید آلات بھی ہیں۔ جو ریڈی ایشن کو ٹریک کریں گے۔ اس کا آغاز جائے واردات سے ہوگا۔ اس دوران ہم میٹنگ کے دوران طے کریں گے کہ ہم سب ایک صفحے پر ہیں۔''

''کیا یہ ممکن ہے؟''

''ایسا ہونا ضروری ہے۔ تب ہی تمام ادارے مل کر حملہ آور ہوں گے۔'' ہیری نے محسوس کیا کہ صورتِ حال ایسی نہیں ہے جیسی بریز بتا رہا تھا۔ اسے شک تھا کہ بات چیت ریکارڈ ہورہی ہے۔ وہاں موجود دیگر افراد بھی گفتگو سن رہے

تھے۔

ہیری خفیف سا ہچکچایا اور بولا۔ ”میرا اگلا قدم کینٹ ہاؤس کی طرف ہوگا۔ مسز کینٹ سے پھر بات کرنی ہے۔ بعدازاں کینٹ آفس جاکر اس کے پارٹنر سے بات کرنی ہے۔“

دوسری طرف خاموشی تھی۔ ہیری نے گاڑی ریسٹورنٹس، جو چوبیس گھنٹے کھلے رہتے تھے، کے ساتھ پارک کی۔ وہاں بہت کم گاہک نظر آرہے تھے۔

”تم لائن پر ہو؟“

”ہاں ہیری...... میں تمہیں بتانا چاہ رہا ہوں کہ تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ہیری نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہوں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”تو تم لوگوں نے ان افراد کو اٹھا لیا ہے؟“

”ہاں، ہم ان سے بات کررہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ہم بھی پہنچیں گے۔ یہ ابھی تک ہومی سائڈ انویسٹی گیشن ہے۔“

خاموشی کا طویل وقفہ آیا۔ ”دیکھو ڈیشکلیو، کیس وسیع دائرہ کار اختیار کرگیا ہے۔ ہم تم دونوں کو مسز کینٹ اور ڈاکٹر کینٹ کے پارٹنر سے بات کرنے کا موقع فراہم کریں گے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ترجیح اب ہومی سائڈ نہیں ہے۔ مطلب قاتل کون ہے؟ ترجیح سیسیم کی برآمدگی ہے اور ہم گیارہ گھنٹے پیچھے ہیں۔“

”ہم قاتل تک پہنچ گئے تو سیسیم ازخود ہاتھ آجائے گی۔“ ہیری نے کھل کر اختلاف کیا۔

”ممکن ہے ایسا ہو۔“ بریئر نے کہا۔ ”لیکن ہمارے تجربے کے مطابق یہ مواد تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں سفر کرے گا۔ لہٰذا ہمیں بھی برق رفتاری کا مظاہرہ کرنا ہے اور ہم یہی کرنے جارہے ہیں۔“

”ہماری وجہ سے رفتار کم ہوجائے گی؟“

”ہیری، تم سمجھ نہیں رہے۔“

”سمجھ رہا ہوں۔ دس بجے آؤں گا۔“ ہیری نے فون بند کردیا۔

فون بند ہوتے ہی اگناسیو نے سچ اور جھوٹ کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ ہیری نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔ ”چلو اندر کافی پیتے ہیں...... ناشتا بھی ہوجائے۔ پھر میں بتاتا ہوں کہ درونِ خانہ کیا کہانی چل رہی ہے۔“

ہیری نے کونے میں ایک بوتھ منتخب کیا جہاں سے داخلی دروازہ نظر آرہا تھا۔ ویٹرس فوراً ہی آن دھمکی۔ ہیری نے کافی، ٹوسٹ اور آملیٹ کا آرڈر دیا۔ ویٹرس کے جاتے ہی اگناسیو نے پھر سوالات شروع کردیے۔

”بچے ہمیں اس کیس سے الگ کیا جارہا ہے، کیا سمجھے؟“

”تمہیں یقین ہے؟ کیسے معلوم ہوا؟“

”کیونکہ انہوں نے ہمارے مطلوبہ افراد کو اٹھا لیا ہے اور میں گارنٹی دیتا ہوں کہ وہ ہمیں مسز کینٹ اور مسٹر کینٹ کے پارٹنر سے بات نہیں کرنے دیں گے۔“

”کیا انہوں نے ایسا کہا یا تم وہم کا شکار ہورہے ہو؟“

”ویل، ویل...... پارٹنر، انتظار کرو اور دیکھو...... ہاں سیکھو بھی۔ ابھی تم نے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرکے جھاڑ دے ہمیں ایک طرف کردیں گے۔ میں ان کی تکنیک کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ ہومی سائڈ ہے...... کوئی بھی، ایف بی آئی بھی ہیری کو کھڈے لائن نہیں لگا سکتی۔“

”کچھ بھروسا کرو ہیری۔“

”بھروسا مجھے خود پر ہے۔ میں اس سڑک پر پہلے بھی سفر کرچکا ہوں۔ جانتا ہوں یہ کہاں جائے گی۔ میں ان پر اعتماد نہیں کرسکتا۔ انہیں سیسیم چاہیے۔ مجھے ان کتوں کو پکڑنا ہے۔ جنہوں نے کینٹ فیملی کو دہشت زدہ کیا اور ڈاکٹر کینٹ کو گھٹنوں کے بل بٹھا کر اس کے سر میں دو گولیاں اتاریں۔“

”یہ مختلف معاملہ ہے۔ قومی سلامتی کا سوال ہے۔“ اگناسیو نے کہا۔

ہیری کو لگا کہ اگناسیو اکیڈمی کے نصاب کے مطابق چل رہا ہے یا کسی خفیہ سوسائٹی کا کوڈ...... ہیری کو پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے کوڈ کے مطابق حرکت کرتا تھا۔

”کل ہالینڈ ڈیم پر جولاش پڑی تھی۔ کہانی وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اگر ہم جائے واردات کو اور قاتل کو نظرانداز کریں گے تو بھول جاؤ کہ قاتل ملے گا...... یا سیسیم۔“

نوجوان اگناسیو، سینئر پارٹنر کے انداز سے نروس ہوگیا۔ اس نے نمک دانی سے آملیٹ میں نمک ملایا...... کچھ نمک میز پر گرگیا۔

”ہیری یہ ترجیحات کا سوال ہے...... میٹنگ کے دوران معلومات کے تبادلے کے بعد معاملہ کھل جائے گا۔“

ہیری بدمزہ ہونے لگا۔ وہ لڑکے کو سکھانا چاہ رہا تھا اور

وہ ہنسنے پر آمادہ نہیں تھا۔

”غور سے سنو، اول کوئی میٹنگ نہیں ہورہی ہے۔ دوسرے یہ لوگ جب معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں تو ہاتھی کی طرح کھاتے ہیں۔ لیکن جب معلومات دینے کی باری آتی ہے تو گونگے بن جاتے ہیں۔ نو بجے میٹنگ تھی۔ دس بجنے والے ہیں۔ ہم دس بجے پہنچیں گے اور میٹنگ کا وقت آگے بڑھا دیا جائے گا...... پھر مزید آگے...... وہ یونہی ہمیں بہلاتے رہیں گے۔ ہم اس غلط فہمی میں رہیں گے کہ ہم ہر معاملے میں شامل ہیں جبکہ ہم کہیں بھی نہیں ہوں گے۔ انجام یہ ہوگا کہ مناسب وقت پر وہ عقبی دروازے سے نکل جائیں...... ناکامی ہوئی تو ہمارے گلے میں آئے گی۔“

اگناسیو نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

”لیکن تم نے جیسی کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا۔ ممکن ہے وہ اس سے کوئی کام کی بات معلوم کرلیتے۔“ اگناسیو بولے بغیر نہ رہ سکا۔

”اونہہ...... ہوسکتا ہے میں، مسز کینٹ یا ڈاکٹر کینٹ کے پارٹنر سے کوئی کام کی بات معلوم کرلیتا...... جنہیں وہ اٹھا کر لے گئے۔ بھول جاؤ۔ جیسی میرا کارڈ ہے۔ تبادلہ ہوگا۔ اگر وہ ہمیں مطلوبہ رسائی دیتے ہیں تو ہم انہیں جیسی تک رسائی دیں گے۔“

دونوں نے کانٹا اور چمچ سنبھال لیے۔ اگناسیو کچھ اور بولتا، لیکن ہیری کے تیور دیکھ کر خاموش رہا۔ انہوں نے اشیائے طعام کا نصف حصہ نمٹایا تھا، جب ہیری کی نظر ریسٹورنٹ میں داخل ہونے والے چار مخصوص وردی پوشوں پر پڑی۔ وہ دو دو کی جوڑی میں منقسم ہوکر وہ اطراف سے ریسٹورنٹ کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ بلاشبہ ایف بی آئی کے آدمی تھے۔

ریسٹورنٹ میں ایک درجن سے بھی کم افراد تھے۔ وہ پُرسکون انداز میں چاروں کی حرکات کا مشاہدہ کررہا تھا۔ اس نے کھانے سے ہاتھ نہیں روکا تھا۔ وہ میزوں پر موجود افراد کی آئی ڈی چیک کررہے تھے۔ اگناسیو کی زیادہ توجہ طعام کی جانب تھی۔ لہٰذا وہ اس نئی سرگرمی سے ناآشنا تھا۔ بالآخر دو ایجنٹ کونے میں ان کے بوتھ تک آگئے۔ بیج بتا رہے تھے کہ ان میں ایک کا نام رونالڈ لیور اور دوسرے کا جان پارکن تھا۔ انہوں نے ہیری سے صرف نظر کیا، کیونکہ وہ عمر رسیدہ لگ رہا تھا۔ اگناسیو کی آئی ڈی طلب کی گئی۔

”کس کی تلاش ہے؟“ ہیری نے سوال کیا۔

”سرکاری کام ہے، سر۔“

اگناسیو نے والٹ نکال کر بیج دکھایا۔ فوٹو کے ساتھ اگناسیو کا نام اور شعبہ لکھا تھا۔ دونوں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔

”مضحکہ خیز بات ہے۔ اگر تم دونوں آئی ڈی کے ذریعے کسی کو تلاش کررہے ہو۔ کیونکہ میں نے بریئر کو گواہ کا نام نہیں بتایا تھا۔“

”تم کون ہو؟“ رونالڈ نے استفسار کیا۔ وہ انچارج معلوم ہورہا تھا۔

”دیکھنا چاہتے ہو؟ بہت پرانی ہے...... فرسودہ۔“ ہیری نے بیج نکالا اور رونالڈ کے حوالے کردیا۔ ایجنٹ نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کے تیور کچھ بدل گئے تھے۔

اس نے مسکرا کر اس کے نام کا مذاق اڑایا۔ ہیری بھی خندہ زن ہوا اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”تمہیں نام کے ساتھ لیور نہیں لگانا چاہیے تھا۔ منہ تمہارا پہلے ہی لیور کے مانند ہے۔“

رونالڈ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے بیج چھوڑ دیا جو آملیٹ کی پلیٹ میں گرا۔ اتفاق سے زردی پک گئی تھی اس لیے بیج پر نشان نہیں پڑا۔ ہیری نے اسے نیپکن سے صاف کرکے واپس رکھ لیا۔

”ہیری مجھے نہیں معلوم کہ کیا کھیل ہورہا ہے۔ مجھے پتا کرنا ہے کہ جیسی میٹ فورڈ کہاں ہے؟“

”کون جیسی؟“ ہیری نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔

رونالڈ کے چہرے پر پھر سرخی لہرائی۔ اس نے دونوں ہاتھ میز پر جمائے اور ہیری کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”تم جانتے ہو، کس کی بات ہورہی ہے اور ہمیں اُسے لے جانا ہے۔“

”تو لے جاؤ۔“ ہیری نے کوئی اثر نہیں لیا۔ ”میٹنگ میں ملاقات ہوگی۔ کینٹ کے پارٹنر سے انٹرویو کرنے کے بعد مسز کینٹ سے بات کروں گا۔ اس کے بعد جیسی کے بارے میں بات کریں گے۔“

رونالڈ نے زہرخند سے اُسے دیکھا۔ ”کیوں مصیبت میں پڑنا چاہتے ہو؟“

”جب تم اسکول میں تھے۔ اس وقت سے میں، مصیبت میں ہی ہوں۔ میری فکر مت کرو...... کسی اور کو دیکھو۔ کھانے کا مزہ لینے دو۔“

رونالڈ سیدھا کھڑا ہوگیا اور انگلی سے ہیری کے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ ”مسٹر ہیری محتاط رہنا۔“ اس نے تنبیہ کی۔

”مشورے کا شکریہ۔“

اگناسیو اس دوران میں خاموش رہا تھا اور قدرے بے کل تھا۔

☆☆☆

دونوں مُل ہالینڈ پر تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہاں کوئی واردات سرے سے نہیں ہوئی تھی۔ ہیری نے جلد ہی وہ جگہ چھوڑ دی اور ایروہیڈ ڈرائیو کی جانب روانہ ہوگیا۔

''کہاں جارہے ہو؟'' اگناسیو نے کافی دیر بعد زبان کھولی۔

''مقتول کینٹ کے گھر۔''

''لیکن......''

''پریشان مت ہو۔'' ہیری نے قطع کلامی کی۔ کینٹ ہاؤس کے سامنے حسبِ توقع فیڈرل کار موجود تھی۔ ہیری اس پر توجہ دیے بغیر کراؤن وک کو ڈرائیو وے میں لے گیا۔ گاڑی سے اتر کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کی سماعت نے فیڈرل ایجنٹ کی کار کا دروازہ کھلنے کی آواز سن لی تھی۔ پورشے کی کی رِنگ اب تک اس کے پاس تھی۔ اس نے صحیح چابی تلاش کرکے لاک میں داخل کردی۔

عین اسی وقت ایجنٹ کی آواز بلند ہوئی۔

''ایف بی آئی......وہیں رک جاؤ۔''

ہیری کا ہاتھ دروازے پر تھا۔

''دروازہ مت کھولنا۔'' ایجنٹ نے وارننگ دی۔

ہیری پلٹا اور پیش قدمی کرتے ہوئے ایجنٹ کو دیکھا۔ ہیری جانتا تھا کہ مکان کی نگرانی کے لیے ایف بی آئی نے عام سا بندہ چنا ہوگا۔ اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ ہیری آسانی سے اسے ہینڈل کرسکتا تھا۔

''ایل، اے، پی، ڈی ہوی سائڈ اسپیشل۔'' ہیری نے تعارف کرایا۔ ''ہم اور تم ساتھ کام کررہے ہیں۔''

''نہیں، یہ معاملہ بیورو نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ ہر قسم کی تفتیش ایف بی آئی کرے گی۔''

''معاف کرنا، جوان...... مجھے ایسا کوئی میمورینڈم نہیں ملا۔'' ہیری نے رخ واپس دروازے کی طرف کرلیا۔

''دور رہو، یہ قومی سلامتی کا معاملہ ہے۔ اپنے بڑوں سے بات کرو۔''

ہیری نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سپیریئرز تمہارے ہوں گے۔ میں سپروائزر کو جوابدہ ہوں۔''

''جو کچھ بھی ہے۔ تم اندر نہیں جاسکتے۔'' ایجنٹ نے حتمی لہجے میں کہا۔

''ہیری۔'' اگناسیو نے مداخلت کی۔ ''شاید ہمیں......''

ہیری نے ہاتھ لہرا کر اس کا جملہ کاٹ دیا اور فیڈرل ایجنٹ کی طرف مڑا۔ ''میں تمہاری آئی ڈی دیکھنا چاہوں گا۔''

ایجنٹ کے چہرے پر حیرت دکھائی دی۔ تاہم اس نے جیب سے شناخت نکالی اور کھول کر ہیری کے سامنے کر دی۔ ہیری تیار تھا۔ اس نے ایجنٹ کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دیا اور بازو پشت پر موڑ دیا۔ ایجنٹ کا منہ دروازے سے جالگا۔ ہیری نے مڑے ہوئے بازو پر دباؤ ڈال کر اسے دروازے سے چپکا دیا۔ ہیری نے اسے زیادہ مزاحمت کا موقع نہیں دیا اور اپنا آزاد ہاتھ اس کی جیکٹ کے نیچے ڈال کر ہتھکڑیاں اس کی بیلٹ سے الگ کرلیں۔

''ہیری کیا کررہے ہو؟'' اگناسیو گھبرا گیا۔

ہیری، ایجنٹ کی کلائیاں ہتھکڑیوں میں جکڑ چکا تھا۔

''میں نے تمہیں کہا تھا کہ کوئی ہمارا راستہ نہیں روک سکتا۔'' ہیری نے اگناسیو سے کہا۔ فیڈرل ایجنٹ کے ہاتھ عقب میں جکڑے جاچکے تھے۔ بیج ابھی تک ہاتھ میں تھا۔ ہیری نے بیج لے کر کھولا۔ نام کی جگہ کلفرڈ میکسویل لکھا تھا۔ ہیری نے بیج واپس جیکٹ کی جیب میں رکھ دیا۔

''اپنا کیریئر ختم سمجھو۔'' میکسویل نے سکون سے کہا۔

''پرانی بات ہے۔'' ہیری نے اطمینان سے جواب دیا۔

میکسویل نے اگناسیو کی طرف دیکھا۔ ''تم بھی اس کے ہمنوا ہو تو تمہیں بھی بھگتنا پڑے گا......خوب سوچ لو۔''

''بکواس بند کرو۔'' ہیری تڑخا۔ ''مصیبت میں ہم نہیں تم پڑو گے۔ جب تم سے جواب طلب کیا جائے گا کہ دو مقامی پولیس والوں کو سنبھالنے میں تم کیوں ناکام ہوئے۔''

ہیری نے دروازہ کھولا اور اسے اندر دھکیلا۔ لیونگ روم میں اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ ہیری نے تلاشی لینا شروع کی اور شولڈر ہولسٹر سے گن برآمد کرلی۔ اس نے فیڈرل ایجنٹ کی جکڑ بندی اس طرح کی تھی کہ وہ پشت پر بندھے ہاتھ کولہوں اور ٹانگوں کے نیچے سے نکال کر سامنے نہ لاسکے۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ کھڑا ہوگیا۔ ''آرام کرو، ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے۔''

ہیری نے ہال وے کی طرف جاتے ہوئے اگناسیو کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ''تم آفس کو کھنگالو، میں پہلے بیڈروم کی طرف جاؤں گا۔'' اس نے ہدایت دی۔ ''ہم کوئی بھی شے اور ہر چیز دیکھیں گے۔ مطلوبہ شے سامنے آئے گی تو خود بولے گی۔ کمپیوٹر کو دیکھنا۔ معمول سے ہٹ کر کچھ نظر آئے تو ذہن میں رکھنا۔''

''ہیری!''

ہیری رک کر پلٹا اور اپنے نئے پارٹنر کو دیکھا۔ اگناسیو کے چہرے پر ہراس نمایاں تھا۔ ہیری اس کے اظہارِ خیال کا منتظر تھا...... حالانکہ وہ میکسویل سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔

''ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔'' اگناسیو نے کہا۔

''پھر کیسا کرنا چاہیے...... پراپر چینل؟ ہمارا باس ان کے باس سے بات کرے اور اجازت ملنے کا انتظار کرے؟''

اگناسیو نے لیونگ روم کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں وقت کی اہمیت کو سمجھتا ہوں۔ یہ ہمارے بیج اتروا دے گا۔ مجھے پروا نہیں لیکن اس طرح ڈیوٹی سے ہٹایا گیا تو بڑی سبکی ہوگی۔''

ہیری آگے بڑھا اور نرمی سے اگناسیو کے شانے پر ہاتھ رکھ کے دھیرے سے کہا۔ ''تم نئے ہو...... بہت سی باتیں آگے چل کر سیکھ جاؤ گے۔ تمہیں یا ہمیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کوئی انگلی نہیں لگا سکتا۔ اوکے؟ میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ کیسے کام کرتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے اہم امر یہ ہے کہ کسی معاملے میں ان کی ساکھ خراب نہ ہو۔ یہ پہلی ترجیح ہے...... ان کا فلسفہ کہہ لو۔ یہ فلسفہ ہر فیلڈ ایجنٹ کی ہڈیوں میں اترا ہوا ہے کہ بیورو کی ساکھ خراب نہیں ہونی چاہیے۔ ہم نے یہاں جو کچھ کیا اور اس کو آزاد کرکے واپس جائیں گے تو وہ کسی کو ہوا نہیں لگنے دے گا کہ وہ اپنی ڈیوٹی انجام دینے سے قاصر رہا۔ اوکے؟''

اگناسیو نے ہچکچاہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔

''بس پھر شروع ہو جاؤ۔ گزشتہ مرتبہ مجھے یہاں زیادہ دیر تک رکنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مجھے بریز کے ساتھ سینٹ اگاتھا کلینک جانا پڑ گیا تھا۔ اب میں دن کی روشنی میں تفصیلی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہر واردات میں کوئی نہ کوئی نشان رہ جاتا ہے۔ عیار سے عیار مجرم غلطی کرتا ہے۔ ہنر یہ ہے کہ اس نشان کو ڈھونڈ لیا جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اب تک کسی نے کوئی اہم کلیو حاصل کیا ہوگا۔ میرے نزدیک وہ لائن ہی غلط ہے جس پر وہ کام کررہے ہیں، یعنی دہشت گردی...... بظاہر تابکاری مواد کے غیاب کے باعث ان کے موقف میں وزن ہے......''

''اوکے، ہیری۔''

ابھی ہیری خواب گاہ میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ اگناسیو کی آواز آئی۔ ہیری پلٹا اور آفس کا رخ کیا۔

''کیا بات ہے؟''

''کمپیوٹر غائب ہے۔'' اگناسیو ڈیسک کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ ہیری کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''وہ لے گئے۔''

''ایف بی آئی؟''

''ظاہر ہے۔'' ہیری نے جواب دیا۔ ''دوسری چیزیں دیکھو۔ ہمیں یہاں سے کچھ لے کر نہیں جانا ہے۔''

ہیری واپس ماسٹر بیڈروم کی جانب چلا گیا۔ پیشاب کی ہلکی سی بُو اب تک موجود تھی۔ کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر وہ ڈریسنگ ٹیبل پر آگیا۔ ٹیبل ٹاپ پر ایک جانب لیمپ اور دوسری جانب فریم شدہ فوٹو رکھا تھا۔ ہیری نے فریم اٹھا کر بغور فوٹو کو دیکھا۔ گلاب کے پودے کے قریب کینٹ اور مسز کینٹ کھڑے تھے۔ آٹھ دس سرخ گلاب کھلے تھے۔ پس منظر میں دور پہاڑی پر بڑے بڑے حروف تھے۔ جو ہالی ووڈ کی نشاندہی کررہے تھے۔ ہیری نے اندازہ لگایا کہ فوٹو بیک یارڈ میں لیا گیا تھا۔ ایلی سیا کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ کمرے میں خوش و خرم جوڑے کی کوئی اور تصویر نظر نہیں آئی۔

ہیری نے فوٹو واپس رکھا اور یکے بعد دیگرے درازیں کھولنی شروع کیں جو ذاتی اشیا سے بھری ہوئی تھیں۔ بیشتر اشیا مقتول اسٹیلے کینٹ کی تھیں۔ نچلی دراز میں ایک کونا خالی تھا۔ ہیری کے اندازے کے مطابق وہ جگہ کینٹ کی گن کے لیے مخصوص تھی۔ اس نے درازیں بند کردیں۔ اور ٹیبل کے دوسری جانب کونے میں چلا گیا۔ وہ نئے زاویے سے کمرے کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ معاً اسے خیال آیا کہ کرائم سین کے فوٹو فائل اور فائل گاڑی میں تھی۔ وہ باہر نکلنے کے لیے لیونگ روم سے گزرا تو میکسویل کرسی سے نیچے فرش پر پڑا تھا۔ وہ یقیناً جدوجہد کرتے ہوئے کرسی سے گرا تھا۔ چہرے پر پسینا اور سرخی تھی۔ اس نے ہاتھوں کو سامنے لانے کے لیے نصف کامیابی حاصل کرلی تھی۔ تاہم اس کوشش میں وہ مزید الجھ گیا تھا۔

''مجھے آزاد کرو۔'' اس نے بھناتے ہوئے انداز میں کہا۔

ہیری نے بمشکل اپنی ہنسی کا گلا گھونٹا۔

''بس چند منٹ اور۔'' وہ باہر نکل گیا۔ گاڑی میں سے سائنٹیفک انویسٹی گیشن ڈویژن کی فائل نکال کر وہ واپس آگیا۔ فائل میں کرائم سین کے فوٹو، رپورٹس اور ای

میل کیا گیا ایلی سیا کینٹ کا فوٹو بھی تھا۔ میکسویل نے پھر اسے مدد کے لیے پکارا۔ لیکن ہیری نے اسے نظر انداز کر دیا۔

بیڈ روم میں آکر اس نے ایلی سیا کا فوٹو نکالا۔ اسے دیکھتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر الماری کے پاس آکر شیشے والا پٹ کھولا۔ دھیرے دھیرے پٹ کھولتے ہوئے وہ فوٹو اور بیڈ کو دیکھ رہا تھا۔ ایک مقام پر زاویہ میچ کر گیا۔ یعنی فوٹو الماری کے پاس کھڑے ہو کر کھینچا گیا تھا۔ ہیری نے الماری کے دونوں پٹ کھول دیے پھر وہ اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے فوٹو لیا گیا تھا۔ اس کی نگاہیں باریک بینی سے کمرے اور بستر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ پُرامید تھا کہ کوئی شے اس کے ساتھ ہم کلام ہو گی۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ بستر کے ساتھ کلاک بند پڑا ہے...... ہیری نے فوٹو پر نگاہ ماری۔ اس میں بھی کلاک بند تھا۔

وہ آگے بڑھا اور جھک کر نیچے دیکھا۔ کلاک کا پلگ نکلا ہوا تھا۔ اس نے پلگ کو جگہ پر لگا دیا۔ ڈیجیٹل اسکرین روشن ہو گئی۔ وہاں سرخ رنگ کے 12:00 کے ہندسے چمک رہے تھے۔ کلاک کام کر رہا تھا۔ وقت ٹھیک کرنا تھا۔

ہیری سوچ میں پڑ گیا۔ سوچ کا محور ایلی سیا تھی۔ بظاہر وہاں آنے والوں نے پلگ نکالا تھا لیکن کیوں؟ شاید اس لیے کہ ایلی سیا کینٹ یہ نہ جان سکے کہ ان دونوں نے وہاں کتنا وقت گزارا تھا۔ کلاک کے سوال کو اس نے ذہن سے ہٹایا اور بستر کے قریب جا کر تصاویر کی فائل کھولی۔ کلوزٹ کی طرف دیکھا۔ کوئی بات تھی جو گرفت میں نہیں آرہی تھی۔ ہیری نے دباؤ محسوس کیا۔ کیا بات ہو سکتی ہے۔ اس نے گھڑی چیک کی۔ فیڈز کے ساتھ میٹنگ میں کئی گھنٹے تھے۔

وہ خواب گاہ سے نکل کر ہال سے ہوتا ہوا کچن میں آیا۔ تمام کمرے دیکھے۔ ایک کمرے سے نکلتے وقت وہ اچانک تھم گیا۔ کمرے میں اس نے ''واک آؤٹ'' کے ربر میٹ دیکھے۔ اس کی نگاہ دیوار کے ایک حصے پر تھی۔ جہاں مستطیل شکل میں رنگ بقیہ دیوار کے مانند معمولی تفریق کا حامل تھا۔ گویا وہاں سے کوئی کیلنڈر یا بڑا پوسٹر اتارا گیا ہو۔ کونوں پر ٹیپ کے نشانات بھی تھے۔ وہ کچھ دیر مستطیل خالی جگہ کو گھورتا رہا...... پھر لیونگ روم میں آگیا۔ واپس کچن میں آیا اور عقب سے گارڈن میں نکل گیا۔ بعد ازاں اس نے گیراج کا جائزہ لیا۔ کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ دوسری معمول کی اشیا کے ساتھ ایک ٹربش کین تھا جس کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے۔ وہ نکلتے نکلتے کین کے پاس رک گیا اور اسے کھولا۔ بالائی حصے میں کاغذی تولیوں کے ٹکڑے تھے۔ قوتِ شامہ سے انگوروں کی مہک ٹکرائی۔ اس نے ایک ٹکڑا چٹکی سے پکڑ کر اٹھایا...... یوں لگا جیسے کسی نے ان کی مدد سے گرا ہوا انگوروں کا رس صاف کیا تھا۔ ان پر سرخ انگوروں کے کاسنی دھبے موجود تھے۔

کین بند کر کے وہ واپس اندر آیا اور اس باتھ روم میں گیا جہاں سے جلی ہوئی سگریٹ کی راکھ راشیل لے گئی تھی۔ کموڈ کے پانی کے ٹینک پر اس نے براؤن نشان دیکھا۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ اس کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے۔ سگریٹ کو فلیش میں ڈال کر پانی کے ذریعے غائب کیا جا سکتا تھا۔ وہاں سے نکل کر اس نے اگنا سیو کو آواز دی اور چلنے کا اشارہ کیا۔

میکسویل فرش پر کلبلا رہا تھا۔

''مردود، مجھے کھولو۔''

''چابی کہاں ہے؟''

''کوٹ میں، بائیں جانب۔''

ہیری نے اس کے ہتھکڑیوں والے ہاتھ ٹانگوں سے نکال کر آگے کیے اور چابی کچھ فاصلے پر پھینک دی۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''مدد کر رہا ہوں۔ باقی کام تمہارا ہے۔ تھوڑی کوشش کرو۔ میکسویل کی بدگوئی کو نظر انداز کر کے اس نے باہر کی طرف پیش قدمی کی۔ اگنا سیو نے بھی تقلید کی۔

☆☆☆

واپسی پر اگنا سیو مہر بہ لب تھا۔ ہیری کے نزدیک اس کی خاموشی کا مطلب واضح تھا۔ آغاز میں ہی اس کا شاندار کیریئر خطرے میں پڑ گیا تھا جس کا سبب اس کا تجربہ کار اور نڈر پارٹنر ہیری تھا۔ ہیری نے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

''میرے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔'' اس نے کہا۔ ''آفس میں کیا ملا؟''

''کچھ خاص نہیں...... کمپیوٹر وہ لے جا چکے تھے۔''

''ڈیسک؟''

''تقریباً خالی تھی۔ ایک دراز میں ٹیکس ریٹرنز اور اسی قسم کی دستاویزات تھیں۔ دوسری میں ٹرسٹ کی نقل تھی۔ لاگونا میں ان کی رئیل اسٹیٹ میں سرمایہ کاری ہے...... انشورنس پالیسیز، ہر شے ٹرسٹ کی شکل میں ہے۔ ہاں ان کے پاسپورٹ بھی تھے۔

''سمجھا...... مقتول نے گزشتہ برس کیا کمایا تھا؟''

''کوارٹر ملین۔ کمپنی میں بھی اس کا پچاس فیصد حصہ ہے۔''

''بیگم کیا کرتی ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

ہیری کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کا ذہن تانا بانا بُننے میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے راشیل کا نمبر ملایا تاہم کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کہاں ہو گی۔ لیکن وہ لوکیشن سے ناواقف تھا۔ اس نے اپنے ذہن کے مطابق مرکزی فیڈرل بلڈنگ کا رخ کیا۔ اسی وقت فون گنگنایا۔ ہیری خاموشی سے سنتا رہا اور فون بند کر کے گاڑی روک دی۔ پورشے اور کرائسلر دریافت کر لی گئی تھیں۔ ہیری نے اگنا سیو کو ضروری ہدایات دے کر گاڑی سے اتار دیا۔ بلڈنگ میں داخلے کے وقت یو ایس مارشل نے اس کی آئی ڈی چیک کی۔ ایلی ویٹر کے ذریعے وہ پندرھویں منزل پر اترا۔ یوں لگا کہ بریز اسی کا منتظر تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں پیغام نہیں ملا۔'' وہ بولا۔

''کیسا پیغام؟''

''کانفرنس کینسل ہو گئی ہے۔''

''مجھے پیغام اسی وقت مل گیا تھا جب تم نے بتایا تھا کہ میٹنگ ایک گھنٹے لیٹ ہے۔ درحقیقت ایسی کوئی میٹنگ سرے سے تھی ہی نہیں۔ کیوں، غلط کہہ رہا ہوں؟''

بریز نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں راشیل کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''میں اس کا پارٹنر ہوں۔ کیا بات ہے، تم مجھے بتا سکتے ہو۔''

''صرف راشیل۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' ہیری نے کہا۔

بریز چند لمحے ہیری کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' بالآخر اس نے کہا۔

ہیری اس کی رہنمائی میں قدم بڑھانے لگا۔ بریز وقتاً فوقتاً سوالات کر رہا تھا۔ ''تمہارا پارٹنر کہاں ہے؟''

''وہ کرائم سین پر ہے۔'' ہیری نے کہا۔ یہ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ البتہ کرائم سین کون سا تھا۔ ہیری نے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ''اس کے لیے بہتر بھی تھا کہ وہ میرے ساتھ نہ آئے۔ ابھی بچہ ہے۔ تم لوگ اسے میرے خلاف استعمال کر سکتے تھے۔''

بریز معارک کر تیزی سے پلٹا۔ دونوں کے چہروں کے درمیان چند انچ کا فاصلہ تھا۔

''ہیری تم جانتے ہو۔ تم کیا کر رہے ہو۔ تم ایک ایسی تفتیش میں رخنہ ڈال رہے ہو جس کے خطرناک نتائج سر پر منڈلا رہے ہیں۔ بتاؤ وہ عینی شاہد کہاں ہے؟''

''ایلی سیا کینٹ کہاں ہے؟'' ہیری نے اطمینان سے سوال پر سوال داغا۔

بریز اسے گھورتا رہا۔ ''یہاں رکو، میں راشیل کو لاتا ہوں۔'' اس نے ایک دروازہ کھولا جس پر 1411 نمبر لکھا تھا...... خود ایک قدم پیچھے ہٹا تاکہ ہیری اندر جا سکے۔ اندر داخل ہوتے ہی ہیری نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے سے انٹرویو روم میں ہے۔ ویسا ہی کمرا جس میں اس نے جیسی سے سوال جواب کیے تھے۔ اس کے پلٹنے سے قبل ہی کسی نے عقب سے دھکا دیا۔ تاہم ہیری نے بریز کو دروازہ بند کرتے دیکھ لیا۔ آواز دینا فضول تھا۔ ہیری نے ڈورناب پر ہاتھ ڈالا لیکن تاخیر ہو چکی تھی۔ اس نے دو مرتبہ دروازہ بجایا پھر رک گیا۔ بریز نے دروازہ کھولنے کے لیے لاک نہیں کیا تھا۔ اس نے مڑ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں صرف تین چیزیں تھیں۔ ایک چھوٹی چوکور میز اور دو عدد کرسیاں۔ یقیناً کیمرا موجود ہو گا۔ اس نے چھت کی طرف دیکھا اور ایک غیر مہذب اشارہ کیا۔

بعد ازاں ہیری نے ایک کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ اس نے سیل فون نکالا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔ اگر وہ فون استعمال کرتا تو بیورو کی بات خراب ہوتی۔ اس کی توقع کے مطابق سگنل نہیں مل رہے تھے۔ انہوں نے ہر بات کا خیال رکھا تھا۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر انتظار کرنے لگا۔ اس کے بغیر وہ جیسی تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ نہ اگنا سیو کو پھانسا دے سکتے تھے۔ ہیری نے اپنے پارٹنر کو جیسی سے متعلق سخت ہدایات جاری کی تھیں اور اسے ساتھ لانے کی حماقت سے دامن بچا لیا تھا۔

بیس منٹ بعد دروازہ کھلا اور راشیل نے اندر قدم رکھا۔ دروازہ بند کر کے اس نے ہیری کے بالمقابل کرسی سنبھال لی۔

''سوری ہیری، مجھے دیر ہو گئی۔'' اس نے معذرت کی۔

''اب تم لوگوں نے پولیس کو اس کی مرضی کے خلاف قید کرنا شروع کر دیا ہے؟''

راشیل کے چہرے پر حیرانی نظر آئی۔

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"کیا کہہ رہے ہو؟" ہیری نے اسی انداز میں نقل اتاری۔ "تمہارے پارٹنر نے مجھے یہاں بند کر دیا۔"

"میں یہاں آئی تو وہ لاک نہیں تھا۔ چیک کر لو۔"

ہیری نے منہ بنا کر ہاتھ لہرایا۔ "ختم کرو۔ کھیلنے کے لیے فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس۔ تفتیش کا کیا بنا؟"

راشیل نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دے۔

"گاڑیاں مل گئی ہیں۔"

"معلوم ہے۔ گاڑیوں سے کیا ملا؟"

"کچھ نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔ یہ کام تم لوگوں کا ہے۔ میرا مطلب کیپٹن بیڈلی سے ہے۔ گاڑیاں جس گھر کے سامنے کھڑی تھیں وہ ایک سابق وزیٹنگ پروفیسر آف انٹرنیشنل پالیٹکس آف USC کا گھر تھا۔ تم لوگ دھوکا کھا گئے۔"

"ہم لوگ نہیں...... یہ کارنامہ کیپٹن بیڈلی کا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"تمہیں نہیں پتا؟" ہیری نے کہا۔

لاس اینجلس او ایچ ایس (آفس آف ہوم لینڈ سیکیورٹی) کا ہیڈ کیپٹن بیڈلی پہلے وہاں پہنچا تھا۔

"میں اگناسیو سے بات کر کے بتاتا ہوں۔ مجھے یہاں سے نکالو کہ میں فون استعمال کر سکوں۔" ہیری نے تعاون کا عندیہ دیا۔

"آؤ۔" راشیل کھڑی ہو گئی۔ باہر آ کر ہیری نے اگناسیو کو کال کی۔ کافی دیر تک بات ہوتی رہی۔ درمیان میں ہیری سوال بھی کرتا رہا...... بالآخر ٹھنڈی سانس بھر کے اس نے فون بند کر دیا۔

"پروفیسر کا نام کرامن تھا؟" اس نے راشیل سے سوال کیا۔

"ہاں۔"

"وہ دہشت گرد تھا؟"

"نہیں، لیکن اس پر نگاہ رکھی گئی تھی۔"

"کیوں؟"

"وہ یو ایس سی، سی این این، کیبل نیوز...... پرنٹ میڈیا پر اینٹی امریکن نظریات کا پرچار کرتا تھا۔ تاہم اس پر کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا اور ٹیکنیکل بنیاد پر اسے یو ایس سی سے نکال دیا گیا۔ شک تھا کہ اس کے رابطے دہشت گرد تنظیموں کے ساتھ ہیں۔ بعد ازاں وہ منظرِ عام سے غائب ہو گیا اور ذہنی خلل کا شکار سمجھ کر آہستہ آہستہ اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ میری نظر میں یہ ایک جھانسا تھا اور بیڈلی جوش و جذبات کے ہاتھوں بہ آسانی شکار ہو گیا۔ پروفیسر کرامن خوامخواہ مارا گیا۔"

"تم لوگوں کو خبر ہو گئی تھی...... بیورو بیڈلی کو روک سکتا تھا۔"

"اگناسیو نے ایل اے پی ڈی کی ہائر اتھارٹیز کو خبر کر دی تھی۔ اس احمق نے فون بند کر دیے۔ حتیٰ کہ اگناسیو کا فون بھی رکھوا لیا۔ تصور میں وہ ایک عظیم کارنامہ انجام دینے جا رہا تھا۔ پولیس حتی الامکان تیزی سے وہاں پہنچی...... فوراً ہی ہم بھی پہنچ گئے لیکن بیڈلی کی ٹیم ہلا بول چکی تھی۔"

"کوئی شک نہیں کہ یہ ایک دھوکا تھا۔ اگناسیو نے بیڈلی سے پوچھا تھا کہ اطلاع کس نے دی۔ لیکن وہ گمنام ٹیپ کہہ کر ٹال گیا۔ ٹپ دینے والوں نے ہوشیاری دکھائی اور گاڑیاں کرامن کے گھر کے سامنے کھڑی کر کے بیڈلی کو گمنام کال کی...... وہ بھی فوراً ہی چڑھ دوڑا۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ امکانات کیا ہیں۔"

"اور کرامن کو سزا بھی مل گئی۔" راشیل نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ظاہر ہے وہ امریکا کے خلاف جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔ بے شمار شہری اس سے نفرت کرتے ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن ہماری تفتیش ہوا میں ہی ہے۔"

"اس کی وجہ تم ہو سکتے ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔" راشیل نے کہا۔ "تم نے واحد چشم دید گواہ کو چھپایا ہوا ہے۔" راشیل برہم ہو گئی۔

"ایلی سیا کینٹ بھی گواہ ہے جسے تم نے چھپایا ہوا ہے۔"

"وہ صرف گواہ ہے۔ واردات کی گواہ نہیں...... دوسری حرکت تم نے فیڈرل ایجنٹ کے ساتھ کی۔"

ہیری کو تعجب ہوا کہ میکسویل نے اپنی درگت بیان کر دی تھی۔ "کیا کہا اس نے؟"

"اس نے کیا کہا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہمیں ایک خطرناک صورتِ حال کا سامنا ہے اور تم جو چالیں چل رہے ہو، وہ میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔"

"اور میں یہ نہیں سمجھ پا رہا کہ تم لوگ قاتل کے پیچھے کیوں نہیں جا رہے...... سیسیم خود ہاتھ آ جائے گی۔" ہیری نے کہا۔ "میری نظر میں یہ ہومی سائڈ کیس ہے۔ اگر نہیں بھی ہے تو بیورو نے ہمیں کیوں دھوکا دیا کہ ہم سب مل کر کام کر رہے ہیں۔" ہیری کے لہجے میں تضحیک در آئی۔

راشیل اسے گھورتی رہی پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "اوکے، ختم کرو بحث۔ مجھے بتاؤ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟"

"بات کرنا چاہتی ہو۔ آؤ پھر کھلی ہوا میں چلتے ہیں۔"

راشیل نے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ دونوں چل پڑے۔ بریز سے بھی مڈبھیڑ ہوئی تاہم وہ خاموش رہا۔ وہ ایلی ویٹر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ عقب سے آواز آئی۔ "رُکنا ذرا۔"

ہیری آواز پہچان کر پھرتی سے پلٹا...... لیکن ایجنٹ میکسویل کا شانہ اس کے سینے سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ دیوار سے جا لگا۔

"اب میری باری ہے کوپ۔" میکسویل نے کہا۔

"رُک جاؤ۔" راشیل چلائی۔ "میں کہتی ہوں، دور ہٹو۔"

ہیری نے ہیڈلاک لگانے کے لیے بازو کو حرکت دی۔ تاہم راشیل درمیان میں آ گئی۔

"میک، واپس جاؤ۔"

میکسویل، ہیری کی شان میں نازیبا کلمات ادا کرتا ہوا پسپا ہو گیا۔ چند اور ایجنٹ وہاں آ گئے تھے۔ جنہیں راشیل نے واپس بھیج دیا۔ بعد ازاں وہ ہیری کے ساتھ ایلی ویٹر میں داخل ہو گئی۔

"تم ٹھیک ہو؟" راشیل نے سوال کیا۔

"ہاں۔"

"جنگلی...... دردِ سر بنتا جا رہا ہے۔" راشیل نے میکسویل کے بارے میں تبصرہ کیا۔ نیچے آ کر وہ لاس اینجلس اسٹریٹ پر آ گئے۔ راشیل نے گھڑی میں وقت دیکھا اور ایک جدید طرز کی آفس بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں ریگن بلڈنگ میں شاندار کافی ہاؤس ہے لیکن خیال رکھنا میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"ایک اور وفاقی عمارت۔" ہیری نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "مجھے حیرت ہے کہ میکسویل نے اعتراف کیوں کیا کہ ہم لوگ دوبارہ کینٹ ہاؤس میں داخل ہوئے تھے؟"

"چھوڑو اِس موضوع کو...... بس اس کے لیے یہ اہم تھا کہ سب کو خبر ہو جائے کہ تم نے کیا حرکت کی ہے۔ اس کے علاوہ اسے کسی چیز کی پروا نہیں۔" راشیل نے جواب دیا۔

ہیری نے نئے زاویے سے سوال کیا۔

"مجھے ایک استفسار کرنا ہے۔ کیا اسے یا کسی اور کو ہمارے سابقہ تعلقات کے بارے میں علم ہے؟"

"ایکو پارک کیس کے بعد یقین سے کہنا مشکل ہے اور آج یہ اہم بھی نہیں ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ تمہیں سیسیم کی کوئی پروا نہیں ہے...... تم اسے محض ایک مرڈر سمجھ رہے ہو...... تم مجھے بتاؤ کہ گواہ کہاں ہے؟"

"وہ محفوظ ہے۔ ایلی سیا کینٹ کہاں ہے؟ اور اس کے شوہر کا پارٹنر......؟"

راشیل نے جزبز ہو کر کہا۔ "وہ دونوں محفوظ ہیں۔ پارٹنر سے تفتیش ہو رہی ہے۔ نیز ایلی سیا کینٹ سے ہم کوئی کام کی بات حاصل نہیں کر سکے۔ وہ کسی قسم کی مدد فراہم نہیں کر سکی۔"

"میرے خیال میں تم غلطی پر ہو۔ وہ پہلے ہی مددگار ثابت ہو چکی ہے۔" ہیری نے کہا۔

راشیل کی آنکھوں میں ابھرنے والا تحیر کا عنصر بہت واضح تھا۔

"کیسے؟ وہ تو ان دونوں کے چہرے تک نہیں دیکھ سکی۔ اس نے صرف ایک نام بتایا ہے جو اس نے ان دونوں کی گفتگو کے دوران سنا...... ہمارے پاس خاص ماہرین ہیں، جو کچھ نہ کچھ معلوم کر ہی لیتے ہیں جو تم لوگوں کے بس کی بات نہیں۔"

"اوہ...... ماسٹر انٹروگیٹر۔ کیا نام ہے تمہارے ماسٹر انٹروگیٹر کا؟"

راشیل نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم تجارت یا تبادلہ نہیں کر رہے ہیں۔ ہیری یہ کیس قومی سلامتی سے تعلق رکھتا ہے۔"

"ایلی سیا نے جو نام بتایا ہے، اس کے عوض میں گواہ تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"نام سے تم کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔"

"پھر بھی میں جاننا چاہتا ہوں۔"

راشیل نے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔ کچھ دیر سوچا اور بولی۔ "پہلے تم بتاؤ۔"

ہیری نے ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اگر یہ چھ ماہ پہلے کی بات ہوتی تو وہ بے دھڑک اسے بتا دیتا۔ لیکن اب دونوں کے تعلقات پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔

"میں نے اسے اپنی رہائش گاہ پر رکھا ہے۔ یقیناً تمہیں جگہ کا علم ہو گا۔"

راشیل نے فون نکال کر کھولا۔

"راشیل ایک سیکنڈ۔ تم نے بتایا نہیں کہ ایلی سیا سے تم نے کیا معلوم کیا؟"

"ہیری معاف کرنا......" اس نے نمبر پنچ کرنے شروع کیے۔

"وہ میرے گھر پر نہیں ہے۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔"

راشیل نے فون بند کیا۔ "کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ......" اس نے غصے کے عالم میں سوال کیا۔ "وقت تیزی کے ساتھ ہاتھ سے نکل رہا ہے اور تم......"

ہیری قریب ہو گیا۔ "نام بتاؤ اور گواہ لے جاؤ...... مجھے امید نہیں تھی کہ تم مجھ سے جھوٹ بولوگی۔"

"ٹھیک ہے...... اس نے جو نام سنا تھا وہ ڈوبی تھا۔ اس وقت اس نے ڈوبی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ کافی تاخیر سے اسے احساس ہوا کہ اس نے یہ نام کہیں سنا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ڈوبی کون ہے؟"

"دہشت گرد۔ نہایت مکار۔ ابھی تک اس کی قومیت کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔ وہ ڈوبی کے جعلی نام سے معروف ہے۔"

ہیری نے فون نکال کر اگنا سیو کا نمبر ملایا جو ابھی تک سلور لیک پر موجود تھا۔ جہاں کیپٹن بیڈلی کارنامہ اپنے نام کرنے کے چکر میں بڑی غلطی کر بیٹھا تھا۔

"اب تم گواہ کا پتا بتاؤ۔" راشیل نے مطالبہ کیا۔

"ذرا ٹھہرو...... تم پہلے ہی ایک بار جھوٹ بول چکی ہو......" اچانک ہیری کو خیال آیا کہ وہ سلور لیک سے مطلوبہ معلومات حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس نے کزرائیڈر کا (KIZ) نمبر لایا۔

"ہیری تم۔" کزرائیڈر کی آواز آئی۔

"ہاں، ایک مسئلہ ہے۔"

"کہاں اُلجھے ہوئے ہو؟"

"یہ بتاؤ کہ تمہارے کمپیوٹر پر نیویارک ٹائمز کا ریکارڈ ہوگا؟"

اُدھر راشیل غصے سے تلملا رہی تھی۔

"تو پھر میری مدد کرو۔"

"ہاں کیوں نہیں، بتاؤ؟"

"میرے پاس ایک فرضی نام ہے "ڈوبی" اخبار کی اسٹوریز میں یہ نام دہشت گرد کے طور پر تلاش کرو۔"

"تھوڑا انتظار کرو۔"

ہیری نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر راشیل کو مخاطب کیا۔

"یقین نہیں آتا کہ بیورو دہشت گرد کی قومیت سے ناواقف ہے۔"

راشیل نے شانے اچکائے۔

"کئی نام ہیں۔" کزرائیڈر کی آواز آئی۔ "ایک نام ڈوبی رے ہے، جو دہشت گردی کی وارداتوں میں ملوث رہا ہے۔"

"تازہ ترین اسٹوری کیا کہتی ہے؟" ہیری نے سوال کیا۔

"بس کے دھماکے میں سولہ افراد کی ہلاکت۔ مقام ہے بیروت۔"

"شکریہ، پھر کال کروں گا۔"

"ایک منٹ۔"

"کیا؟"

"ہیری یہ گروپ بالکل مختلف ہے۔ درندے ہیں یہ لوگ۔ احتیاط کرنا۔"

"سمجھ گیا۔ شکریہ۔"

"نیویارک ٹائمز کے مطابق ڈوبی نام کا آدمی امریکا میں نہیں ہے...... اور نہ تھا۔"

"یہی سوال ہے کہ ایلی سیا کے منہ سے یہ لفظ کیسے برآمد ہوا۔ اس نے کہاں سنا، یا پڑھا؟ اگر اس کے گھر میں گھسنے والوں کے منہ سے سنا تو پھر ان دونوں کا کیا تعلق ہے ڈوبی کے ساتھ؟"

"تم لوگ یہ کیوں فرض کر رہے ہو کہ وہ یہاں موجود ہے؟" ہیری نے کہا۔ "اور تعجب ہے کہ تمہیں نہیں معلوم کہ اس کا تعلق کس تنظیم سے ہے...... تم لوگ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ اگر انکار کرو گی تو پھر مجھے پاگل خانے میں داخل کرا دو۔"

"ہیری میں بہت زیادہ خود مختار نہیں ہوں۔ بیورو کا ایک معمولی پرزہ ہوں۔ حتیٰ کہ بریز بھی مجھ سے سینئر ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ایک اخبار ڈوبی کے بارے میں اسٹوریز لگا تا رہا ہے تو ہم کیا کچھ نہیں جانتے ہوں گے۔ فی الحال میری مجبوری سمجھو۔ وقت کے ساتھ سب کچھ سامنے آجائے گا۔"

"اچھا اتنا ہی بتا دو، کیا وہ امریکا میں ہے؟" ہیری نے سوال کیا۔

راشیل نے ایک گہری سانس لی۔ "ہمارے پاس اس کی وڈیو ہے جب وہ لاس اینجلس ائرپورٹ سے نکل رہا تھا۔ ہمیں اسے دبوچنے میں ذرا تاخیر ہو گئی تھی۔"

"جلے ہوئے تمباکو سے کیا حاصل ہوا؟"

"ترکی سگریٹ کا ہے۔ جہاں اس نے دھما کا کیا تھا۔ تاہم لیب میں تمباکو پر اب بھی کام ہو رہا ہے۔"

ہیری نے سوالات کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے سر ہلایا۔ معاً اسے اپنی حماقت کا احساس ہونے لگا۔ کیوں اس نے اب تک جیسی کو اپنی تحویل میں رکھا۔ کیا اس کے اندازے غلط تھے۔ کیا واقعی یہ دہشت گردی کا معاملہ ہے؟

"گواہ، ولکاکس کے مارک ٹوئین ہوٹل میں ہے۔" وہ بولا۔ "کمرا نمبر تین سو تین، فرضی نام چارلس ڈکنز ہے۔"

"کیوٹ۔" راشیل نے پھرتی سے ایک بار پھر سیل فون نکالا۔

"راشیل ایک اور بات۔"

"کیا؟"

"شوٹر نے گولی چلاتے وقت ایک نعرہ لگایا تھا۔ وہ ایک نام تھا۔"

"کیسا نام؟"

"اس نے کئی نام لیے تھے۔ وہ بار بار نام بدل رہا تھا۔ وہ خوف اور دھماکے کے باعث نام غالباً ٹھیک نہیں سن سکا۔ ان ناموں سے میں کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا۔" ہیری نے اسے نام بتائے۔

راشیل نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور نمبر ملایا۔ جواب آنے سے قبل اس نے ہیری سے کہا۔ "امید کرو کہ ہم بروقت ان کو پکڑ لیں۔"

رابطہ ہونے پر اس نے مختصر بات کی۔ "ولکاکس میں مارک ٹوئین ہوٹل کمرا نمبر تین سو تین۔ اٹھالو اُسے۔ گو...... گو...... گو......"

اس نے پھر ہیری کو دیکھا۔ ہیری کے غلط اندازوں پر راشیل کی آنکھوں میں مایوسی تھی۔

"مجھے جانا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "ٹیم ملنے تک مجھے ائرپورٹس، مالز، سب ویز سے دور رہنا ہوگا۔" اس نے رخ پھیر لیا۔

ہیری اپنی جگہ کھڑا اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئی تھی، جب ہیری کا سیل فون گنگنایا۔

"ہیری کہاں ہو؟ جوزف لیبلن بول رہا ہوں۔"

"جو، کیا مسئلہ ہے؟"

"ہم ایک لٹیرے کے پیچھے کوئن آف اینجلز تک آئے تو وہاں کافی کے لیے رک گئے۔ اس وقت پیرامیڈیکس کی چند باتیں ہمارے کانوں تک پہنچیں...... وہ ایک مریض کے بارے میں بات کر رہے تھے، جسے ایمرجنسی روم میں لایا گیا تھا۔ کوئی تابکاری کا کیس تھا۔ مجھے تمہارے کیس کا خیال آیا...... جہاں مقتول کی انگلی میں ریڈی ایشن الرٹ رنگ موجود تھا۔ ایمرجنسی میں یہاں ARS کا کیس ہے۔" جوزف نے بات ختم کی۔

ہیری نے ہموار آواز میں سوال کیا۔ اس کی نگاہ دور ہوتی ہوئی راشیل پر جمی تھی۔

"ARS کیا ہے؟"

"اکیوٹ ریڈی ایشن سنڈروم۔ اس کی بری حالت ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے......"

"شکریہ جوزف، میں آتا ہوں۔" ہیری نے فون آف کر دیا۔ اس نے قدم بڑھاتے ہوئے راشیل کو آواز دی۔ وہ رکی اور پلٹی۔ ہیری نے اسے تازہ اطلاع فراہم کی اور غور سے اس کے ہیجان زدہ چہرے کو دیکھنے لگا۔

"مریض کہاں سے ملا تھا؟"

"میں نے سوالات نہیں کیے۔"

"دوڑو۔" راشیل نے بھاگتے بھاگتے سیل فون نکالا۔

☆☆☆

ہالی ووڈ فری وے پر ٹریفک رینگ رہا تھا۔ ہیری بوش شمالی رخ پر اُڑا جا رہا تھا...... چھت پر فلیش لائٹ، سائرن اور پولیس کار۔ تینوں عناصر رنگ دکھا رہے تھے۔ ٹریفک ازخود جگہ دے رہا تھا۔ اسٹیئرنگ پر ہیری کی انگلیوں کے جوڑ سفید پڑ گئے۔ نگاہ ساکت تھی۔ رفتار کی سوئی نوے کو کراس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" راشیل نے چیخ کر کہا۔

"بتایا نہ ٹیم کے پیچھے...... کوئین آف اینجل...... ایمرجنسی روم...... تابکاری سے مرتا ہوا مریض......"

"لعنت ہے...... پوری بات کیوں نہیں بتائی تھی۔"

"چار منٹ...... چار منٹ میں ہم وہاں ہوں گے۔" اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ بریز کی ٹیم سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

راشیل نے سائرن کا سوئچ آف کیا۔

"کیا کر رہی ہو؟"

"مجھے بات کرنی ہے۔" جواب آیا۔

ہیری نے رفتار گرا کر ستر کر دی۔

راشیل نے فون ملایا۔ وہ میکسویل نہیں بریز سے بات کر رہی تھی۔ ”مارک ٹوئن کو بھول جاؤ۔ کوئین آف اینجلز پہنچو۔ ٹیم ساتھ رکھو۔ جلدی...... میں وہیں ملوں گی۔ ہم سیسیم کے قریب ہیں۔ فون بند ہوتے ہی ہیری نے سائرن کے سوئچ پر ہاتھ مارا اور ایکسلریٹر کو دباتا چلا گیا۔

”میں نے چار منٹ کا کہا تھا اور تم ان سے کہہ رہی ہو کہ تین منٹ میں وہاں پہنچو گی۔“ ہیری نے خوش دلی سے اعتراض کیا۔

”میں بوش کے ساتھ ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ ”مجھے متاثر کرنے کا اچھا موقع ہے تمہارے پاس۔“

کسی نے سازِ دل چھیڑا...... شعلہ سا لپکا...... دل دھڑکا۔ بہت عرصے بعد اس طرح مسکرائی تھی۔ مدت بعد اسے بوش کہہ کر پکارا تھا۔

”تم وہی راشیل بول رہی ہو؟“

”ہاں!“

”فون ملاؤ اور دو منٹ کا بول دو۔“ ہیری نے کہا۔

”یہ گاڑی ہے...... ہیلی کاپٹر نہیں۔“ وہ چلائی۔

”میں ڈرائیو کر رہا ہوں، گھڑی دیکھو۔“

”نوے سے اوپر مت جاؤ۔“ اس نے چلا کر کہا۔

”تم گھڑی دیکھو۔“ کراؤن وکٹوریا، سامنے سے کھسکنے والی گاڑی کو چھوتی ہوئی نکلی۔

دو منٹ بعد وہ سائرن بند کر رہا تھا۔

☆☆☆

پُرہجوم ایمرجنسی روم میں جوزف بھی موجود تھا۔ اس کی رہنمائی میں وہ علاج گاہ کی طرف گئے۔ باہر ایک پرائیویٹ گارڈ ایستادہ تھا۔ ہیری نے آگے ہو کر بیچ کی قناکش کی۔ گارڈ نے پردہ ایک طرف کر دیا۔ اندرونی حصے کو چھ کیوبس میں منقسم کیا گیا تھا۔ وہاں ایک ہی مریض تھا۔ پستہ قد، سیاہ بال اور جلد کا رنگ سیاہی مائل تھا۔ مکڑی کے جالے کے مانند ٹیوبس اور وائرز اس کے اوپر اور اطراف میں جسم کے ساتھ منسلک تھے۔ ایک خاص قسم کی مشین بھی موجود تھی۔ بستر شفاف پلاسٹک ٹینٹ کے اندر تھا۔ مرد کے پپوٹے تقریباً بند اور ساکت تھے۔ تمام بدن عریاں تھا۔ بس زیرِ ناف ایک مختصر تولیا پڑا تھا۔ پیٹ پر دائیں جانب اور دائیں کولہے پر آتشیں آبلے نمایاں تھے۔ دائیں ہاتھ پر بھی جلنے کے نشانات تھے۔ اذیت ناک سرخ دائروں کے گرد کاسنی حلقے تھے۔ کہیں کہیں جلد پر مواد پھوٹ پڑا تھا۔

نامعلوم جیلی نما کریم متاثرہ مقامات پر لگائی گئی تھی۔ تاہم یہ رسمی کارروائی کے مشابہ تھی۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے؟“ ہیری نے استفسار کیا۔

”ہیری قریب مت جانا۔“ راشیل نے تشویش ظاہر کی۔ ”وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ باہر نکلو، ڈاکٹر سے بات کرتے ہیں۔“

”کیا یہ سیسیم کی تباہ کاری ہے؟ کیا یہ اتنی تیزی سے کام کرتا ہے؟“

”ہاں، اگر خاص مقدار میں، براہِ راست اثر پذیر ہو۔“ راشیل نے جواب دیا۔ ”یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس آدمی نے سیسیم کی کچھ مقدار دائیں جیب میں رکھی ہوئی تھی......“

اس نے واپسی کے لیے قدم اٹھایا۔ ہیری نے بھی تقلید کی۔

”کیا یہ ڈوبلی ہو سکتا ہے؟“ ہیری نے سوال کیا۔

”نہیں، یہ ڈوبلی نہیں ہے۔“ پردہ ہٹا کر اس نے گارڈ کے لیے حکم جاری کیا کہ ایمرجنسی میں تعینات ڈاکٹر کو بلائے۔ بعدازاں اس نے سیل فون کا فلیپ ہٹایا اور ایک بٹن دبایا۔

ردِعمل فوراً آیا۔

”یہ سیسیم کا مریض ہے۔ ڈائریکٹ ایکسپوزڈ۔ ہمیں کمانڈ پوسٹ کی ضرورت پڑے گی...... حفاظتی پروٹوکول بھی ضروری ہے۔“

دوسری جانب سے کچھ کہا گیا۔ راشیل نے جواب دینے کے بعد کہا۔ ”ابھی تک شناخت میرے پاس نہیں آئی ہے۔ شناخت ملتے ہی میں بلا تامل فون کروں گی۔“ اس نے فون بند کر کے ہیری کی طرف دیکھا۔

”تابکاری سے متعلق ٹیم دس منٹ میں یہاں پہنچ جائے گی۔ کمانڈ پوسٹ کو ہدایات میں دوں گی۔“

”ہونہہ، ایک بات بتاؤ۔“

”کہو۔“

”کیا تم نے سوچا کہ ہر چیز ایک ہی مکان سے کیوں برآمد ہو رہی ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”گن، کیمرا، کمپیوٹر...... وغیرہ۔ ایلی سیا کینٹ کو بدنام کرنے کے لیے بندھن بھی کینٹ ہاؤس کے ہی تھے۔ وہاں گھسنے والوں کے پاس اسکائی ماسک اور چاقو کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گاڑی بھی انہی کی استعمال کی گئی۔ تمہارا دھیان

اس جانب نہیں گیا؟“

قبل اس کے کہ وہ جواب دیتی، ایک عورت اسپتال کے نیلے رنگ کے لباس میں ان کے قریب آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کلپ بورڈ تھا۔

”میرا نام ڈاکٹر گارنر ہے۔ آپ لوگوں کو مریض سے دور رہنا چاہیے۔ جب تک ہم مرض کی نوعیت نہیں سمجھ لیتے۔“

دونوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے سوال کیا۔ ”آپ کیا بتا سکتی ہیں؟“

”اس وقت تک کچھ زیادہ نہیں۔ بیماری کی ابتدائی علامت عروج پر ہے۔ وہ کسی چیز کی زد میں آیا ہے۔ بیکٹیریا، وائرس یا...... پھر کسی قسم کی تابکاری۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم ابھی تک بے خبر ہیں کہ وہ کس چیز کی زد میں آیا تھا اور یہ جانے بغیر ہم کوئی مخصوص علاج اختیار کرنے سے قاصر ہیں۔“

”علامات کیا دریافت ہوئی ہیں؟“ راشیل نے سوال کیا۔

”جلنے کے نشانات آپ نے دیکھے ہوں گے۔ وہ ہمارا سب سے چھوٹا مسئلہ ہے لیکن اندرونی تباہی......“ ڈاکٹر نے وقفہ لیا۔ ”اس کا دفاعی نظام قریب الختم ہے۔ نظامِ ہضم اور اس کے متعلقات نابود ہو گئے ہیں۔ ہم نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی ہے لیکن میں پُرامید نہیں ہوں۔ ذہن اور اعصاب پر شدید دباؤ ہے جو اسے حرکتِ قلب کی بندش کی طرف لے جائے گا۔“

”بیماری کی زد میں آنے کے کتنی دیر بعد یہ سنڈروم ظاہر ہوتا ہے؟“ ہیری نے تابکاری کا لفظ استعمال کیے بغیر راشیل سے استفسار کیا۔

”ایک گھنٹے کے اندر اندر۔“

”کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ شخص کون ہے اور کہاں سے ملا؟“ ہیری نے ڈاکٹر سے سوال کیا۔ اتنا وہ سمجھ گیا تھا مریض اور موت کے درمیان قلیل وقفہ رہ گیا ہے۔

”آپ کو پیرامیڈیکل سے بات کرنی پڑے گی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ سڑک پر چلتے چلتے گرا تھا۔“ ہاتھ میں پکڑے کلپ بورڈ پر نظر ڈالنے کے بعد وہ گویا ہوئی۔ ”نام ڈبرٹو گونزالز ہے۔ عمر چالیس برس۔ پتا نامعلوم۔“

راشیل نے کچھ فاصلے پر جا کر سیل فون نکالا۔ ہیری جانتا تھا کہ وہ قریب المرگ مریض کا نام بتانے جا رہی ہے۔

نام دہشت گردوں کے ڈیٹا بیس کے حوالے کیا جائے گا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ طویل فہرست میں گونزالز کا نام دہشت گرد کے طور پر شامل ہے یا نہیں۔

”اس کے کپڑے، والٹ وغیرہ کہاں ہیں؟“ ہیری نے ڈاکٹر سے سوال کیا۔

”بوجہ انہیں ایمرجنسی روم سے ہٹا لیا گیا تھا۔“

”کسی نے انہیں جانچا؟“

”نہیں جناب۔ یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔“

”وہ اشیا کہاں ہیں؟“

آپ نرسنگ اسٹاف سے معلوم کر سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے ایک طرف اشارہ کیا اور ہیری بلا تامل نرسنگ اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں موجود نرس کے مطابق مریض سے متعلق تمام اشیا میڈیکل ویسٹ کنٹینر میں منتقل کر دی گئی تھیں۔ کنٹینر اس سے متعلقہ کمرے میں ہے۔“

”وہ کمرا کہاں ہے؟“ ہیری نے سوال کیا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ یہ عمل اسپتال کے طریقہ کار کے مطابق ہے...... یا پھر خوف کے باعث ایسا کیا گیا تھا۔

نرس نے جواب دینے کے بجائے اسے ایک سیکیورٹی گارڈ کے حوالے کر دیا۔

عقب سے راشیل کی آواز آئی۔ ”یہ لیتے جاؤ۔“ اس نے اپنی بیلٹ سے منسلک ریڈی ایشن الرٹ مانیٹر اسے پکڑایا۔ ”رسک مت لینا...... اگر یہ بول اٹھے تو فوراً واپس نکلنا۔ میں سنجیدہ ہوں۔ فوراً واپس نکل آنا۔“

ہیری نے اس کی غزالی آنکھوں میں دیکھا۔ ”اوکے۔“ مانیٹر اس نے جیب میں رکھ لیا۔ گارڈ، ہال وے سے گزر کر سیڑھیوں کے ذریعے اسے تہ خانے میں لے آیا۔ یہاں بھی ایک ہال وے تھا جس کی لمبائی غیر معمولی تھی۔ یعنی وہ عمارت کے انتہائی سرے کی طرف جا رہے تھے۔

انسی نیریٹر روم خالی پڑا تھا۔ ہیری نے گارڈ کو ایک قدم پسپا ہوتے دیکھا اور اس کی مشکل آسان کر دی۔ ”تم کمرے کے باہر میرا انتظار کرو۔“ اس نے گارڈ کو اشارہ کیا۔ گارڈ نے بھی تیز ردِعمل ظاہر کیا۔ اس کے جانے کے بعد ہیری نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں کسی شے کو جلائے جانے کے آثار مفقود تھے۔ فرش پر تین فٹ اونچا کنٹینر رکھا تھا۔ اس کے ڈھکن کو ٹیپ کی مدد سے مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا۔ اس پر وارننگ لکھی تھی۔ آتش زدگی کے لیے تیار خطرناک اشیا۔

ہیری نے کی چین نکالی، جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا

قلمی چاقو بھی تھا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے ڈھکن کے گرد لپٹا ٹیپ تراش دیا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے ڈھکن ہٹایا...... جیب سے مانیٹر نکال کر کنٹینر کے اندر جھانکا۔ اندر ڈیرٹو کے کپڑے اور ان پر بولس رکھے تھے۔ ہیری نے مانیٹر اوپر گھمایا۔ کوئی الارم سنائی نہیں دیا۔ ہیری نے رکی ہوئی سانس خارج کی اور کنٹینر الٹ دیا۔ نیلے رنگ کے کپڑے کاٹ کر اتارے گئے تھے۔ پتلون، قمیص، موزے اور انڈر ویئر۔ سیاہ رنگ کا ایک والٹ بھی نظر آرہا تھا...... ہیری نے پھر تابکاری چیک والے مانیٹر کو ہر جانب گھما کر اطمینان کیا۔ پھر اسے آف کر کے جیب میں رکھ لیا۔ کپڑوں کی رنگت اور سیل ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کوئی عام سا کام کرنے کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ ہیری نے پہلے قمیص کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک قلم اور ایک عام سا آلہ برآمد ہوا۔ جو ٹائر میں ہوا کا دباؤ استعمال کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک جیب سے ورکنگ گلوز برآمد ہوئے۔ چابیوں کا گچھا اور سیل فون۔ وہ رک گیا۔ تصور میں ڈیرٹو کے دائیں ہاتھ اور کولھے کا خوفناک منظر ابھرا۔ تاہم اس نے دائیں جیب کو بھی جانچا۔ وہاں کوئی سیسیم نہیں تھی۔ جیب خالی تھی۔ اوپر نیچے، دائیں بائیں اور پیچھے...... اتنی جیبیں کام کے دوران استعمال کرنے والے کپڑوں میں ہی ہوتی ہیں۔

ہیری نے چابیاں اور سیل فون ایک جگہ والٹ کے قریب رکھ دیے۔ ایک چابی پر اسے ٹویوٹا اسکنیا کا نشان نظر آیا۔ وہ فوراً نشان کی اہمیت جان گیا۔ بعد ازاں اس نے فون کھول کر کال ڈائریکٹری چیک کی۔ اسے ایک طرف رکھا اور والٹ اٹھا لیا جس میں میکسیکن ڈرائیونگ لائسنس تھا جس پر ڈیرٹو کا فوٹو اور نام بھی تحریر تھا۔ دوسرے فوٹو میں ایک عورت تین بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ غالباً فوٹو پرانا اور میکسیکو میں لیا گیا تھا۔ کوئی گرین کارڈ یا شہریت کا ثبوت برآمد نہیں ہو سکا۔ رقم کی جگہ محض چھ ڈالرز تھے۔ کوئی کریڈٹ کارڈ نہیں تھا۔ پتلون کے ٹکڑوں کا جائزہ لینے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا اور فون نکال کر راشیل کا نمبر ملایا۔ راشیل نے فوراً جواب دیا۔

''میں نے تلاشی لے لی ہے۔ سیسیم نہیں ہے۔''

دوسری جانب سکوت طاری تھا۔

''راشیل......؟''

''ہاں، میں نے سنا...... میری آرزو تھی کہ کچھ مل جاتا۔ ہیری میری خواہش شدت اختیار کر گئی ہے کہ کھیل ختم ہونا چاہیے۔''

''میری بھی یہی تمنا ہے۔'' ہیری نے کہا۔

''کوئی اور کام کی چیز؟'' راشیل کی سوالیہ آواز آئی۔

''میکسیکن ڈرائیونگ لائسنس ہے لیکن یہ جعلی معلوم ہوتا ہے۔ نام بھی غالباً اصلی نہیں ہے۔''

''ویل، یعنی دہشت گردوں نے میکسیکن بارڈر کراس کیا ہے اور مریض المعروف ڈیرٹو گونزالز ان میں سے ایک ہے۔ کینٹ ہاؤس میں گھسنے والے دو افراد، ڈیرٹو، ڈوبی اور شاید کچھ اور بھی ہوں گے۔'' راشیل نے خیال آرائی کی۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا، راشیل۔ میری رائے کے مطابق یہ آدمی......'' ہیری کی بات ادھوری رہ گئی۔

''ہیری، میری ٹیم پہنچ گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں واپس آتا ہوں۔'' ہیری نے اشیا واپس کنٹینر میں منتقل کیں اور اسے اٹھا کر واپسی کا راستہ پکڑا۔ سیڑھیوں پر آکر اس نے سیل فون نکالا اور سٹی کمیونیکیشن سینٹر سے رابطہ کیا۔ وہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ پیرامیڈیکس نے ڈیرٹو کو کہاں سے اٹھایا تھا، کال کہاں سے آئی تھی؟ جس کے بعد پیرامیڈ منظرنامے پر نمودار ہوئے۔ چند منٹ انتظار کرنے کے بعد اسے جواب ملا۔

''کال پونے پانچ بجے جس فون سے آئی تھی وہ ''ایزی پرنٹ'' کوینگا بولیورڈ میں رجسٹرڈ ہے۔ وہ آدمی پارکنگ لاٹ میں گرا ہوا تھا۔''

''پلیز، پارکنگ سے قریب ترین کراس اسٹریٹ لوکیشن بتائیے۔''

اس مرتبہ جواب جلدی آیا۔

''ملینکر تھم بولیورڈ۔''

ہیری نے شکریے کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ حیران تھا کہ ہر مقام کینٹ سے قریب ایک مخصوص دائرے کے اندر تھا۔ مل ہالینڈ اوورلک مرڈر سائٹ کینٹ ہاؤس سے قریب تھی۔ کیپٹن بیڈلی نے گاڑیوں کی دریافت پر جس مکان پر ناکام دھاوا بولا تھا، وہ اور...... ڈیرٹو جہاں گرا تھا وہ مقام بھی۔ لاس اینجلس کے مرڈر کیسز میں پوری ریاست لپیٹ میں آتی رہی تھی جبکہ یہاں معاملہ برعکس تھا۔ وہ خیالات میں غلطاں ڈھیرے ڈھیرے سیڑھیاں چڑھتا رہا۔

☆☆☆

ہیری نے دیکھا کہ ایمرجنسی روم کے اطراف سے غیر ضروری افراد کو ہٹایا جا چکا تھا بلکہ نکالا جا چکا تھا۔ حفاظتی ساز و سامان اور ریڈی ایشن مانیٹر سے لیس افراد وہاں چکرا رہے تھے۔ راشیل اسے نرسنگ اسٹیشن پر نظر آئی۔ وہاں پہنچ

کر ہیری نے کنٹینر اسے پکڑا دیا۔ راشیل نے اسے نیچے رکھ دیا اور ٹیم کے ایک رکن کو اشارے سے بلایا۔ کنٹینر اس کے حوالے کیا اور مختصر ہدایات دیں۔

''حادثاتی مریض کی کیا کیفیت ہے؟'' ہیری نے گویا اسے حادثہ قرار دے دیا۔

''حادثاتی؟'' راشیل کی آنکھوں میں بھی سوال تھا۔

''جب تک ثابت نہیں ہو جاتا کہ وہ ملوث ہے یا نہیں...... اسے حادثہ ہی سمجھنا چاہیے۔''

''اگر تم کہتے ہو...... میں نہیں سمجھتی کہ ہمیں اس سے بات کرنے کا موقع ملے گا۔''

''مطلب وہ زندہ ہے؟'' ہیری نے کہا۔

''زندہ جیسا ہے......''

''تو پھر مجھے چلنا چاہیے۔''

''کیا؟ کہاں؟ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''میں نے سوچا تھا کہ تم کمانڈ پوسٹ پر رہو گی۔''

''سیسیم نہیں ہے تو مجھے کمانڈ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ چند افراد کو بتانا پڑے گا کہ میں نیا سرا پکڑنے کے لیے آگے بڑھ رہی ہوں۔''

ہیری ہچکچایا۔ تاہم اسے احساس تھا کہ دل کے کسی نہاں خانے میں خواہش دبی ہے کہ راشیل بھی ساتھ رہے۔

''او کے۔'' وہ بولا۔

''ہم کہاں جائیں گے؟''

''میں نہیں جانتا۔ یہ دہشت گردی ہے یا حادثہ لیکن میں ایک بات جانتا ہوں۔ وہ یہ کہ ڈیرٹو ٹویوٹا ڈرائیو کر رہا تھا اور شاید یہ بھی علم رکھتا ہوں کہ ہمیں مذکورہ ٹویوٹا کہاں ملے گی۔''

☆☆☆

ہیری لاس اینجلس کے خدوخال سے خوب واقف تھا۔ اسے علم تھا کہ ''کوینگا'' تک پہنچنے کے لیے ہائی وے فری وے استعمال کرنا تاخیر کا سبب بنے گا۔ وہ ذیلی سڑکوں پر چکراتا ہوا ہائی لینڈ ایونیو کے ذریعے کوینگا پاس پر نکلا۔ دورانِ سفر اس نے سٹی کمیونیکیشن سینٹر سے حاصل شدہ معلومات راشیل کے گوش گزار کر دیں۔

''ابتدائی کال ''ایزی پرنٹ'' نامی چھاپا خانے سے آئی تھی...... مجھے یقین ہے کہ جو ٹویوٹا وہ ڈرائیو کر رہا تھا، وہ اسی پارکنگ میں ہونی چاہیے جہاں وہ گرا تھا۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ اگر ٹویوٹا مل گئی تو سیسیم بھی مل گئی۔ اسرار یہ ہے کہ سیسیم اس کے پاس کیوں اور کیسے تھی؟''

''اور کیوں وہ اتنا احمق تھا کہ اس نے بغیر کسی حفاظت کے اسے جیب میں رکھ لیا۔'' راشیل نے اضافہ کیا۔

''کیونکہ وہ سیسیم کی اصلیت سے ناواقف تھا۔'' ہیری نے کہا۔

''یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کا تعلق دہشت گردوں سے نہ ہو۔'' راشیل کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ ''بوش ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

وہ مسکرایا۔ راشیل نے اس کے نام کا آخری حصہ پھر استعمال کیا تھا۔ یہ قربت کی علامت تھی۔ ''ایکو پارک کیس'' سے پہلے وہ اسے بوش کے نام سے ہی پکارتی تھی...... محتاجِ بیان تھی ابھی دل کی بات...... لیکن لاشعوری طور پر گاہے گاہے وہ عالمِ بےخودی میں لڑکھڑا جاتی۔ پتا نہیں عالمِ بےخودی تھی یا عالمِ ہوش۔ تاہم تلخیوں کے اختتام کا آغاز ہو رہا تھا۔

''اور اس پروفیسر کو مت بھولنا جس کے گھر کے آگے سے گاڑیاں گمنام کال کے ذریعے برآمد ہوئی تھیں۔'' ہیری نے کہا۔

''ہاں، وہ ایک دھوکا تھا۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''لیکن اچھا تھا۔ اس فریب نے مائی کیپٹن بیڈلی کو پنچر کر دیا۔''

وہ ہنس دی۔ ''کیا اسے اس نام سے پکارا جاتا ہے؟''

''ہاں، مائی کنگ کا تک...... لیکن ظاہر ہے، سامنے نہیں۔''

''اور تمہیں؟؟ سرپھرا یا پاگل دیوانہ...... شاید دیوانہ۔'' راشیل نے کہا۔

''ہاں، دیوانہ...... مجنوں...... مجنوں بھی ہوں لیلیٰ اور محمل بھی۔ طوفان بھی ہوں...... کشتی بھی اور ساحل بھی...... اب یہ نہ پوچھنا کس کا دیوانہ ہوں؟''

''فری ہو رہے ہو......؟''

''ہاں، پھر سے۔ شرط لگاتا ہوں کہ یہی موقع ہے۔''

''بار بار شرطیں لگا رہے ہو؟''

''تم بھی لگا کے دیکھ لو۔''

''اداس ہو جاؤ گے۔'' راشیل نے چھیڑا۔

''اس پر بھی شرط لگاتا ہوں کہ نہیں ہوں گا۔''

وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''بوش......''

''ہاں؟''

''کچھ نہیں۔''

''سمجھ گیا...... راشیل تمہیں پتا ہے، تمہارا نمبر ابھی تک میری فون ڈائریکٹری میں محفوظ ہے۔ میں اسے مٹا نہیں سکا...... میرے خیال میں تم نے میرا نمبر ہٹا دیا ہوگا۔''

جواب دینے سے پہلے راشیل نے طویل وقفہ لیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہارا نمبر محفوظ ہے، ہیری۔''

ہیری پھر مسکرایا۔ وہ واپس بوش سے ہیری پر آ گئی تھی۔

وہ لڑکھڑا گئی تھی اور جان بھی گئی تھی۔ ہیری کے نزدیک اب سنبھلنے کی کوشش جان کا زیاں تھا...... عقل و خرد کی چیرہ دستی کب تک...... دیوانہ ہے کتنا دلِ دیوانہ بھی...... میرا ہو یا تیرا۔ اب ہر آن سنبھلنا مشکل تھا۔ انداز بدل بدل کے چلنا دشوار تھا۔

''ہم پہنچ رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور رفتار کم کی۔ بائیں جانب شاپنگ سینٹر میں ''ایزی پرنٹ'' کے پینا فلیکس پر نظر ڈال کر اس نے گاڑی پارکنگ میں ڈال دی۔ پارکنگ پلیس زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بائیں گلی میں گزرتے ہوئے اس نے دونوں طرف کھڑی گاڑیوں کو نظروں سے ٹٹولا۔ ٹویوٹا، کہیں نہیں تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ مختلف ماڈلز ہیں کاروں کے علاوہ پک اَپ ٹرک بھی ہو سکتا ہے۔ بصورت دیگر قریبی دوسری پارکنگ کی تلاشی لینی پڑے گی۔ تاہم اسے توی امید تھی مطلوبہ گاڑی وہیں ہے۔ ''لائسنس پلیٹ...... یا رنگت وغیرہ؟'' راشیل نے کہا۔

''نہیں، نہیں۔'' آخر تک جا کر اس نے گاڑی واپس گھمائی اور دھیمی رفتار سے واپس پلٹا۔

''ٹویوٹا کو یہاں ہونا چاہیے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا اسٹریٹ پر جانا چاہیے۔'' راشیل نے مشورہ دیا۔ ہیری نے سر ہلایا۔ اسٹریٹ پر نکلنے سے پہلے دائیں جانب اس کی نگاہ پرانے سفید پک اَپ ٹرک پر پڑی۔ وہ قدرے آگے بڑھ گیا تھا۔ بریک لگائے۔ راشیل نے پلٹ کر بغور دیکھا۔

''بوش، تم ایک جینئس ہو۔'' اس کی آواز جذباتی انداز میں بلند ہو گئی تھی۔

ہیری نے ریورس گیئر ڈالا۔ راشیل نے سیل فون کے لیے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں راشیل، ابھی نہیں۔ چیک کرنے دو۔ کہیں مجھ سے غلطی نہ ہو جائے۔'' اس نے راشیل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں بوش، تم پوری فارم میں ہو۔'' راشیل نے کہا۔ تاہم اس نے فون نہیں نکالا۔

ہیری نے کھڑکی سے سر نکال کر پک اَپ ٹرک کا جائزہ لیا۔ جس کا فرنٹ ہیری کی طرف تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی اور گھوم کر واپس آیا۔ ٹویوٹا ٹرک کے عقب میں دس فٹ کے فاصلے پر اس نے گاڑی روک دی۔ پک اَپ ٹرک کے عقب میں بڑ نما کینوپی تھی۔ سبز رنگ کا بڑا سا کوڑے دان ٹویوٹا کے قریب دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ لائسنس پلیٹ کی جگہ ''لوسٹ ٹیگ'' کا نشان لٹک رہا تھا۔ وہ دراصل پُراسرار ہونے والی گاڑی تھی۔

وہ دونوں گاڑی سے باہر آ گئے۔ ہیری نے کینوپی کے دروازے پر زور آزمائی کی۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر اندر جھانکا۔ وہاں نیم تاریکی تھی۔ جس کی وجہ رنگین شیشے تھے۔

''ہیری تمہارے پاس مانیٹر ہے؟'' راشیل کی مضطرب آواز آئی۔

جواباً ہیری نے جیب سے مانیٹر نکال کر ہاتھ اوپر کیا۔ اندر جانے سے پہلے اس نے مانیٹر بیلٹ کے ساتھ لگا لیا۔ ٹویوٹا کے عقبی حصے میں کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ ہیری کی متلاشی نگاہیں مطلوبہ شے کے لیے ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ جلد ہی اسے گرے رنگ کا کنٹینر نظر آ گیا۔ جس کے نیچے پہیے لگے تھے۔ اس کی رفتارِ قلب میں اضافہ ہو گیا۔ وہ جس چیز کو دیکھ رہا تھا، اس کا مخصوص نام پگ تھا۔ معلومات کے مطابق اس کے گرد سیسے کا حفاظتی خول تھا۔ اس پر ''ریڈی ایشن الرٹ'' کا اشارہ موجود نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی انتباہ۔ غالباً ایسے کسی اشارے کو ہٹا دیا گیا تھا۔ راشیل بھی اندر جھانک رہی تھی۔

''کیا یہی پگ (سیسم کنٹینر) ہے؟'' ہیری کی آواز آئی۔

''ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔'' راشیل کی آواز میں ہیجان تھا۔ ہیری نے پگ کے کان (ہینڈل) پکڑ کر اسے کچرے سے باہر نکالا اور عقبی دروازے کے قریب لے آیا۔ ٹاپ چار جگہ سے بند تھی۔

''کیا ہمیں کھول کر سیسم کی موجودگی کا یقین کرنا چاہیے؟'' ہیری نے استفسار کیا۔

''نہیں، ہمیں احتیاط کرنی چاہیے۔ میں ٹیم کو کال کرتی ہوں۔ وہ حفاظتی نظام سے مسلح ہیں۔'' راشیل نے جواب دیا اور فون نکالا۔

ہیری ٹرک کے فرنٹ کی جانب آیا۔ کھڑکی سے

جھانکنے پر اسے برگر نما چیز دکھائی دی۔ جسے آدھا کھا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ ناشتا پسنجر سیٹ پر پڑا تھا۔ ایک چپٹا خالی بیگ بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کی نگاہ دفعتاً ایک کیمرے پر جم گئی جو اسی نشست پر ایک پرانے بریف کیس پر رکھا تھا۔ بریف کیس کا ہینڈل ٹوٹا ہوا تھا جبکہ کیمرا اچھی حالت میں اور برانڈ نیو تھا۔

ہیری نے ڈرائیونگ سائڈ کے ڈور کو آزمایا۔ حسبِ توقع وہ بھی کھلا تھا۔ ہیری کے اندازے کے مطابق ڈبرٹو کے ذہن سے ہر شے ہوا ہو گئی تھی۔ جیسے ہی سیسم کے مہلک اثرات نے سر اٹھایا ہوگا۔ وہ نکل بھاگا لیکن زیادہ دور نہیں جا سکا۔

ہیری نے مانیٹر ہاتھ میں لیا اور ڈور کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ سکوت...... نو الارم۔ اس نے مانیٹر واپس بیلٹ کے ساتھ لگایا اور اتر کر اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا۔ واپسی پر اس کے دونوں ہاتھوں پر ربر گلوز موجود تھے۔ اس کے کانوں میں فون پر بات کرتی راشیل کی آواز آئی۔

''کھیل تقریباً ختم ہے...... کیا ہم اسے کھول کر دیکھیں؟''

جواب سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''جلد از جلد پہنچو......''

ہیری نے ٹویوٹا میں داخل ہو کر نکون ڈیجیٹل اٹھا لیا۔ اسے یقین واثق تھا کہ اس کے ہاتھ میں وہ کیمرا ہے جس سے ایلی سیا کینٹ کی تصویر اتاری گئی تھی۔ تاہم وہ فوٹو دیکھنے میں ناکام رہا۔ کیونکہ میموری چپ نکال دی گئی تھی۔ اس نے کیمرا چھوڑ کر برابر کی نشست پر موجود دیگر اشیا کا جائزہ لیا۔ تاہم اسے کوئی اہم چیز نظر نہیں آئی۔ معاً اس کی نگاہ فلور پر گئی جہاں رول کیا گیا ایک پوسٹر پڑا تھا۔ اُدھر متوجہ ہونے سے پہلے اس نے بریف کیس کھول کر دیکھا جو خالی تھا۔

اب وہ دونوں نشستوں کے درمیان موجود ہینڈ ریسٹ پر کہنی لگا کر جھکا اور بایاں ہاتھ بڑھا کر گلو کمپارٹمنٹ کھولا۔ وہاں ایک ہینڈ گن کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہیری کا دل پھر زور سے دھڑکا۔ اس نے گن اٹھا لی۔ وہ اسمتھ اینڈ ویسن اعشاریہ بائیس کیلیبر ریوالور تھا۔

''قتل کا ہتھیار بھی ہاتھ آ گیا۔'' وہ بڑبڑایا۔ پھر راشیل کو سنانے کے لیے یہی بات بلند آواز میں دہرائی۔ وہ ٹویوٹا کے عقبی سمت میں ابھی تک فون کے ساتھ مصروفِ کار تھی۔

ہیری نے گن واپس رکھ دی اور کہنی پر زور برقرار رکھتے ہوئے مزید جھک کر رولڈ پوسٹر اٹھا لیا۔ اس کی یہ حرکت محض تجسس کے زیرِ اثر تھی۔ جس کے تحت اس نے پوسٹر کھول دیا۔ وہ سیدھا ہو گیا تھا۔ دائیں کہنی سے نیچے کا حصہ ٹویوٹا کے ہینڈ ریسٹ پر لگا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے درمیان پوسٹر نما چارٹ تھا جس پر بارہ عدد شبیہ نما اشکال بنی ہوئی تھیں۔ ہر شکل مختلف تھی۔ مخصوص پوزیشن...... ''یوگا آسن۔''

ہیری کی یادداشت میں کسی نے سرگوشی کی۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ تصور ہی تصور میں وہ اُڑتا ہوا یک لخت کینٹ ہاؤس میں پہنچ گیا جہاں ایک دیوار پر اسے احساس ہوا تھا کہ وہاں سے کسی نے کلینڈر یا پوسٹر ہٹایا ہے اور دیوار کے اس حصے پر رنگ بقیہ دیوار سے معمولی مختلف تھا۔ اس نے بغور پوسٹر کا سائز دیکھا پھر آنکھیں بند کر کے تصوراتی نگاہ سے دیوار کا وہ حصہ دیکھا۔

''یہ وہیں سے ہٹایا گیا ہے۔'' وہ بڑبڑایا اور آنکھیں کھول دیں۔ اس نے پوسٹر واپس رول کیا اور باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولا۔ آرم ریسٹ سے ہاتھ ہٹتے ہی اسے شک ہوا کہ وہ محض آرم ریسٹ نہیں...... بلکہ نیچے خلا بھی ہے۔ وہ تھم گیا اور آرم ریسٹ کو کھولا۔ اگلے ہی لمحے وہ برفانی تودے کے مانند جم کے رہ گیا۔ اندر کپ ہولڈر میں بلٹ جیسے بارہ کیپسول پڑے تھے جو دونوں جانب سے چپٹے تھے۔ پالشڈ اسٹیل، چاندی کے مانند چمک رہا تھا...... یا شاید چاندی ہی تھی۔

ہیری کا سکتہ ٹوٹا اور اس نے مانیٹر نکال کر کیپسولز پر گھمایا۔ خطرہ ظاہر کرنے کے لیے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ اس نے مانیٹر کو دیکھا جس کے ایک طرف چھوٹا سا سوئچ تھا۔ انگوٹھے کی حرکت سے اس نے سوئچ اوپر کر دیا۔ تیز چبھتا ہوا الارم اتنا بلند آہنگ تھا۔ گویا کانوں کی راہ کھوپڑی میں گھسا جا رہا ہو۔ ہیری اچھل پڑا۔ وہ بے ڈھنگے انداز میں باہر نکلا۔ پوسٹر بھی ہاتھ سے نکل کر گاڑی کے باہر گرا۔ ہیری نے مانیٹر آف کیا۔

''کیا ہوا؟'' راشیل چلائی۔

ہیری نے خود پر قابو پاتے ہوئے ٹویوٹا کے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا؟''

''اس نے کچھ سیسم نکال کر آرم ریسٹ میں ڈال دی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے لباس میں سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ اس کا دایاں کولھا آرم ریسٹ کے ساتھ لگا ہوگا۔''

ہیری نے بے خیالی میں اپنے دائیں کولھے پر ہاتھ پھیرا۔ ''سیسیم ہاتھ سے نکالنے پر ڈبرٹو پہلے ہی براہِ راست متاثر ہو چکا تھا۔''

راشیل سکتے کے عالم میں ہیری کو تک رہی تھی۔

''تم ٹھیک ہو؟'' اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

ہیری تقریباً ہنس دیا۔ ''پتا نہیں۔''

راشیل کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ جیسے وہ کچھ جان گئی ہے لیکن شیئر نہیں کرنا چاہتی۔

''کیا ہوا؟'' ہیری نے کہا۔

''کچھ نہیں۔ تمہیں مانیٹر کا خیال رکھنا چاہیے تھا؟ تمہیں چیک کرنا پڑے گا۔ ٹیم پہنچنے والی ہے۔''

''وہ کیا کریں گے۔ میں نے اتنا وقت اندر نہیں گزارا جتنا ڈبرٹو نے گزارا تھا۔ اس نے اندر بیٹھ کر تماشا بھی کیا تھا۔''

وہ خاموش رہی۔ ہیری نے مانیٹر اسے پکڑا دیا۔

''یہ شروع سے ہی آف تھا...... جب تم نے مجھے دیا۔''

راشیل نے مانیٹر کو دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

ہیری سوچ رہا تھا کہ اس نے دو مرتبہ مانیٹر جیب سے نکالا اور رکھا۔ شاید لاعلمی میں اس کے ہاتھ کی کسی حرکت نے مانیٹر آف کر دیا ہو۔ اس نے پلٹ کر ٹویوٹا کی طرف دیکھا۔

''کیا وہ خود کو ہلاک کر چکا ہے۔''

''مجھے پانی پینا ہے۔'' وہ بولا اور گاڑی کی طرف چلا گیا۔ گاڑی میں سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے گھونٹ بھرے اور بوتل واپس رکھ دی۔ گاڑی کی چھت پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنے احساسات کو پڑھنے کی کوشش کی۔ ایمرجنسی ڈاکٹر کی باتیں یاد کیں جو اس نے ڈبرٹو کے بارے میں بتائی تھیں۔ سب سے خطرناک بات اندرونی تباہ کاری تھی۔ کیا اس کا اپنا دفاعی نظام ناکارہ ہو رہا ہے۔ ''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے خود سے کہا۔

''ہیری؟''

اس نے سر گھمایا۔ راشیل اس کی طرف آ رہی تھی۔

''ٹیم پانچ منٹ میں پہنچ جائے گی۔ تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔''

''گڈ، میری بات ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ قلیل وقت کے لیے زد میں آنے سے کسی بڑے خطرے کا امکان نہیں ہے لیکن پھر بھی تمہیں ایمرجنسی میں جا کر چیک کرانا چاہیے۔''

''یہ ایمرجنسی بوتل ہے۔'' ہیری نے پھر پانی کی بوتل نکالی اور چند گھونٹ لے کر مسکرایا۔ اس کی پشت گاڑی کی طرف تھی۔ سامنے راشیل کھڑی تھی۔ وہ اس کے قریب سے گزرا...... نگاہ جنوب کی طرف گئی۔ سلور لیک میں کوڑے دان کتنے کتنے فاصلے پر رکھے تھے۔ وہی حال یہاں کو ہینگا میں تھا۔ سلور لیک کے مانند یہاں بھی کوڑا کرکٹ اٹھانے کا دن تھا۔ کوڑا اٹھانے والے ٹرک وہاں پہنچنے کے لیے تیار تھے۔ یہ بات سیسیم وہاں پھینکنے والے جانتے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ یوں سیسیم کوڑے کے ساتھ سٹ کر شہر سے دور مخصوص مقام پر کوڑے کے ساتھ نذرِ آتش ہو جائے گی۔

''لاؤ یہ پوسٹر مجھے دو۔ دوسری چیزوں کے ساتھ ڈبرٹو نے اسے بھی کوڑے دان سے نکالا تھا۔ حالانکہ یہ اس کے کسی کام کا نہیں۔''

سائرن کی آواز قریب آ گئی تھی۔

''اس پوسٹر میں کیا ہے؟''

دو فیڈرل گاڑیوں کی جھلک نظر آئی۔ ان کا رخ ہیری اور راشیل کی طرف تھا۔ ہیری نے دیکھا کہ آگے والی گاڑی بریز ڈرائیو کر رہا تھا۔

''ہیری میں کیا پوچھ رہی ہوں؟ ہیری......''

ہیری کے گھٹنے مڑے۔ گرنے سے پہلے راشیل نے اسے تھام لیا۔ ''بوش!'' وہ کراہی۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے کار تک لے چلو۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ راشیل نے اسے سیدھا کھڑا ہونے میں مدد کی۔ ایک ہاتھ اپنی گردن میں حائل کیا اور سہارا دے کر اسے کار کی طرف لے گئی۔ ان کے عقب میں گاڑیاں رکیں۔ دروازے کھل کر بند ہونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

''چابیاں کہاں ہیں؟'' راشیل نے پوچھا۔

بریز دوڑتا آ رہا تھا۔ جب ہیری نے چابیاں راشیل کے حوالے کیں۔

''کیا ہے؟ کیا ہوا؟''

''میرا خیال ہے کہ سیسیم نے اسے کسی حد تک گزند پہنچایا ہے۔'' راشیل نے جواب دیا۔

بریز اضطراری طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''ٹھیک ہے اسپتال چلو۔ جب موقع ملے مجھے کال کرنا۔'' بریز نے کہا۔

''کم آن بوش۔'' راشیل نے کہا۔ ''میرے ساتھ رہو۔''

☆☆☆

''میں تمہیں واپس کوئین آف اینجلز لے جا رہی ہوں۔ ڈاکٹر گارنر کے پاس۔'' وہ جذباتی انداز میں بولی۔

''جے رہو...... بوش میرے لیے۔''

چلو ختم فسانہ ہوا۔ ہیری نے مسکراہٹ دبائی۔ راکھ میں کوئی چنگاری دھیمے دھیمے سلگ رہی تھی۔ وہ شعلے میں ڈھل کر اچانک بھڑکنے لگی۔ دل ہنگامہ طلب سینے سے لگانے پر تُلا تھا۔ اندیشوں نے اظہار کی جرأت بڑھائی تو سوئی ہوئی حسرت جاگ اٹھی۔

''ٹھیک ہے صرف تمہارے لیے...... سیسیم کیا چیز۔'' وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ ''اسپتال کو بھول جاؤ۔ مجھے کینٹ ہاؤس لے چلو۔''

راشیل کی آنکھوں میں حیرت، مسرت اور شوخی کا ملا جلا تاثر۔ ''میں کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی۔'' وہ مسکرائی۔ ''غلطی ہو گئی۔''

''غلطی پسند آئی۔ کچھ اور کہنا ہے، کہہ دو...... کب سے ترس رہا ہوں۔''

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔''

''ایسا نہیں ہے۔ میں شرط لگاتا ہوں۔''

''ہار جاؤ گے۔'' مسکراہٹ راشیل کے ہونٹوں سے لپٹی ہوئی تھی۔

''تم سے ہار کے بھی جیت جاؤں گا۔''

''مکالمہ ہے یا شاعری؟''

''شاعری...... ہاں یاد آیا۔ دانستہ فریب کھا رہی ہو یا تابِ غم آزما رہی ہو۔''

''بس کرو بوش، یہ بتاؤ کہ تم واقعی ٹھیک ہو؟''

''ہاں...... تمہارے لیے۔''

راشیل نے لمحہ بھر کے لیے سڑک سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔

''یوں نہ دیکھو۔ گریبان چاک کر کے صحرا میں نکل جاؤں گا۔''

''اچھا بتاؤ یہ کینٹ ہاؤس کی کیا کہانی ہے؟'' راشیل نے راستہ بدل لیا تھا۔ ''اور تم نے ڈراما کیوں کیا؟''

''میں تمہیں وہاں سے ہٹانا چاہتا تھا۔ مجھے کچھ چیک کرنا ہے اور تم سے بات کرنی ہے۔''

''کیسی چیکنگ، کیسی بات؟ تمہیں اندازہ ہے کہ سیسیم کی برآمدگی کا تمام کریڈٹ بریز لے جائے گا جبکہ وہ دریافت ہماری تھی۔''

ہیری نے جیکٹ میں سے پوسٹر نکال کر کھولا۔ ''فکر مت کرو۔ گرفتاریوں کا کریڈٹ تمہیں ملے گا۔'' اس نے پوسٹر کا نصف حصہ تہ کیا اور اسے گھٹنوں پر پھیلا لیا۔ اس کی دلچسپی کا سامان پوسٹر کے نچلے نصف حصے میں تھا۔

''کن گرفتاریوں کی بات کر رہے ہو؟'' راشیل نے سوال کیا۔

''بتاتا ہوں۔ یوگا کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

''تھوڑا بہت۔'' اس نے پوسٹر پر نگاہ ماری۔

''دھنور آسن...... ہندی میں یہ پوسچر دھنور آسن کہلاتا۔ انگریزی میں ''بو پوسچر''...... کمان آسن بھی کہتے ہیں۔''

''سن رہی ہوں۔''

''ایلی سیا کینٹ، یوگا کی پریکٹس کرتی تھی۔ میں نے پریکٹس کے مخصوص میٹس ''واک آؤٹ روم'' میں دیکھے تھے۔''

''میں نے بھی دیکھے تھے...... تو کیا ہوا؟''

''تم نے دیوار کا وہ حصہ دیکھا تھا، جہاں سے کوئی پکچر، کلینڈر یا پوسٹر ہٹایا گیا تھا؟''

''ہاں، میں نے دیکھا تھا۔''

''میں شرط لگاتا ہوں کہ یہ پوسٹر دیوار کے اس حصے پر بالکل فٹ بیٹھے گا۔''

''یہ تم نے بات بات پر شرطیں لگانی کب سے شروع کر دی ہیں، خیر آگے بتاؤ یہ دیوار کے اس حصے پر پرفیکٹ چسپاں ہو جائے گا تو کیا مطلب ہوگا؟''

''شرط...... میرا مطلب یہ ایک پرفیکٹ کرائم ہے۔ ایلی سیا کینٹ نے شوہر کو ٹھکانے لگانے کے لیے بڑی باریک بینی سے منصوبہ تیار کیا تھا۔ اگر بدقسمت خواہ مخواہ دوسری اشیا کے ساتھ پوسٹر نہ اٹھاتا تو مجھے دشواری پیش آتی۔ ایلی سیا کینٹ کے گمان میں نہ ہوگا کہ کیا ہوگا۔ ورنہ وہ پوسٹر کو دوسرے انداز میں تلف کرتی۔''

راشیل نے ناقابلِ یقین نظروں سے ہیری کو دیکھا۔

''اوہ، ہیری تم کہہ رہے ہو کہ ایلی سیا کینٹ دہشت گردوں سے مل گئی تھی اور سیسیم کے بدلے شوہر کو قتل کروا دیا...... نہیں، یہ مضحکہ خیز بات ہے۔''

''چلتی رہو، ہم دو منٹ میں وہاں پہنچنے والے ہیں۔ ایلی سیا سازش کے لیے دہشت گردوں کے ساتھ نہیں بلکہ کسی اور کے ساتھ ملوث تھی۔ سیسیم دھوکا تھا، ورنہ اس طرح اسے کچرے کی نذر نہ کیا جاتا۔ تم بھی پریشان تھیں کہ دہشت

گردوں نے سیسیم کچرے میں ڈالنے کے لیے چوری کیوں کی تھی...... دراصل یہ مرڈر کیس تھا۔ سیسیم اور پروفیسر کا گھر محض دھوکا تھے...... غلط سمت میں ڈالنے کے لیے۔ یہ پوسٹر ہماری مدد کرے گا۔"

"کیسے؟"

"دھنور آسن...... راکنگ بو۔" ہیری نے پوسٹر کا رخ راشیل کی طرف کرتے ہوئے زیریں کونے کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا اس کو اس آسن کے مانند نہیں باندھا گیا تھا؟"

راشیل نے رفتار کم کی، سامنے دیکھا...... پھر غور سے آسن پر نظر ڈالی۔

"قاتل اور ایلی سیا نے پوسٹر اس خدشے کے پیشِ نظر ہٹایا کہ دورانِ تفتیش کوئی شرط لگانے والا کھٹک نہ جائے۔"

"ہیری تم بہت بڑی بات کر رہے ہو۔"

"پوسٹر اپنی اصل جگہ پر پہنچ جائے گا تو بات چھوٹی رہ جائے گی۔"

"تم کر سکتے ہو؟"

"بس گھر آنے دو۔" اس نے اعتراف کیا۔ "امید ہے تمہارے پاس چابی ہوگی۔ لگالو شرط۔"

☆☆☆

کینٹ ہاؤس کے سامنے بیورو کی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے سب اس دریافت شدہ سیسیم کی طرف متوجہ تھے۔

"شکر ہے، اس بار میکسویل کا سامنا نہیں ہوگا۔" ہیری نے کہا۔

راشیل بے تاثر چہرے کے ساتھ خاموش تھی۔

ہیری نے پوسٹر کے ساتھ کرائم سین کی تصاویر والی فائل بھی اٹھالی۔ "اگر پوسٹر ٹھیک ٹھیک فٹ نہیں ہوا تو میں اس معاملے سے نکل جاؤں گا پھر تم اپنی مرضی کے مطابق حرکت کرسکتی ہو۔"

کچھ دیر بعد وہ مذکورہ دیوار کے سامنے مکان کے اندر کھڑے تھے۔ ہیری نے پوسٹر پھیلایا...... راشیل نے ہاتھ بٹایا۔ ہیری کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ بال برابر فرق نہیں تھا۔ صرف کونوں پر ٹیپ کے نشانات کے علاوہ...... ہیری نے پوسٹر واپس لپیٹا اور دونوں لیونگ روم میں آگئے۔

"دھنور آسن میں خود کو بندھوانے کا خیال ایلی سیا کا ہوسکتا ہے۔ شاید تفتیش کنندگان کو الجھانے کے لیے۔ تاہم اسے اور اس کے ساتھی یا قاتل کا اندازہ تھا کہ کوئی سراغ رساں پوسٹر کو دیکھ کر لنک نہ ملالے۔ لہٰذا پوسٹر ہٹانا ضروری تھا۔ اسکائی ماسک کے علاوہ تمام اشیا کچرے سے برآمد ہوگئیں۔ ڈبرٹو کی بدقسمتی...... ہماری خوش قسمتی۔"

"ایلی سیا ماسٹر کریمنل ہے۔" راشیل نے کہا لیکن ہیری نے اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز محسوس کرلیا۔ تاہم اس نے پروا نہیں کی۔ وہ پُریقین تھا کہ وہ راشیل کو قائل کرلے گا۔

"چند ایک اشیا، مثلاً ٹائیز، گلوز، ماسک، سائلنسر وغیرہ نہیں ملے۔ اگر تم اپنے آدمیوں کو ہدایت دو کہ وہ دیگر کوڑے دانوں کی تلاشی لیں تو وہ بھی مل جائیں گی۔"

"کہانی میں متعدد سوراخ ہیں۔ یہاں دو آدمی داخل ہوئے تھے۔ تمہاری کہانی سے احساس ہو رہا ہے کہ ایلی سیا نے کسی ایک کو ساتھ ملا کر سازش تیار کی تھی، جبکہ تمہارے گواہ کے مطابق تم نے بریز کو بتایا تھا کہ 'کل ہالینڈ لک اوور تک...... جہاں ڈاکٹر کا قتل ہوا وہاں بھی دو گاڑیاں اور دو آدمی تھے......؟" راشیل نے غیر متاثر انداز میں اعتراض کیا۔ "پھر امریکا میں 'ڈوبی' کی موجودگی کا علم صرف ایف بی آئی کو تھا۔ نیویارک ٹائمز کی آخری اسٹوری ترکی سے متعلق تھی۔"

ہیری نے ہاتھ اٹھایا۔ "ذرا آہستہ چلو۔ مجھے پیاس لگی ہے۔" وہ کچن میں چلا گیا۔ ریفریجریٹر سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی...... پانی پیتے ہوئے اس نے دروازہ کھلا رکھا۔ وہ کاسنی انگوروں کے رس کی پلاسٹک بوتل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بالائی شیلف میں رکھی تھی۔ پانی کی بوتل رکھ کر اس نے انگوروں کے رس کی بوتل اٹھائی۔ اسے یاد آرہا تھا کہ دوسری مرتبہ جب وہ زبردستی کینٹ ہاؤس میں داخل ہوا تھا اس نے گیراج میں رکھے ٹریش کین میں چھوٹے کاغذی تولیے دیکھے تھے جن پر کاسنی دھبے پڑے تھے۔

"پزل کا ایک اور اشارہ۔" اس نے خود سے کہا۔ بوتل واپس رکھی اور ریفریجریٹر بند کر کے لیونگ روم میں آگیا۔

اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی راشیل نے نیا سوال داغ دیا۔

"نیز وہ جس طرح بندھی تھی...... اس طرح دو افراد ہی اُسے باندھ سکتے تھے۔"

"چلو میں اسی سوال سے شروع کرتا ہوں۔" ہیری نے کہا۔ "تم بھول رہی ہو کہ وہ یوگا کی پریکٹس کرتی تھی۔ وہ کسی مدد کے بغیر یہ آسن اختیار کرنے پر قادر تھی۔ باندھنے کا کام اس کے ساتھی نے کیا۔ باقی رہ گئے دو سوال۔ جہاں قتل

ہوا وہاں دوسرا آدمی میرے گواہ کے مطابق گاڑی سے اترا ہی نہیں تھا۔ دوسری گاڑی میں ایلی سیا خود تھی۔"

جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ راشیل ہنس پڑی۔ "میں یہ بھی فرض کرلیتی ہوں لیکن سب سے ٹیڑھا سوال وہی ہے کہ ایلی سیا نے ہمارے ماسٹر انویسٹی گیٹر کو ڈوبی کا نام کیسے بتایا؟"

"ہاں واقعی سوال ٹیڑھا ہے بلکہ بل دار ہے۔ یہ بتاؤ کہ ڈوبی کی وڈیو ائرپورٹ پر بیورو نے کب دیکھی۔"

"کیا مطلب؟"

"پلیز، جواب دو۔"

"او کے، بارہ اگست...... گزشتہ برس۔"

"او کے پھر کیا ہوا؟ بیورو کو الرٹ کردیا گیا اور وفاقی ہوم لینڈ سیکیورٹی کو بھی؟"

"ہاں...... لیکن فوراً نہیں۔ دو ماہ کی جانچ پڑتال کے بعد...... بلیٹن میں نے ہی لکھا تھا جو نو اکتوبر کو سرکولیٹ ہوا۔"

"اسے پبلک نہیں کیا گیا؟"

"وہ اس لیے کہ دراصل...... میں بتا نہیں سکتی۔"

"تم نے بتا دیا ہے۔" ہیری نے کہا۔ "دو مہینے کے اندر تم نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ کہاں نمودار ہوگا۔ اگر تم لوگ مشتہر کردیتے تو وہ انڈر گراؤنڈ چلا جاتا اور پھر کبھی نظر نہیں آتا۔"

"تم اپنی کہانی جاری رکھو۔" راشیل نے اس کے اندازے کی تردید نہیں کی۔

"اندرونِ خانہ جس نے بھی بلیٹن پڑھا، ان میں سے کوئی بھی ایلی سیا کو ڈوبی کا نام بتا سکتا تھا۔"

راشیل پھر ہنس دی۔ "فرض کرلیا لیکن بہت سے لوگ ہیں۔ شارٹ لسٹ کیسے کرو گے؟"

"یہ کام تم کرو گی۔ الٹا چلنا شروع کرو۔ جو ایجنسیاں باخبر تھیں، ان میں سے کس کے افراد کا پہلی مرتبہ ایلی سیا سے ٹاکرا ہوا۔"

راشیل نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"جس دائرے کا تم ذکر کرتے رہے ہو۔ اس دائرے کے اندر کہیں، کوئی بھی اس سے ٹکرا سکتا تھا...... مطلب مڈبھیڑ......"

"گڈ، اب یوں سوچو کہ وہ کون ہوسکتا ہے جسے ڈوبی اور سیسیم دونوں کے بارے میں علم تھا۔ مزید برآں وہ یہ بھی جانتا تھا یا تھے کہ ڈاکٹر کینٹ (مقتول) سیسیم تک رسائی رکھتا ہے۔ اب سوچو ایسا کون پہلی مرتبہ ایلی سیا سے ملا؟"

"نہیں...... نہیں...... یہ ایک غیر معمولی اتفاق ہوگا، فلک بوس اتفاق۔" اس کی تیوریوں کے بل کھنچ گئے۔ اسے دفعتاً احساس ہوا کہ ہیری بوش اسے کہاں لے جارہا ہے۔ سمجھنے کے بعد وہ شاک کی کیفیت میں تھی۔

"میں اور میرا پارٹنر ایک سال پہلے ڈاکٹر کینٹ کو خبردار کرنے آئے تھے۔" اس نے سرگوشی کی۔ "میرا قیاس ہے کہ تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔"

"میں نے کئی جگہ شی (She) نہیں۔ ہی (He) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تم اکیلی یہاں نہیں آسکتیں۔"

ہیری کی ذومعنی بات کا مطلب سمجھ کر راشیل کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ "لو دے...... یہ پاگل پن ہے۔ میں تم پر یقین نہیں......" وہ یکلخت تھم گئی۔ اپنے پارٹنر کا خیال اس کے ذہن میں آیا۔

ہیری کھڑا ہوگیا۔ لوہا گرم تھا۔ "وہاٹ؟" وہ بولا۔

"کچھ نہیں۔"

"بول دو۔"

"دیکھو۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "میرا مشورہ ہے کہ کسی اور سے اپنی تھیوری کا ذکر نہیں کرنا۔ تم خوش قسمت ہو کہ یہ باتیں تم نے میرے سامنے کیں۔ جو محض ایک بے معنی پوسٹر کے گرد چکرا رہی ہیں۔"

"اس کے سوا کوئی نظریہ نہیں ہے۔ میں حقائق کی بات کر رہا ہوں۔ اس نظریے کو نظر انداز کرو گی تو بیورو یا کوئی اور بھی قاتل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ یا یوں کہہ لو کہ اصل قاتل تک۔ بیورو، ہوم لینڈ سیکیورٹی اور دیگر وفاقی ایجنسیوں کی گہری دلچسپی اس بات میں ہے کہ دہشت گردی کی موجودگی کو ثابت کریں۔ اس طرح وہ اپنی ناکامیوں کی گرد جھاڑ کر اپنی اہمیت منوائیں گے۔ جہاں تک ثبوت و شواہد کی بات ہے تو پوسٹر محض ابتدا ہے۔ ایلی سیا کو لائی ڈیٹیکٹر پر رکھو گی تو معلوم ہوگا کہ اس نے مجھے، تمہیں اور تمہارے ماسٹر انٹروگیٹر سے جو بولا...... سب جھوٹ تھا۔ اصل ماسٹر ایلی سیا خود ہے۔"

راشیل آگے جھکی، فرش کی طرف دیکھا اور بولی۔ "شکریہ ہیری جس ماسٹر انٹروگیٹر کا مذاق اُڑا رہے ہو، وہ میں تھی۔"

ہیری کا منہ کھل گیا۔

"اوہ...... ویل...... سوری۔ لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نکتہ یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولنے میں ماسٹر ہے۔ لیڈی

ماسٹر۔"

راشیل اٹھ کے کھڑی ہوگئی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ ونڈو بلائنڈ میں رخنہ پیدا کر کے اس نے باہر جھانکا۔

ہیری سمجھ گیا کہ راشیل کی دلچسپی قریب الختم ہے۔

"تمہارے گواہ کا کیا ہوا؟" اس نے مڑے بغیر پوچھا۔ "تم نے کچھ نام اگلوائے تھے؟"

"دراصل نام اس نے ایک ہی سنا تھا۔ پُریقین نہ ہونے کی وجہ سے اس نے کئی نام لیے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ بیان کے مطابق قاتل نے گولی چلاتے وقت نام لیا تھا، جیسے نعرہ لگاتے ہیں۔ نام اور دھماکا، اگرچہ دھماکا مصنوعی سائلنسر کی وجہ سے زوردار نہیں تھا۔ تاہم کچھ فاصلہ بھی تھا۔ تینوں عناصر ایک دوسرے میں اُلجھ گئے۔" ہیری نے کہا۔ "مزید یہ کہ عینی شاہد ہراساں بھی تھا۔"

"تم نے چار نام بتائے تھے۔" وہ بولی۔ "اریٹو، مولیسا، اولیسا اور الیکسا...... کیا بات ہوئی؟ کیا تمہارا گواہ بھی سازش کا حصہ تھا۔ محض ایک فریب؟"

"نہیں۔ پوسٹر ملنے کے بعد راستہ کھل گیا۔ میں نے الٹا چلنا شروع کیا اور معما حل ہوتا گیا۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ قاتل نے نام ایلی سیا کا لیا تھا جو گاڑی سے نہیں اتری تھی۔ ناموں میں اریٹو کے علاوہ تینوں ناموں پر غور کرو...... گواہ کا خوف، فاصلہ اور دھماکے کا عنصر نکال دو تو وہ نام صاف سن لیتا...... ایلی سیا۔" ہیری مسکرایا۔

"لیکن وہ تو یہاں بندھی پڑی تھی۔" راشیل نے قدرے نرمی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی کا عنصر واپس آنے لگا۔

ہیری سنبھل گیا اور شرط لگانے سے پہلے اپنا بہترین پتّا نکالا۔ تصاویر والی فائل راشیل کی طرف بڑھائی۔

"دیکھو، کیا نظر آرہا ہے؟"

راشیل نے فائل کھولی اور مختلف زاویوں سے کھینچی گئی ماسٹر بیڈروم کی تصاویر دیکھنے لگی۔

"میں کیا مِس کر رہی ہوں؟" اس نے استفسار کیا۔

"مجھے۔"

"کیا؟" اس نے سر اٹھایا۔ ہیری رخسار کھجا رہا تھا۔

"دیکھو اس تصویر میں کپڑے نظر نہیں آرہے۔ اس نے بتایا تھا کہ حکم کے مطابق وہ کپڑے اتار کر بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ کیا ہم یقین کرلیں کہ گھر میں داخل ہونے والوں نے باندھنے سے پہلے ایلی سیا کو اجازت دی ہوگی کہ وہ لباس کو صحیح جگہ پر لٹکا دے؟ اب یہ آخری فوٹو دیکھو۔ ای میل فوٹو کا پرنٹ آؤٹ۔"

وہ پرنٹ کو گھور رہی تھی۔ ہیری نے دیکھا، اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔

"کیا دیکھا؟"

"گاؤن۔" اس نے ہیجانی آواز میں جواب دیا۔

"ہم نے جب اسے لباس لینے کے لیے اکیلا چھوڑا تو وہ گاؤن لینے کے لیے وارڈ روب کی طرف گئی۔ کرسی پر گاؤن نہیں تھا بلکہ کہیں نہیں تھا۔"

ہیری نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ "کہانی کہتی ہے کہ نرم دل دہشت گردوں نے گاؤن واپس جگہ پر رکھنے کے بعد اسے باندھا تھا یا پھر تمام کارروائی کے دوران میں مسز کینٹ کو دو بار باندھا گیا۔ بوجہ گاؤن بھی حرکت پذیر رہا...... اور اس تصویر میں کلاک کو دیکھو۔ اس کا پلگ ٹیبل کے نیچے تھا جسے نکال دیا گیا۔"

"کیوں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ تصویر میں صحیح وقت دکھائی دے۔ ممکن ہے کہ پہلا فوٹو ایک دن پہلے لیا گیا ہو...... یا دو دن یا دو ہفتے۔"

راشیل نے جس انداز میں سر کو جنبش دی۔ ہیری سمجھ گیا کہ وہ یقیناً بھی آخری منزل پر ہے۔

"ایک مرتبہ اسے باندھا گیا۔ فوٹو بنانے کے لیے۔ دوسری مرتبہ باندھا گیا بازیابی کے لیے۔ جب ہم نے آکر اسے کھولا۔" راشیل نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ اس نے اپنے شوہر کو نہیں مارا۔ مارنے والا اس کا ساتھی تھا لیکن وہ وہاں موجود تھی۔ بعدازاں انہوں نے سیسیم اور دیگر اشیا کو کچرے کے سپرد کیا۔ گاڑیاں پروفیسر کے گھر کے آگے کھڑی کیں۔ واپس آئے اور ایلی سیا کا ساتھی اسے باندھ کر نکل گیا۔ سب کچھ آس پاس ایک مخصوص دائرے میں اس لیے ہوا کہ پولیس کے آنے سے پہلے...... ایلی سیا کو باندھ کے ڈالنا تھا۔"

"یعنی جب ہم پہنچے تو وہ بے ہوش نہیں تھی۔ پلان کے مطابق ایک ڈراما تھا جس میں گیلے بستر نے رنگ بھر دیا۔" راشیل نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"ہاں اور پیشاب کی بُو نے انگوروں کے رس کی معمولی سی خوشبو کو بھی چرا لیا۔"

"کیا مطلب؟" راشیل چونکی۔

"خراشیں اور بندشوں کے اودے نشانات دراصل کاسنی انگوروں کے رس کا کرشمہ تھا۔ اودے نشانات بتا رہے تھے کہ اسے گھنٹوں پہلے باندھا گیا تھا جبکہ ایسا نہیں تھا۔ انگوروں کے رس کی بوتل ابھی تک ریفریجریٹر میں رکھی ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ......"

"کیا ہوا؟"

"جب ہم اُسے یہاں سے لے گئے تھے اور میں اس کے ساتھ خفیہ جگہ پر چھوٹے سے کمرے میں سوال جواب کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے وہم سا ہوا تھا کہ کہیں انگوروں کے رس کی خوشبو ہے۔ میں نے سوچا کہ ہم سے پہلے وہاں جو ہوگا، اس نے سرخ انگوروں کا رس پیا ہوگا...... اوہ تو......"

"اب تم سمجھ رہی ہو۔" ہیری نے کہا۔

معاً راشیل کے روشن چہرے پر ایک سایہ لہرایا۔ "لیکن محرک کہاں گیا؟" وہ بولی۔ "ہم ایک نامعلوم فیڈرل ایجنٹ کے بارے میں بات کر رہے ہیں جس کی وجہ سے ایک آدمی قتل ہوا اور ایک خود بالواسطہ مارا گیا۔ سیسیم اسپتال سے نکالی گئی۔ ہماری تھیوری میں کوئی جھول نہیں رہنا چاہیے۔"

ہیری اس سوال کے لیے تیار تھا۔

"محرک کیا تھا؟ ایک رخ تم دیکھ چکی ہو۔ وہ تھا ایلی سیا کا حسنِ جہاں سوز، تو بہ شکن......"

راشیل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "لیکن وہ (HE)......"

"مجھے بات ختم کرنے دو۔" ہیری نے کہا۔ "گزشتہ برس جب تم اور بریز ڈاکٹر کو ہوشیار کرنے آئے تھے، اس وقت ایلی سیا اور بریز کی آنکھ لڑی اور افیئر شروع ہوا۔ بات بڑھتی گئی، دوسرا رخ انشورنس کی رقم تھی۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر کا اپنے پارٹنر کی کمپنی میں نصف حصہ۔ زن اور زر...... یہ محرک کافی و شافی تھا۔ سیسیم، دہشت گردی یا کسی اور چیز کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سیدھا سادہ مرڈر تھا سیکس اور دولت کے لیے۔ اب لگاؤ شرط۔"

راشیل کی ایک بھوں پیشانی پر چڑھ گئی۔ اس کا سر دائیں بائیں ہل رہا تھا۔ "تم نہیں جانتے تم کیا کہہ رہے ہو۔ بریز شادی شدہ، تین بچوں کا باپ ہے۔ خشک مزاج اور بورنگ ہے۔ خرافات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"کوئی بھی کسی بھی وقت بدل سکتا ہے۔ عورت ایک فتنہ ہے...... سب نہیں تو اکثر...... اور مرد......"

"تم پوری بات سن لو۔ تم غلطی پر ہو۔ بریز اس سے پہلے ایلی سیا سے ملا ہی نہیں۔ جب میں گزشتہ سال یہاں آئی تھی تو وہ میرا پارٹنر نہیں تھا۔ یہ بات میں نے تمہیں کبھی نہیں بتائی۔ ضرورت تھی نہ موقع......"

ہیری نے زوردار جھٹکا کھایا۔ الیکٹرک شاک...... وہ شروع سے بریز کو پارٹنر فرض کرتا آیا تھا۔ بریز کی شبیہ لاشعوری طور پر کہانی میں فٹ ہوگئی تھی۔

"پھر اس وقت پارٹنر کون تھا؟"

"میں نے پارٹنر تبدیل کرلیا تھا۔"

"کون تھا؟"

راشیل اس کی آنکھوں میں دیر تک تکتی رہی......

"کلف میکسویل۔"

☆☆☆

ایک اور جھٹکا۔ وہ تقریباً ہنس دیا تھا لیکن کچھ نہ کر سکا۔ سر جھٹک کر رہ گیا۔ مطلب، راشیل یہ کہہ رہی تھی کہ مرڈر کیس میں ایلی سیا کا ساتھی، میکسویل تھا...... وہی جسے چند گھنٹے قبل ہیری کینٹ ہاؤس میں ہتھکڑی لگا چکا تھا۔

"یقین نہیں آتا۔" بالآخر وہ بولا۔

راشیل کبیدہ خاطر نظر آئی۔ اس بات پر کہ یہ گھناؤنا کام ایک اندر کے ممبر نے کیا تھا۔ سیسیم کا دھوکا خوب

عصمت

عصمت کے متعلق خود عورت کا جو معیار ہے۔ وہ مردوں کی پروازِ خیال سے اس قدر بلند و بالا ہے کہ وہ اس معیار کی بلندی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ عورتوں کو پردہ میں بٹھانے والے مرد جو اپنے آپ کو عورت کی عصمت کا محافظ سمجھتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ اپنی عصمت کی محافظ یا تو عورت خود ہوتی ہے ورنہ دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو عورت کو اس گمراہی سے روک سکے۔ اس لیے کہ مرد اپنے پورے استبداد اور اپنی پوری جابرانہ قوتوں سے کام لیں تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ عورت کو جسمانی عصمت شکنی سے محفوظ رکھ سکیں لیکن دراصل عصمت تو اسی وقت سے ختم ہو جاتی ہے جب کسی عورت کے ذہن میں اس قسم کا گمراہ خیال آجائے۔"

مرسلہ: عبدالرؤف ضیا، پنڈی گھیب (کیمبل پور)

صورتی سے دیا گیا۔

دونوں مہر بہ لب ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ کچھ کہنے سننے کا یارا نہ تھا۔ سب کو دہشت گردوں کے پیچھے لگا کر دونوں نے عیاشی کا سامان کر لیا تھا۔

''اگر کبھی ڈوبلی اور ساتھی پکڑے بھی گئے تو اس قتل کا دفاع نہیں کر سکیں گے۔''

''ہاں، یہ ایک مکمل جرم ہے...... قریب قریب......'' ہیری نے اعتراف کیا۔ ڈبرٹو غریب خوانخواہ دودھ میں مکھی بن کے گرا۔ ورنہ ہم ابھی تک......'' ہیری چپ ہو گیا۔

''اب ہمیں کیا کرنا چاہیے بوش؟'' الفت بھرا لہجہ پھر لوٹ آیا۔

ہیری نے شانے اچکائے، پھر کچھ سوچ کر کہا۔ ''دونوں کے لیے چوہے دان بنا کر دو الگ کمروں میں چھوڑ دیں گے اور گھنٹی بجائیں گے۔ دونوں پر الزام دھر دیں گے۔ بلیم گیم...... میرا اندازہ ہے کہ ایلی سیا بول پڑے گی۔ وہ الزام میکسویل پر لگائے گی کہ اس نے اپنی پوزیشن کو استعمال کرتے ہوئے اسے استعمال کیا۔''

''غالباً تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ نیز میرا نہیں خیال کہ میکسویل اتنا اسمارٹ ہے...... جو تم سے جان بچا لے۔ میں اس کے ساتھ کام کر چکی ہوں اور......'' راشیل کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون نکال کر اسکرین دیکھی۔

''بریز ہے۔'' اس نے بتایا۔

''باتوں کے دوران میں معلوم کرو، میکسویل کہاں ہے؟'' ہیری نے اشارہ کیا۔

راشیل نے فون اٹینڈ کیا۔ چند سوالات کے جواب دیے اور ہیری بوش کی خیریت کے بارے میں بتایا۔ وہ سرسری انداز میں باتوں کا رخ میکسویل کی طرف لے گئی۔ ''بائی دا وے، میکسویل کہاں ہے؟ مجھے بات کرنی ہے۔ ہال وے میں ہیری کے ساتھ اس کا رویہ مجھے برا لگا تھا۔''

اس نے رک کر جواب سنا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑتے دیکھ کر ہیری چوکنا ہو گیا۔

''کب کی بات ہے؟'' راشیل نے سوال کیا۔ جواب سننے کے بعد اس نے کہا۔

''سنو مجھے جانا ہوگا۔ ہیری کو شاید ڈسچارج کر رہے ہیں۔ فارغ ہوتے ہی میں وہاں آتی ہوں۔'' رابطہ ختم کرنے کے بعد اس نے ہیری کو دیکھا جو سوالیہ نظروں سے اسے تک رہا تھا۔

''کیا کہا اُس نے؟'' ہیری نے سوال کیا۔

''اس کا کہنا ہے کہ اکثریت سیسیم کے مقام پر ہے۔ اور وہ لوگ ریڈی ایشن ٹیم کا انتظار کر رہے ہیں۔ مارک ٹوئن سے گواہ کو اٹھانے کے لیے میکسویل نے اپنی خدمات پیش کیں۔''

''وہ اکیلا گیا ہے؟''

''بریز نے یہی بتایا ہے۔''

''کتنی دیر ہو گئی؟''

''نصف گھنٹا۔''

''وہ اُسے ختم کرنے گیا ہے۔ نکلو یہاں سے۔'' ہیری تیزی سے حرکت میں آیا۔ ''جیسی کے کمرے میں فون نہیں ہے۔''

ہیری نے ہالی ووڈ ڈویژن کے واچ کمانڈر سے رابطہ کر کے کہا کہ ایک پٹرول کار ہوٹل کی طرف روانہ کر دی جائے۔ جو گواہ کو چیک کرے گی پھر اس نے ہوٹل میں استقبالیہ کا نمبر ملایا۔

''ایلون، میں ہیری بوش بات کر رہا ہوں۔ صبح آیا تھا۔ پہچانا؟''

''او یس، کیا بات ہے آفیسر؟''

''کیا کسی نے چارلس ڈکنز سے ملنے کی کوشش کی؟''

''نہیں۔''

''گزشتہ بیس منٹ میں کوئی پولیس جیسا آدمی وہاں آیا تھا؟''

''نہیں، کیا ہوا؟''

''غور سے سنو۔ تم اوپر جا کر میرا پیغام چارلس ڈکنز تک پہنچاؤ گے۔ تم کہو گے کہ وہ فوراً وہاں سے نکل جائے اور کہیں سے مجھے فون کرے۔''

''فرنٹ ڈیسک پر میں اکیلا ہوں۔''

''یہ ایمرجنسی ہے۔ تمہارے پانچ منٹ خرچ ہوں گے۔ میرا نمبر لکھو...... تین دو۔ تین، دو۔ چار۔ چار، پانچ۔ چھ۔ تین۔ ایک۔ سمجھ گئے۔''

''ٹھیک ہے جاتا ہوں۔''

''گڈ، میرے علاوہ کوئی آئے تو کہنا کہ وہ چیک آؤٹ کر گیا ہے...... شکریہ۔'' اس نے فون بند کر کے راشیل کی طرف دیکھا۔ راشیل سمجھ گئی کہ ہیری ایلون پر تکیہ نہیں کر سکتا۔ ہیری کے تاثرات یہی کہہ رہے تھے۔

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پوری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ ہیری نے اندازہ لگایا کہ وہ پانچ منٹ

میں مارک ٹوئن ہوٹل پہنچ سکتا ہے۔ اس نے بے چینی محسوس کی۔ میکسویل کو نصف گھنٹے کی سبقت حاصل تھی۔

''اس نے ہوٹل کا عقبی راستہ بھی اختیار کیا ہوگا تو وہ جیسی تک پہنچ چکا ہوگا۔'' ہیری نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ''استقبالیہ کلرک پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔''

''ممکن ہے وہ صرف یہ جاننا چاہ رہا ہو کہ جیسی اس کے لیے خطرہ بن سکتا ہے یا نہیں......'' راشیل نے خیال ظاہر کیا۔

ہیری نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئی چانس نہیں ہے۔ کوڑے دان سے سیسم کی برآمدگی کے بعد وہ کوئی رسک نہیں لے گا۔ اس کی سازش کا تار و پود بکھر چکا ہے۔ ایک ہی راستہ ہے کہ وہ جلد از جلد ممکنہ خطرات کا صفایا کر دے۔ پہلے گواہ پھر ایلی سیا۔''

''ایلی سیا؟ جس کے لیے سب ہنگامہ ہوا۔ کیا وہ اس کے خلاف جائے گا؟'' راشیل نے شک کا اظہار کیا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب جان پر بن آئے تو باقی تمام ترجیحات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اس نے ایک بڑا قدم اٹھایا ایلی سیا کے لیے...... اب وہ ایسا ہی قدم صرف اپنی خاطر اٹھائے گا...... اور......''

دفعتاً وہ چپ ہو گیا۔ سینے میں گھونسا سا لگا۔ اس نے بلند آواز میں خود پر لعنت بھیجی...... ہالی ووڈ باؤل کے سامنے اس نے ہائی لینڈ ایونیو پر خطرناک انداز میں تین لائنیں کراس کیں اور چیختے پہیوں کے ساتھ سامنے سے آنے والے ٹریفک سے بچ کر یوٹرن لیا۔ کار ایک طرف سے اٹھی...... اور ہالی ووڈ فری وے پر دوڑنا شروع کیا۔ راشیل کا ایک ہاتھ ڈیش بورڈ اور دوسرا ہینڈل پر تھا۔

''ہیری کیا کر رہے ہو؟''

ہیری نے سائرن آن کیا...... چھت کی بتی بھی روشن ہو گئی۔ وہ رفتار بڑھاتا چلا گیا اور چلا کر جواب دیا۔ ''جیسی کی طرف جانے کا اُس نے دھوکا دیا ہے۔ اس کے لیے بڑا خطرہ کون ہے؟''

''ایلی سیا۔'' راشیل نے بلند آواز میں کہا۔

''ہاں، وہ ایلی سیا کو ٹیکٹیکل انٹیلی جنس یونٹ سے نکالنے گیا ہے۔'' ہیری نے کہا۔ وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کیا وہ بغیر سائرن کے عام انداز میں گیا ہوگا۔

راشیل نے سیل فون نکالا۔ وہ نمبر کے بعد نمبر ملا رہی تھی۔ لاحاصل...... کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔

''TIU کہاں ہے؟''

''اس مرتبہ راشیل نے بلا جھجک جواب دیا۔ ''براڈوے پر، ملین ڈالر تھیٹر بلڈنگ کی تیسری انٹری۔''

ہیری نے سائرن بند کیا اور اگنا سیو کا نمبر ملایا۔

''کہاں ہو تم؟''

''چھوڑ دو سب کچھ...... ملین ڈالر تھیٹر بلڈنگ پہنچو۔ تیسری سڑک سے داخل ہونا۔ کوئی سوال نہیں۔ جلدی کرو۔'' اس نے فون بند کر کے سائرن آن کر دیا۔

☆☆☆

اگلے دس منٹ، دس گھنٹوں کے مانند تھے۔ ہیری تیز رفتار بل کھاتے سانپ کے مانند ٹریفک میں راستہ بنا رہا تھا۔ تین بلاک پیچھے اس نے سائرن بند کر دیا۔ وہ تھیٹر کے قریب تھے۔ بلند عمارت نظر آتے ہی اس نے کہا۔

''سیکرٹ یونٹ اور سیکرٹ آفس کے لیے اچھی جگہ۔ کوئی شک نہیں کر سکتا۔''

راشیل نے پھر کال کرنے کی کوشش کی اور مایوسی کے عالم میں فون بند کر دیا۔ ''سیکریٹری کو تو ہونا چاہیے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''کون سی منزل؟''

''ساتویں۔'' راشیل نے جواب دیا۔

''اسکواڈ؟''

''آٹھ ایجنٹ...... آفس منیجر چھٹی پر ہے، سیکریٹری غالباً لنچ کے لیے نکلی ہوگی۔ لیکن ایلی سیا کو تنہا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ پالیسی کے خلاف ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

ہیری نے موڑ کاٹا اور تیسری اسٹریٹ میں داخل ہو کر گاڑی روک دی۔ کچھ دور اگنا سیو عام سے انداز میں والوو اسٹیشن ویگن کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ویگن کے قریب ایک ایف بی آئی کی کار کھڑی تھی۔ وہ دونوں گاڑی سے اترے۔ ہیری، اگنا سیو کی طرف گیا اور راشیل نے فیڈرل بیورو کی کار میں جھانکا۔

''کیا تم نے میکسویل کو دیکھا؟'' ہیری نے اگنا سیو سے سوال کیا۔

''کون؟''

''وہی جسے ہم نے کینٹ ہاؤس میں باندھا تھا۔''

''نہیں، میں نے کسی کو نہیں دیکھا، کیا مسئلہ ہے؟''

اسی اثنا میں راشیل ان دونوں کے قریب آ گئی۔

''وہ کار اسی کی ہے۔'' اس نے انکشاف کیا۔

ہیری نے اگنا سیو کو بتایا کہ راشیل کون ہے۔ دونوں نے مصافحہ کیا۔

''اس کا مطلب وہ اوپر ہے۔'' ہیری بولا۔ ''کتنی سیڑھیاں ہیں؟''

''تین اسٹیئر ویلز۔'' راشیل نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ ان سیڑھیوں سے باہر آئے گا جو اس کی کار سے قریب ہیں۔'' راشیل نے کونے کی جانب ڈبل اسٹیل ڈور کی طرف اشارہ کیا۔

ہیری نے ڈور کا رخ کیا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے تھے۔

''آخر ہو کیا رہا ہے؟'' اگنا سیو کی آواز آئی۔

''میکسویل، ڈاکٹرز کا قاتل ہے۔'' ہیری نے جواب دیا۔

اگنا سیو حیرت زدہ رہ گیا۔

ہیری نے ڈور کا جائزہ لیا، باہر کی جانب کوئی ناب یا ہینڈل نہیں تھا۔ اس نے زور دیا تو پٹ تھوڑے سے کھل گئے۔ وہ مڑا اور اگنا سیو کو دیکھا۔

''غور سے سنو، وقت کم ہے۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ میکسویل ہمارا ٹارگٹ ہے۔ وہ یہاں ایلی سیا کو لانے آیا ہے۔''

''ایلی سیا؟ وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''یہ بھی ایف بی آئی کی ایک خفیہ لوکیشن ہے۔ وہ یہاں لائی گئی تھی۔ سوالات مت کرو۔ میں اور راشیل اوپر جا رہے ہیں۔ تم اس دروازے پر نظر رکھو گے۔ اگر میکسویل یہاں سے نکلے، اسے قابو کر لینا۔ چاہے گولی چلانا پڑے۔ میں سنجیدہ ہوں۔''

''سمجھ گیا۔'' اگنا سیو نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ایف بی آئی کی ایجنٹ ہیری کے ساتھ ہے۔

''گڈ، اس دوران میں 'بیک اَپ' کے لیے کال کر لینا اور چوکس رہنا۔'' یہ کہہ کر ہیری، راشیل کے ہمراہ اندر داخل ہو گیا۔ اندر کوئی لابی نہیں تھی۔ صرف ایلی ویٹر۔ بٹن دبانے پر ایلی ویٹر کا در کھلا۔ ساتویں منزل کے لیے راشیل نے ''کی کارڈ'' استعمال کیا۔ ایلی ویٹر کا عمودی سفر شروع ہو گیا۔

''اگر یہ ساتویں منزل پر پہنچی تو کسی روشنی یا بیل کا اشارہ جائے گا؟'' ہیری نے سوال کیا۔

''مجھے یاد...... میرا خیال ہے...... ہاں یقیناً ایسا ہو گا۔''

''برا ہو گا۔ مطلب ہم ساکت بطخوں کے مانند نشانے پر ہوں گے۔'' ہیری نے اپنا کیمبر، ہولسٹر سے کھینچا۔ راشیل نے بھی گن باہر نکالی۔ ہیری نے اسے ایک دیوار کے ساتھ لگایا اور خود مخالف دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ گن پر تھے۔ گن کا رخ شانے کے قریب چھت کی جانب تھا۔ دونوں حملے کی پوزیشن میں تھے...... بالآخر ایلی ویٹر ساتویں منزل پر پہنچ گیا...... در کھلا اور گھنٹی بجنے کی ہلکی سی آواز آئی۔

وہاں کوئی نہیں تھا۔ راشیل نے بائیں طرف جھانکا جہاں دفاتر تھے۔ ہیری فائر کے لیے تیار تھا۔ وہ جنگی حالت میں باہر آیا۔ دونوں شانہ بشانہ قدم بہ قدم دفاتر کی طرف بڑھے۔ کیوب نما دفاتر میں اسکواڈ روم اور تین پرائیویٹ روم تھے۔ ہر جانب سناٹا تھا۔

ہیری نے کھڑکی سے پہلے کمرے میں جھانکا۔ کرسی پر ایک آدمی نیم دراز تھا۔ سینے پر سرخ تولیا تھا۔ سر پیچھے کی طرف اور آنکھیں بند تھیں۔ لمحہ بھر میں ہیری نے دیکھ لیا کہ وہ تولیا نہیں خون تھا۔ اسے سینے میں گولی ماری گئی تھی۔ اس نے آنکھ سے راشیل کو اشارہ دیا۔ راشیل نے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت مدھم آہ خارج ہوئی۔

کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ ہیری نے احتیاط اور آہستگی سے اندر قدم رکھا۔ راشیل پشت سے اسے کور کر رہی تھی۔ ایلی سیا کینٹ دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھی تھی۔ ہیری گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ایلی سیا کی کھلی ہوئی مقناطیسی آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ آنکھوں کا مقناطیس بھی کشش کی طاقت کھو بیٹھا تھا۔ ایک گن، فرش پر ایلی سیا کی ٹانگوں کے درمیان پڑی تھی۔ اس کے عقب میں دیوار خون سے رنگین تھی۔ خون تازہ تھا۔

ہیری نے سر گھما کر کمرے کو کھنگالا...... یہ سیٹ اَپ تھا۔ بظاہر یوں لگ رہا تھا کہ ایلی سیا نے ایجنٹ کی گن ہتھیا کر اسے ختم کیا۔ بعدازاں اسی ہتھیار سے اپنی جان لے لی۔ کوئی تحریر، کوئی وضاحت نمایاں نہیں تھی۔ میکسویل مختصر وقت میں اس سے زیادہ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

ہیری کھڑا ہو گیا۔ ''راشیل، وہ شاید ابھی یہیں ہے۔'' ہیری نے سرگوشی کی۔ راشیل نے خاموشی سے سر ہلایا۔ ہیری نے باہر آ کر اسکواڈ روم کی کھڑکی میں جھانکا۔ عین اسی وقت الیکٹرونک ریک کے پیچھے کسی کی جھلک نظر آئی۔ ہیری نے گن اوپر کی اور چوکنا ہو گیا۔ نگاہ ریک پر جمی ہوئی تھی۔ راشیل کو اس نے پیچھے رکھا تھا۔ جھلک پھر نظر آئی۔ ریک کے پیچھے سے کوئی باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ آڑ ختم ہو گئی۔ وہ میکسویل تھا۔

''میکسویل!'' ہیری دہاڑا۔ ''رک جاؤ۔''

رکنے کے بجائے اس نے گھوم کر فائرنگ کی۔ کھڑکی کے پرخچے اڑ گئے۔ شیشے، ہیری کے اطراف میں برسے۔ ہیری نے نیچے بیٹھتے ہوئے ہاتھ پھیلا کر دروازے پر جوابی فائرنگ کی جو باہر کی جانب کھل گیا تھا۔

''راشیل، تم ٹھیک ہو؟'' اسی خمیدہ حالت میں نگاہ پھیرے بغیر سوال کیا۔ راشیل کی آواز فرش کی طرف سے آئی۔ وہ شوٹنگ کے آغاز پر ہی نیچے لیٹ گئی تھی۔

''وہ کہاں ہے؟''

''سیڑھیوں پر۔'' راشیل نے جواب دیا۔ ہیری مزید جھکا اور لڑھکتا ہوا مخالف دیوار کے ساتھ جا لگا۔ منظر صاف ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ کھلے ہوئے دروازے کے عین سامنے سیڑھیاں تھیں جہاں سے چند گولیاں ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے آس پاس داغی گئیں۔ پھر سناٹا۔ ہیری نے سیڑھیوں پر دو فائر کیے۔ دھپ دھپ کی آواز کے ساتھ قدموں کی آہٹ دور ہوتی گئی۔

ہیری اٹھ کھڑا ہوا اور سیڑھیوں کی جانب لپکا۔ راشیل بھی کپڑے جھاڑ کر اٹھی۔ اس کے رخسار پر کٹ لگا ہوا تھا۔ ہیری نے سیل فون پر اسپیڈ ڈائل استعمال کیا۔ پوری گھنٹی بجنے سے پہلے اگنا سیو کا جواب آیا۔

''ہوشیار، وہ نیچے آ رہا ہے۔'' ہیری نے فون بند کیا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگنی شروع کیں۔ تاہم اسے اندازہ تھا کہ میکسویل فاصلہ بڑھا چکا ہے۔

☆☆☆

ہیری نے تین لینڈنگ کے بعد تین تین سیڑھیوں پر کودنا شروع کیا۔ کچھ فاصلے پر راشیل اس کے عقب میں تھی۔ اچانک نیچے سے دھماکا نما آواز آئی۔ میکسویل سیڑھیوں کے آخر میں دروازے سے ٹکرایا تھا۔ فوراً بعد کوئی چیخا اور فائرنگ کے دھماکے۔ اندازہ نہیں ہو سکا کہ کتنی گولیاں چلیں...... کیا حشر ہوا۔

وہ دس سیکنڈ بعد باہر تھرڈ اسٹریٹ پر تھا۔ ہیرو کی کار کے ساتھ اگنا سیو ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ میں اس کی گن تھی۔ اسی ہاتھ کو کہنی کے قریب سے اس نے دوسرے ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا۔ شانے کے قریب خون کا دھبا پھیلتا جا رہا تھا۔ دو طرفہ ٹریفک تھم گیا تھا۔ پاپیادہ چلنے والے تحفظ کے لیے بھاگ رہے تھے۔

''میری دو گولیاں اُسے لگی ہیں۔'' اگنا سیو اذیت کے باوجود چلایا۔ ''اس طرف گیا ہے۔'' اس نے سمت بتائی۔

ہیری نے سر ہلایا۔ سمت کہہ رہی تھی کہ وہ بنکر ہل کی سرنگ میں گیا ہے۔ ہیری نے رک کر پارٹنر کا زخم دیکھا۔ تشویش کی بات نہیں تھی۔

''بیک اَپ کو کال کی تھی؟''

''ہاں، وہ راستے میں ہیں۔'' اگنا سیو نے کہا۔

''جمے رہو، تم نے کارنامہ انجام دیا ہے۔ مدد پہنچنے والی ہے۔ ہم اس کے پیچھے جا رہے ہیں۔''

ہیری اور راشیل ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر اگنا سیو کی بتائی ہوئی سمت کی طرف گئے۔ میکسویل کو پانا آسان تھا۔ اگنا سیو نے اسے خاصا زخمی کر دیا تھا۔ انہیں خون کے قطرے نظر آ رہے تھے۔ ہیری نے راشیل کا خون آلود رخسار دیکھ لیا تھا۔ تاہم خاموش رہا۔ وہ خونی نشان دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ لیکن تھرڈ اسٹریٹ اور گرینڈ سینٹرل مارکیٹ کے مشترکہ کونے پر دھبے غائب ہو گئے۔

''اس طرف۔'' ہیری نے اشارہ کیا۔

دونوں تیزی سے وسیع مارکیٹ کی طرف بڑھے۔ خونی دھبے پھر نظر آئے۔ ہیری ان کے سہارے اندر گھس گیا۔ مارکیٹ دو منزلہ تھی۔ مارکیٹ میں شور اور ہجوم تھا۔ دونوں عناصر دشواری پیدا کر رہے تھے۔ معاً دھماکوں کے ساتھ چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ غالباً ہوائی فائرنگ ہوئی تھی۔

ہجوم بے ہنگم انداز میں گرتا پڑتا باہر کی جانب رواں ہوا۔ ہیری نے تیزی سے انسانی لہر کا اندازہ کیا اور راشیل کا ہاتھ پکڑ کر ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مارکیٹ خالی ہو چکی تھی۔ ہیری نے آڑ سے جھانکا، میکسویل غائب تھا۔ کیا وہ ہجوم کے ساتھ نکل گیا؟ ہیری نے خود سے سوال کیا۔ مشکل ہے، وہ زخمی ہے...... اس نے خود ہی جواب دیا۔ آنکھیں حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ پھر اسے گوشت کی دکان کے مخالف سمت کے شیشے میں حرکت نظر آئی۔ اس نے غور کیا۔ میکسویل گوشت کی دکان میں تھا۔ ہیری نے خطرہ مول لے کر آڑ چھوڑ دی۔ وہ لٹکتے ہوئے گائے کے ٹکڑوں کے درمیان جھانکتا رہا تھا۔

ہیری نے دیکھا کہ میکسویل دکان کے عقبی حصے میں ریفریجریٹر سے ٹیک لگائے نیچے بیٹھا ہے۔

''وہ گوشت کی دکان میں نیچے بیٹھا ہے۔'' آڑ میں آ کر ہیری نے سرگوشی کی۔ ''تم گھوم کر اس طرف سے

دائیں جانب آؤ اور میں سامنے سے...... اس طرح میں اس کی سائڈ میں رہوں گا اور تم ریفریجریٹر کے سامنے ہوگی۔"

"خطرہ؟"

"ہاں، خطرہ ہے لیکن تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو۔ خطرہ تمہارے سامنے ہوگا۔ میں اس طرف سے جا کر اس کی توجہ بٹاؤں گا۔ اس نے تم پر گولی چلائی تو اسے کھڑا ہونا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

ہیری نے پھر حالات کا جائزہ لیا۔ وہ وہیں بیٹھا تھا۔ چہرے پر پسینا اور سرخی تھی۔

"حرکت کرو، وہ وہیں ہے۔"

راشیل نے سر ہلایا پھر دونوں نے جگہ چھوڑ دی۔

ہیری آڑ بدلتا ہوا لیکن کافی شاپ تک چلا گیا۔ دکان کی بلند دیواریں دفاع کے لیے موزوں تھیں۔ بیس فٹ دور میکسویل کا سائڈ ویو نظر آ رہا تھا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ قمیص پوری خون میں بھیگی ہوئی تھی لیکن اس نے گن دونوں ہاتھوں سے تھامی ہوئی تھی۔ ہیری نے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ دفعتاً راشیل کی آواز گونجی۔

"میک، میں ہوں...... راشیل۔ مجھے مدد کے لیے آنے دو۔" وہ کھلی جگہ پر کھڑی تھی۔ گن والا ہاتھ نیچے تھا۔

"مدد کا وقت نکل گیا۔" میکسویل کی کراہتی ہوئی آواز آئی۔ "بہت تاخیر ہوگئی ہے۔"

"کم آن، اس طرح مت سوچو۔"

"اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

اچانک میکسویل کے جسم نے جھٹکا کھایا۔ کھانسی اٹھی جس کے ساتھ لہو ہونٹوں تک آ گیا۔

"گاڈ، اس آدمی نے مجھے مار ہی دیا۔" دوبارہ کھانسنے سے پہلے وہ بولا۔

"میک مجھے آنے دو۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں، تم آئیں تو میں......" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فائرنگ ہوئی۔ راشیل تاڑ گئی تھی۔ وہ پھرتی سے نیچے گری اور آڑ میں چلی گئی۔ میکسویل کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ٹھیک نشانہ لیتا یا کھڑا ہوتا۔

ہیری دونوں ہاتھوں میں گن تھامے باہر نکلا۔ شوٹنگ پوز میں اس نے قدم اٹھایا۔ پھر دوسرا...... نشانہ میکسویل کی کھوپڑی تھی۔ جس نے گن اپنی گود میں رکھ لی تھی۔ خون اس کی باچھوں سے رس رہا تھا۔ اس نے چھینے کی کوشش کی۔

"میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں...... اُس کا قصور تھا...... وہ شوہر سے جان چھڑانا چاہتی تھی...... میں صرف اسے چاہتا تھا۔ اس نے مجھے راستہ دکھایا...... کسی طرح شوہر کو ہٹانا پڑے گا...... اور...... میں نے کر دیا۔ لعنت ہے مجھ......"

ہیری نے ایک قدم اور لیا۔ میکسویل نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا تھا۔

"سوری، راشیل...... ان کو بتا دینا۔"

"تم خود بتاؤ گے۔ حوصلہ رکھو۔"

دفعتاً میکسویل نے گن اٹھا کر ٹھوڑی کے نیچے رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔ سر نے پیچھے کی طرف جھٹکا کھایا۔ خون ریفریجریٹر ڈور کے اوپری حصے تک چلا گیا۔ گن اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان فرش پر گر گئی۔ وہی انداز تھا جس انداز میں اس کی محبوبہ ختم ہوئی تھی۔

☆☆☆

ہیری نے گھڑی دیکھی۔ ایک بج رہا تھا۔ بارہ گھنٹے سے کچھ اوپر ہوئے تھے اور کیس کلوز ہو گیا تھا۔ پانچ افراد مارے گئے تھے۔ چھٹے نے اسپتال میں دم توڑا تھا اور ایک زخمی تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ایک اوورلک جیسے مقام پر مارا گیا اور مارنے والے نے قصائی کی دکان میں دم توڑا۔ موت ہم سب کے اردگرد چکرا رہی ہے۔ کسی کو جلد جھپٹ لے گی، کسی کو دیر سے۔ کچھ موت کو آتا دیکھ لیں گے اور بہت سے بے خبر ہوں گے کہ فرشتۂ اجل سر پر منڈلا رہا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ اہم بات ہے کہ آپ نے مثبت انداز اختیار کرنا ہے اور آخری سانس تک لڑنا ہے۔ زندگی جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" راشیل کی آواز نے اسے خیالات کی دنیا سے باہر نکالا۔ راشیل کی آنکھوں میں حزنیہ تاثر تھا۔

"کچھ نہیں۔" ہیری نے اس کے زخمی رخسار کی طرف دیکھا۔ "نشان رہ جائے گا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ہیری نے اس کا گداز ہاتھ تھام لیا۔ خود اس کے چہرے پر تاسف کی علامات موجود تھیں۔ دونوں نے بوجھل قدموں سے باہر کا رخ کیا، جہاں سائرن کی آوازیں خاصی بلند ہو گئی تھیں۔

تلاش

محمد عفان آزاد

والدین اولاد کے لیے نعمت ہوتے ہیں... ان کی اچانک موت بچوں کو ایسے درد سے دوچار کرتی ہے کہ وہ اس غم ناک دردناک سانحے سے بمشکل نکل پاتے ہیں... مال و زر کے لیے خونی رشتے بھی لہو لہو ہو جاتے ہیں... میراث میں ملنے والے ایک قدیم گھر کی کتھا... جس سے کئی کہانیاں وابستہ ہو چکی تھیں...

در و دیوار میں بسی پراسراریت کا انوکھا اور تحیر خیز انکشاف



ایک ہفتہ قبل ہوورڈ اپنے نئے مکان میں منتقل ہوا تھا اور یہاں کی قدیم آرائشی اشیا کو جدید طرزِ زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے وکٹورین طرز کی لکھنے کی میز کو اسٹڈی کے وسط میں رکھا۔ سماوار سے گرم چائے نکالی اور لیپ ٹاپ میز پر رکھ دیا۔ اس کے برابر میں ایک لڑکی کی فریم شدہ تصویر رکھی ہوئی تھی جس میں وہ مکان

کے عقب میں جھولا جھول رہی تھی۔ یہ تصویر ان آرائشی اشیا سے مختلف تھی جو سابقہ مالکان چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

اس نے کھڑکی کی طرف قدم بڑھایا اور دیکھا کہ ایک عورت پردے کے پار سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ عورت کون ہو سکتی ہے۔ وہ درمیانی عمر کی سفید فام عورت تھی اور خاصی پُرکشش لگ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ مکان میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا تعلق کسی فلم یونٹ سے ہو۔ شاید وہ یہاں کسی فلم کی شوٹنگ کرنا چاہ رہے ہوں یا پھر وہ کوئی پڑوسن ہو جو نئے سیاہ فام مکین کی جاسوسی کر رہی ہو۔

ہوورڈ نے بیرونی دروازہ کھولا اور یہ احتیاط کی کہ اس کا پاؤں پورچ کے بالکل قریب لگے ہوئے دھبے پر نہ پڑنے پائے۔ وہ اسے اسی وقت صاف کرسکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

''ہیلو!'' اس نے ٹرکوں، ویگنوں، کھانے کے سامان اور برقی موٹروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

وہ عورت اپنے خیالوں سے چونکتے ہوئے بولی۔ ''معاف کرنا۔ تم ضرور یہ سمجھ رہے ہوگے کہ میں مداخلتِ بے جا کر رہی ہوں۔''

ہوورڈ نے کچھ نہیں کہا لیکن وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کیا وہ بھی اس بلاک میں کسی نئے سیاہ فام کو دیکھ کر حیران ہو رہی ہے۔

''یہ فلم والے نہیں چاہتے کہ میں اس طرف آؤں۔''

''یہاں ہمیشہ کسی نہ کسی فلم کی شوٹنگ ہوتی رہتی ہے یا جیسا مجھے بتایا گیا ہے۔'' ہوورڈ نے کہا۔ کیرول ایونیو ایسے تاریخی وکٹورین طرز کے گھروں سے بھرا پڑا تھا جنہیں بنکرہل سے یہاں منتقل کیا گیا۔ اسی لیے یہ فلم والوں کی پسندیدہ لوکیشن تھی۔

''وہ یہاں اس طرح کام کرتے ہیں جیسے یہ ان کی اپنی جگہ ہو۔'' ہوورڈ نے کہا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔

''تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟'' وہ بولی۔

''تم مجھے جانی پہچانی لگتی ہو۔''

وہ لان عبور کر کے پورچ کے پاس آئی اور بولی۔ ''میں اس گھر میں رہا کرتی تھی۔''

ممکن ہے کہ ہوورڈ بھوتوں پر یقین نہ رکھتا ہو لیکن وہ ہر اس جگہ پائے جاتے ہیں جہاں آپ انہیں دیکھنا چاہیں۔ بھوتوں اور جنوں کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان پر بے شمار فلمیں بن چکی ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کی عکس بندی کیرول ایونیو اور بنکرہل میں بھی ہو چکی ہے لیکن وہ عورت بھوت نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت تھی۔

ہوورڈ مسکرا دیا۔ وہ اس عورت کو جانتا تھا۔ یہ وہی تصویروں والی لڑکی تھی جو بار بار اس کے خوابوں میں آتی اور رات کو اس کی نیند اڑا دیتی۔ یہ وہی بھوت تھا۔ اس نے اس عورت کو اندر آنے کی دعوت دی اور کہا۔ ''احتیاط کرنا کہ اس دھبے پر تمہارا قدم نہ پڑنے پائے۔ یہ اس جگہ کا نشان تھا جہاں مجھے گولی ماری گئی۔ میرے بہترین دوست ہوورڈ نے یہ مکان میری بیوی نکول سے خریدا تھا جس نے مکان میں موجود تمام چیزیں مثلاً قیمتی فرنیچر، نایاب تصاویر اور دیواروں پر آویزاں پرانے فوٹو کسی اضافی معاوضے کے بغیر اس کے حوالے کر دیے۔

وہ اسے لیونگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک فریم شدہ تصویر اور چائے کے دو کپ تھے۔ اس تصویر میں ایک لڑکی جھولا جھول رہی تھی اور ایک درمیانی عمر کا شخص اسے جھولا جھلا رہا تھا۔ اس کے پڑوس والے مکان پر بھاری مشینری لگا دی گئی تھی اور اسے وہاں سے منتقل کرنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ سوٹ اور ڈانگریاں پہنے اڑسٹھ ماڈل کی ڈاج کار کے پاس کھڑے لڑکی کی مکان کی طرف اشارہ کر کے باتیں کر رہے تھے۔

ہوورڈ نے وہ تصویر اسے دی۔ عورت نے اسے دیکھا اور اس پر اپنی نظریں جما دیں۔

''یہ میں ہوں۔'' اس نے کہا۔ اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا اور آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔

''میں جانتا ہوں۔'' ہوورڈ نے کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''تمہاری آنکھیں اس تصویر والی سے بہت ملتی ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ کچھ چیزیں عمر بڑھنے کے باوجود بھی نہیں تبدیل ہوتیں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور چیزوں پر بہت زیادہ توجہ دیتا ہوں۔''

اس نے اپنا کارڈ اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میری نیندیں اڑا دی ہیں۔''

''کیا؟''

''تمہاری تصویریں۔ میں نے اس مکان میں تین

تصویریں دیکھی ہیں جو مسلسل مجھے پریشان کر رہی ہیں اور میں سوچتا رہتا ہوں کہ ان تصویروں میں یہ لڑکی کون ہے اور اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔''

''یہ تمہارے اندر کا سراغ رساں بول رہا ہے۔'' اس نے تصویر کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں بہت جلدی میں یہاں سے جانا پڑا۔ جس کی وجہ سے کئی چیزیں یہاں رہ گئیں۔ یہ تصویر جانے سے پہلے لی گئی تھی۔ حادثے سے چند روز قبل۔''

''حادثہ؟''

''میرے والدین کو ایک شرابی ڈرائیور نے ہلاک کر دیا تھا۔''

''اوہ، یہ سن کر افسوس ہوا۔''

''اس واقعے کو بہت عرصہ ہوگیا۔''

ہوورڈ نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اوپر اور بھی تصویریں ہیں۔''

''میں وہ بھی دیکھنا چاہوں گی۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔''

ہوورڈ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر گیا اور دو مزید فریم شدہ تصویریں لے کر آگیا۔ ایک تصویر میں وہ گھر کے سامنے اپنے سے بڑی عمر کے لڑکے کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی جبکہ دوسری تصویر اس کی پورٹریٹ تھی۔ اس نے وہ تصویریں اس سے لے لیں اور انہیں پیار سے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہوورڈ نے جیب سے رومال نکال کر اسے پیش کیا اور وہ اپنے گال صاف کرنے لگی۔

''معاف کرنا۔ اس مکان اور تصویروں کو دیکھ کر میں جذباتی ہوگئی اور بہت سی باتیں یاد آگئیں۔''

''ان تصویروں میں تمہارے ساتھ دوسرے لوگ کون ہیں؟''

''جھولا جھلانے والا میرا باپ ہے اور دوسری تصویر میں میرا بڑا بھائی لیری ہے۔ وہ مجھ سے عمر میں کئی سال بڑا تھا۔''

''تم اس مکان میں کب رہا کرتی تھیں؟''

''ساٹھ کی دہائی میں۔ انہوں نے ہم سے وہ جگہ خالی کرنے کے لیے کہا تاکہ وہ وہاں نیا بنکرہل تعمیر کر سکیں۔ انیس سو اکہتر میں ہمیں وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا گیا لیکن اس سے پہلے ہی میرے والدین مر گئے۔ اب میرے پاس اس مکان اور اپنے خاندان کی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ وہ بہت اچھے دن تھے، اس کے بعد......''

''آج تم نے یہاں آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''میں اس بارے میں کافی عرصے سے سوچ رہی تھی۔ جانتی تھی کہ انہوں نے اس مکان کو مسمار کرنے کے بجائے وہاں سے ہٹا دیا تھا لیکن کچھ عرصہ پہلے تک یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے کہاں منتقل کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اسے ایک بڑی کرین سے اٹھا کر پہیوں والے پلیٹ فارم پر رکھا گیا تھا تاکہ اسے کسی دوسری جگہ لے جایا جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس علاقے میں وہی آخری مکان رہ گیا تھا۔ میرے ڈیڈی اسے بیچنا نہیں چاہ رہے تھے۔ بلڈر سمجھ رہا تھا کہ وہ زیادہ پیسوں کے لیے ایسا کر رہے ہیں جبکہ میں سمجھتی ہوں کہ ایسی بات نہیں۔ انہیں اس مکان، جگہ اور وہاں کی ہر چیز سے محبت تھی۔ جب حال ہی میں میرے شوہر کا انتقال ہوا تو میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اب وہ مکان کہاں ہے اور یہاں پہنچ گئی۔''

اس نے ہوورڈ کو غور سے دیکھا اور بولی۔ ''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا اگر میں اسے اندر سے دیکھ لوں۔''

وہ اسے اپنے ساتھ لے کر مکان دکھانے لے گیا۔ وہ ہوورڈ کے دفتر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہمارا کھیلنے کا کمرا تھا۔ میں اور بھائی یہاں بورڈ گیم کھیلا کرتے تھے اور اس کونے میں لکڑی پر اپنے نام لکھا کرتے تھے۔''

وہ اس کونے تک گئی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنی انگلیوں سے وہ جگہ صاف کرنے لگی، وہاں پامیلا اور لیری لکھا ہوا تھا۔

''یہ ابھی تک یہاں ہیں۔'' وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ ''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اس کی ایک تصویر لے لوں۔''

ہوورڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے اپنا آئی پیڈ نکالا اور اس کونے کی تین تصویریں کھینچ لیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ میں تمہاری خلوت میں مداخلت کر رہی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں مسز......''

''پامیلا کارڈن۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''یہاں آکر بہت سی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ہم حادثے کے فوراً بعد یہاں سے چلے گئے تھے۔''

''تم اور تمہارا بھائی؟''

''ہاں لیکن ہماری پرورش دو مختلف خاندانوں میں ہوئی اور کچھ عرصے بعد ہمارا رابطہ ختم ہوگیا۔ میں نے کئی

سالوں سے اسے دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''کیا میں وہ جھولے والی تصویر دوبارہ دیکھ سکتی ہوں؟''

ہوورڈ نے وہ تصویر اسے پکڑا دی اور وہ اسے بڑے پیار سے دیکھتی رہی، پھر اس نے اپنی چائے ختم کی اور بولی۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے۔ میں نے تمہارا بہت وقت لے لیا۔ بہت بہت شکریہ۔''

وہ اسے رخصت کرنے باہر پورچ تک آیا تو وہ بولی۔ ''مسٹر ہوورڈ۔ میں تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

''کس سلسلے میں؟''

''میرے بھائی کو تلاش کرو۔ میں اس کا معاوضہ ادا کروں گی۔''

ہوورڈ نے کہا۔ ''میں اس بارے میں سوچوں گا۔''

وہ اپنی نئے ماڈل کی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

ہوورڈ اپنے گھر میں واپس جانے ہی والا تھا کہ سڑک کے پار ایک شخص نے باغبانی کرتے ہوئے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس کے پاس آ کر بولا۔ ''تم نئے پڑوسی ہو؟''

''ہاں، ہوورڈ ہیم۔''

''میں نورس بریڈے ہوں۔ سڑک کے پار میرا گھر ہے۔'' اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھایا اور بولا۔ ''میں تمہیں اس علاقے میں خوش آمدید کہتا ہوں، اگر چاہو تو میرے ساتھ ایک پیگ اسکاچ پی لو۔''

''شکریہ، مسٹر بریڈے۔''

''اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ جانتا ہوں کہ نئی جگہ پر چیزیں ڈھونڈنے میں کتنی مشکل پیش آتی ہے۔''

ہوورڈ نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور دروازہ بند کر کے اندر آ گیا۔ اس نے میز پر رکھا ہوا گلدستہ اٹھایا اور اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''امید ہے کہ یہ ایک اچھا گھر ثابت ہوگا۔''

لیکن اس مکان کے ساتھ ماضی میں کچھ ناخوشگوار واقعات جڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کئی وکٹورین طرز کے مکانوں کے ساتھ اسے بھی بنکر ہل سے کیرول ایونیو لایا گیا۔ اس سے پہلے جو مالک مکان تھا۔ اس کا قتل ہوا۔ اب اس کی بیوی اور اس کا بوائے فرینڈ جیل میں ہیں اور مقدمہ شروع ہونے کا انتظار کر رہے ہیں اور اب ہوورڈ کے علم میں یہ بات آئی کہ اس مکان کا ایک اور پرانا مالک بھی اپنی بیوی سمیت کار کے حادثے میں ہلاک ہو چکا تھا۔

ہوورڈ نے اپنا لیپ ٹاپ اٹھایا اور گوگل میں جا کر لیری کارڈن کا نام ٹائپ کیا لیکن کوئی معلومات نہیں ملیں پھر اس نے لارنس کارڈن کا نام ڈالا۔ اس کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس نے زیرلب کہا۔ ''تمہارے ساتھ کیا ہوا دوست؟''

اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اسمارٹ فون اٹھا کر پامیلا کو پیغام بھیجنے لگا۔ ''میں نے تمہارا کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور بھائی کو ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کروں گا۔''

''بھوت۔ میں کسی بھوت پر یقین نہیں رکھتا۔'' ہوورڈ نے پولیس سراغ رساں ایرن بوڈین سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت ایتھلس فلائٹ کیفے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے فون کر کے بوڈین سے کہا تھا کہ وہ لیری کو ڈھونڈنے میں اس کی مدد کرے۔ اسے ذاتی طور پر اس سے ملنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ ایسا چاہ رہی تھی۔ وہ اپنے عام یونی فارم یعنی پینٹ سوٹ اور فلیٹ شوز میں تھی۔

ہوورڈ نے اس جھولے والی لڑکی کی تصویر نکالی اور بولا۔ ''یہ کل میرے دروازے پر آئی تھی۔''

''یہ کون ہے؟''

''یہ اب بڑی ہوگئی ہے اور اس شخص کی بہن ہے جس کی تلاش میں تم سے مدد مانگ رہا ہوں۔''

بوڈین نے کچھ کاغذات نکالے اور بولی۔ ''یہ تمہارے مطلوبہ شخص کا کرمنل ریکارڈ ہے جو طویل ہونے کے علاوہ کافی دلچسپ بھی ہے۔''

''کیا تم مجھے اس کا پتا دے سکتی ہو؟''

''کیوں نہیں، ہمارا کام ہی لوگوں کو تحفظ دینا اور ان کی خدمت کرنا ہے۔''

ٹائرون گلیڈس، باتھرون میں واقع ڈولفن ولا میں رہتا تھا۔ ہوورڈ نے اس کے دروازے کی گھنٹی بجائی تو اندر سے کسی نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

ہوورڈ نے پپ ہول کے سامنے اپنا لائسنس لہرایا۔ ٹائرون کا نام لیری کے ریکارڈ میں اس کے مددگار کے طور پر درج تھا۔ لیری کو تو ابھی تک بوڈین تلاش نہ کر سکی لیکن ٹائرون بہ آسانی مل گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور ہوورڈ پر نظریں جما دیں۔ اس نے اسے اندر آنے کی دعوت نہیں دی۔

''تمہیں لیری کارڈن یاد ہے؟''

''ہاں، ہم ساتھ ہوتے تھے۔''

''جانتے ہو وہ آج کل کہاں ہے؟''

''کیوں؟''

''اس کی بہن اسے تلاش کر رہی ہے۔''

''اور اس نے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں۔'' ٹائرون نے جلتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''ممکن ہے کہ وہ ملنا نہ چاہتا ہو۔''

ہوورڈ نے ایک کمپیوٹر پرنٹ آؤٹ نکالا اور اس پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم دونوں مختلف جرائم مثلاً چوری، ڈاکا اور کار لفٹنگ میں ملوث رہے ہو؟''

''ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم نے صرف بنکر ہل کے ایک مکان میں چوری کی تھی جسے وہاں سے ہٹایا جا رہا تھا۔ وہاں سے ہمیں کچھ پرانی تانبے اور پیتل کی چیزیں ملیں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اب وہ میرے ساتھ کام نہیں کرتا۔ اگر اس نے رابطہ کیا تو میں تمہارے بارے میں بتا دوں گا۔''

ہوورڈ سر ہلاتا ہوا وہاں سے چل دیا لیکن باہر جا کر اس نے ایک آلہ نکالا جس کے ذریعے سیل فون پر ہونے والی گفتگو سنی جا سکتی ہے۔ ہوورڈ کے جانے کے چند منٹ بعد ٹائرون نے لیری کو فون کیا اور اس نمبر کے ذریعے ہوورڈ کو لیری کا پتا معلوم ہوگیا۔ وہ لاس اینجلس کے مضافاتی علاقے لنکاسٹر میں رہتا تھا۔ اس طرح کے الگ تھلگ مقامات منشیات فروشوں کی اولین ترجیح ہوتے ہیں۔

وہ اپنے دروازے پر ہوورڈ کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا لیکن تھوڑی سی بحث کے بعد وہ کئی برس بعد اپنی بہن سے ملنے پر راضی ہوگیا۔ ہوورڈ نے اسے جگہ اور وقت سے آگاہ کیا اور پامیلا کو لے کر الویرا اسٹریٹ پر واقع میکسیکن کیفے پہنچ گیا۔ پامیلا ہر دس سیکنڈ بعد گھڑی دیکھ رہی تھی۔ بالآخر ایک شخص کیفے میں داخل ہوا۔ اس کے سنہرے بال کندھوں تک لٹک رہے تھے۔ چوڑا چہرہ۔ چوڑے کندھے۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں۔

''لیری۔'' پامیلا یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کی گردن میں اپنے بازو ڈال دیے۔ چالیس منٹ تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر انہیں کچھ منگوانے کا خیال آیا۔

پامیلا نے مشروب کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھ سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

لیری نے کہا۔ ''میں ماضی کو بھلانا چاہ رہا تھا۔''

پامیلا کی آنکھوں کی چمک مدھم ہوگئی لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا پھر گفتگو کا رخ بنکر ہل کی طرف ہوگیا۔ ''اگر وہ حادثہ نہ ہوتا۔'' پامیلا بولی۔ ''تو ہم کبھی جدا نہیں ہوتے۔''

''وہ حادثہ نہیں تھا۔'' لیری نے کہا۔

''اگر وہ حادثہ نہیں تو پھر کیا تھا؟''

''ممی اور ڈیڈی وہ مکان فروخت کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔'' لیری نے کہا۔ ''لیکن اس کو وہاں سے ہٹائے بغیر شہر کی ترقی کا منصوبہ پورا نہیں ہو سکتا تھا۔''

''یعنی تم یہ کہہ رہے ہو کہ منصوبہ سازوں نے ان سے جان چھڑائی؟''

''ہاں، یہ ممکن ہے۔''

''وہ کون ہو سکتا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔ وہاں کا انچارج میئر کا اسسٹنٹ تھا۔''

''لیکن وہ ایک حادثہ ہی تھا۔ نشے میں دھت ڈرائیور نے انہیں ٹکر ماردی۔''

''یہ تو ان لوگوں نے کہانی بنائی تھی۔''

''لیکن وہ کون ہو سکتے ہیں۔ شہری انتظامیہ کے لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔''

''اتنی معصوم مت بنو۔'' لیری اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

''بہرحال اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس واقعے کو تقریباً پچاس برس ہو چکے ہیں۔'' پامیلا اپنے بھائی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہر کوئی سمجھ رہا تھا کہ میں نے انہیں قتل کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے تفتیش کی لیکن کچھ ثابت نہ کر سکے اور مجھے چھوڑنا پڑا۔ لیکن اس واقعے نے میری زندگی ہمیشہ کے لیے بدل دی۔''

''مجھے تمہارے غائب ہونے پر کوئی حیرت نہیں ہے۔'' پامیلا نے کہا۔ ''اس الزام کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

اس کے بعد لیری نے کچھ نہیں کہا اور جانے کی اجازت چاہی تاہم پامیلا نے اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ لیا۔ اس کے جانے کے بعد ہوورڈ چلتا ہوا پامیلا کے پاس آیا۔

''کیا وہ ایسا کر سکتا ہے؟'' پامیلا نے پوچھا۔

''اس کا کرمنل ریکارڈ تو ہے لیکن ایسا شدید نہیں۔''

’’کہتے ہیں کہ لوگ چھوٹے جرم سے شروع کر کے ترقی کرتے ہیں۔‘‘

’’تم ٹھیک تو ہو۔ گاڑی چلالوگی۔‘‘

’’تم میری فکر مت کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔‘‘

☆☆☆

ہوورڈ نے آگ بجھانے والے عملے کو دیکھا کہ وہ لیری کارڈن کو اس کے ٹرک سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ٹیلی فون پر بووین نے اسے بتایا کہ یہ ایک حادثہ تھا۔ ہوورڈ اتفاقات پر یقین نہیں رکھتا تھا اور اس کے خیال میں یہ حادثہ نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا۔ اسے لیری کو اپنی گوشہ نشینی سے باہر نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ اچھا ہوتا اگر وہ حقیقی دنیا میں واپس نہ آتا۔

’’مجھے افسوس ہے۔‘‘ ہوورڈ نے پامیلا سے کہا۔ وہ اسے فون پر اس حادثے کے بارے میں بتا چکا تھا۔ پامیلا بھائی کے ٹرک کی طرف بڑھی تو ایک باوردی پولیس آفیسر نے اسے روک لیا۔

’’یہ نہیں ہوسکتا۔ اتنے برسوں بعد وہ مجھے ملا۔ اب میں اسے کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔‘‘

ہوورڈ نے کہا۔ ’’پولیس کے کہنے کے مطابق یہ ایک حادثہ ہے۔‘‘

’’دو کار کے حادثے۔‘‘ پامیلا اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ’’پہلے میرے والدین اور اب لیری۔ ابھی تک میں اس سے اچھی طرح ملی بھی نہیں تھی۔‘‘

ایک دم اس کا چہرہ سخت ہوگیا۔ وہ ہوورڈ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’میں چاہتی ہوں کہ تم اس کے قاتل کو تلاش کرو۔‘‘

’’پولیس کا خیال ہے کہ وہ سڑک پر آنے والی کسی چیز کو بچانے کے لیے بے قابو ہو کر پھسلا اور ٹرک کو کنٹرول نہ کر سکا۔‘‘

’’اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس آدمی کو تلاش کرو جس نے میرے والدین کو قتل کیا تھا۔‘‘

’’اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تمہارے والدین کی موت کسی حادثے کا نتیجہ نہیں تھی تب بھی جس شخص نے یہ قتل کیا۔ وہ اب کافی عمر رسیدہ ہو چکا ہوگا اور کیا پتا کہ وہ زندہ بھی نہ ہو۔ اس بات کو کافی عرصہ ہو چکا ہے اور یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ کیا ہوا تھا۔‘‘

’’مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہ کام کرو۔‘‘

ایک پچاس سال پرانے کیس کی تفتیش کرنا آسان نہ تھا۔ اس نے لائبریری جا کر اخبارات کے تراشے دیکھے جن سے معلوم ہوا کہ مسٹر اور مسز کارڈن انیس سو اڑسٹھ ماڈل نیلے رنگ کی ڈاج چارجر کی ٹکر سے ہلاک ہوئے تھے۔ اس گاڑی کی چھت سیاہ رنگ کی تھی۔ اخبار نے اس کار اور اس کے مالک والٹر ڈی اونیل کی تصاویر بھی شائع کی تھیں۔ کار کا ونڈ شیلڈ ٹوٹا ہوا تھا جبکہ اونیل کو پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔ ہوورڈ نے سوچا کہ وہ اس گاڑی کو پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ شاید اس تصویر میں جس میں پامیلا جھولا جھول رہی تھی۔

ہوورڈ اپنی گاڑی میں اسپرنگ اسٹریٹ پر واقع ہوٹل پہنچا۔ یہ علاقہ بالکل بدل گیا تھا لیکن اب بھی وہاں بے گھر افراد رہائش پذیر تھے۔ ہوورڈ ایک قدیم طرز کی لفٹ کے ذریعے کمرا نمبر 721 تک پہنچا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

’’والٹر اونیل؟‘‘ ہوورڈ نے اپنا لائسنس دکھاتے ہوئے کہا۔ اونیل کی شکل اخبار میں شائع ہونے والی تصویر سے بمشکل مل رہی تھی جس کی وجہ بڑھتی ہوئی عمر اور کثرت شراب نوشی تھی۔ اونیل نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا اور ہوورڈ نے اسے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

’’امید ہے کہ تم میری صاف گوئی کا برا نہیں مناؤ گے۔‘‘ ہوورڈ نے کہا۔ ’’تم پر مسٹر اور مسز لارنس کارڈن کو ہلاک کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا؟‘‘

’’ہاں، مجھے اس کا مجرم قرار دیا گیا تھا۔‘‘ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

’’کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہ جرم تم نے نہیں کیا تھا؟‘‘

’’ہاں، میں نے ہی کیا تھا لیکن مجھے کچھ یاد نہیں۔ نشہ کی حالت میں سب بھول جاتا ہوں، جب دوسرے روز مجھے گرفتار کیا گیا تب بھی یاد نہیں تھا کہ میں نے ان دونوں کو ٹکر ماری تھی۔‘‘

’’تمہیں سزا ہوئی اور چھ مہینے کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔‘‘

’’دو آدمیوں کو مارنے کے جرم میں یہ کوئی بڑی سزا نہیں تھی۔ تم بھی سوچ رہے ہو گے کہ یہ زیادہ ہونی چاہیے تھی۔‘‘

’’لیکن تم اس گاڑی کے مالک تھے جس نے ان دونوں کو ٹکر ماری۔‘‘ یہ کہہ کر ہوورڈ نے جیب سے وہ تصویر نکالی جس میں پامیلا کا باپ اسے جھولا جھلا رہا تھا

اور پس منظر میں کارکنوں کے علاوہ ڈاج کار بھی نظر آرہی تھی۔

اونیل اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’یہ میری کار ہے۔‘‘

ہوورڈ نے کچھ اور تصویریں نکالیں جو حادثے کے بعد لی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر میں کار کے سامنے والے حصے میں ڈینٹ اور اس کا ونڈ شیلڈ ٹوٹا ہوا تھا۔

’’تمہیں یہ تصویریں یاد ہیں؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’ہاں، یاد ہیں۔ اس وقت میں ہوش میں آگیا تھا۔‘‘

ہوورڈ نے اسے ایک اور تصویر دکھائی جو بووین نے اسے دی تھی اور پوچھا۔ ’’یہ تصویر حادثے کے بعد کب لی گئی تھی؟‘‘

’’مجھے یاد نہیں۔ شاید دوسرے یا تیسرے دن؟‘‘

’’تمہارے چہرے یا بازو پر کوئی نشان نظر نہیں آرہا۔ کیا تم زخمی ہوئے تھے؟‘‘

’’کچھ زیادہ نہیں۔ میں نشے میں تھا اور کہتے ہیں کہ نشہ کرنے والا زیادہ زخمی نہیں ہوتا۔‘‘

ہوورڈ نے وہ تصویر لفافے میں رکھ لی اور اسے ایک بار پھر پامیلا کی وہ تصویر دکھائی جس میں وہ جھولا جھول رہی تھی۔

’’اس تصویر میں اور کون کون ہے؟‘‘

’’یہ بہت پرانی بات ہوگئی اور میں نشے میں بھی تھا۔ اس لیے مجھے کچھ یاد نہیں۔‘‘

ہوورڈ نے سختی سے کہا۔ ’’یاد کر کے بتاؤ کہ اس تصویر میں دوسرے لوگ کون ہیں؟‘‘

اونیل نے تصویر کو بغور دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ’’ایک تو میں ہوں۔ دوسرا اسٹر گلاسگو ہے۔ یہ میئر کے دفتر میں کام کرتا تھا اور تیسرے کا نام میں بھول گیا لیکن یہ ڈیولپر کے لیے کام کرتا تھا بس مجھے اتنا ہی یاد ہے۔‘‘

ہوورڈ نے وہ تصویر جیب میں رکھی۔ اونیل سے ہاتھ ملایا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اس نے ہینکاک پارک کے علاقے میں ایک مکان کے دروازے پر دستک دی تو ایک ہسپانوی عورت دروازے پر آئی۔

’’میں ٹیرنس گلاسگو سے ملنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تم نے اپائنٹمنٹ لیا ہے؟‘‘ عورت نے پوچھا۔

ایک عمر رسیدہ شخص تھری پیس سوٹ میں ملبوس اس کے عقب میں نمودار ہوا۔ ’’میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟‘‘

’’میں سمجھتا ہوں کہ تم ساٹھ کی دہائی میں لاس اینجلس

بے ہودہ سوال

سیلز مین نے گھنٹی بجائی، دروازہ کھلا اور آٹھ نو سال کا ایک لڑکا سگار پیتا ہوا باہر آیا۔

’’بیٹے! آپ کی امی گھر پر ہیں؟‘‘ سیلز مین نے اپنا تھیلا چھپاتے ہوئے پوچھا۔

لڑکے نے سگار کا ایک گہرا کش لے کر دھواں اڑایا، راکھ فرش پر جھاڑی اور سیلز مین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ’’تمہارا کیا خیال ہے؟ میری سگار نوشی دیکھ کر تمہیں یہ بے ہودہ سوال کرنا چاہیے تھا؟‘‘

☆☆☆

بارش ہوئی تو ایک شخص نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ’’اب ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئے گی اور چند دنوں میں زمین کی دبی اشیا باہر نکل آئیں گی۔‘‘

’’یا اللہ خیر!‘‘ تاج محمد آنسو نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ’’میری تو تین بیویاں زمین میں دبی ہوئی ہیں۔‘‘

☆☆☆

ماں نے بیمار بچے سے کہا۔ ’’بوبی! تمہیں نرس سے خوش اخلاقی برتنا چاہیے۔ دیکھتے نہیں، وہ تمہاری کتنی خدمت کرتی ہے؟‘‘

بوبی بولا۔ ’’نہیں ممی! میں نرس سے نفرت کرتا ہوں، وہ ہمیشہ مجھے کڑوی دوائیں پلاتی ہے۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ جس طرح ڈیڈی اس کے گال نوچتے ہیں، اسی طرح میں بھی اس کے گالوں کو نوچ ڈالوں۔‘‘

کرک میٹھا خیل سے عبداللہ خٹک کی معصومیت

تیسرا نمبر

ایک صاحب نے ریس کورس سے واپس آنے کے بعد اپنی بیوی کو بتایا۔ ’’آج تو مجھ پر بڑا حادثہ گزر گیا، میں اپنے جوتے کے تسمے باندھنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ ایک کم بخت جاکی آیا جسے کم دکھائی دیتا تھا، آتے ہی میری کمر پر زین کس دی۔‘‘

بیوی حیرانی سے بولی۔ ’’خدا کی پناہ! پھر تم نے کیا کیا......؟‘‘

’’کرتا کیا؟ تیسرے نمبر پر آیا۔‘‘ جواب ملا۔

انجم جاوید، پاک پتن شریف سے

کے ڈپٹی میئر تھے۔"
"ہاں مجھے اس پر فخر ہے۔"
"تم نے بنکر ہل کی تعمیرِ نو کی نگرانی کی تھی؟"
"کیا تم کوئی کہانی لکھ رہے ہو؟"
ہوورڈ نے اس مفروضے کی تردید کرنا ضروری نہ سمجھا اور مسکرا کر رہ گیا۔ گلاسگو نے اسے اندر آنے کی دعوت دی اور اسے ایک آراستہ پیراستہ ہال میں لے گیا۔
"میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور ان حادثاتی اموات کی تحقیقات کر رہا ہوں جن کی بدولت بنکر ہل کی تعمیرِ نو کی آخری رکاوٹ بھی دور ہوگئی۔"
"تم نے تو یوں ظاہر کیا تھا کہ کسی اخبار کے لیے انٹرویو کرنے آئے ہو۔ میں اس طرح کا دھوکا پسند نہیں کرتا۔"
"میں اس فریب کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن مجھے ڈر تھا کہ اگر اپنی اصلیت بتا دی تو شاید تم مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرو گے۔ کیا میں امید کروں کہ تم حقیقت جان لینے کے بعد مجھ سے تعاون کرو گے؟"
"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"
"کیا تمہیں مسٹر اور مسز کارڈن یاد ہیں۔ وہ بنکر ہل میں رہا کرتے تھے اور تمہیں تعمیرِ نو کے لیے ان کی زمین کی ضرورت تھی۔ پھر وہ دونوں ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔"
"انہیں ایک شرابی ڈرائیور نے ٹکر ماری تھی۔"
"اسے صرف چھ ماہ جیل ہوئی تھی جو قتل کے مجرم کے لیے بہت کم سزا ہے۔"
"اگر تمہیں اس پر یقین نہیں تو پھر ان کے بیٹے لیری کو چیک کرو۔ وہ اپنے باپ سے نفرت کرتا تھا۔"
"تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس نے یہ قتل کیے؟"
"میں نہیں جانتا۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ باپ بیٹے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس کے علاوہ لیری کا آدھا بچپن اصلاحی جیل میں گزرا۔"

☆☆☆

"وہ کسی کو قتل کرنے کے لیے تین بڑی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں؟" ہوورڈ نے بودین سے پوچھا۔ وہ اس کے کچن میں بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔
"محبت، انتقام اور دولت۔" اس نے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو پیسے کی خاطر قتل کیا گیا۔" ہوورڈ نے کہا۔ "کارڈن وہ جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا جس کی وجہ سے منصوبے کی تکمیل میں رکاوٹ پیش آ رہی تھی چنانچہ انہوں نے اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔"
"تمہارے خیال میں اونیل اس کا ذمے دار ہے؟"
"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" ہوورڈ نے کہا۔ "اونیل کو کچھ یاد نہیں۔ وہ کیوں ایسا کرے گا۔ جب تک کہ اسے اس خدمت کا معاوضہ نہ دیا جائے۔ وہ ان دنوں ویت نام سے واپس آیا تھا۔ شاید اسے پیسوں کی ضرورت ہو۔"
"او کے۔" بودین نے کہا۔ "یہ اونیل کا مقصد ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ گلاسگو نے اسے اس کام کا معاوضہ دیا ہو تاکہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔"
"یا اس نے خود یہ کام کیا ہو۔"
"ممکن ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" بودین بولی۔ "اگر وہ خود کار نہیں چلا رہا تھا تب بھی شرطیہ کہتی ہوں کہ وہی اس واقعے کا منصوبہ ساز تھا۔"
بودین کے جانے کے بعد ہوورڈ نے پامیلا کی تصویر اٹھائی اور اسے غور سے دیکھنے لگا پھر اس نے میز پر سے محدب عدسہ اٹھایا اور اس کی مدد سے تصویر پر نظریں جما دیں۔ کوئی بات اسے مسلسل پریشان کر رہی تھی پھر وہ تصویر لے کر اپنے دفتر میں گیا اور اسے اسکینر کی مدد سے محفوظ کرلیا پھر فوٹو شاپ کے ذریعے اس کے ایک حصے کو بڑا کیا اور مانیٹر پر نظریں جما دیں۔
والٹ اونیل اپنی کار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ والٹ پہلے ہی تصویر میں موجود ایک شخص کو گلاسگو کے نام سے شناخت کر چکا تھا۔ تصویر میں وہ ایک دوسرے شخص سے باتیں کر رہا تھا جو حلیے سے فورمین لگ رہا تھا۔
اگلے روز صبح میں وہ اسٹیٹ ایجنٹ ایمنڈا کے دفتر گیا اور اس سے ایک پرنٹ آؤٹ لے کر واپس اپنے گھر آ گیا۔ اس نے گاڑی گھر کے سامنے کھڑی کی اور سڑک پر کھڑے ہو کر فلم یونٹ کے لوگوں کو دیکھنے لگا جو کچھ فاصلے پر کسی فلم کی شوٹنگ کی تیاری کر رہے تھے۔
لورس اس کے پاس آ کر بولا۔ "کیا بات ہے۔ تم جلدی واپس آ گئے؟"
"ہاں، میں ایک کیس پر کام کر رہا ہوں لیکن یہ اتنا پرانا ہو چکا ہے کہ بہت سی باتیں بھی پرانی ہو چکی ہیں۔"
"شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ مجھے سراغ رسانی پسند ہے۔"
"میں یقیناً تمہاری مدد لے سکتا ہوں۔ تمہیں معلوم

ہے کہ اس مکان میں ایک فیملی رہا کرتی تھی۔ ماں باپ اور دو بہن بھائی، والدین کو قتل کر دیا گیا تھا۔"
"میں ٹی وی پر ایسے شوز دیکھتا رہتا ہوں لیکن جس پر سب سے پہلے شبہ کیا جاتا ہے۔ وہ قاتل نہیں ہوتا۔"
"نہیں ایسا نہیں ہے کیونکہ پولیس ہمیشہ اسی شخص کا پیچھا کرتی ہے جو مشتبہ نظر آئے۔"
"میں کافی پینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" لورس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"
وہ لورس کی نشست گاہ میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے جہاں سے ہوورڈ کا مکان صاف نظر آ رہا تھا۔ لورس نے اسے کافی کا کپ دیا اور خود بھی اس کے گھونٹ لینے لگا۔ ہوورڈ کی نظر ایک تصویر پر گئی جس میں لورس ایک عورت کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔
"یہ تمہاری بیوی ہے؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں، عرصہ ہوا اس کا انتقال ہوگیا۔"
ہوورڈ نے وہ تصویر اٹھائی اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ لورس اب بھی اس پرانی تصویر جیسا نظر آ رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ پہلے اس کے بال سیاہ تھے اور ماتھے پر زخم کا نشان زیادہ واضح اور تازہ تھا۔
ہوورڈ نے اسے کیس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے ویت نام سے آئے ہوئے اس شخص کو آلۂ کار بنایا۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ اس زمانے میں وہاں سے آنے والے کتنے پریشان تھے۔"
"جنگ ہمیشہ نقصان دہ ہوا کرتی ہے۔"
ہوورڈ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ "ہم یہاں آ کر بہت خوش تھے۔" لورس نے کہا۔ "دراصل ہم پہلے ہی یہاں آ گئے تھے جب انہوں نے بنکر ہل سے مکان ہٹانا شروع کیے۔"
"میں نے سنا ہے کہ ہماری سڑک کے زیادہ تر مکان پہلے بنکر ہل پر ہوتے تھے۔"
"ہاں، زیادہ تر وہیں تعمیر ہوئے تھے۔ جب ساٹھ کی دہائی کے آخر میں بنکر ہل کی تعمیرِ نو شروع ہوئی تو ان مکانوں کو بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا۔"
"میں تو اپنے مکان کی تاریخ سن کر حیران ہوں۔ پچھلا مالک مکان جانے سے پہلے ایک چھوٹی لڑکی اور اس کے بھائی کی تصویریں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ان پر کیا گزری ہوگی۔"
"یہ پچاس سال پرانی بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہوں گے۔"
"ان میں سے ایک چند روز قبل مجھ سے ملنے آئی تھی۔"
لورس کافی پیتے پیتے رک گیا اور ہوورڈ کو دیکھنے لگا۔
"تم ٹھیک تو ہو؟"
"میں...... میرا مطلب ہے کہ غلط خطوط پر سوچ رہے ہو۔"
"ہاں، یہ تمہارا احساسِ جرم بول رہا ہے۔"
"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"
"وہی جو تم سن رہے ہو۔" ہوورڈ نے کہا۔ "تم نے ہی ان میاں بیوی کو قتل کیا تھا۔"
"تم پاگل ہوگئے ہو۔"
"تم نے انہیں قتل کیا یا کسی کے ذریعے مروایا۔ بات ایک ہی ہے۔"
"میرے گھر سے نکل جاؤ۔"
"تم ٹرانس اینجلس کنسٹرکشن میں فورمین تھے۔ تمہیں کارڈن سے وہ جگہ خالی کروانا تھی ورنہ تم بھاری انعام سے محروم ہو جاتے۔ تم نے اس کام میں کچھ زیادہ ہی تیزی دکھائی اور ایک رات کے لیے اونیل کی کار مستعار لے کر اپنا سر اس کی ونڈ شیلڈ سے ٹکرایا جس کا زخم تمہارے ماتھے پر اس تصویر میں واضح طور پر نظر آ رہا ہے جو تمہاری بیوی کے ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ تم پامیلا کارڈن کی تصویر میں بھی اونیل اور گلاسگو کے ساتھ موجود ہو۔" یہ کہہ کر ہوورڈ نے وہ تصویر اسے دکھائی۔
"نکل جاؤ۔"
"میں نے تمہارے مکان پر بھی تھوڑی سی ریسرچ کی ہے۔ یہ بھی بنکر ہل سے یہاں لایا گیا تھا اور اس کی تمہیں بھاری قیمت ملی کیونکہ تم نے کارڈن کو راستے سے ہٹا دیا تھا جو کسی قیمت پر بھی اپنا مکان بیچنے کے لیے تیار نہیں تھا اور اس کے بعد سے تم یہاں ہنسی خوشی رہ رہے ہو۔"
"تم پاگل ہو گئے ہو۔" لورس چلّایا۔
"مجھے اس سے بھی زیادہ بُرے خطاب سننے کو ملتے ہیں۔"
"اگر تم ٹھیک کہہ رہے ہو تب بھی یہ پچاس برس پرانی بات ہے اور تم اسے کسی طرح بھی ثابت نہیں کر سکتے۔"
"تم اس تصویر میں موجود ہو۔"
"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ میں دن رات وہاں

موجود ہوتا تھا۔"

عین اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

''اندر آجاؤ والٹ۔'' ہوورڈ نے کہا۔

والٹر اونیل نشست گاہ میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''مسٹر بریڈلے۔''

''والٹر۔'' لورس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

''مسٹر بریڈلے، کافی عرصے سے تمہیں نہیں دیکھا۔''

لورس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اونیل نے کہا۔ ''اس رات میں وہ کار نہیں چلا رہا تھا۔''

لورس شکست خوردہ انداز میں میز پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑا ہوا تھا۔ اس نے بمشکل اتنا کہا۔ ''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

''تمہارے ماتھے پر زخم کا نشان دیکھ کر۔'' ہوورڈ نے کہا۔ ''جبکہ والٹ کے چہرے پر ایسا کوئی نشان نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس نے ان دونوں کو ٹکر ماری ہوتی تو اس کا سر بھی ونڈ شیلڈ سے ٹکراتا۔''

''میں ایسا کیوں کرتا؟'' اونیل نے کہا۔

لورس جان چکا تھا کہ وہ ہار چکا ہے۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور بولا۔ ''ہمیں منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا اور کارڈن اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔''

''لیکن مجھے قربانی کا بکرا کیوں بنایا؟''

''مجھے صرف تمہاری کار چاہیے تھی۔''

ہوورڈ نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ لورس کی نظریں بھی اس جانب اٹھ گئیں۔ بووین دو باوردی پولیس والوں کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

''تم اس تک کیسے پہنچے؟'' پامیلا نے پوچھا۔ وہ ہوورڈ کے پورچ میں اونیل اور اس کے ساتھ کھڑی تھی اور پولیس کی گاڑی کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھی جس کی پچھلی نشست پر لورس بیٹھا ہوا تھا۔

''میں تمہاری جھولے والی تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پس منظر میں کار کے ساتھ کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں سے ایک کی شکل میرے پڑوسی لورس سے ملتی ہے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ زیادہ شراب پینے کی وجہ سے ایسا سوچ رہا ہوں پھر میں نے محدب عدسے سے اس تصویر کو دیکھا اور کمپیوٹر میں بڑا کر کے محفوظ کر لیا تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ تعمیرِ نو کے کام کی نگرانی کرنے والا فورمین تھا۔''

پامیلا پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرے والدین کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''تمہارے والدین وہ مکان فروخت کرنا نہیں چاہتے تھے جبکہ کمپنی وہ جگہ ہر حال میں حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ لورس نے ان کی مدد کی اور اس کے عوض کئی فائدے حاصل کیے۔ اس نے والٹ اونیل کی کار عاریتاً لی اور تمہارے والدین کو ٹکر مار کر ہلاک کر دیا پھر اس کا الزام بھی اونیل پر لگا دیا۔''

''لورس یہاں کس طرح آیا؟''

''میں نے اس سلسلے میں اسٹیٹ ایجنٹ امینڈا سے رابطہ کیا کہ مجھے اس کی تفصیل فراہم کرے۔ اس نے مجھے بتایا کہ حادثے کے ایک ماہ بعد یہ مکان لورس کے نام ہو گیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ محض اتفاق ہے۔ اسے یہ مکان انعام میں ملا تھا۔''

''اور تم نے اس سے کس طرح اعتراف کروایا؟''

''میں صرف والٹ کو یہاں لے آیا۔ یہی اس کے لیے بہت تھا۔ اسے اپنے جرم کا اعتراف کرنا پڑا۔''

''مسٹر گلاسکو کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ اسے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ صرف کام کی نگرانی کر رہا تھا۔''

''اور لیری؟''

''اس کی موت محض ایک حادثہ تھی۔ وہ ٹرک کو کنٹرول نہ کر سکا۔''

پامیلا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بولی۔ ''میں تم سے رابطے میں رہوں گی۔''

''کیا تم مرکزِ شہر تک جا رہی ہو؟'' اونیل نے پوچھا۔

''نہیں، لیکن میں تمہیں وہاں چھوڑ دوں گی۔''

ان کے جانے کے بعد اب وہاں ہوورڈ اور بووین رہ گئے۔ ''اندر آجاؤ۔ ایک ڈرنک ہو جائے۔''

وہ نشست گاہ میں داخل ہوئے اور آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔'' بووین نے کہا۔

''کہو۔''

''کیا تم کبھی مجھے یہاں سے جانے کے لیے کہو گے؟''

ہوورڈ مسکرا دیا اور اسی مسکراہٹ میں اس کا جواب پنہاں تھا۔



جعلی تصویر

تنویر ریاض

دولت مند بننے کا خواب بہت ہی دلنشین اور روح پرور ہوتا ہے... ان دونوں نے بھی اپنی پسند کا خواب دیکھا اور اس کی تعبیر کی تکمیل کے لیے سرگرم ہو گئے... وہ اپنے خوابوں کے حسین محلات کے نزدیک تر تھے... منزل ان کی منتظر تھی... مگر اچانک ہی کامیابی کے درمیان ایسی رکاوٹیں آئیں کہ ہر خواب چکنا چور ہو گیا...

دلچسپ اور چونکا دینے والے انجام سے بھرپور تصویر کہانی......

سبرینا ایلیسن گرجا میں پہلی قطار کی بینچ پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں اس کی ماں کی آخری رسومات ادا کی جا رہی تھیں۔ اس نے سیاہ رنگ کا پوری آستینوں والا اسکرٹ پہن رکھا تھا اور پوری توجہ سے ڈائس پر رکھی میز کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے ماں کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ سکون محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ ماں کے

رخصت ہونے کے بعد اس کی اپنی زندگی شروع ہوسکتی تھی۔ اس نے دائیں جانب دیکھا۔ سام رولنس وہاں موجود تھا اور ایک ستون سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور نظروں ہی نظروں میں پیغام دیا۔ ”تم بہت اچھی جارہی ہو۔ اپنے آپ کو مضبوط رکھو۔ یہ تقریباً ختم ہوچکی ہے۔“

وہ مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو کہ اس کا پیغام مل گیا ہے۔ اس کی ماں کو سام پسند نہیں تھا جبکہ وہ اس کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتی تھی۔ سام کے علاوہ وہاں اس کے باپ کا پرانا دوست سینیٹر پیٹرک اونیل بھی موجود تھا اور وہ بھی سام کی بیوی ماریا کی طرح پکا کیتھولک تھا۔

ماریا نے طلاق لینے سے انکار کردیا تھا اور سام نے بھی اس پر اصرار نہیں کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسکینڈل بن جائے۔ وہ سینٹ ونسنٹ اسپتال میں سماجی کارکن کے طور پر کام کرتی تھی۔ اسے چلانے والی راہبائیں کٹر مذہبی عقائد رکھتی تھیں اور طلاق یافتہ عورت کے لیے اس اسپتال میں کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ جب سام نے سبرینا کو بتایا کہ ماریا تو اس موضوع پر بات کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے تو اسے یقین نہیں آیا کہ اس دور میں بھی ایسا ہوسکتا ہے۔

سبرینا نے اسپتال کی ویب سائٹ پر ماریا کے بارے میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ وہ عمر میں اس سے دو سال بڑی یعنی تیس برس کی تھی اور اس سے کہیں زیادہ خوب صورت، گوری رنگت، دلکش نقوش اور بادامی آنکھیں۔ وہ اپنے مریضوں سے بہت مخلص تھی اور ان سے ہمدردی سے پیش آتی تھی۔ یہ مضمون پڑھ کر سبرینا اس سے حسد محسوس کرنے لگی۔ سام ایک شاعر اور جز وقتی انگریزی کا استاد تھا اور اس کا گزارا بیوی کی کمائی پر تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ سبرینا اس کی مدد کرے۔ وہ جانتی تھی کہ سام اس سے سچی محبت کرتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ماں اسے پسند نہیں کرتی۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کے حصے میں بہت کچھ آتا۔ ان میں کچھ ایسی قیمتی پینٹنگز بھی تھیں جن سے انہیں آٹھ یا دس ملین ڈالر حاصل ہوسکتے تھے پھر سام بہ آسانی ماریا کو چھوڑ دیتا۔ اس کے بعد وہ دونوں اپنے خوابوں کی دنیا بسا سکتے تھے۔

اونیل چھوٹی مدت کے لیے انتخاب میں حصہ لینے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ وہ ڈائس کی جانب ایسے بڑھا گویا اپنی انتخابی مہم میں تقریر کرنے آیا ہو۔ اس نے سبرینا کی ماں کے حوالے سے کئی باتیں بیان کیں جن میں ایک جھوٹی کہانی بھی شامل تھی کہ سبرینا کی ماں نے اسکول لے جانے کے لیے بسکٹ بنائے جو اس نے چرا لیے۔ اس کا کہنا تھا کہ ایوی یعنی سبرینا کی ماں نے وہ بسکٹ اس کے لیے بنائے تھے۔ سبرینا اس جھوٹ پر تلملا کر رہ گئی تھی۔

پادری کا نام جیرڈ مچل تھا۔ اسے اس گرجا میں آئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس نے ڈائس پر آکر ایوی کی پسندیدہ مناجات پڑھیں۔ حاضرین نے کورس کے انداز میں اس کا ساتھ دیا اور اس طرح یہ دعائیہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔ پھر وہ سبرینا کے پاس آیا اور وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی وسطی راستہ تک پہنچی اور اس جگہ کھڑی ہوگئی جہاں اس نے بتایا تھا۔ اسے یوں نمایاں ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ صرف وہی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا سوائے سام کے جو ایک کونے میں کھڑا اس کا انتظار کررہا تھا۔

ایوی کے دوست ایک قطار میں کھڑے اس سے تعزیت کررہے تھے۔ وہ باری باری ہر ایک کا شکریہ ادا کررہی تھی۔ وہ انہیں پسند کرتی تھی۔ وہ سب اس کی ماں کی طرح حقیقی، فیاض اور ہوشیار تھے گو کہ سبرینا بے چینی محسوس کررہی تھی۔ وہ گھر جانا چاہتی تھی یا کچھ وقت سام کے ساتھ گزارنا چاہ رہی تھی۔

”میری بچی۔“ سینیٹر اونیل نے کہا اور جھک کر اس کے گال کا بوسہ لے لیا۔ وہ بھی پنجوں کے بل کھڑی ہوئی اور جواب میں اس کے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ وہ اسے کتنی اہمیت دیتی ہے۔

”شکریہ سینیٹر۔ تمہارے تعریفی کلمات بہت شاندار تھے۔ خاص طور سے مجھے بسکٹ والی کہانی بہت پسند آئی۔“

سینیٹر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے آج بھی ان کا ذائقہ یاد ہے۔ ویسے تم مجھے پیٹ کہا کرو کیونکہ اب تم بڑی ہوگئی ہو۔“

سبرینا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں ایسا محسوس نہیں کرتی۔“ اس نے نیچے کی طرف دیکھا جیسے آنسو روکنے کی کوشش کررہی ہو۔ ”خصوصاً اس وقت۔“

”واقعی، ماں کی جدائی بہت بڑا صدمہ ہے۔ وہ بہت خاص عورت تھی۔“

سبرینا ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”وہ ایک غیر معمولی عورت تھی۔“

پروفیسر نے اس کے ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آج واشنگٹن واپس جانا ہے لیکن آئندہ موسم بہار میں چند فنڈ

ریزنگ پروگرام ہونے والے ہیں۔ ہم اس موقع پر اکٹھا ہونے کا پلان بنا سکتے ہیں۔“

”میں اس وقت کا انتظار کروں گی۔“

سینیٹر کی نظر ایک طرف کھڑے ہوئے سام پر گئی تو وہ بے اختیار بول اٹھا۔ ”میں یہاں سام کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہارا اچھا دوست ہے۔“

سبرینا نے سام کے بارے میں تفصیل بتانی ضروری نہیں سمجھی بلکہ اس کے بجائے ایک عام سی بات کہہ دی۔ ”ہم اپنی طرف سے بہتر کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ اس نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری وجہ سے دوسرے لوگ انتظار کررہے ہیں۔ مجھے مدعو کرنے کا شکریہ۔ یہ ایک شاندار دعائیہ تقریب تھی۔“

اس نے اپنی انگلی سے اس کا چہرہ چھوتے ہوئے کہا۔ ”اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے ضرور فون کرنا۔“

”شکریہ سینیٹر، میں ضرور کروں گی۔“

سینیٹر کے جاتے ہی سام اس کے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”بے بی، تم بہت اچھا کام کررہی ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے سبرینا کا گال چھوا... اور چرچ سے باہر چلا گیا۔ سبرینا اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”سبرینا! مجھے بہت افسوس ہوا۔“ ایک آدمی نے کہا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس کا پڑوسی میتھیوز تھا۔ اس کے پیچھے گل فروش جینٹ تھی۔ ایوی کو تازہ پھول بہت پسند تھے۔ اسی طرح سبرینا باری باری سب لوگوں سے ملتی رہی اور پندرہ منٹ بعد وہ فارغ ہوگئی۔ پادری اس کے قریب آیا۔ سبرینا نے نظریں اٹھا کر اس کے عقب میں دیکھا۔ سام اس کا انتظار کررہا تھا۔ سبرینا نے پادری کا شکریہ ادا کیا۔ پادری نے بھی جواب میں کچھ کہا جسے اس نے پوری طرح نہیں سنا اور مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔

سام گاڑی چلا رہا تھا اور سبرینا اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”یہ بہت مشکل کام تھا سام۔ ہر کوئی مجھے دیکھ رہا تھا اور وہ توقع کررہے تھے کہ میں بے ہوش ہوجاؤں یا رونا شروع کردوں۔“

”یہ ایک فطری بات ہے۔ وہ تم سے ہمدردی کررہے تھے۔“

”سینیٹر اونیل نے مجھ سے کہا کہ اسے پیٹ کہہ کر بلایا کروں۔“

”یہ بہت اچھی بات ہے۔ وہ تمہیں اپنے خاندان کا فرد سمجھتا ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتی۔“

”میں جانتا ہوں۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتا لیکن اسے تم سے محبت ہے۔“

”وہ سمجھتا ہے کہ تم بے دین ہو۔“

سام نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی ران پر رکھا اور بولا۔ ”وہ تو میں ہوں۔“

سام نے اپنے آئی پیڈ پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ ”فریسکوز“ نے ابھی ابھی اعلان کیا ہے کہ وہ اپریل کے آخر میں نادر و نایاب تصویروں کی نمائش کررہے ہیں۔ یہ ہمارے لیے ایک اچھا موقع ہے۔“

”میرا خیال تھا کہ تم کرسٹی ز یا سوتھ بائی، کو ترجیح دو گے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ فریسکو کی نمائش دیکھنے کافی لوگ آئیں گے۔“

”یہ دنیا میں تیسرے نمبر کا نیلام گھر ہے۔ ان کی نمائش دیکھنے بے شمار لوگ آتے ہیں۔“

☆☆☆

سبرینا نے فریسکو کے تخمینہ کار ڈاکٹر کلارک ولیم سے ملاقات کا وقت طے کیا جسے اس نیلام کا مہتمم مقرر کیا گیا تھا تاکہ وہ اس نمائش میں اپنی کوئی نادر و نایاب تصویر رکھ سکے۔ اب وہ انتظار گاہ میں اس کی آمد کا انتظار کررہی تھی۔ وہ اپنے ہمراہ تصویر بھی لے کر آئی تھی۔ تبھی ایک نوجوان عورت بڑے شیشوں کا چشمہ لگائے اس کے پاس آئی۔

”میں ڈاکٹر ولیم کی معاون ڈان مرفی ہوں اور اس کے کہنے پر میں یہ تصدیق کرنا چاہتی ہوں کہ کیا واقعی تمہارے پاس فرنانڈ لیگر کی بنائی ہوئی نایاب تصویر ہے جو تم نیلام میں رکھنا چاہتی ہو؟“

سبرینا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، اس کا عنوان ہے ”دو مین ان گولڈ وتھ کیٹ۔“

”کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ اس تصویر کا یہی عنوان ہے کیونکہ جب ہمیں استقبالیہ کلرک نے اس بارے میں بتایا تو ولیم نے فہرست دیکھی۔ لیگر نے کبھی اس عنوان سے کوئی تصویر نہیں بنائی۔ البتہ وومن وتھ کیٹ، کے عنوان سے ایک تصویر ضرور بنائی تھی جو میٹرو پولیٹن میوزیم آف آرٹ کی ملکیت ہے۔“

”ممکن ہے کہ مجھ سے نام لینے میں غلطی ہوئی ہو لیکن میری دادی ہمیشہ یہی نام لیا کرتی تھیں۔“ سبرینا نے جھک کر تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ اپنے ساتھ لے کر آئی ہوں۔“

''تمہیں یہ تصویر کہاں سے ملی؟''

''میری ماں کا گزشتہ خزاں میں انتقال ہوا۔ یہ تصویر ہمیشہ سے ڈائننگ روم میں آویزاں ہے۔ دادی کا کہنا تھا کہ میرے پردادا نے یہ تصویر انیس سو انیس میں پیرس کی گیلری سے خریدی تھی۔

''اس گیلری کا نام کیا تھا؟''

''مجھے معلوم نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔''

وہ اسے لے کر راہداری کے آخری سرے پر واقع ایک کمرے میں لے گئی۔ ڈاکٹر ولیم درمیانی عمر اور درمیانہ قد کا شخص تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا سوٹ اور سرخ ٹائی لگا رکھی تھی۔ جب اس نے بولنا شروع کیا تو اس کے لہجے میں شک کا عنصر نمایاں تھا۔ اس نے بڑی وضاحت سے بتایا کہ سبرینا کی لائی ہوئی تصویر اصلی نہیں ہو سکتی۔

جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو سبرینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہ رہی تھی کہ تم اسے ایک نظر دیکھ لو۔''

ایک گھنٹا بعد وہ اس تصویر کی قیمت کا اندازہ لگانے پر تیار ہو گیا اور سبرینا نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی ماں کے گھر جا کر اس تصویر کی خریداری کی رسید یا کوئی ایسا ثبوت تلاش کرنے کی کوشش کرے گی جو اس کی کہانی کی تصدیق کر سکے۔

سبرینا اور سام کو اس نیلام میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ وہ دونوں پچھلی قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلی تصویر جو نیلام کے لیے پیش ہوئی۔ وہ 1909ء میں بنائی گئی تھی جو صرف تیس ملین ڈالر میں فروخت ہوئی جبکہ دوسری کے صرف دس لاکھ ڈالر ہی لگ سکے جب وومن ان گولڈ تھ کیٹ کی باری آئی تو بھرے ہوئے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ اس تصویر کی دریافت نے غیر متوقع اور ڈرامائی ہلچل مچا دی۔

جب بوسٹن گلوب میں یہ اسٹوری شائع ہوئی تو سینیٹر اونیل نے سبرینا کو فون کر کے کہا۔ ''تمہارے باپ اور دادا نے یقیناً اپنے پتے چھپا کر رکھے ہوں گے۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے خاندان کے پاس ایسی کوئی تصویر ہے۔ ممکن ہے کہ تمہارے دادا نے کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیا ہو لیکن تمہارا باپ تو میرا دوست تھا، بہت قریبی دوست لیکن اس نے بھی کبھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی اس کی قیمت کا اندازہ ہوگا۔ میں نے اپنے پردادا کے بارے میں یہی سنا ہے کہ وہ بہت سیدھے سادے تھے۔ انہوں نے یہ تصویر صرف اس لیے خریدی کہ انہیں پسند آگئی تھی۔ شاید ہی کبھی انہوں نے اس کی قیمت کے بارے میں سوچا ہو۔''

''شکریہ سبرینا، تمہاری باتوں سے میری تسلی ہو گئی۔''

وہ بوسٹن گلوب کو انٹرویو دینے کے لیے صرف اس وجہ سے تیار ہوئی کہ ڈاکٹر ولیم نے اس کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے مزید انٹرویوز دینے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں اس تصویر کے حوالے سے پُراسرار باتیں پھیلنے لگیں اور اس بارے میں قیاس آرائیاں بھی کی گئیں۔ مقامی اخبارات میں ایسے مضامین شائع ہوئے جن میں اس تصویر کی ثقافتی اہمیت اور قدر و قیمت پر گفتگو کی گئی تھی۔

جب بولی شروع ہوئی تو سبرینا کو محسوس ہوا کہ وہ بے خودی کے عالم میں ہے۔ وہ تصویر آٹھ اعشاریہ سات ملین ڈالر میں فروخت ہوئی تو اس کے ہوش اڑ گئے اور وہ کافی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ سام نے اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ دونوں اگلی نیلامی شروع ہونے سے پہلے وہاں سے چل دیے۔

تین ہفتے بعد نیلام کمپنی نے اس تصویر کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سام اور سبرینا کے مشترکہ اکاؤنٹ میں جمع کروا دی جو انہوں نے گزشتہ جنوری میں کھولا تھا۔ اس کے بعد سبرینا نے دیکھا کہ ایک گھنٹا بعد سام نے وہ پوری رقم بالی کے اس بینک اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جو انہوں نے مشترکہ طور پر آن لائن کھولا تھا۔ سام کا کہنا تھا کہ روئے زمین پر بالی سے زیادہ رومان پرور جگہ کوئی نہیں۔

اختتام ہفتہ سبرینا نے انڈونیشیا کے دارالحکومت جکارتہ کے لیے فرسٹ کلاس کے دو یک طرفہ ٹکٹ خریدے اور وہاں سے بالی کے لیے ایک پرائیویٹ طیارہ چارٹرڈ کروایا۔ انہیں تین مئی کی سہ پہر روانہ ہونا تھا۔ پہلے وہ لاس اینجلس جاتے اور وہاں سے رات میں جکارتہ کے لیے پرواز پکڑتے۔ اس نے کمپیوٹر اسکرین پر وقت دیکھا۔ نو بج کر بیس منٹ سوموار کا دن اور تاریخ تیس اپریل۔ دو دن میں وہ نہ صرف اپنا فرنیچر اور دیگر گھریلو اشیا فروخت کر سکتی تھی بلکہ اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ کسی پراپرٹی ایجنٹ کو مکان کی فروخت کی ذمے داری بھی دے دے جو اسے ورثے میں ملا تھا۔

اس نے کمپیوٹر پر لگژری ولا کا بھی انتخاب کر لیا جہاں وہ کم از کم ایک مہینا آرام سے رہ سکتے تھے اور اگر انہیں

اپنے خوابوں کا گھر ملنے میں دیر ہو جاتی تو اسی ولا میں رہائش اختیار کی جا سکتی تھی۔ اس کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اس ولا کے دلکش منظر میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ خوابوں کی دنیا میں کہیں دور نکل جاتی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری طرف سے سینیٹر اونیل بول رہا تھا۔

''معذرت خواہ ہوں کہ بالکل آخری وقت میں مجھے تم سے یہ بات کہنا پڑ رہی ہے۔ میرے پروگرام تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ آج مجھے نیوبری پورٹ میں ایک فنڈ ریزنگ لنچ میں شرکت کرنا ہے گوکہ میں اس طرح کے کھانے نہیں کھاتا لیکن مجھے چندہ دینے والے میرے ساتھ کچھ وقت بھی گزارنا چاہیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ اس لنچ میں شریک ہو جاؤ۔ اس علاقے میں برائن بہت اچھا ریستوران ہے۔ تم دو بجے تک وہاں آجاؤ۔''

''شکریہ سینیٹر۔'' سبرینا نے کہا اور سوچنے لگی کہ اگلی بار جب وہ فون کرے گا تو اسے کتنی مایوسی ہوگی۔ ''میں ضرور آؤں گی۔''

اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی۔ فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس مرتبہ ڈاکٹر ولیم اس سے مخاطب تھا۔ اس کا لہجہ کچھ اکھڑا ہوا تھا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم سے رابطہ ہو گیا۔ دراصل ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ میں تم سے ذاتی طور پر گفتگو کر کے اسے یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں۔''

سبرینا کے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''کیسا مسئلہ؟''

''کیونکہ اس تصویر کا ماخذ معلوم نہیں۔ اس لیے خریدار کی انشورنس کمپنی اس کا آزادانہ تخمینہ لگانا چاہتی ہے لیکن لگتا ہے کہ وہ اس میں استعمال ہونے والے سامان کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''جب تم سے ملاقات ہوگی تو اس کی وضاحت کر دوں گا۔ گیارہ بجے کا وقت کیسا رہے گا؟''

سبرینا نے بحالت مجبوری کہا۔ ''ٹھیک ہے آجاؤ۔''

سام سے اس کی ملاقات رات کے کھانے پر ہی ہوتی لیکن اب انہیں پہلی پرواز سے نکلنا تھا چاہے وہ کہیں بھی جا رہی ہو۔ اس نے سام کو میسج کیا کہ وہ اپنا سامان لے کر اس کے پاس پہنچ جائے۔ خود اس نے بھی اپنا سامان باندھنا۔

شروع کر دیا۔

سام اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے ساڑھے دس بجے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے کندھے سے بیگ لٹک رہا تھا۔ سبرینا نے اسے ڈاکٹر ولیم سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ اس نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم جانتی ہو کہ کیا کہنا اور کرنا ہے۔''

''اگر تم میرے ساتھ ہو تو کچھ بھی کر سکتی ہوں۔''

''میں بالکل پوری طرح تمہارے ساتھ ہوں۔ البتہ میرا خیال ہے کہ اس وقت مجھے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ ہمیں معاملے کو آسان بنانا ہے۔''

دس بج کر پچاس منٹ پر سام بیڈ روم میں چلا گیا اور دروازہ تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا تاکہ سبرینا اور ولیم کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکے۔

وقت مقررہ پر ڈاکٹر ولیم ایک اور آدمی کے ساتھ آیا۔ جس کا نام اس نے جوشوا روسکو بتایا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں چمڑے کا بریف کیس پکڑ رکھا تھا۔ سبرینا نے انہیں بیٹھنے کی دعوت دی۔

ڈاکٹر ولیم نے کہا۔ ''کیا سام یہاں موجود ہے؟''

''نہیں، مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کیونکہ تم نے اس کا نام اتھارٹی فارم میں ڈالا ہے۔ اس لیے ہمیں اس سے بھی بات کرنا ہوگی۔''

''وہ اس تصویر کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مسئلہ کیا ہے؟''

''جیسا کہ میں نے تمہیں فون پر بتایا کہ تصویر میں استعمال ہونے والے سامان پر سوالات اٹھ رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تصویر پر السی کا تیل لگا ہوا ہے اور اس میں ایٹمی ذرات پائے گئے ہیں جو صرف ان پودوں میں ہو سکتے ہیں جو جاپان پر ہونے والی بمباری کے بعد پروان چڑھے ہوں۔''

سبرینا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں اس کی کوئی وضاحت نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہ لیبارٹری میں نمونے بدل گئے ہوں۔''

''یہ بھی ممکن ہے یا پھر السی کا تیل تصویر کی سطح صاف کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ شاید تمہاری دادی نے تصویر صاف کی ہو۔''

''بالکل۔'' سبرینا مسکرائی۔ ''دادی بہت نازک مزاج تھیں۔''

''اور اپنی ماں کے بارے میں کیا کہو گی؟''

''وہ بھی گھر کا بہت خیال رکھتی تھیں۔''

''یہ میں نے اس لیے پوچھا کہ اس تجزیہ میں کوکونٹ ایسڈ بھی پایا گیا ہے جو موجودہ دور میں کچھ صابن مثلاً آئیوری وغیرہ کا ایک جزو ہے۔ یہ صابن بھی عام طور پر تصویروں کی صفائی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔''

''مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔''

ولیم نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ اسی جواب کی توقع کر رہا تھا پھر بولا۔ ''ٹیسٹ ابھی ہو رہے ہیں لیکن ان بے قاعدگیوں کو دیکھتے ہوئے ان کی پریشانی بڑھ گئی ہے۔ میں اسی لیے مسٹر روسکو کو ساتھ لے کر آیا ہوں تاکہ وہ تمہیں مشورہ دے سکیں کہ کیا کرنا ہے۔ یہ وکیل ہیں۔''

روسکو نے اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے کاغذات کا پلندہ نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس معاملے کو یہیں ختم کرنے کا مناسب طریقہ یہی ہے کہ تم رقم واپس کر دو۔'' اس نے کاغذات سبرینا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں وہ فارم بھی ہے جس پر تمہیں دستخط کرنا ہیں۔''

سبرینا نے کاغذات لیتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

''دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم پولیس کو اطلاع دے دیں۔ آرٹ کے نام پر دھوکا اب ایک کاروبار کی شکل اختیار کر چکا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ اس کی تحقیقات ایف بی آئی کے سپرد کر دیں۔ یہ ہم سب کے بہترین مفاد میں ہے کہ یہ معاملہ ہمارے درمیان ہی رہے۔ امید ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو گی۔''

سبرینا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ میں ان کاغذات کو پڑھنے کے بعد تمہیں فون کروں گی۔'' پھر وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔''

ڈاکٹر ولیم نے جاتے جاتے کہا۔ ''سام سے کہہ دینا کہ اسے بھی اس فارم پر دستخط کرنا ہیں۔ میں ایک گھنٹا بعد فون کروں گا۔''

ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ دوڑتے ہوئے بیڈ روم میں گئی اور سام کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ رقم پہلے ہی ہالی منتقل ہو چکی ہے۔ اگر وہ جج کو قائل کر کے وارنٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تب تک ہم یہاں سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔ فراڈ وہ کہلاتا ہے جس میں نیت شامل ہو اور وہ اسے کبھی ثابت نہیں کر سکیں گے۔''

اصلی ہے۔''

''ہاں۔'' سبرینا بولی۔ ''میں نے اسے ایک ڈائری بھی دی جس میں انیس سو بیس سے انیس سو تیئس کے دو واقعات درج تھے۔ میں نے ان صفحات پر نشان لگا دیا جن میں میری پردادی نے ایک نئے لباس کے لیے کپڑے کی خریداری اور اسے سلوانے کے لیے درزی کے پاس جانے کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے فوٹو میں وہی لباس پہن رکھا ہے۔''

سام کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ فوٹو اور ڈائری کی وجہ سے یہ پینٹنگ قابلِ اعتبار ٹھہری لیکن اب السی کا تیل اور آئیوری سوپ کا مسئلہ سامنے آنے کے بعد وہ ہر چیز کو چیک کریں گے۔ وہ اور کیا کچھ معلوم کر سکتے ہیں؟''

''وہ فوٹو کا کاغذ اور ایملشن دیکھیں گے، ڈائری کے گتے، کاغذ، سیاہی اور لکھائی کا معائنہ کریں گے۔ اس کے علاوہ تصویر کے رنگوں، کینوس اور پینٹنگ اسٹائل کو بھی چیک کریں گے جس میں انہیں کوئی خامی نظر نہیں آئے گی۔ میں نے وہ رنگ خود بنایا تھا اور اس میں تھوڑی سی مقدار سفید زنک کی ملا دی جو لیگر کے زمانے میں دستیاب تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک غیر استعمال شدہ ڈائری، انیس سو بیس میں استعمال ہونے والا کیمرا اور السی کے تیل کا پرانا ڈرم بھی مل گیا۔''

سام نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے یہ تمام چیزیں پورٹس ماؤتھ اور برم لیلڈ کے بازاروں سے خریدیں جن کی نشاندہی ممکن نہیں۔ یہ خریداری کرتے وقت میں نے لمبے بالوں کی وگ اور سیاہ فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس لیے مجھے کوئی نہیں پہچان سکتا۔''

سبرینا نے کہا۔ ''ہم نے ایک دکان سے اسی طرز کا لباس خریدا جہاں پرانے زمانے کے ملبوسات ملتے ہیں اور بوسٹن کے نواح میں پرانی چیزوں کی دکان سے ہمیں اس دور میں استعمال ہونے والا پین اور سیاہی بھی مل گئی، پھر میرے لیے پردادی کی ڈائری لکھنا کوئی مسئلہ نہ رہا۔ اسی طرح میں نے اپنے بال گھنگھریالے کروائے۔ اس کے بعد کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ تصویر والی عورت میری پردادی نہیں ہے۔''

''یہاں تک تو ٹھیک ہے۔'' سام بولا۔ ''لیکن پینٹنگ پر وہ مزید کیا اعتراض کر سکتے ہیں؟''

''ہم نے پیرس کی مارکیٹ سے انیس سو بیس کے آرٹسٹوں کی دو پینٹنگز خریدیں۔ میں نے ایک تصویر کے

''ہمیں آج بلکہ ابھی یہاں سے چلے جانا چاہیے۔''

''نہیں، یہ مناسب نہیں ہوگا۔ پروگرام میں کوئی بھی تبدیلی خطرناک ہو سکتی ہے۔ ہمیں یہی ظاہر کرنا ہے کہ چھٹیوں پر جا رہے ہیں۔''

''وہ تمہاری بیوی سے بھی پوچھ سکتے ہیں؟''

''اسے اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ میں ایک کانفرنس میں شرکت کرنے سان فرانسسکو جا رہا ہوں اور دو دن پہلے روانہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ایک دوست کے ساتھ سیمینار میں شرکت کرنی ہے۔''

''میں یہ دباؤ برداشت نہیں کر سکتی۔ ہم پکڑے جائیں گے۔''

''اپنے دماغ میں یہ بات بٹھا لو کہ تمہاری نیت خراب نہیں تھی۔ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تم ایک سیدھی سادی عورت ہو۔ تمہاری دادی نے جھوٹ بولا اور تم نے اس پر یقین کر لیا۔ اس کے علاوہ تمہارا کوئی قصور نہیں۔''

''سام۔'' وہ بولی۔ ''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔''

''بالکل نہیں، ہمارا منصوبہ بالکل مکمل تھا پھر بھی تمہارے اطمینان کے لیے اسے دہرا لیتے ہیں۔ تم فرنانڈ لیگر کی ایک تصویر لے کر ڈاکٹر ولیم کے پاس گئیں جس کے نیچے کی جانب مصور کے دستخط اور تاریخ درج تھی۔ ڈاکٹر ولیم نے کیٹلاگ دیکھی لیکن اس میں اس عنوان کے تحت کسی تصویر کا نام نہیں تھا۔''

''وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گیا اور شبہ ظاہر کیا کہ یہ تصویر جعلی ہے۔'' سبرینا بولی۔ ''میں نے اسے یقین دلایا کہ یہ تصویر تقریباً سو برس سے ہمارے گھر میں ہے اور میرے پردادا نے اسے 1919ء میں پیرس سے خریدا تھا لیکن میرے پاس اس خریداری کی رسید نہیں تھی اور نہ ہی مجھے اس گیلری کا نام معلوم تھا۔ اس نے کہا کہ یہ کیسے ثابت ہوگا کہ یہ تصویر میرے پردادا نے خریدی اور گزشتہ سو سال سے ہمارے ڈرائنگ روم میں آویزاں ہے۔ میں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا کہ مجھے ایک فوٹو یاد آ رہی ہے جس میں میری پردادی اپنی بنائی ہوئی ڈش کی طرف اشارہ کر رہی ہیں اور پس منظر میں یہ تصویر صاف نظر آ رہی ہے۔ ان کے لباس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ فوٹو 1920ء یا اس کے بعد لی گئی ہوگی۔''

''دوسرے دن تم ڈاکٹر ولیم کے پاس گئیں اور وہ فوٹو اسے دیتے ہوئے تاکید کی کہ اسے سنبھال کر رکھے کیونکہ وہ

کینوس کو چاقو سے کھرچ کر صاف کیا اور اسے رات بھر تیل میں بھگوئے رکھا پھر دوسرے روز اسے آئیوری سوپ سے اچھی طرح صاف کیا اور لیگر کے انداز میں برش استعمال کرتے ہوئے یہ تصویر بنادی۔"

"تم نے رنگوں اور برش کا استعمال خوب کیا۔ اس عورت کے غیر جذباتی انداز کی اس سے اچھی تصویر کشی نہیں ہوسکتی تھی۔"

"اب بھی یہ خطرہ موجود ہے کہ کوئی رپورٹر کسی ایسے دوست، ملازم یا کاریگر تک پہنچ جائے جو یہ کہہ دے کہ اس نے لیگر کی بنائی ہوئی یہ تصویر کبھی ڈائننگ روم میں نہیں دیکھی۔"

"رپورٹرز دوسری خبروں کی جانب متوجہ ہوچکے ہیں اور ان کے لیے یہ خبر پرانی ہوچکی ہے جب تک کہ کوئی انہیں اس بارے میں نہ بتاتے اور میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر ولیم یا خریدار اس معاملے کی تشہیر نہیں چاہیں گے۔"

"لہٰذا کوئی بھی نہیں جان پائے گا کہ میں نے لیگر کی تصویریں پیرس میں دیکھی تھیں۔"

"کسی کو یہ خیال بھی نہیں آسکتا۔" سام نے بڑے یقین سے کہا۔

پندرہ منٹ بعد دروازہ کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ سبرینا نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور پلٹ کر خوف زدہ آواز میں بولی۔ "وہ واپس آگئے ہیں۔ اب میں کیا کروں؟"

"وہی جو تمہیں کرنا ہے۔" سام بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا "میں یہیں ہوں۔"

سبرینا نے دوانچ کے قریب دروازہ کھولا اور بولی۔

"کیا بات ہے؟"

"کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟" ڈاکٹر ولیم نے کہا۔

"میں مصروف ہوں۔"

"سبرینا یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ انہوں نے ایک اور نکتہ اٹھایا ہے اور یہ بہت ہی پریشان کن ہے۔" ولیم نے کہا۔ "انہیں تصویر پر سفید (titanium) ٹیٹنیم کے نشانات ملے ہیں۔"

سبرینا کو بہت زور کا چکر آیا اور اس نے دروازے کی چوکھٹ کا سہارا لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کینوس پر سفید ٹیٹنیم کیسے آگیا اور وہ اس کا کیا جواب دے۔

وہ انجان بنتے ہوئے بولی۔ "کیا کوئی بُری بات ہے؟"

"یہ پروڈکٹ 1921ء سے پہلے دستیاب نہیں تھی۔"

"یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ ہمارا فوری مسئلہ یہ ہے کہ تم اس فارم پر دستخط کردو۔ ہمیں اپنی رقم واپس چاہیے۔"

سبرینا نے قدم پیچھے ہٹا کر دروازہ بند کردیا۔ سام نے بیڈ روم سے باہر آکر کہا۔ "سفید ٹیٹنیم جدید دور کی دریافت ہے۔ کیا میں نے صحیح سنا؟"

"ہاں۔"

"یہ کینوس پر کیسے آگئی؟"

سبرینا کاؤچ پر گر گئی۔ "میں نہیں جانتی۔ ممکن ہے کہ اس پر غلطی سے سفید زنک لگ گیا ہو۔ وہ بوتل میرے پاس اب بھی ہے۔"

سام کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ غصے سے بولا۔ "تم جانتی تھیں کہ بوتل پر غلط لیبل چسپاں ہے اور اس میں زنک نہیں بلکہ ٹیٹنیم ہے۔ اس کے باوجود تم نے اسے استعمال کیا؟"

"مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ کمپنی ایسی غلطی کرسکتی ہے۔"

"وہ بوتل کہاں ہے؟"

سبرینا جلدی سے وہ بوتل لے کر آئی۔ سام نے اس کے لیبل کو غور سے پڑھا۔ اس کے اجزاء میں سفید ٹیٹنیم کا ذکر نہیں تھا۔ سام نے وہ بوتل اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لی۔

ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف ڈاکٹر ولیم بول رہا تھا۔ "سبرینا، ہم اس معاملے میں پولیس کو ملوث نہیں کرنا چاہتے۔ تم دونوں فارم پر دستخط کرکے مجھے مطلع کرو۔ میں ابھی تم سے یہ فارم لے لوں گا۔"

سبرینا نے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کردیا اور سام سے بولی۔ "ہمیں اس کی رقم واپس کردینی چاہیے۔"

سام نے سبرینا کو اٹھایا اور اسے اپنے بہت قریب کرلیا۔ سبرینا کو سکون محسوس ہوکہ وہ اسے معاف کرنے کے لیے تیار ہوگیا ہے۔ پہلے سام کا ارادہ نصف شب کے قریب روانہ ہونے کا تھا لیکن اب وہ ایک منٹ بھی نہیں رک سکتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سبرینا کی گردن دبوچ لی۔ پہلے تو وہ سمجھ نہ سکی کہ کیا ہورہا ہے پھر اس نے مزاحمت شروع کردی جس کے نتیجے میں سام نے اپنے ہاتھوں کا دباؤ مزید بڑھادیا اور چند سیکنڈ بعد سبرینا کا بے جان جسم زمین پر پڑا ہوا تھا۔

سبرینا کے بیگ میں سے اسے ایک پلاسٹک کا لفافہ ملا جس میں جہاز کے ٹکٹ، اس کا پاسپورٹ، ایک چھوٹے

لفافے میں پانچ ہزار ڈالر کے نوٹ اور ایک ٹائپ شدہ کاغذ جس پر ان کے بینک اکاؤنٹ کا نمبر اور پاس ورڈ وغیرہ درج تھا۔ اس نے وہ لفافہ اپنے کمپیوٹر بیگ اور ٹیوب سائز پاکٹ میں رکھ لی۔ وہ مڑنے والا تھا کہ اس کی نظر سبرینا کے آئی فون پر گئی۔ اس نے وہ بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔

سام نے اپنی کار سے ایک ترپال نکالی اور بلیو بیری کی تین جھاڑیاں لاکر اس گڑھے کے کنارے رکھ دیں جو اس نے پہلے ہی باڑ لگانے کے لیے کھود رکھا تھا۔ اس نے سبرینا کی لاش ترپال پر رکھی اور اسے رول کرنے کے لیے فرش پر جھکا ہی تھا کہ بیل بجنے کی آواز آئی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باہر اس کی بیوی ماریا کھڑی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اسے کوسا۔ دروازہ کھولا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔

"یہ کون ہے؟" ماریا نے پوچھا۔

"تم میرا تعاقب کررہی تھیں؟"

"ہاں کیونکہ اگر تمہیں ائرپورٹ جانا ہوتا تو بائیں جانب مڑتے لیکن جب تم نے دائیں طرف گاڑی موڑی تو مجھے شبہ ہوا اور میں تمہارا پیچھا کرنے پر مجبور ہوگئی۔ یہ کون ہے؟"

"ابھی نہیں، بعد میں بتادوں گا۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں اس کے ساتھ نہیں جارہا تھا۔"

"پھر تم یہاں کیوں آئے؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا، فی الحال تم جاؤ۔"

"نہیں، مجھے اندر آنے دو۔ میں خود اس سے بات کروں گی۔"

"گھر جاؤ ماریا۔ میں ایک گھنٹے بعد آرہا ہوں۔"

ماریا نے اسے دھکا دیا اور وہ پیچھے کی جانب لڑکھڑاتا ہوا کاؤچ پر جاگرا۔ وہ اس کے برابر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھی لیکن تین قدم چل کر رک گئی۔ اس کی آنکھیں لاش پر جمی ہوئی تھیں۔

"اوہ میرے خدا! سام یہ تم نے کیا کردیا؟"

"چلی جاؤ اور مجھے اپنا کام ختم کرنے دو۔"

"نہیں، میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟"

ماریا کا چہرہ زرد ہورہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سام اسے نظرانداز کرکے اپنے کام میں لگ گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے لاش کو کینوس میں لپیٹا اور اسے عقبی صحن میں لے گیا۔ ماریا کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ سام نے سبرینا کی لاش گڑھے میں اتاری اور اسے مٹی سے برابر کردیا پھر اس نے وہاں بلیو بیری کی جھاڑیاں لگائیں اور مزید مٹی ڈالی۔

اس دوران ماریا نے کمرے کا جائزہ لیا۔ سام کا سوٹ کیس دروازے کے ساتھ جبکہ اس کا کمپیوٹر بیگ صوفے پر رکھا ہوا تھا۔ ماریا کی نظر اس نیلے لفافے پر گئی جس کا ایک کونا بیگ سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ سام ابھی تک مٹی بھرنے میں مصروف تھا۔ اس نے وہ لفافہ نکال لیا۔ اس میں نقد رقم اور ان کے اکاؤنٹس کی تفصیل دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر اس نے سبرینا کا بیگ کھول کر اس کا پاسپورٹ نکالا۔ اس کی تصویر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سبرینا اس جیسی پُرکشش نہیں تھی لیکن دونوں کی شکلوں میں بہت معمولی فرق تھا۔ ماریا نے ایک بار پھر سبرینا کا بیگ کھولا اور اس کا والٹ نکال لیا جس میں کچھ نقد رقم کے علاوہ تین عدد کریڈٹ کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس اور انشورنس کارڈ رکھا ہوا تھا۔ ماریا نے وہ والٹ بھی لفافے میں رکھ لیا۔

اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سام اس جگہ پر کھاد پھیلا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ چشمہ لگانے اور سامنے کے بالوں کو کاٹنے کے بعد وہ سبرینا جیسی ہی دکھائی دے گی اور کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔ یہ معمولی تبدیلیاں ہی کافی ہیں۔ اب اسے سام کو الجھائے رکھنا تھا جب تک وہ جہاز میں سوار نہیں ہوجاتی اور وہ جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔

سام نے جب سینئر کی آواز سنی تو وہ حیران رہ گیا اور بولا۔ "تم اس وقت یہاں؟"

"ہاں، مجھے سبرینا کی طرف سے پریشانی ہورہی ہے۔ اسے آج میرے ساتھ لنچ کرنا تھا۔ کیا وہ گھر پر ہے؟"

"نہیں، اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ تم سے ملنے جارہی ہے۔"

سینئر نے سام کے مٹی سے بھرے ہوئے بالوں اور گیلی زمین دیکھی تو بولا۔ "لگتا ہے کہ تم نے بلیو بیری کے پودے لگائے ہیں۔"

"ہاں، سبرینا کو یہ بہت پسند ہیں۔"

سینئر نے پیچھے مڑ کر ڈرائیو وے کی جانب دیکھا اور بولا۔ "سبرینا کی کار تو کھڑی ہوئی ہے۔"

"وہ صبح ہی اپنے کسی دوست کے ساتھ چلی گئی تھی۔ جیسے ہی واپس آئے گی تو میں تمہیں فون کروادوں گا۔"

"میری صبح اس سے بات ہوئی تھی۔ اس نے تو اپنے

پروگرام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

اس وقت ایک گاڑی آ کر رکی اور اس میں سے ایک طویل قامت شخص برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ تین باوردی پولیس والے بھی تھے۔

"سینئر اونیل۔" سوٹ والے نے کہا۔ "کیون پاؤلے۔ میں تمہارا بہت بڑا مداح ہوں۔"

"شکریہ۔" سینئر نے کہا۔

وہ شخص سام کی طرف مڑا۔ "میں سراغ رساں پاؤلے ہوں۔ تم ہی سیموئل رولنس ہو۔"

"یہ سب کیا ہے؟"

"کیا سبرینا ایلیسن گھر پر ہے؟"

"نہیں۔ باہر گئی ہوئی ہے۔"

"کہاں؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔"

"اسے آج میرے ساتھ دو بجے لنچ کرنا تھا۔" سینئر نے کہا۔ "جب وہ نہیں پہنچی تو میں اسے دیکھنے چلا آیا اور میں نے سام کو بلیو بیری کے پودے لگاتے دیکھا۔"

سراغ رساں پاؤلے نے شکریہ ادا کرنے کے انداز میں سر ہلایا اور سام سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا تم ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن جانے سے پہلے اپنے ہاتھ دھونا پسند کرو گے۔"

"کس سلسلے میں؟"

"ہمیں تھوڑی دیر پہلے ایک نامعلوم کال موصول ہوئی ہے کہ سبرینا کا قتل ہو گیا ہے اور تم نے اسے مارا ہے۔"

"یہ بالکل مضحکہ خیز ہے۔"

سراغ رساں مسکراتے ہوئے بولا۔ "ممکن ہے کہ یہ اطلاع غلط ہو اور کسی عورت نے تمہیں پریشان کرنے کے لیے ایسا کیا ہو۔ اس لیے تم سے بات کرنا ضروری ہے، چلو اندر چلتے ہیں تاکہ تم ہاتھ منہ دھو لو۔"

سام کچن میں ہاتھ دھونے چلا گیا۔ سراغ رساں کی نظر سبرینا کے بیگ پر گئی۔ اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور بیگ ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "اس میں مجھے اس کا والٹ یا فون نہیں مل رہا۔"

سینئر نے کہا۔ "میں اس کا نمبر ڈائل کرتا ہوں۔"

سبرینا کا فون سام کی جیب میں تھا۔ اس کی گھنٹی بجی تو سینئر نے کہا۔ "اس کا فون تمہاری جیب میں کیوں ہے؟"

سام اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "شاید وہ غلطی سے میرا فون لے گئی۔ ہم دونوں کے فون ایک جیسے ہیں۔"

"تمہارے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے۔" پھر وہ سراغ رساں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "میں جا رہا ہوں لیکن میرا مشورہ ہے کہ اس جگہ کی کھدائی ضرور کرو جہاں سام نے بلیو بیری کے پودے لگائے ہیں۔" اس کے بعد وہ مزید کوئی لفظ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

سام نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "میں اپنے وکیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"بہت گرمی ہے۔" ماریا نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ وہاں اب بھی ٹھنڈا موسم ہو گا اور مئی کے آخر یا جون سے پہلے گرمی نہیں پڑتی۔ کیا تم کبھی جون کے مہینے میں نیو انگلینڈ گئے ہو؟"

اس کا نیا دوست آسٹریلین تھا جو اپنی فٹ بال ٹیم کے ہمراہ فتح کا جشن منانے بالی آیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ مجھے کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گی؟"

"میں اب کبھی واپس نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے زمین پر ہی جنت مل گئی ہے، میں اسے چھوڑ کر کیوں جاؤں؟"

"میرا خیال تھا کہ تم چھٹیاں منانے آئی ہو۔"

اس کا نام جارج تھا۔ ماریا کو بالی آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ ایک بار میں اس کی ملاقات جارج سے ہوئی۔ تب سے ہی وہ دونوں ساتھ تھے۔

"جارج، میں نے بغیر اطلاع دیے ملازمت چھوڑ دی۔ اپنا سامان باندھا، بینک اکاؤنٹ خالی کیا اور یہاں آ گئی۔ اب امریکا میں میرے لیے کچھ نہیں رکھا۔"

"ممکن ہے کہ میں بھی آسٹریلیا واپس نہ جاؤں۔"

"کیوں؟" وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

"تمہیں چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد جارج نے پوچھا۔ "بائی دا وے، تم کرتی کیا ہو؟"

"میں انشورنس کمپنی میں سراغ رساں ہوں۔" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھا اور کہا۔

"میرا کام ان لوگوں کو پکڑنا ہے جو ناجائز طریقے سے پیسا حاصل کرتے ہیں۔"

▼▼▼

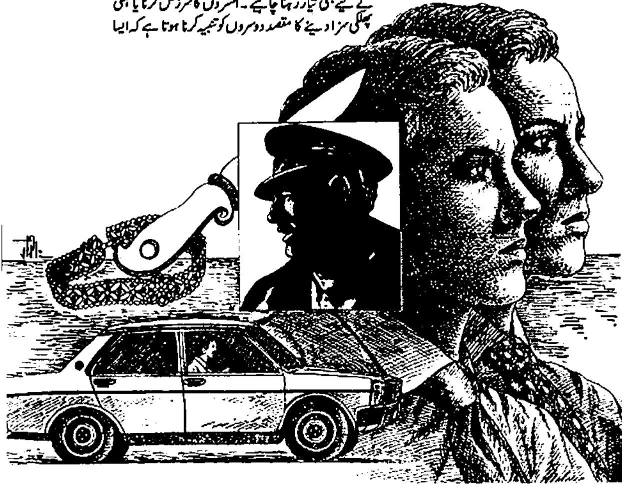
پکڑ

وسیم بن اشرف

وقت کی دبیز تہوں میں چیزیں چھپ ضرور جاتی ہیں... مگر نابود نہیں ہوتیں... سالوں پرانے ایک کیس کی دلچسپ رُوداد... ایک عورت کا اندوہناک قتل جو معمے کی صورت اختیار کر چکا تھا... سراغ رساں جیسے جیسے بڑھتا گیا... کیس کی پرتیں کھلتی گئیں۔

دو سادہ و معصوم بھائیوں کی محبت و یگانگت جو ہم مشکل بھی تھے

میرے سینئر افسر نے میرا تبادلہ ایک دوسرے شعبے میں کر دیا تھا۔ یہ میرے لیے تعجب کی بات نہ تھی، جب آپ کسی بڑی شخصیت یا اس کے کسی عزیز رشتے دار کو قانون شکنی پر کوئی سزا دیتے ہیں تو پھر آپ کو اس کے نتائج بھگتنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ افسروں کا سرزنش کرنا یا ہلکی پھلکی سزا دینے کا مقصد دوسروں کو تنبیہ کرنا ہوتا ہے کہ ایسا



کرنے سے کیسے نتائج کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ مجھ سے بھی ایسا ہی ''جرم'' سرزد ہوا تھا۔ میئر کا بیٹا شراب کے نشے میں دھت تیز رفتاری سے گاڑی کو سڑک پر لہراتا جا رہا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ کسی کو شدید نقصان پہنچاتا میں نے اس کا چالان کر دیا۔ اس ''گستاخی'' کا صلہ مجھے اسی روز مل گیا۔ میرا نام رابرٹ ہے اور میں ہوی سائڈ ڈیپارٹمنٹ میں سارجنٹ ہوں۔ اپنا کام پوری دیانت داری کے ساتھ کرتا ہوں، غفلت نام کی چیز میری ڈکشنری میں ہی نہیں ہے۔ میرے کام کے انداز اور ایمانداری کو میرے ساتھی بھی سراہتے تھے۔ کسی کو قانون سے کھلواڑ کرتے دیکھنا میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ ہوی سائڈ ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے کے باوجود میں نے شہر کے میئر کے بیٹے کا چالان کیا تو میرے چیف نے ''تحفے'' کے طور پر ایک نئی ذمے داری سونپ دی۔ چیف نے حکم دیا کہ تم ریکارڈ روم میں ایسے کیسوں پر نظرِ ثانی کرو گے جو گزشتہ 25 برس یا اس سے زیادہ مدت میں حل نہیں ہوسکے۔ ان میں قتل سے لے کر مار پیٹ اور جھگڑوں سمیت ہر قسم کے فوجداری مقدمات تھے۔ الماریوں میں ایسے مقدمات کی فائلوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ان پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ چیف کا حکم تھا کہ ان میں سے ہر ایک فائل کا مطالعہ کروں اور جائزہ لوں کہ کیا کوئی ایسا کیس ہے جس پر اب بھی کچھ کیا جاسکتا ہے یا نہیں، یہ تمام فائلیں ریکارڈ روم کے ایک تنگ سے کمرے میں بھری ہوئی تھیں۔

میں نے گہری سانس لی اور کمرے کا جائزہ لینے لگا، کمرے میں ایک بھی کھڑکی نہ تھی۔ میں الماریوں کے بیچ اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اس سرگشت کے دوران ایک جانب تھوڑی سی کھلی جگہ پر بوسیدہ سی ایک میز اور کرسی نظر آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھ سے پہلے بھی کسی کو یہاں مقرر کیا جاچکا تھا۔ میں نے میز کے اوپر لٹکتا بلب روشن کر دیا اور پھر سے الماریوں کی طرف متوجہ ہو کر ان کے لیبل پڑھنے لگا۔

کیپٹن اینٹن نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہاں تقریباً ہر طرح کے فوجداری جرائم کا ریکارڈ میرا منہ چڑا رہا تھا اور ان میں سے ہر جرم 25 برس قبل ہوا تھا، میں نے کڑوا گھونٹ بھرا اور اس سیکشن کو ڈھونڈنے لگا جس میں قتل کے مقدمات کا ریکارڈ موجود تھا۔ مجھے وہ سیکشن مل گیا تو میں نے ایک الماری کے پٹ کھولے، ایک موٹی سی فائل نکالی اور گرد سے اَٹی ہوئی کرسی کو پھونکوں سے تھوڑا بہت صاف کر کے اس پر بیٹھ کر فائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔ قتل کی یہ واردات 1991ء میں ہوئی تھی۔ مہینا نومبر کا تھا۔ نومبر کے پہلے جمعے کو شام چھ بج کر 40 منٹ پر خاتون کا قتل ہوا تھا۔

چھ بج کر 40 منٹ پر مسز برنین کے ہمسایوں نے اس کی چیخیں سنی تھیں اور پڑوس والے اپنی کھڑکیوں سے جھانکنے لگے۔ ایک پڑوسن مسز ولسن نے مسز برنین کے گھر کے پچھلے حصے سے ایک سایہ سا نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ان دنوں سورج پونے پانچ بجے غروب ہو رہا تھا اس لیے پونے سات بجے تک گہری تاریکی پھیل چکی تھی اور چونکہ چاند بھی بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا اس لیے مسز ولسن اس سے کچھ زیادہ دیکھنے یا بتانے سے قاصر تھی۔ بہرحال مسز ولسن نے فوراً پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس مکان میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ مسز برنین باورچی خانے کے فرش پر لہو میں نہائی مردہ پڑی تھی۔ قتل کسی تیز دھار آلے سے کیا گیا تھا۔ تین گہرے زخم اس کے جسم پر موجود تھے۔ آلۂ قتل جائے واردات سے غائب تھا۔ پولیس کو لاش کے پاس ہیروں کا ایک بریسلٹ ملا، جس کی مالیت ماہر جوہریوں کے نزدیک کم و بیش 25 ہزار ڈالر تھی۔ پولیس نے لاش کے فوٹو وغیرہ لیے اور مزید ضروری کارروائی کے بعد ڈیڈ باڈی کو پوسٹ مارٹم کے لیے مردہ خانے بھجوا دیا۔

پولیس کے دو جاسوس جن میں سے ایک کا نام سارجنٹ فلپ تھا، برنین کے گھر پر رات 11 بجے تک رہے، گیارہ بجے مسز برنین کا شوہر ڈینس برنین گھر واپس آیا تو سارجنٹ نے اسے حالات سے آگاہ کیا۔ اپنی بیوی کے قتل کا سُن کر بظاہر ڈینس کو بہت صدمہ ہوا تھا۔ پولیس کے دریافت کرنے پر اس نے اس بات سے قطعی انکار کر دیا کہ اس قتل میں اس کا کوئی ہاتھ ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ شام 6 بجے سے رات کے 10 بجے تک اپنے جڑواں بھائی البرٹ کے گھر پر تھا۔ ڈینس کو مزید تفتیش کے لیے پولیس اسٹیشن لے جایا گیا لیکن وہ اپنے بیان پر ہی قائم رہا۔ جب اس کے بھائی البرٹ کو پولیس اسٹیشن طلب کیا گیا تو اس نے بھی اپنے بھائی کے بیان کی مکمل تائید کی۔ آخر پولیس نے صبح کے ساڑھے پانچ بجے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔ سادہ لباس میں ایک اہلکار کو اس کی نگرانی پر مامور کر دیا گیا۔ ڈینس پولیس اسٹیشن سے سیدھا اپنے بھائی کے مکان پر گیا اور پھر وہاں سے سینٹ جان کے گرجا گھر جا پہنچا، وہاں اس نے صبح کی دعا میں شرکت کی۔ بعد میں پتا چلا کہ خواہ آندھی آئے یا

طوفان حالات موافق ہوں یا ناموافق مگر ڈینس ہر صبح کی دعا میں ضرور شریک ہوتا تھا۔

کیس میں میری دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ میں نے مزید پڑھنا شروع کیا، فائل میں ہر چیز موجود تھی۔ انٹرویو کا ریکارڈ، مختلف افراد سے پوچھے گئے سوالات، گواہوں کے بیانات، حلیے، انگلیوں کے نشانات، کیس سے متعلق کئی لوگوں کے زندگی کے حالات، ہر بات جو پولیس تحقیقات سے معلوم ہوسکتی تھی، وہ سب کچھ موجود تھا مگر اس کے باوجود قتل کا معما حل نہ ہوسکا تھا۔ قاتل کا پتا نہ چلنا تھا اور نہ چلا۔ میں نے وہ رپورٹ دیکھی جو پولیس اور گواہوں کے انٹرویوز کے بارے میں تھی۔ سارجنٹ فلپ نے سب سے پہلے مسز ولسن سے سوالات پوچھے تھے۔

''مجھے ان لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے۔'' مسز ولسن نے ایک سوال کے جواب میں بتایا۔ ''انہیں یہاں آئے صرف چھ مہینے ہوئے ہیں۔''

''پھر بھی جو کچھ آپ جانتی ہیں وہ بتائیں۔''

''میں مسز برنین کی ایک بات کی تعریف کروں گی، وہ ہمیشہ پیر کے روز کپڑے دھوتی تھی جبکہ دوسرے لوگ کبھی منگل کو دھوتے ہیں اور کبھی بدھ کو اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کا کوئی دن مقرر نہیں۔ جب چاہا دھو لیے۔ اس کے علاوہ وہ رسی پر بڑی ترتیب سے کپڑے خشک ہونے کے لیے ڈالتی تھی۔''

''ترتیب سے کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تکیے کے غلاف ایک ساتھ، تمام پتلونیں ایک ساتھ، قمیصیں ایک ساتھ، دوسرے لوگوں کی طرح نہیں کہ جو کپڑا ہاتھ لگا رسی پر پھیلاتے چلے گئے۔''

''میں سمجھ گیا، ہاں تو آپ نے چھ بج کر چالیس منٹ پر مسز برنین کی چیخ سنی اور فوراً اپنی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔''

''جی ہاں، باہر کافی اندھیرا تھا، مگر میں نے اس شخص کو گھر کے عقبی لان سے بھاگ کر گلی میں جاتے دیکھ لیا تھا۔''

''کیا وہ مسٹر برنین تھے؟''

''یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی، بس وہ ایک ہیولا یا سایہ سا معلوم ہو رہا تھا، وہ کوئی بھی شخص ہوسکتا تھا۔''

''کیا مسٹر برنین اور اس کی بیوی میں کبھی بحث، تو تکار یا جھگڑا نہیں ہوتا تھا؟''

''وہ دونوں بہت خاموش طبع تھے، کبھی کسی نے انہیں اونچی آواز میں بولتے بھی نہیں سنا، بہت ہی شائستہ اور نفیس میاں بیوی تھے، بظاہر ان دونوں میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوتی تھی سوائے ووڈکا کی بوتلوں کے۔''

''ووڈکا کی بوتلیں؟''

''جی ہاں، ہر دوسرے تیسرے دن مسز برنین خاموشی سے اپنے مکان کے پچھلے دروازے سے ایک خالی بوتل ہاتھ میں لیے نکلتی اور اسے کچرے کے ڈرم میں پھینک دیتی۔ اتفاق سے ایک دفعہ جب کچرا دان خالی کرنے والا آیا تو میں باہر کھڑی تھی، میں نے دیکھا برنین والوں کے ڈرم سے آٹھ یا نو بوتلیں نکلیں اور ہر دو ہفتے کے بعد یہی تعداد نکلتی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے برنین اور اس کی بیوی شراب پیتے تھے۔''

''میرا خیال ہے مسٹر برنین نہیں پیتے تھے، میں آدمی کی صورت دیکھ کر بتا سکتی ہوں کہ یہ شراب پیتا ہے یا نہیں، اس کی بیوی پیتی ہوگی، ووڈکا پینے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اسے پینے کے بعد منہ سے بُو نہیں آتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ اپنے شوہر سے چھپا کر پیتی تھی اور خالی بوتلیں چپکے سے کچرے دان میں پھینک دیتی تھی۔''

''کیا کبھی کوئی دوست یا ملاقاتی ان لوگوں سے ملنے آتا تھا؟''

''زیادہ لوگ تو نہیں آتے تھے البتہ اس کی بیوی کا ایک خاص ملاقاتی ضرور تھا۔''

''کوئی ایسا شخص جو اکثر اس سے ملنے آتا ہو؟''

''آتا نہیں تھا بلکہ وہ اس سے ملنے جاتی تھی۔''

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''میری بہن یہاں سے چار بلاک آگے رہتی ہے، میں اکثر اس سے ملنے جاتی رہتی ہوں۔ تقریباً دو ماہ قبل ایک سہ پہر کو میں اور میری بہن میگی رہائشی کھڑکی کے پاس بیٹھی چائے پی رہی تھیں کہ میں نے مسز برنین کو سڑک پر آتے دیکھا، وہ موڑ پر رک گئی۔ میں سمجھی شاید بس کا انتظار کر رہی ہے، کئی بسیں آئیں اور نکل گئیں مگر وہ یونہی کھڑی رہی، یہ ایک عجیب بات تھی، تجسس ایک فطری چیز ہے، چنانچہ میں اور میگی حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں، پھر ایک بڑی کار آئی اور مسز برنین کے پاس آ کر رکی اور وہ جلدی سے اس میں بیٹھ گئی۔ یہ بدھ کی بات تھی، جمعے کو اتفاق سے میں اور میگی پھر وہیں بیٹھی تھیں کہ ہم نے دوبارہ مسز برنین کو اسی کار میں جاتے دیکھا، میگی نے مجھ سے کہا کہ وہ اس معاملے پر نظر رکھے گی اور پتا ہے کیا

معلوم ہوا، مسز برنین ہفتے میں دو تین بار اس آدمی کے ساتھ ضرور جاتی تھی۔"

"کیا آپ اس کار کے بارے میں بتا سکتی ہیں؟"

"مجھے کاروں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں البتہ وہ کوئی قیمتی کار لگتی تھی، میں تو اس شخص کا حلیہ بھی نہیں بتا سکتی، وہ کبھی کار سے باہر نکلا ہی نہیں پھر بھی......"

"پھر بھی کیا؟"

"میری بہن نے کار کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔"

اس نے سارجنٹ فلپ کو کار کا نمبر بتادیا، اسٹیٹ موٹر وہیکل ڈپارٹمنٹ سے معلوم ہوا کہ وہ کار چارلی نام کے شخص کی ہے جو 2481 سمن ایونیو پر رہتا ہے، تحقیقات کی گئیں، معلوم ہوا کہ چارلی کی عمر پینتالیس، اڑتالیس سال کے لگ بھگ ہے، وہ ایک بہت بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا سینئر وائس پریذیڈنٹ ہے، شادی شدہ ہے اور اس کے دو بچے کالج میں زیر تعلیم ہیں۔

سارجنٹ فلپ اس سے ملنے پہنچ گیا۔

"کیا تم مسز برنین نام کی کسی خاتون کو جانتے ہو؟" سارجنٹ نے پوچھا۔

"برنین......" چارلی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں، میں اس نام کی کسی خاتون کو نہیں جانتا۔"

"ممکن ہے یہ تصویر تمہاری یادداشت کی کوئی مدد کرے۔" سارجنٹ فلپ نے اسے مسز برنین کا فوٹو دکھایا۔

چارلی نے تصویر دیکھی۔ اس کا رنگ قدرے زرد پڑ گیا، اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"تم نے اسے آخری بار کب دیکھا تھا؟" سارجنٹ نے پوچھا۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں مسز برنین نام کی کسی خاتون کو نہیں جانتا۔" اب اس کے حواس بحال ہو چکے تھے۔

"لیکن ہمارے پاس ایسے معتبر گواہ ہیں جنہوں نے تمہیں کئی مرتبہ اس سے ملتے دیکھا ہے اور انہی میں سے ایک نے تمہاری کار کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔" سارجنٹ کی بات پر چارلی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

"آخر ہوا کیا ہے، کچھ بتائیں گے؟" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"مسز برنین کو گزشتہ رات قتل کردیا گیا۔" سارجنٹ نے دھماکا کیا۔ چارلی کو اپنی کنپٹیاں پھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں، سرد لہریں اس کے وجود کو دہلانے لگیں۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس قتل سے میرا کوئی تعلق ہے۔" اس نے حواس مجتمع کر کے پوچھا۔

"کل چھ بج کر چالیس منٹ پر تم کہاں تھے؟"

"کیا قتل اسی وقت ہوا ہے؟"

"برائے کرم میرے سوال کا جواب دو۔" سارجنٹ کا لہجہ قدرے درشت ہوگیا۔ چارلی چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، اب وہ مطمئن نظر آرہا تھا، وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"گزشتہ روز اس وقت میں اسٹیٹ بزنس ایسوسی ایشن کی دعوت میں شریک تھا۔ یہ تقریب پارک فالز میں ہوئی، یہ جگہ یہاں سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔"

"کیا کوئی شخص تمہارے اس بیان کی تصدیق کرسکتا ہے۔"

"کیوں نہیں، سو سے زائد افراد اس کی تائید کرسکتے ہیں، دراصل مجھے وہاں تقریر بھی کرنا تھی، میں چھ بجے پارٹی میں پہنچ گیا تھا، سات بجے کھانا کھایا گیا، ساڑھے سات بجے میں نے تقریر کی۔"

"مسز برنین سے تمہارے تعلقات کس نوعیت کے تھے؟"

"ہم دونوں صرف دوست تھے۔"

"ہاں ایسے دوست جو چھپ کر ملاقاتیں کرتے تھے، ایسا دوست جس نے خاصا مہنگا بریسلٹ خرید کر اسے دیا، ہم اس کا سراغ لگا رہے ہیں اور ہمارے لیے یہ معلوم کرنا قطعی دشوار نہیں ہوگا کہ مسز برنین کے پاس وہ بریسلٹ کہاں سے آیا۔"

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ہی اسے دیا تھا۔" چارلی نے پسپائی میں ہی عافیت سمجھی۔

"تمہاری اس سے جان پہچان کیسے ہوئی؟"

"پہلی ملاقات اتفاقیہ تھی، پھر راہ و رسم بڑھتے چلے گئے، دراصل اس کا شوہر اسے خوش نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ اسے سمجھ ہی نہ پایا تھا۔"

"تم نے اس سے کس قسم کے وعدے کیے تھے؟"

"وعدے!" اس کا چہرہ حیرانی کا تاثر لیے ہوئے تھا۔

"کوئی شخص کسی کو پچیس، تیس ہزار کا زیور یونہی تولے

کر نہیں دے دیتا، کیا تم نے کبھی اس کو یہ تاثر دیا تھا کہ اس سے تمہارے تعلقات رسمی نوعیت سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہیں اور یہ کہ ان کا نتیجہ شادی بھی ہوسکتا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" چارلی نے زور دے کر کہا۔ "ممکن ہے اس نے ان تعلقات کا مطلب غلط سمجھ لیا ہو لیکن میں نے کبھی بھی اس سے اس قسم کا کوئی وعدہ کیا نہ ہی ایسی آس امید دلائی۔" پھر اس نے قدرے رک کر ایک گہری سانس لی۔ "سارجنٹ کیا اس معاملے میں میرا نام درمیان میں لانا ضروری ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں ایک شادی شدہ شخص ہوں، جس کے دو بچے بھی ہیں۔ اگر مسز برنین سے میری دوستی منظر عام پر آگئی تو اس سے میری شخصیت کو نقصان پہنچے گا جبکہ میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔"

"لیکن تمہاری دوستی اس قتل کی وجہ تو ہوسکتی ہے۔" سارجنٹ نے جواب دیا۔ "یہ سن کر چارلی کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔"

ریکارڈ روم کی کرسی اتنی شکستہ ہوچکی تھی کہ میں بار بار اس سے پھسل جاتا تھا بہرکیف میں نے ایک بار پھر خود کو گرنے سے بچاتے ہوئے اس کیس سے متعلق کچھ اور کاغذات پر توجہ مرکوز کردی۔

ڈینس اور البرٹ جڑواں بھائی تھے۔ دونوں میں اس قدر مشابہت تھی کہ انہیں الگ الگ پہچاننا مشکل تھا۔ ان کے قریبی دوست بھی عموماً دھوکا کھا جاتے تھے کہ ڈینس کون ہے اور البرٹ کون ہے۔ ان کے والدین نے شروع ہی سے فیصلہ کرلیا تھا کہ دو بھائیوں کی شکل خواہ ایک جیسی سہی لیکن دونوں کی شخصیت ایک دوسرے سے مختلف ہونی چاہیے۔ اسکول میں اگرچہ انہیں ایک جیسی تعلیم دلائی گئی اور ان کی ترقی کی رفتار بھی کم وبیش ایک جیسی ہی رہی لیکن ان کے مضامین الگ الگ تھے۔ انہیں اتفاق سے ہی کبھی کلاس میں ایک ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ دونوں کا لباس بھی جداگانہ ہوتا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے ہوکر وہ ایک دوسرے سے کافی مختلف ثابت ہوئے، ڈینس اپنے باپ پر گیا تھا اور مذہب کی طرف زیادہ مائل تھا جبکہ البرٹ اپنی ماں کی طرح فلسفیانہ خیالات رکھتا تھا، اسی طرح دونوں کا شعبہ بھی مختلف تھا۔ ڈینس نے اکاؤنٹنٹ بننا پسند کیا جبکہ البرٹ لائبریرین تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں بے حد محبت و پیار تھا۔

میں نے رپورٹ کے وہ صفحات دیکھنے شروع کیے جن میں ڈینس سے سوالات کیے گئے تھے چونکہ اس سے کئی بار پوچھ گچھ کی گئی تھی اس لیے یہ سوال و جواب کافی صفحات

ہوشیار

عمارت میں زبردست آگ لگی ہوئی تھی۔ بھگدڑ کے باوجود سب لوگ نکل گئے مگر تین افراد اس بُری طرح پھنسے کہ چھت پر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

فائر انجن آئے، عملے نے نیچے ایک بڑا کمبل تان کر آواز لگائی کہ ایک آدمی نیچے کود جائے۔ وہ کودا، عملے نے اسے کمبل میں لپیٹا اور احتیاط سے الگ لے گئے۔

دوسرا بھی اسی طرح نیچے آگیا۔ اوپر ایک خاتون رہ گئی۔ "میں نہیں کودوں گی...... میرے چھلانگ لگاتے ہی تم لوگ کمبل ہٹالو گے۔" اس نے اوپر سے چلا کر جواب دیا۔

آگ تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ عملے نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن عورت کو ان پر یقین نہیں آیا۔ آخرکار اس نے اپنی شرط پیش کردی۔ "تم لوگ کمبل سڑک پر پھیلا کر اس سے دور ہٹ جاؤ...... میں کمبل پر کود جاؤں گی!"

کورنگی سے عمیرا اقبال کی عقل مندی

سمندر

شکاری دو دو کی تین ٹولیوں میں شکار کے لیے نکلے۔ شام سے پہلے دو ٹولیاں شکار لے کر لوٹ آئیں۔ سورج ڈھلنے کے بعد تیسری ٹولی کا صرف ایک شکاری اپنے کندھے پر شکار کیا ہوا ہرن لادے نمودار ہوا تو سب پریشان ہو گئے۔

"جانی کہاں ہے...... اسے کیا ہوا...... کہاں چھوڑ آئے اسے......؟" سب نے سوالات کی بھرمار کردی۔

آنے والے نے ہرن کو اطمینان سے زمین پر ڈالا اور انہیں بتایا۔ "جانی کو کوئی دورہ پڑا اور وہ گر کر بے ہوش ہوگیا......"

"اور تم اسے یوں ہی لاوارث چھوڑ آئے؟"

"مجبوری تھی۔" اس نے شانے اچکا کر بے پروائی سے کہا۔ "ہرن چھوڑ کر اسے لاتا تو آس پاس گھومنے والے شکاری میرا ہرن چرا لے جاتے...... جانی کو ہم آرام سے لے آئیں گے، اسے کون چرائے گا۔"

میر بتا راضی، کراچی

پر محیط تھے۔ میں انہیں جستہ جستہ دیکھتا چلا گیا۔

’’تمہارا کہنا ہے کہ تم نے شام اپنے بھائی کے گھر گزاری، کیا اس نے تمہیں مدعو کیا تھا، یا تم یونہی اتفاقاً چلے گئے تھے؟‘‘

’’اس نے مجھے باقاعدہ دعوت دی تھی۔‘‘

’’تم اپنے بھائی کے گھر کس وقت پہنچے تھے؟‘‘

’’میں وہاں تقریباً چھ بجے پہنچ گیا تھا۔‘‘

’’اور کتنی دیر تک رہے؟‘‘

’’ساڑھے دس بجے تک۔ اس کے بعد جب میں گھر پہنچا تو ایک پولیس سارجنٹ میرا منتظر تھا۔‘‘

’’تم نے کھانا اپنے بھائی کے ساتھ کھایا تھا؟‘‘

’’جی ہاں۔‘‘

’’کھانے میں کیا کیا تھا؟‘‘

’’بھنا گوشت، تلے ہوئے آلو، ٹماٹر کے قتلے، مٹر اور کافی۔‘‘

’’تمہارا بھائی کنوارا ہے؟‘‘

’’جی ہاں۔‘‘

’’پھر کھانا کس نے تیار کیا؟‘‘

’’اس کی مکان مالکہ نے، البرٹ مسز پورٹر کے مکان کی بالائی منزل پر رہتا ہے، مسز پورٹر اس کے لیے رات کا کھانا تیار کرتی ہے اور اوپر... دے جاتی ہے۔‘‘

’’کیا اس نے ہی تم دونوں کے لیے میز پر کھانا لگایا تھا؟‘‘

’’نہیں، میرے آنے سے پہلے ہی کھانا تیار کر کے دے گئی تھی، البرٹ نے اسے گرم رکھنے کے لیے اوون میں رکھ دیا تھا۔‘‘

’’کیا مسز پورٹر نے تمہیں آتے دیکھا؟‘‘

’’مجھے معلوم نہیں۔‘‘

’’کھانے کے بعد تم نے کیا کیا؟‘‘

’’البرٹ اور میں شطرنج کھیلتے رہے۔‘‘

’’رات کے ساڑھے دس بجے تک۔‘‘

’’ہاں اور ہر بازی میں ہی جیتتا رہا، البرٹ اچھا کھلاڑی نہیں ہے، اس لیے اسے شطرنج سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں۔‘‘

’’اس کے باوجود وہ تین گھنٹے کھیلتا رہا؟‘‘

’’ہاں، وہ دوسروں کے جذبات کا خیال رکھنے والا آدمی ہے۔ پھر یہ کہ میں اس کا مہمان تھا۔‘‘

’’کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کون تمہاری بیوی کو مارنا چاہتا تھا؟‘‘

’’بالکل نہیں، وہ یقیناً کوئی چور یا اسی قبیل کا کوئی جرائم پیشہ ہوگا۔‘‘

’’تمہارے اور تمہاری بیوی کے درمیان کبھی جھگڑا بھی ہوتا تھا؟‘‘

’’کبھی کبھار اور میرا خیال ہے شاید ہی کوئی ایسے میاں بیوی ہوں گے جن کے درمیان کبھی کوئی اختلافِ رائے نہ ہوتا ہو۔‘‘

’’جھگڑا عام طور پر کس بات پر ہوتا تھا؟‘‘

’’کوئی خاص بات باعثِ اختلاف نہیں تھی، بس یہی روزمرہ کی چھوٹی موٹی باتوں پر تکرار ہو جاتی تھی۔‘‘

’’کیا تم چارلی کولنگ نام کے کسی شخص کو جانتے ہو؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ ڈینس نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’میں اس نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں ہوں۔‘‘

تم نے وہ بریسلٹ دیکھا جو ہمیں لاش کے پاس سے ملا۔‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟‘‘

’’جی نہیں، میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔‘‘

میں نے کچھ ورق پلٹے، مسز پورٹر یعنی دوسرے بھائی کی مکان مالکہ سے بھی کئی سوال کیے گئے تھے، اس نے ڈینس کو آتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ اس نے ساڑھے دس بجے رخصت ہوتے ضرور سنا تھا، پھر میں نے وہ صفحات دیکھے جن میں البرٹ سے سوالات کیے گئے تھے۔ البرٹ فوج میں بھی رہ چکا تھا۔ وہاں اس نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، اس بہادری کے صلے میں اسے مختلف نوعیت کے سات تمغے بھی مل چکے تھے۔

’’کیا تمہارا بھائی اکثر تمہارے پاس آتا رہتا ہے؟‘‘

’’اکثر تو نہیں کبھی کبھی آتا ہے، اس روز اسے میں نے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی تھی اور وہ شام کو چھ بجے کے قریب آیا تھا، ہم نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور پھر شطرنج کھیلتے رہے۔‘‘

’’کتنی بازیاں کھیلی تھیں؟‘‘

’’صحیح تعداد تو نہیں بتا سکتا شاید پانچ یا چھ بازیاں۔‘‘

’’اور ان میں سے نصف تم نے جیتی تھیں۔‘‘

’’جی نہیں، ہر مرتبہ ڈینس ہی جیتتا رہا، وہ شطرنج کا اچھا کھلاڑی ہے۔‘‘

’’کیا اس وقت تم نے ریڈیو بھی آن کر رکھا تھا۔‘‘

’’جی نہیں۔‘‘

’’مجھے معلوم ہوا ہے اس شام کھانے میں بکرے کی چانپیں تھیں۔‘‘

’’جی نہیں، گائے کا بھنا گوشت تھا، آلو تھے، ٹماٹر تھے، مٹر تھے۔‘‘

’’آلوؤں کا بھرتہ تھا؟‘‘

’’جی نہیں، تلے ہوئے آلو تھے۔‘‘

’’ڈینس نے کھانے کے بعد شراب بھی پی تھی؟‘‘

’’وہ شراب نہیں پیتا، ہم نے کریم کافی پی تھی۔‘‘

’’تم نے اپنے بھائی کی بیوی کو دعوت نہیں دی تھی؟‘‘

’’پہلے میں اسے بھی بلاتا تھا لیکن جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے گھر آکر بور ہوتی ہے تو میں نے اسے مدعو کرنا کم کر دیا اور جب کبھی میں اسے دعوت دیتا تھا تب بھی وہ اکثر سر درد کا بہانہ کر دیتی تھی۔‘‘

میں نے قدموں کی آہٹ سنی، نگاہ اٹھا کر دیکھا تو کیپٹن ملی کھڑا تھا۔ ’’خوب، تو تم ابھی تک یہیں ہو، معلوم ہوتا ہے کہ کام دلچسپ لگا، بہر حال تمہاری بہن نے فون کیا تھا کہ تم دوپہر کا کھانا گھر کھانے کیوں نہیں آئے۔‘‘

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے آٹھ بج چکے تھے اور مجھے احساس تک نہ ہوا تھا، میں کرسی سے کھڑا ہو گیا، کاغذات سمیٹ کر فائل میں رکھے، فائل واپس الماری میں رکھی، کمرے سے نکل کر اسے مقفل کیا، کیپٹن شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔ میں نے رات کو کام کرنے والے عملے سے شہر کی ڈائریکٹری مانگی، اس میں دیکھا ڈینس تو نہیں تاہم البرٹ برنین کا پتا مجھے مل گیا، مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ وہ اب تک اسی جگہ رہ رہا تھا، پچیس سال قبل جہاں مقیم تھا۔

میں نے اپنی بہن کو فون کر کے اپنی خیریت سے آگاہ کیا اور پھر کار میں بیٹھ کر البرٹ سے ملنے چل دیا، مطلوبہ مکان پر پہنچ کر میں نے اوپر والے فلیٹ کی ڈور بیل بجائی، چند لمحوں بعد دوسری منزل کا ہال روشن ہو گیا اور آواز آئی۔ ’’دروازہ کھلا ہے۔‘‘ میں سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا، آخری سیڑھی کے پاس چھوٹے قد کا ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا، پچپن سال سے اوپر عمر لگتی تھی لیکن چہرے پر جوانی کے آثار باقی تھے۔

’’تمہارا نام البرٹ ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا، میں تھوڑا سا ہچکچایا پھر اپنے پرس سے اپنا پولیس کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔ ’’میرا نام سارجنٹ رابرٹ ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ اس نے میرے کندھے کے اوپر سے میرے پیچھے دیکھا۔

’’میرا خیال تھا پولیس کے جاسوس عموماً دو کی تعداد میں کام کرتے ہیں۔‘‘ وہ بولا۔

’’سرِدست تو میں اسپیشل ڈیوٹی پر ہوں اور اکیلا ہی کام کر رہا ہوں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں تمہارے بھائی ڈینس سے کہاں مل سکتا ہوں؟‘‘ میرے استفسار پر اس نے خفیف سی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔

’’گویا آپ کو نہیں معلوم وہ آج کل کہاں ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

اس نے مجھے اندر آنے کی دعوت دی، مجھے ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کچن نظر آیا اور کچن کے بعد ایک کمرا تھا جس میں کتابیں ہی کتابیں نظر آرہی تھیں۔ ماحول میں کتابوں، تمباکو کے دھوئیں اور شاید بھنے گوشت کی ملی جلی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے نفیس پائپ میں اعلیٰ کوالٹی کا تمباکو بھرا اور اسے سلگاتے ہوئے پوچھا۔ ’’تم یہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو کہ ڈینس کہاں ہے؟‘‘

’’آپ کو اس کا اتا پتا معلوم ہے یا نہیں؟‘‘

’’ہاں معلوم ہے۔‘‘ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ’’وہ قبرستان میں آرام کر رہا ہے، 1995ء میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔‘‘

’’1995ء میں؟‘‘

’’ہاں! مگر آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟‘‘

’’میں اس سے اس کی مقتولہ بیوی کے بارے میں چند باتیں کرنا چاہتا تھا۔‘‘

’’کہیں آپ یہ تو انکشاف نہیں کرنے والے کہ آخر پولیس نے اس قتل کا معما حل کر لیا ہے۔‘‘ وہ چونک کر بولا۔

’’کچھ ایسی ہی بات ہے۔‘‘

’’گویا آپ جانتے ہیں کہ اس کی بیوی کو کس نے قتل کیا تھا؟‘‘

’’ہاں، تمہارے بھائی ڈینس نے۔‘‘ میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا، البرٹ بڑی دلچسپی سے میری زبان سے مزید انکشاف سننے کا منتظر تھا۔

’’میں نے اس واردات کی کڑیاں کچھ اس طرح ترتیب دی ہیں۔‘‘ اسے خاموش پا کر میں نے کہنا شروع کیا۔ ’’تمہارے بھائی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی کے چارلی سے تعلقات ہیں، میرا خیال ہے کہ اس نے اتفاقاً ہیرے کا وہ بریسلٹ دیکھ لیا اور پھر یہ جاننا چاہا کہ وہ

اس کے پاس کہاں سے آیا اور یہ سوال و جواب ایسے وقت پر ہوئے جب اس کی بیوی ووڈ کا شراب کے نشے میں تھی، چنانچہ نہ صرف اس نے تعلقات کا اعتراف کرلیا بلکہ خود کو حق بجانب ٹھہرانے کی بھی کوشش کی ہوگی، یہ ڈھٹائی دیکھ کر ڈینس طیش میں آگیا۔ اس نے کچن سے چاقو لیا اور اسے قتل کردیا، پھر وہ بدحواسی کے عالم میں تمہارے پاس بھاگا چلا آیا، راستے میں چاقو اس نے کسی گٹر میں پھینک دیا ہوگا، اس کے بعد تم دونوں بھائیوں نے مل کر ڈینس کی موقع واردات سے عدم موجودگی کی وہ داستان گھڑی جو بعد میں پولیس کو سنائی۔"

"اچھا......!" البرٹ نے حیرت سے کہا۔ "آپ کو یہ خیال کیسے سوجھا کہ وہ ایک گھڑی ہوئی داستان تھی؟"

"ایک سچا کیتھولک عیسائی، جیسا کہ تمہارا بھائی ڈینس تھا، جمعے کے دن گوشت کھانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، اگرچہ کیتھولک چرچ کے عقائد میں کافی نرمی اور لچک پیدا کردی گئی تھی تاہم پھر بھی جمعے کو گوشت ایک راسخ العقیدہ شخص کے کھانے والی بات ہضم نہیں ہوتی اور اتفاق سے جس دن قتل ہوا وہ جمعے کا دن تھا، اب اگر جیسا کہ ڈینس نے بیان دیا تھا کہ تم نے اسے دعوت پر بلایا تھا تو تم کھانے میں بھنا ہوا گوشت نہیں پکوا سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قطعی غیر متوقع طور پر تمہارے گھر آیا تھا اور یوں اچانک آنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کردیا تھا اور تم سے مشورہ کرنے آیا تھا کہ اب کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے، تم نے اسے تسلی دی، اس کا خوف دور کیا اور باہمی مشورے سے تم دونوں نے فیصلہ کیا کہ پولیس کو دونوں ہی یہ بیان دیں گے کہ ڈینس چھ بجے تمہارے مکان پر پہنچ گیا تھا جبکہ حقیقت میں سات بجے یا اس کے بعد آیا تھا۔" میں نے فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ تم لوگوں نے پولیس کو یہ بیان کیوں نہیں دیا کہ تم نے گوشت کے بجائے مچھلی کھائی تھی۔"

"مسز پورٹر نے اس دن بھنا ہوا گوشت ہی بنایا تھا۔" البرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور وہ ڈینس کی آمد سے بہت پہلے ہی کھانا اوپر پہنچا گئی تھی، ڈینس کی آمد واقعی غیر متوقع تھی، ورنہ جیسا کہ تم نے کہا میں مچھلی کا بھی انتظام کرلیتا، پھر یہ بھی ظاہر تھا کہ پولیس صرف ہم سے کی گئی تفتیش پر اکتفا نہ کرتی بلکہ مسز پورٹر سے بھی کھانے کے بارے میں سوال کرتی، اب اگر ہم پولیس کو بھنے ہوئے گوشت کے علاوہ کچھ بتاتے تو ہمارا جھوٹ لازماً پکڑ لیا جاتا اور پولیس مشکوک ہوجاتی کہ یقیناً کوئی گڑبڑ ہے۔"

"اوہ!" میرے منہ سے نکلا۔ "تو تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے جھوٹی کہانی تراشی تھی۔"

"یہی سمجھ لو۔" البرٹ نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کیس کے بارے میں ایک بات اور ہے جو مجھے حالات کے مطابق معلوم نہیں ہوتی۔" میں نے البرٹ سے اس حد تک اعتراف کرانے کے بعد دوسرا قدم اٹھایا۔ "اور وہ بات تم دونوں کے جڑواں بھائی ہونے والی بات ہے۔"

"کیا مطلب، میں سمجھا نہیں۔" البرٹ نے تعجب سے کہا۔

"جب قتل کے کسی کیس میں جڑواں بھائی ملوث ہوتے ہیں تو اکثر مشابہت کی یکسانیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک بھائی کی جگہ دوسرا بھائی کام کر جاتا ہے۔"

"مگر ہمیں اپنی شخصیت بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟" البرٹ نے پلکیں جھپکائیں۔

"بہت اہم وجہ تھی مسٹر ڈینس۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی میں تمہارے سامنے اس شام کے واقعات کی ایک وضاحت پیش کرچکا ہوں، یہ تم سے اعتراف کرانے کے لیے تھی جبکہ میرے خیال میں اصل واقعات کچھ اس طرح سے پیش آئے ہوں گے۔" "اس شام جب تم اپنے گھر پہنچے تو تم نے اپنی بیوی کو شراب کے نشے میں مدہوش پایا، اتنا ہی نہیں اس نے وہ بریسلٹ بھی پہن رکھا تھا جو اسے چارلی نے تحفے میں دیا تھا۔ تم نے اس سے بریسلٹ کے بارے میں باز پرس کی اور اس نے عالم مدہوشی میں ہر بات کا اعتراف کرلیا، یہ انکشاف تمہاری غیرت پر ایک تازیانہ تھا، بلاشبہ تمہارا دل چاہا کہ تم اس بے وفا عورت کو اپنے ہاتھوں سے ختم کردو مگر تم ایک کٹر مذہبی آدمی تھے، تم چاہتے ہوئے بھی اس کی جان نہ لے سکے، اسی پریشانی کے عالم میں تم اپنے بھائی کے گھر گئے اور اس سے سارا واقعہ بیان کیا، وہ فوجی رہ چکا تھا، یہ بات برداشت نہ کرسکا، اس نے تمہاری بے حسی پر لعنت ملامت کی اور جو کام تم نہیں کرسکے، خود انجام تک پہنچانے چل دیا، تمہارے گھر پہنچ کر اس نے کچن سے چاقو اٹھایا اور تمہاری بیوی کا قصہ تمام کردیا۔ مگر گھر سے فرار ہوتے وقت اس نے محسوس کرلیا کہ اسے تمہاری پڑوسن مسز ولسن نے دیکھ لیا ہے،

ظاہر ہے اس کے پاس یہ جاننے کا تو ذریعہ نہ تھا کہ وہ اسے پہچان سکی ہے یا نہیں، اسی نے یہ سمجھا کہ شاید مسز ولسن نے اسے دیکھ کر یہ خیال کیا ہو کہ وہ تم تھے چنانچہ اس نے موقع واردات سے تمہاری عدم موجودگی ثابت کرنے کے لیے یہ داستان گھڑی کہ تم چھ بجے سے ساڑھے دس بجے تک اس کے فلیٹ میں تھے اور دوسری جانب تمہیں مجبور کرکے شکل و صورت ایک جیسی ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہیں شخصیت تبدیل کرنے پر آمادہ کرلیا۔ اب ہوا یہ کہ البرٹ ڈینس بن گیا اور ڈینس البرٹ، یہ اس لیے کہ اسے تم سے بے حد محبت تھی، اس نے سوچا کہ اس داستان کے باوجود اگر پولیس کو تم پر شبہ ہو تو تمہارے بجائے البرٹ یعنی اصل قاتل پکڑا جائے اور تم محفوظ رہو، تمہیں یہ ہرگز منظور نہ تھا مگر اس نے بے حد اصرار کرکے تمہیں مجبور کردیا۔ طے یہ ہوا کہ اگر حالات سازگار رہے اور معاملہ دب گیا تو پھر کچھ دن کے بعد تم دونوں اپنی اصلی شخصیت کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ مگر اتفاق ایسا ہوا کہ نقلی ڈینس پر شبہ تو کیا گیا مگر اسے ثابت نہ کیا جاسکا اور اسے آزاد کردیا گیا لیکن اس دوران ایک ایسا کام ہوا جس کا تم دونوں کو پہلے سے اندازہ نہ تھا یعنی ڈینس کی حیثیت سے پولیس اسٹیشن میں البرٹ کی انگلیوں کے نشانات لے لیے گئے اور تم دونوں کو اندیشہ ہوا کہ اب اگر تم دونوں نے اپنی اصلی شخصیت اختیار کی تو کسی بھی وقت دونوں کے لیے مصیبت کھڑی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اسی تبدیلی کو مستقل کردیا گیا۔ یہاں تک کہ واردات کے تین سال بعد بقول تمہارے ڈینس یا دوسرے الفاظ میں البرٹ کا انتقال ہوگیا۔"

ان دھماکا خیز انکشافات کو سن کر چند لمحوں کے لیے نقلی البرٹ مبہوت رہ گیا پھر حواس بحال کرکے کہنے لگا۔ "کہانی تو تم نے خوب سوچی ہے مگر اسے ثابت نہیں کرسکتے۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔ اسے بڑی آسانی سے ثابت کیا جاسکتا ہے، فوج کے ریکارڈ میں یقیناً البرٹ کی انگلیوں کے نشانات موجود ہوں گے، اب اگر وہ نشانات نکلوا کر پولیس کے ریکارڈ میں موجود انگلیوں کے نشانات سے ملائے جائیں جو اس نے وہاں ڈینس کی حیثیت سے دیے تھے تو سچ اور جھوٹ سامنے آجائے گا۔"

نقلی البرٹ (ڈینس) کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا، وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ "تمہیں کس بات سے شبہ ہوا کہ میں البرٹ نہیں، ڈینس ہوں۔" آخرکار شکست تسلیم کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ جیسا کہ میں نے کہا جڑواں بھائی کسی معاملے میں ملوث ہوں اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ ہم شکل ہونے سے کوئی فائدہ اٹھایا گیا ہو، دوسرا یہ کہ تم نے میری پہلی وضاحت کو بڑی آسانی سے قبول کرلیا، تمہیں اندیشہ تھا کہ اگر تم نے کوئی اعتراض یا انکار کیا تو کہیں میرا ذہن اصل واقعے کی تہ تک نہ پہنچ جائے اور میں تمہاری تبدیل شدہ شخصیت کا راز نہ جان لوں، مگر یہ شبہ میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھا۔ مجھے یہ حلق سے اتارنے میں بڑی مشکل ہو رہی تھی کہ جو شخص اتنا مذہبی آدمی ہو کہ ہر صبح گرجا گھر جاکر عبادت کرتا ہو وہ نہ صرف کسی کی جان لے لے بلکہ پولیس اسٹیشن سے رخصت ہوکر پہلے اپنے گھر پہنچے، ظاہر ہے کہ وہ تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ پولیس اسٹیشن میں اس کی انگلیوں کے نشان لیے گئے ہیں اور یہ کہ اب تم دونوں کو اپنی تبدیل شدہ شخصیت کو برقرار رکھنا ہے اور اسی شخصیت کو برقرار رکھنے کی غرض سے وہ تمہارے معمول کے مطابق گرجا گھر گیا تاکہ کسی کو اس کی تبدیلی کا شبہ نہ ہو۔"

"تم سچ کہتے ہو۔" نقلی البرٹ یعنی ڈینس نے اعتراف کرلیا۔ "میں واقعی ڈینس ہوں مگر اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"میرا فرض مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں اپنے افسران کو اصل واقعات کی رپورٹ پیش کروں۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر اس سے کیا ہوگا، تم البرٹ کو سزا تو نہیں دلوا سکتے، وہ تمہارے دنیاوی قانون کی دسترس سے بہت دور چلا گیا ہے، البتہ تم ایک شریف اور غیرت مند انسان کو بدنام کرنے کا موجب ضرور بن جاؤ گے، ایسا انسان جس نے نہ صرف بہادری سے اپنے وطن کا دفاع کیا تھا بلکہ اپنے بھائی کی عزت کا جنازہ نکالنے والی سے انتقام لے لیا۔" اس نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ "سارجنٹ! کیا تم یہ محسوس نہیں کرتے کہ اب ان گڑے مردوں کو اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمدردی اور انسانیت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ ہوچکا ہے، اسے ہمیشہ کے لیے فراموش کردیا جائے۔"

میں بڑی دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا۔ بالآخر ایک گہری سانس لے کر اٹھا اور ڈینس کو کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے رخصت ہوگیا۔ مگر میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کرسکا کہ میری خاموشی حق بجانب تھی یا نہیں۔



انگارے

طاہر جاوید مغل

اکتیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... انہوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادو کی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مالی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پا چکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکاکی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نو بیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہو گیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ تاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ

پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی بہنی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بیگم قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیرِ زمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیرِ زمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ جا ماجی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارے قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا۔ ہر طرف گولیاں...... دھماکے اور دھواں دھار لڑائی تھی۔ بالآخر پسی ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنون سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب تخت کے حق دار قسطینا اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤد بھاؤ کے پاس تھا لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ پاکستان آ چکا تھا ہر طرف قتل و غارت گری پھیلا رہے تھے...... ڈیتھ اسکواڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی معصوم لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہو گیا تھا میں اور انیق نے ان کے ٹھکانے کا کھوج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ادھر جا ماجی سے خورسنہ آ چکی تھی اور سجاول کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔ ڈیتھ اسکواڈ کا خاتمہ بے حد ضروری تھا۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر ان کے ٹھکانے کو تباہ کر دیا اور خود بھی بمشکل یعنی جان بچا پایا۔ اس مقام پر زبردست بلاسٹ ہوا اور مجھے بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ ٹیکساری گینگ سے بچنے کا یہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا کہ میں سب کی نظروں میں مردہ رہوں۔ اپنے چہرے پر سرجری کے ذریعے تبدیلیاں کروا کے میں اپنوں میں اجنبی بن گیا تھا۔ اب تاجور کے گاؤں جانا چاہتا تھا۔ سیف کے گھر والوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ بالآخر میں ان کے گاؤں پہنچ کے سیف کے گھر والوں کے دل میں گھر کر گیا۔ تاجور کی شادی داراب فیملی میں ہو رہی تھی۔ میں ایسا بالکل نہیں چاہتا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور لپک کر ایک برساتی نما کمرے میں چلا گیا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔ مجھے یہی لگا کہ تاجور جاگ رہی ہے۔ میں بالکل ساکت کھڑا رہا اور ایک ادھ کھلی کھڑکی سے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ یکدم اٹھ بیٹھی۔ ”کون ہے؟“ اس نے ہولے سے کہا جیسے اسے خود بھی یقین نہ ہو کہ کوئی یہاں موجود ہے۔

”کیا ہوا تاجور بی بی؟“ نوکرانی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔

”کچھ نہیں فردوس، شاید کوئی بلی تھی۔“ تاجور نے کہا اور دوبارہ لیٹ گئی۔

نیم تاریکی میں مجھے چھت اور وہاں بچھی ہوئی چارپائیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ تاجور والی چارپائی پر حرکت تھی۔ پتا چلتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔ شاید اس کا شک پوری طرح رفع نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اٹھی، بال سمیٹے اور چپل پہن کر برساتی کی طرف آئی۔ میں الرٹ ہو گیا۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن بڑی واضح تھی۔ برساتی کے دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس نے واٹر کولر میں سے پانی نکال کر شیشے کے گلاس میں ڈالا اور وہیں پر ایک گھٹنا ٹیک کر ایک گھٹنا اٹھا کر پینے لگی۔

پانی پینے کے بعد واپس جاتے جاتے وہ پھر رک گئی۔ اس نے تذبذب کے انداز میں چند قدم اٹھائے اور برساتی میں جھانکا۔ یقیناً اس نے میرا ہیولا دیکھ لیا تھا۔ اب میرے

لیے بے حرکت رہنا ناممکن تھا۔ میں نے جھپٹ کر اسے یوں دبوچا کہ اس کی کمر کے گرد اپنا بازو حمائل کیا اور برق رفتاری کے ساتھ اپنی ہتھیلی سے اس کا منہ ڈھانپ دیا۔

وہ چلائی ضرور مگر اس کی آواز گلے کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ میری سخت گرفت نے اسے جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر زور مارا مگر فوراً ہی سمجھ گئی کہ جس نے اسے دبوچا ہے وہ اس کو شور مچانے یا خود کو چھڑانے کا موقع نہیں دے گا۔ میں نے بدلی ہوئی آواز میں تیز سرگوشی کی۔ ”میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں، کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ لیکن اگر تم نے ہاتھ پاؤں چلائے تو پھر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔“

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن بول نہیں سکی۔

میں نے گرفت میں تھوڑی سی نرمی کی اور نسبتاً دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”دیکھو، میں دشمن نہیں ہوں۔ تمہیں یا تمہارے بھائیوں کو میری طرف سے ذرا سا گزند بھی نہیں پہنچے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں جس طرح خاموشی سے آیا ہوں اسی طرح واپس چلا جاؤں گا۔ تم بھی مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹالوں تو تم شور نہیں مچاؤ گی۔“

اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا مگر وہ جس کیفیت میں تھی اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔

میں نے پھر کہا۔ ”درست۔ مرد کی زبان ایک ہوتی ہے اور میں تمہیں زبان دے رہا ہوں۔ تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے واپس چلا جاؤں گا۔ اگر تم کہو گی تو کبھی واپس بھی نہیں آؤں گا لیکن اگر میں نے تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹایا اور تم نے شور مچایا تو پھر اچھا نہیں ہوگا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟“

میں اس کے عقب میں تھا۔ وہ سر موڑ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کررہی تھی مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے کومل جسم میں لرزش تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اثبات میں سر ہلایا۔

اس مرتبہ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہیجانی حالت میں جواب نہیں دے رہی۔ میں نے کہا۔ ”میں تم سے صرف ایک چیز لینا چاہتا ہوں اور وہ تمہیں دینا ہی پڑے گی...... اس کے بغیر میں واپس نہیں جاؤں گا۔“

اس نے پھر مڑ کر میری جانب دیکھنے کی کوشش کی، میں بولا۔ ”اب میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹارہا ہوں۔ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔“

میں نے اس کے ہونٹوں اور نرم رخساروں پر سے اپنی گرفت ختم کردی۔ اس کے جسم میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ نیم تاریکی میں میرے خدوخال ایک پرچھائیں کی طرح ہی نظر آتے ہوں گے۔

”کون ہو تم؟“ اس نے دہشت زدہ آواز میں متوحش سوال کیا۔

”کہا ہے ناکہ دشمن نہیں ہوں۔“ میں نے اُسے بدستور گرفت میں لیے لیے کہا۔ ”میں شاہ زیب کا دوست ہوں۔ تم سے ایک بہت اہم بات کرنا چاہتا ہوں...... لیکن اس طرح نہیں اطمینان سے، تاکہ تم سن اور سمجھ سکو...... اور میں سمجھا سکوں۔ اس کے لیے مجھے تمہارے فون نمبر کی ضرورت ہے......“

اس نے تاریکی میں گردن موڑ کر اور آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔ ”کک...... کون ہو تم؟“

”کہا ہے ناکہ شاہ زیب کا قریبی دوست ہوں۔ جو بات تم سے کروں گا، وہ بڑی اہم ہوگی۔ وعدہ کرو کہ تم میری پوری بات سنے بغیر فون بند نہیں کروگی۔“

”مم...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے پھر خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

”میں نے صرف اس لیے تمہیں تھام رکھا ہے کہ تم گھبرائی ہوئی ہو۔ اس کمرے سے نکلنے کی کوشش کروگی، یہ میرے اور تمہارے دونوں کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ اگر تم کوئی حرکت نہ کرو تو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“

”چھوڑ دو مجھے۔“ وہ عجب ہراس اور پریشانی کے عالم میں بولی۔

میں نے گرفت پہلے ڈھیلی کی پھر اُسے چھوڑ دیا۔

اس نے پورا گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اسی دوران میں چھت کی طرف سے تاجور کے چھوٹے بھائی اسفند کے کھٹکنے کی آواز آئی۔ ”باجی...... باجی۔“

وہ روہانسی ہوکر بولی۔ ”میرا بھائی جاگ گیا ہے۔ ابھی فردوس بھی جاگ جائے گی۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔“

”تم مجھے فون نمبر دو، میں ایک سیکنڈ نہیں ٹھہروں گا لیکن دیکھو غلط نمبر نہ دینا۔“

وہ آمادہ نظر نہیں آرہی تھی۔ دوسری طرف میں بھی اٹل تھا۔ شدید تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے سرگوشی کے لہجے میں اٹک اٹک کر نمبر بتادیا۔

”میں کل رات نو بجے کے بعد کسی وقت کال کروں گا۔ تم فون آن رکھنا۔“

وہ خاموش رہی۔ باہر سے اسفند کی آواز پھر آئی۔ ”باجی۔“ وہ شاید اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”آئی اسفند۔“ وہ گھبرا کر بولی پھر میری طرف مڑ کر سرگوشی میں کہا۔ ”خدا کے لیے اب تم جاؤ یہاں سے۔“

”تم بچے کو سلاؤ، میں جاتا ہوں۔“

وہ دوپٹا سنبھال کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں نے ادھ کھلی کھڑکی سے دیکھا، وہ اسفند کو لٹا کر اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔ اس نے اسفند کا رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔ میں چھت پر سے گزرتا تو وہ میری طرف دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے چھت پار کی اور منڈیر سے چھجے پر چلا آیا۔ پھر جس طرح آیا تھا اسی طرح عقبی دیوار پھاند کر باہر نکل گیا۔

جو کچھ ہوا، وہ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں تو صرف اسے دیکھنے کی ایک ہیجانی سی خواہش کے ساتھ وہاں چلا گیا تھا۔ میری ہتھیلی پر ابھی تک اس کے نرم ہونٹوں اور ریشمی رخساروں کا لمس موجود تھا۔ میں نے اسے اپنی گرفت میں لیا تھا...... یہ میری مجبوری تھی۔ اس کے حسین جسم کی ہر سہانی یاد میرے ذہن میں تازہ ہوگئی تھی۔ میں نے خاموشی کی زبان میں جیسے اپنے آپ سے کہا۔ ”شاہ زیب! تم یونہی تو اس کے دیوانے نہیں ہو۔ وہ لاکھوں میں ایک ہے، بے مثل ہے...... موجودہ حالات میں اگر تمہارے لیے کوئی گنجائش نکل رہی ہے تو پھر اسے پانے میں دیر نہ کرو۔ یہ نہ ہو کوئی اور دیوار تمہارے اور اس کے درمیان آجائے۔“

اگلے روز رات نو بجے تک کا وقت میں نے بمشکل گزارا۔ حاکم علی سیالکوٹ گیا ہوا تھا۔ میں ڈیرے کے کمرے میں اکیلا تھا اور بہ آسانی تاجور سے بات کرسکتا تھا۔ ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ میں نے اپنے ”بے نامی“ نمبر سے اسے کال کی بیل جاتی رہی مگر جواب نہیں آیا۔ یہی غنیمت تھا کہ فون آف نہیں تھا۔

تین چار بار بیل دینے کے بعد میں نے کوشش ترک کردی۔ ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ دوبارہ کال کی۔ اس مرتبہ جلد ہی کال ریسیو کرلی گئی۔

میں نے حسب سابق بدلی ہوئی بھاری آواز میں کہا۔ ”تاجور! میں بہت دیر سے کال کررہا ہوں۔ تمہیں ڈسٹرب کرنے کے لیے معافی چاہتا ہوں مگر یہ ضروری ہے۔“

”پلیز، تم کو جو کہنا ہے، جلدی کہہ دو۔ میں زیادہ دیر بات نہیں کرسکتی۔“ وہ دبی آواز میں بولی۔

اندازہ ہورہا تھا کہ وہ چھت پر نہیں ہے۔ مجھ سے بات کرنے کے لیے نیچے کسی کمرے میں چلی گئی ہے۔ مجھے پتا تھا کہ اس کے گھر والے آج واپس نہیں آئے۔ لہٰذا موقع تھا کہ ذرا تفصیل سے بات کی جاسکے۔ میں بڑے عجیب موڈ میں تھا۔ تاجور کو ستانے کو دل بھی چاہ رہا تھا۔ اُسے پیار کرنے کو بھی اور یہ بتانے کو بھی کہ میں ابھی اس کی دنیا سے اور اس کی زندگی سے نکلا نہیں ہوں۔ لیکن یہ خبر اتنی بڑی تھی کہ اسے اس طرح نہیں دی جاسکتی تھی اور پھر اس میں اَن گنت خطرات بھی پوشیدہ تھے۔

میں نے کہا۔ ”تاجور! تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ میری بات مکمل ہونے تک تم فون بند نہیں کروگی اور نہ ہی بُرا مانو گی۔“

”پلیز، تمہیں جو کہنا ہے، جلدی کہو۔ میں نے بتایا ہے میں زیادہ بات نہیں کرسکتی...... اور یہ بھی بتادوں کہ یہ پہلی اور آخری بار ہوگی۔“

”اس کا فیصلہ بعد میں کرنا۔ پہلے میری بات سنو۔“ میں نے ذرا تحکم سے کہا۔

”کہیں...... کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”شاہ زیب میرا کزن اور دوست تھا۔ ہم ڈنمارک سے اکٹھے ہی آئے تھے۔ یہاں بھی میں ہر وقت اس کے آس پاس رہتا تھا لیکن اتفاق یہ ہے کہ دو چار بار کے علاوہ تم مجھے دیکھ نہیں سکی ہو اور جب دیکھا ہے تب بھی تمہیں علم نہیں تھا کہ میں اس کا دوست ہوں۔ میں اور شاہ زیب ایک دوسرے کو ایسے ہی جانتے تھے جیسے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو جانتے ہیں۔ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی مجھ سے چھپاتا نہیں تھا۔“

”آ...... آپ کا نام کیا ہے؟“

”وقاص...... وقاص احمد...... میں آج کل اسی گاؤں میں ہوں۔“

چند سیکنڈ خاموشی کے بعد وہ بولی۔ ”لیکن میں نے کبھی شاہ زیب سے یا ان کے کسی دوست سے آپ کا نام نہیں سنا۔“

”چلو تم نے کم از کم یہ تو نہیں کہا کہ کسی شاہ زیب کو جانتی ہی نہیں ہو۔ بہرحال...... ہماری کچھ مجبوریاں تھیں جن کے سبب ہم دوسروں کے سامنے ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے اور نہ یہ ظاہر ہونے دیتے تھے کہ ہمارے درمیان اتنا گہرا تعلق موجود ہے اگر تمہیں کسی طرح کا شک ہے تو میں ہر طرح سے اسے رفع کرسکتا ہوں۔“

”آپ مجھے صرف یہ بتائیں کہ اس طرح میرے گھر میں گھسنے اور مجھے فون کے لیے مجبور کرنے سے آپ کا مقصد

کیا ہے؟"

"میں سیدھی بات کرنے والا بندہ ہوں اس لیے جو کچھ میرے دل میں ہے صاف صاف کہوں گا۔ شاہ زیب اپنی ہر بات مجھ سے "شیئر" کرتا تھا۔ لاہور میں تم دونوں کی پہلی ملاقات سے لے کر دوسری ملاقات تک اور پھر آخری ملاقات تک ہر بات میں بھی اسی طرح جانتا ہوں جس طرح وہ جانتا تھا اور تم جانتی ہو۔ وہ تمہارے پیچھے چاند گڑھی کیسے گیا، چاند گڑھی میں تمہاری ملاقاتیں کس طرح ہوتی رہیں، پھر تم نے کس طرح شاہ زیب کے سامنے اپنی خواہش رکھی کہ وہ تمہاری سہیلی ریشمی کا کھوج لگائے۔ ملنگی ڈیرے کے سارے حالات مجھے معلوم ہیں۔ تمہارا ملنگی ڈیرے پر پہنچنا، پھر شاہ زیب کے ساتھ ہی پکڑا جانا، ملنگی ڈیرے میں تمہارا اور شاہ زیب کا ایک ہی کمرے میں رہنا...... وہاں پالتو چیتوں کی آوازیں اور ان آوازوں کے "نتیجے"...... ایک ایک بات میرے علم میں ہے۔"

پالتو چیتوں کی آوازیں اور آوازوں کے نتیجے......

میں نے یہ الفاظ معنی خیز انداز میں کہے تھے اور یقیناً ان الفاظ نے تاجور کو سرتا پا ہلا یا تھا۔ چند لمحے فون پر سناٹا رہا پھر وہ جیسے کراہی۔ "کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھے کسی طرح بلیک میل کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میرے پاس بہت کچھ ہے تاجور! اگر میں بلیک میل کرنا چاہوں تو اللہ کے سوا تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا مگر میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، میں تمہیں بلیک میل نہیں کروں گا...... اور نہ کبھی اس بارے میں سوچوں گا۔ بس شرط یہی ہے کہ جو کچھ میں کہوں اسے سن لو...... اور اس کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچنا۔"

"آپ اپنی بات جلدی مکمل کریں۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

میں نے گہری سانس لی اور فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "تاجور! شاہ زیب مجھے بہت پیارا تھا۔ وہ اپنے دل کا حال مجھ سے اس طرح بیان کرتا تھا کہ کبھی کبھی وہ مجھے اپنے ہی دل کا حال معلوم ہونے لگتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے مجھے اس کے پیار سے پیار ہو گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تم دونوں کی محبت کی باتیں سن سن کر میں تم دونوں کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میں شاہ زیب کے فون کا انتظار کرتا رہتا تھا کہ کب اس کا فون آئے اور وہ مجھ سے تمہاری باتیں کرے۔ تمہارے بارے میں بتائے۔ محبت کے سلسلے میں جب وہ کوئی پیش قدمی کرتا تھا تو مجھے لگتا جیسے اس نے نہیں، میں نے کی ہے...... اور جب کوئی محرومی اس کے حصے میں آتی تھی تو اس محرومی کی چوٹ شاہ زیب کی طرح میں بھی اپنے دل پر محسوس کرتا تھا۔"

تاجور کی پریشان کن آواز ابھری۔ "ہم...... مجھے ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا کہ اب آپ نے کیا کہنے کے لیے مجھے فون کیا ہے؟"

میں نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ "بات بہت عجیب ہے تاجور لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ بات سن کر تمہارے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج گئی ہوں گی۔ مگر میں تمہاری ہی قسم کھا کر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری یہ محبت کبھی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی اور نہ تمہاری عزت کو کسی خطرے میں ڈالے گی۔ بس مجھ پر اتنی مہربانی رکھنا کہ کبھی کبھار مجھ سے بات کر لیا کرنا۔"

وہ دکھی لہجے میں بولی۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ تم شاہ زیب کے کیسے دوست ہو کہ جو اس کے جانے کے بعد میرے لیے مشکلیں پیدا کررہے ہو۔ ایک وہ انیق ہے جو بار بار یہاں آ کر ہمیں تکلیف دے رہا ہے۔ اب تم یہاں پہنچ گئے ہو اور اس کی دوستی کا دعویٰ کررہے ہو۔"

"میں کسی اور کی نہیں صرف اپنی بات کرتا ہوں تاجور۔ مجھے تم سے محبت کے سوا کچھ درکار نہیں۔ اور یہ محبت بھی تم سے کچھ مانگے گی نہیں۔"

وہ آہ بھر کر بولی۔ "شاید آپ جانتے نہیں ہو۔ یہاں کے حالات کیا ہیں۔ ان لوگوں کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ آپ کے ٹوٹے کرکے چیل کوؤں کو ڈال دیں گے یا پھر ساری عمر کے لیے جیل میں سڑنا پڑے گا۔"

"تم کن لوگوں کی بات کررہی ہو؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

وہ چند سیکنڈ بعد بولی۔ "جہاں میرے ماں باپ میرا رشتہ کررہے ہیں اگر آپ نہیں جانتے ہو تو جان جاؤ۔ وہ داراب فیملی ہے۔ ان کے نوکروں کے نوکر بھی بندے کو کیڑے مکوڑے کی طرح مار دیتے ہیں۔"

"اوہو تو تم اس دارج کھوتے سے ڈرا رہی ہو مجھ کو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تمہارے لیے وہ کچھ بھی ہو لیکن میرے لیے وہ کھوتا بلکہ کھوتے کا پتر ہے...... دولتیاں جھاڑنے والے ایسے بڑے جناور دیکھے ہیں میں نے اور شاہ زیب نے۔ جب ہم ایسے جناوروں کو لگام ڈال کر ان پر سواری کرتے ہیں تو دیکھنے والا تماشا ہوتا ہے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ نشے میں ہو یا پھر آپ کے ہوش ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ آپ اگر واقعی اس گاؤں میں ہیں تو صبح ہونے تک یہاں سے نکل جائیں۔ آپ خود کو شاہ زیب کا دوست کہہ رہے ہیں اور میں ان کے دوست کو اس سے اچھا مشورہ نہیں دے سکتی اور ہو سکے تو انیق سے بھی کہہ دیں۔ وہ اب آیا تو یہ لوگ مار ڈالیں گے اُسے۔"

میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم اور تمہارے گھر والے ان لاہوری پھنے خانوں سے ڈرے ہوئے ہو۔ خیر...... کوئی بات نہیں...... انیق کی باری بعد میں آئے گی۔ اب پہلے میں تو زور دیکھ لوں ان کمینے کن ٹٹوؤں کا۔" میرا لہجہ غصیلا تھا۔

یوں لگا کہ تاجور کو غلطی کا احساس ہوا ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کہ اسے دارابوں والی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ وہ گھبرا کر بولی۔ "آپ اپنا تعلق شاہ زیب سے بتا رہے ہو تو پھر میری عزت کا تماشا نہ بناؤ۔ یہ بہت بڑا فساد ہوگا۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔ میں آپ کو...... شاہ زیب کا واسطہ دیتی ہوں۔ آپ یہاں سے چلے جاؤ۔"

"یہ رشتے والی بات بتا کر تم نے میرے اندر آگ لگا دی ہے تاجور! یہ کیا سمجھتے ہیں کہ شاہ زیب نہیں ہے تو دین محمد صاحب کی بیٹی لوٹ کا مال ہے...... میں ان نکھٹوں کو ان کی اوقات یاد دلا کر ہی رہوں گا۔"

میں نے فون بند کر دیا اور نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میں جانتا تھا کہ تاجور اس وقت شدید تناؤ میں ہوگی اور خود کو کوس رہی ہوگی کہ اس نے یہ دارابوں والی بات مجھ سے کیوں کی۔

قریباً دس منٹ بعد میں نے اسے دوبارہ فون کیا تو اس نے فوراً اٹھا لیا۔ "ہیلو۔" وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔

میں نے حسب سابق بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ "تاجور! تم نے شاہ زیب کا جگرا دیکھا ہوگا۔ اس کے لنگوٹیے یار کا جگرا بھی اس سے کم نہیں ہے...... مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ چنا کھوتا دراج اور اس کی ونگ بے بے اپنی طاقت دکھا کر تم لوگوں کو اس رشتے پر مجبور کررہے ہیں۔ اب تم دیکھنا، میں انہیں روکتا کیسے ہوں۔"

"پلیز ایسی باتیں نہ کرو۔ میں پہلے ہی بہت بھگت چکی ہوں...... اب اور بھگتنے کی ہمت نہیں۔ میں تو مٹی کی ایک ڈھیری ہوں۔ اس ڈھیری کو میرے ماں باپ جس کے گھر میں ڈال دیں گے وہ اس کے گھر میں پڑی رہے گی۔ آپ نے شروع میں کہا تھا کہ آپ دشمن نہیں ہیں تو پھر پلیز دشمنوں والی باتیں نہ کریں۔"

وہ مجھے سمجھانے بجھانے میں لگ گئی۔ اپنی دانست میں وہ میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے بھی یہی تاثر دیا جیسے اس کی باتوں سے میرے اندر کے شعلوں پر پھوار پڑ رہی ہے...... اور اگر وہ مجھے اسی طرح سمجھائے بجھائے گی تو شاید دو چار ٹیلی فونک ملاقاتوں میں، میں عقل کے ناخن لے لوں گا۔

میں نے تاجور کو بتا دیا کہ میں گاؤں کے چوہدری بشیر کے پاس بطور ڈرائیور ٹھہرا ہوا ہوں۔ مجھے دو ماہ کی عارضی ملازمت دی گئی ہے۔

اس نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔ "چوہدری بشیر کا پتا آپ کو کس نے دیا تھا؟"

اس سوال کا جو جواب میں نے تاجور کو دیا، وہ بڑا مدلل تھا۔ اس جواب نے تاجور کو مکمل یقین دلا دیا کہ میں شاہ زیب کے انتہائی قریب رہا ہوں۔

میں نے کہا۔ "چوہدری بشیر کے بارے میں مجھے شاہ زیب نے ہی بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ چوہدری کے بیٹے سیفی کے ساتھ جاماجی میں کیا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی اس بارے میں سب کچھ جانتی ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کے سانسوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔ میں بولا۔ "تاجور! دھماکے والے حادثے سے چند روز پہلے شاہ زیب نے مجھ سے کہا تھا کہ سیفی کی موت کا اس کے ذہن پر بڑا بوجھ ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو جائے تو میں سیفی کے گھر والوں کی خیر خبر لوں اور اس کے لیے جو کچھ بھی ہو سکے کروں۔ میرے اس گاؤں میں آنے کا ایک مقصد تم ہو اور دوسرا چوہدری بشیر کا گھرانا ......"

وہ عجیب درد بھری آواز میں بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ شاہ زیب کو پتا تھا...... اس کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہے۔" میں نے لہجے میں درد بھر کر کہا۔ "وہ شدید خطرات میں گھرا ہوا تھا، اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اگلے دن کا سورج دیکھے گا یا نہیں، جیسے کوئی مسافر سامان باندھ کر اسٹیشن پر بیٹھا ہو۔"

"لیکن اگر......" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن گلا رندھ گیا۔ وہ خاموش ہو گئی...... کتنی ہی دیر وہ کچھ بول نہ سکی۔

میں نے بات بدلنا مناسب سمجھا۔ دوبارہ چوہدری بشیر والے موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ شک پڑتا ہے کہ چوہدری بشیر کو کسی طرح اپنے بیٹے کی موت کا پتا چل گیا ہے۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے بہت دکھی نظر آرہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تاجور کہ تم نے یا تمہارے گھر والوں میں سے کسی نے چوہدری بشیر کو بتادیا ہو؟“

”مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔ پھر ایک دم ٹھٹک گئی۔ ”مجھے لگتا ہے کوئی سیڑھیوں سے نیچے آرہا ہے...... اچھا میں فون بند کررہی ہوں۔“ اس نے فون بند کردیا۔

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد جب میں چوہدری بشیر کی ”مہران“ کو ٹیوب ویل کی حوضی کے پاس کھڑا کرکے دھو رہا تھا میری نگاہوں میں لاہور کے وہ خونی مناظر چل رہے تھے جب فیکساری گینگ کے ا-حمد اسکواڈ نے لاہور کے گلی کوچوں میں تباہی مچائی تھی اور میں نے ان کو قرار واقعی جواب دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ بَلا فی الحال تو ٹل گئی ہے مگر اس کے دوبارہ ظاہر ہونے کے امکانات بھی موجود تھے۔ میں نہ سہی...... وہ ان لوگوں کو نشانہ بنا سکتے تھے جن سے میرا کوئی تعلق تھا...... انہی سوچوں کے دوران میں میری نگاہ چوہدری بشیر کے گھر پر پڑی۔ سیف کی بہنیں شاید کہیں گئی ہوئی تھیں۔ سیف کی والدہ بیرونی دروازہ کھولے چارپائی پر بیٹھی تھی خاموش، گم صم۔ اس کی نگاہیں کسی کا راستہ دیکھ رہی تھیں۔ دروازے سے گزر کر یہ نگاہیں کھیتوں کھلیانوں اور ان میں چلتی ہوئی پگڈنڈیوں پر بھٹک رہی تھیں۔ وہ جیسے کہہ رہی تھیں

......آجا میرے لعل، کہاں ہے تُو۔ اپنی ماں کو کب تک تڑپائے گا۔ کب شکل دکھائے گا اسے، کیا اس کے مرنے پر ہی آئے گا؟...... آجا میرے سوہنے! تیری ماں رو روکر اندھی ہونے والی ہے۔

میرا دل غم سے بھر گیا۔ ایک فقیر صدا لگاتا ہوا گلی سے گزرا۔ ”سب دا بھلا، سب دی خیر...... مُراداں پوریاں...... اپنے بچے بچیاں دا صدقہ......“

میں نے دیکھا شفقت بی بی اپنے گھٹنوں پر بہت زور دے کر اٹھی۔ لڑکھڑاتی ہوئی سی دروازے پر آئی اور اپنی چادر کے پلو سے کچھ کھول کر فقیر کو تھما دیا۔ یقیناً کچھ مڑے تڑے روپے ہی ہوں گے۔

اسی دوران میں میری نگاہ چوہدری بشیر پر پڑی۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ گھر کی طرف آرہا تھا۔ دو دنوں میں ہی پہلے سے کہیں زیادہ بوڑھا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے غصے میں شفقت بی بی سے کچھ کہا۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ الفاظ مجھ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یقیناً یہ کہا ہوگا کہ وہ کیوں اس طرح دروازہ کھولے کھڑی ہے۔ اس نے دروازہ بند کردیا۔

جو کیمرا میں نے ڈیرے کی بیٹھک میں چھپایا تھا وہ ابھی تک وہیں تھا۔ اسے اتارنے کا مناسب موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ یہ موقع اچھا تھا۔ میں گاڑی کا گیلا کپڑا نچوڑ کر اسے دھوپ میں پھیلانے کے بہانے بیٹھک کے دروازے تک پہنچا۔ اسے دھکیلا لیکن مایوسی ہوئی۔ خلافِ معمول دروازہ لاک تھا۔ میں واپس آگیا اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اسی شام مجھے ایک بار پھر چوہدری بشیر کی گفتگو سننے اور اس کے تاثرات جاننے کا موقع مل گیا۔

شام کو منشی منظور چوہدری بشیر کے پاس ڈیرے والی بیٹھک میں تھا اور دروازہ بند تھا۔ میں نے اپنے سیل فون کی مطلوبہ ”ایپلی کیشن“ میں جا کر اسکرین کو آڈیو ویڈیو ریسیور کی شکل دی۔ کچھ ہی دیر بعد کمرے میں ہونے والی گفتگو سنائی دینے لگی۔ تصویر پہلے کی طرح ندارد تھی۔

منشی منظور کہہ رہا تھا۔ ”آپ نے دھی رانیوں کو بھی کچھ نہیں بتایا؟“

”کیسے بتاؤں......؟“ چوہدری بشیر نے رندھی آواز میں کہا۔ ”ان کو بتاؤں گا تو ان کی ماں کو بھی پتا چلے گا۔ وہ نہیں بچے گی۔ میں نے کہا ہے ناں وہ نہیں بچے گی۔“ چوہدری بشیر باقاعدہ رونے لگا۔ منشی منظور اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔

کچھ دیر بعد منشی منظور کی آواز آئی۔ ”کیا چوہدری دین محمد کو پکا یقین ہے کہ ایسا ہو چکا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ سیفی......“

”ہاں منظور! اب خود کو دھوکا دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ نہیں رہا ہے۔ وہ چلا گیا ہے...... ہمیں چھوڑ گیا ہے ہمیشہ کے لیے...... اور دیکھو...... وہ...... وہ جھلی کملی اس کی راہ تک رہی ہے۔ تیر اتیں بانٹ رہی ہے...... اس کی شکل دیکھتا ہوں تو دل پھٹ جاتا ہے میرا۔“

”اب یہ سب کچھ زیادہ دیر تو نہیں چھپایا جا سکتا ناں۔“ منشی منظور کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ”دل پر پتھر رکھ کر آپا جی کو بتانا ہی پڑے گا۔“

”وہ پہلے ہی مرنے والی ہورہی ہے۔ کل بھی ادھی رات تک ہائے ہائے کرتی رہی تھی۔ چوہدری عظمت نے

مالی پور میں ایک اللہ والے کا بتایا ہے۔ مشک اور زعفران سے تعویذ لکھ کر دیتا ہے۔ سویرے جانا ہے اُس کی طرف......“

اسی دوران میں فون کی بیل سنائی دی۔ آواز سے اندازہ ہوگیا کہ یہ منشی منظور کے فون کی بیل ہے۔ بیل ہوتی رہی مگر منشی منظور نے کال ریسیو نہیں کی۔

”ٹھیکیدار افضل تھا؟“ چوہدری بشیر نے پوچھا۔

”ہاں جی، صبح سے تین بار فون کر چکا ہے۔“

”کیا کہہ رہا ہے؟“ چوہدری نے مری مری آواز میں دریافت کیا۔

”بس وہی بک بک کررہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اس مہینے کی پندرہ تاریخ تک کم از کم چھ لاکھ دے دو۔ نہیں تو بات تھانے کچہری تک جائے گی۔“

اس کے بعد چوہدری بشیر اور منشی ماسٹر منظور میں جو مختصر گفتگو ہوئی، اس سے میرا یہ یقین پختہ ہوگیا کہ چوہدری بشیر کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس نے اپنا بھرم بنایا ہوا تھا۔ حقیقت میں وہ اچھا خاصا مقروض تھا۔ چند برس پہلے زمین کے جھگڑے میں مقدمے بازی ہوئی تھی جس میں بشیر کا کافی سارا روپیا غارت ہوگیا تھا۔ اب بھی اس کے تین چار کھیت گروی پڑے ہوئے تھے۔

اگلے روز میں نے اپنا جادوئی کیمرا اتار کر پھر محفوظ کر لیا۔ یہ کیمرا میرے لیے آئینہ جہاں نما کی حیثیت اختیار کرتا جارہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس طرح کے ایک دو اور کیمرے ہوں تاکہ اگر کسی وقت یہ پکڑا بھی جائے یا ضائع ہوجائے تو متبادل میرے پاس موجود ہو۔

دوپہر کے وقت چوہدری بشیر میرے ساتھ گاڑی پر گجرات کے مضافاتی علاقے میں گیا۔ یہاں سے ہم کو اس ”اللہ والے“ کو لے کر سکھیرا آنا تھا جس نے شفقت بی بی کی طبیعت کی بحالی کے لیے وظیفہ اور تعویذ وغیرہ کرنا تھا۔ یہ شخص فی الحال اپنے مریدوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہمیں اس کے گھر کے باہر گاڑی میں بیٹھ کر اس کا طویل انتظار کرنا پڑا۔ میں نے موقع دیکھ کر چوہدری بشیر سے بات کی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”چوہدری جی، گستاخی معاف، کل مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ چوہدری بشیر نے میری طرف دیکھ کر غمزدہ لہجے میں کہا۔

”کل جب آپ منشی صاحب کے ساتھ ڈیرے کی بیٹھک میں تھے، میں لوڈر کی چابی ڈھونڈتا ہوا بیٹھک کی طرف آیا تھا۔“

”تو پھر۔“ وہ ذرا چونک کر بولا۔

”میں بڑی معافی چاہتا ہوں جی...... آپ کے رونے کی...... ہلکی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ آپ...... اپنے بیٹے سیف کی بات کررہے تھے...... مجھے بہت افسوس ہوا ہے جی...... بہت زیادہ افسوس۔“

چوہدری بشیر میری طرف دیکھتا رہا پھر سمجھ گیا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ چند لمحے بعد وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ”اگر تم نے سن ہی لیا ہے تو پھر یہ بات ابھی صرف اپنے تک رکھنی ہے۔ کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے...... سن رہے ہو ناں؟“

میں نے شدومد سے اقرار میں سر ہلایا۔ چوہدری بشیر اس ذکر پر پھر آبدیدہ ہوگیا اور اس نے اپنی سفید پگڑی کا پلو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ گاڑی میں مہیب خاموشی طاری ہو گئی۔

کچھ دیر بعد میں نے ہمدردانہ آہنگ میں کہا۔ ”چوہدری جی! مجھے نہیں پتا سیف صاحب کی جان کیسے گئی اور کن حالات میں گئی لیکن اتنا تو پتا چل رہا ہے کہ یہ دکھ آپ کے لیے بہت ہی گہرا ہے...... اور اس وجہ سے اور بھی زیادہ گہرا ہو چکا ہے کہ آپ چوہدرانی جی کی بیماری کی وجہ سے انہیں یہ خبر نہیں دے سکتے۔“

چوہدری خاموش رہا مگر تاثرات بتارہے تھے کہ وہ میری بات کی تائید کررہا ہے۔ میں نے کہا۔ ”چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن اگر آپ برا نہ مانیں، تو میں آپ کو اس سلسلے میں ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔“

چوہدری پھر اپنی بھیگی ہوئی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”مالک! بالکل اسی طرح کا ایک واقعہ میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ تب میں گجرات میں ایک کارخانے دار سلیم شیخ صاحب کی ڈرائیوری کررہا تھا۔ ان کی والدہ بھی مالکن کی طرح بہت زیادہ بیمار تھیں۔ سلیم صاحب کی بہن انگلینڈ میں ایک ایکسیڈنٹ میں فوت ہوگئی تھی۔ وہ بہن کی موت کی خبر ماں کو دینا چاہتے تھے۔ ڈاکٹروں سے مشورہ کرکے انہوں نے والدہ کو پہلے دل کے اسپتال میں داخل کرایا۔ ان کو سی سی یو میں رکھنے کے بعد انہیں بیٹی اور داماد کی موت کی خبر دی گئی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ان کو دل کا سخت دورہ پڑا۔ مگر سارا انتظام پہلے سے تھا۔ ڈاکٹرز نے ان کی جان بچالی۔“

چوہدری بشیر کے چہرے پر سوچ کے تاثرات

ابھرے۔ مجھے لگا کہ میری بات اس کے دل کو لگ رہی ہے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "چوہدری جی! میں نے مالکن کی حالت دیکھی ہے۔ وہ واقعی یہ صدمہ برداشت نہیں کرسکیں گی۔ لیکن زیادہ دیر ان سے یہ بات چھپائی بھی نہیں جاسکتی۔ میری تو ادنیٰ سی رائے ہے کہ ہم انہیں لاہور لے جائیں اور وہی کام کریں جو سلیم شیخ صاحب نے کیا تھا۔"

"لاہور لے جانا کون سا سوکھا (آسان) کام ہے۔" وہ پژمردہ آواز میں بولا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ چاہیں تو میں اس سلسلے میں کچھ کرسکتا ہوں۔ میں نے دو سال پہلے ایک بڑے ڈاکٹر صاحب کی ڈرائیوری بھی کی ہے۔ بہت ہی اچھے بندے ہیں۔ دل کا ایک بڑا پرائیویٹ اسپتال چلا رہے ہیں۔ وہ ایک دو دن کے لیے مالکن کو داخل کرلیں گے۔ مجھے نہیں لگتا کہ خرچہ بھی لیں گے۔"

چوہدری بشیر کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ابھر رہی تھیں۔

☆☆☆

اور یہ منظر تھا لاہور کے ایک بہترین کارڈ یک اسپتال کا۔ شفقت بی بی کو یہاں ایڈمٹ کرایا جاچکا تھا۔ چوہدری بشیر اور اس کی ایک بہن بھی یہاں موجود تھی۔ منشی منظور گاؤں میں ہی تھا۔ میں ایم ایس ڈاکٹر عرفان ملک کے آفس میں بیٹھا تھا اور شفقت بی بی کے بارے میں ہی بات کررہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو ساری صورتِ حال بتادی تھی اور خرچے کا حساب بھی لکھوالیا تھا۔ ابتدائی طور پر تین دن کا ایڈمیشن تھا۔ اگر مزید ضرورت پڑتی تو دورانیہ بڑھایا جاسکتا تھا۔ تین دن کا تخمینہ تین لاکھ روپے لگا تھا۔ میرے لیے یہ ہرگز بڑی رقم نہیں تھی۔ میں نے ایڈوانس پے منٹ جمع کرادی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "یہ انتظام آپ کررہے ہیں؟"

"میری اتنی حیثیت نہیں جناب! یہ علاقے کے ہی ایک خدا ترس صاحب ہیں۔ نیکی کے کاموں میں خاموشی سے حصہ لیتے ہیں۔ اگر وہ خود آگے آتے تو شاید چوہدری بشیر کو یہ پسند نہ ہوتا۔ انہوں نے رقم میرے حوالے کردی۔ میں نے ایک گستاخی کی ہے۔ بشیر صاحب سے یہی کہا ہے کہ آپ سے میری علیک سلیک ہے اور میں چند سال پہلے آپ کی ڈرائیوری بھی کرتا رہا ہوں۔ آپ بڑی کرم نوازی فرماتے ہیں مجھ پر۔"

بات ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں آرہی تھی۔ انہوں نے زیادہ سوال جواب نہیں کیے۔ (مجھے یہ بھی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی نظر نے میری کاسمیٹک سرجری کو محسوس نہیں کیا اور میرے چہرے کے مصنوعی حصوں کو نہیں ٹٹولا)

اور پھر اسی سہ پہر اس ساری پلاننگ کا مشکل ترین مرحلہ آیا۔ اس کام کے لیے میرے ہی مشورے سے چوہدری بشیر نے ایک مولانا صاحب کو یہاں بلالیا تھا۔ ان کا نام قدرت اللہ تھا۔ نجانے کیوں ان کی اجلی صورت دیکھ کر مجھے جاپانی کے حاذق ذکری صاحب کی یاد آگئی۔ وہی جن کا ایک خط ابھی تک "بن پڑھا" میرے پاس پڑا تھا۔

عمر رسیدہ مولانا قدرت اللہ شفقت بی بی کے پاس پہنچے۔ چند منٹ ان سے اللہ اور اس کے دین کی باتیں کیں۔ مشیتِ ایزدی کے حوالے سے بتایا۔ ہم سی سی یو سے باہر تھے اور شیشے میں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ فوری طبی امداد کے لیے سارے جدید انتظامات شفقت بی بی کے اردگرد موجود تھے اور ڈاکٹرز بھی الرٹ تھے۔ خود پروفیسر ڈاکٹر عرفان ملک بھی اسپتال میں تھے۔ آخر مولانا اصل موضوع پر آئے اور انہوں نے شفقت بی بی کو محتاط لفظوں میں وہ خبر سنادی جو ایک دکھی ماں کے سینے کو شق کرسکتی تھی۔ ایک ایسی ماں جس کا سب کچھ اس کا اکلوتا بیٹا ہی تھا۔

شفقت بی بی کا رنگ ہلدی ہوگیا اور منہ کھلا رہ گیا پھر وہ زور سے چلائیں۔ انہوں نے کچھ کہا اور دیوانہ وار بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔

یہی وقت تھا جب ہم اندر داخل ہوگئے۔ چوہدری بشیر لپک کر بڑھا اور اس نے شفقت بی بی کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا۔ وہ دلدوز انداز میں پکاریں۔ "دیکھو سیفی کے ابا! یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایسے کس طرح ہوسکتا ہے؟ یہ جھوٹ ہے...... یہ جھوٹ ہے۔"

"نہیں شفقت!" چوہدری بشیر نے روتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ ہمارا پتر اب نہیں ہے۔ وہ اللہ کی امانت تھا، اللہ نے اسے واپس لے لیا...... اللہ کی یہی منشا تھی۔"

وہ شوہر کے سینے پر دوہتڑ مارنے لگیں۔ "نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ یہ جھوٹ ہے۔"

انہوں نے خود کو شوہر کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ رو رہی تھیں۔ پکار رہی تھیں۔ اپنے سیفی کو




آوازیں دے رہی تھیں۔ یہ اندوہناک مناظر تھے۔ دل خون ہو رہا تھا۔ یکایک شفقت بی بی کے چہرے پر تکلیف کے شدید آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے جیسے اپنا کلیجا تھام لیا۔ زرد رنگ اب نیلگوں ہونے لگا۔ چوہدری بشیر نے مجھے پکارا۔ ہم دونوں نے مل کر شفقت بی بی کو بستر پر لٹا دیا۔ ڈاکٹرز ان پر جھک گئے اور طبی امداد دینے لگے۔ انہیں آکسیجن چڑھا دی گئی۔ پہلے سے تیار شدہ ایک انجکشن فوری طور پر ''بازو پر لگے کینولا'' میں انجیکٹ کیا گیا۔ وہ تکلیف سے بے حال ہو رہی تھیں۔ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ ڈاکٹرز نے ان کے گرد پردہ تان دیا اور ہمیں باہر جانے کو کہا۔

وہ بڑے اضطراب کی گھڑیاں تھیں۔ چوہدری بشیر محمد بھی مسلسل رو رہا تھا۔ منتوں مرادوں سے ملنے والا اکلوتا بیٹا جدا ہو گیا تھا۔ میں نے چوہدری بشیر کی اجازت سے گاؤں میں منشی منظور کو فون کیا۔ وہاں سے بھی رونے اور بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ منشی منظور نے گلوگیر آواز میں بتایا کہ اس نے بھی بچیوں کو ان کے بھائی کی موت کی خبر سنا دی ہے۔

ڈاکٹرز نے شفقت بی بی کو ایسی ادویات دی تھیں جن کی وجہ سے وہ ہلکی غنودگی میں تھیں۔ رات دس گیارہ بجے تک ان کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور ایک بار پھر آہ و بکا کرنے لگیں۔

''میرے سیفی کو کیا ہوا۔ اس نے تو ابھی سہرا باندھنا تھا۔ وہ تو چنگا بھلا گیا تھا۔ کس نے مارا اُسے، کس نے مارا؟''

میں چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں اسے کیسے بتاتا...... ہاں جی! تمہارے پُتر کو میں نے مارا ہے...... اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

شفقت بی بی نے گریہ وزاری کی حالت میں ایک بار پھر چوہدری بشیر کا شانہ تھام لیا۔ اسے جھنجوڑتے ہوئے بولیں۔ ''میرے سیفی نے کیا قصور کیا تھا آپ کا؟ آپ نے اسے دھکا دے کر گھر سے نکالا۔ اسے دربدر کیا۔ اب میں کہاں ڈھونڈوں اُسے؟''

چوہدری بشیر نے سسک کر کہا۔ ''اس کی جگہ میں مر جاتا، مجھے کیا پتا تھا اس نے یہ دن دکھانا ہے۔ اس کے قدموں میں اپنی پگ رکھ دیتا۔ اسے پنڈ سے باہر نہ جانے دیتا۔ پرچھانویں کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا۔'' شفقت بی بی پر پھر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔

☆☆☆

چوتھے روز صبح دس گیارہ بجے تک شفقت بی بی کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ ڈاکٹر عرفان ملک نے کہا کہ ہم چاہیں تو انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے کچھ روٹین کی اور کچھ ہنگامی ادویات بھی لکھ دیں اور مناسب ہدایات دیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ آپ لوگوں نے بہت اچھا فیصلہ کیا...... مکمل طبی امداد کے بغیر وہ اتنا تناؤ اور شدید دکھ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔''

اسی روز شام سے پہلے ہم سکھیرا گاؤں واپس پہنچ گئے۔ طوفان آتے ہیں۔ کچھ کی شدت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ کچھ کی شدت ختم ہونے میں دیر لگتی ہے۔ چوہدری بشیر کے گھر آنے والے طوفان کی شدت بھی آہستہ آہستہ ہی کم ہونا تھی۔ دوسرے روز چوہدری بشیر کے گھر میں پُرسہ دینے والوں کا ہجوم تھا۔ وسیع پیمانے پر قرآن خوانی کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ گاؤں میں لوگوں کو بس یہی بتایا گیا تھا کہ سیف اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ برونائی چلا گیا تھا۔ وہاں وہ مسلمان رضاکاروں میں شامل ہو کر کچھ غیر مسلموں کے ساتھ لڑا اور شہید ہوا اور اگر دیکھا جاتا تو اس کی موت، شہادت سے کم تو نہیں تھی۔

چوہدری بشیر کے گھر اور ڈیرے پر آنے والے لوگوں کی دیکھ بھال اور کھانے کا انتظام کرنے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ میں ایک دری گھر کے سامنے بچھا رہا تھا جب میں نے فقط چند فٹ کے فاصلے پر تاجور اور اس کی والدہ کو دیکھا۔ تاجور کا چہرہ کپڑے کی طرح سفید تھا اور سوگواری اس کے ملیح چہرے پر ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ وہ میرے بالکل قریب سے مجھ پر توجہ دیے بغیر گزر گئی۔ اپنے چہرے کی تبدیلیوں پر میرا اعتماد کچھ اور بڑھ گیا۔ دوسری دری لینے کے لیے...... مجھے دوبارہ گھر کے صحن میں جانا تھا۔ میں نے اپنے سر پر ڈبی دار پرنا (بڑا رومال) درست کیا اور اندر چلا گیا۔ برآمدے میں خواتین کا ہجوم تھا۔ شازیہ، تاجور سے لپٹی ہوئی تھی اور ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

میں سر جھکائے ہوئے اسٹور میں چلا گیا اور دری لے کر باہر نکل آیا۔ گھر کے افراد اب مجھ سے بلاجھجک بات کر لیتے تھے۔ شازیہ تیزی سے میرے پاس آئی اور بولی۔ ''وقاص بھائی! امی کی طبیعت صبح پھر بگڑی ہوئی تھی۔ آپ نے بتایا تھا کہ سفید والی چھوٹی گولی روز بھی دی جا سکتی ہے۔ کیا آپ بڑے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے دوبارہ پوچھ سکتے ہیں؟''

''اچھا ٹھیک ہے میری بہن! میں کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا۔

میری اچٹتی سی نگاہ خواتین کے ہجوم کی طرف گئی۔ مجھے یوں لگا کہ مجھے تاجور کی جھلک نظر آئی ہے۔ خواتین کے عقب سے شاید وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسی رات فون پر میری بات اکبر سے ہوئی۔ اسے بھی چار پانچ دن پہلے سیف کی موت کی اطلاع مل چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اطلاع شازیہ کے ذریعے ہی اس تک پہنچی ہوگی۔ ہم نے ایک دوسرے سے اظہارِ افسوس کیا۔ وہ افسردہ تھا۔ تاہم اپنے کاروبار کے حوالے سے تھوڑا پُرجوش بھی محسوس ہوتا تھا، بولا۔ ''وقاص بھائی! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یونس صاحب سے تمہاری ملاقات ہو چکی ہے۔'' (یونس سجاول کا وہی دوست تھا جسے ایک ''مہربان فنانسر'' کی حیثیت سے سجاول نے اکبر کی طرف بھیجا تھا)

یونس نے اکبر کو رقم اپنے پاس سے فراہم کی تھی۔ بعد میں یونس نے یہ رقم مجھ سے لے لینی تھی۔

اکبر نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اس بری دنیا میں بھی اچھے بندوں کی کمی نہیں ہے وقاص بھائی، یونس صاحب نے بس برائے نام لکھت پڑھت کے ساتھ پیسے دے دیے ہیں۔ شرطیں بھی بڑی آسان ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ہیں وہ۔ آپ دیکھنا میں کتنی جلدی رزلٹ نکالتا ہوں اس کام میں۔''

میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کی کہ ابھی کچھ عرصے تک وہ شازیہ سے میل ملاقات کی کوشش نہ کرے۔ ویسے بھی وہ سب لوگ صدمے کی حالت میں ہیں اور اس صدمے سے نکلنے میں انہیں تھوڑا ٹائم لگے گا۔

''آپ بالکل بے فکر رہو وقاص بھائی! بس سمجھ لو کہ میں نے آپ کی انگلی پکڑ لی ہے۔ آپ جس طرف چلاؤ گے چل پڑوں گا۔''

''بس ذرا تحمل رکھنا ہوگا اور کام میں جان مارنی ہوگی۔ اللہ نے چاہا تو سب اچھا ہو جائے گا۔''

وہ ذرا رک کر بولا۔ ''ایک چھوٹی سی غلطی ہو گئی ہے۔ پتا نہیں کہ مجھے اسے بتانا چاہیے تھا یا نہیں۔''

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''شازیہ کی۔'' وہ دبے لہجے میں بولا۔ ''میں نے...... اس سے آپ کا ذکر کر دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ آپ نے کس طرح سے میری مدد کی ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ آج صبح شازیہ جس طرح جلدی سے میری طرف آئی تھی اور اپنائیت سے بات کی تھی، اس کے پیچھے یہ وجہ بھی ہے کہ وہ اکبر سے میرے نئے رویّے کے بارے میں جان چکی ہے۔

میں نے کہا۔ ''نہ بتاتے تو اچھا تھا...... چلو اب جو بھی ہو گیا لیکن...... اسے اچھی طرح تاکید کر دو کہ اپنے تک ہی رکھے، ورنہ اس کے نتیجے میں نقصان تم دونوں کا ہی ہونا ہے۔''

''آپ اس بارے میں بے فکر رہیں۔'' وہ زور دے کر بولا۔

☆☆☆

مزید پندرہ بیس روز گزر گئے۔ شدید ترین صدمے بھی وقت کے ساتھ اپنا اثر کھونے لگتے ہیں۔ جتنا تعلق ہوتا ہے، گھاؤ کی اتنی ہی گہرائی ہوتی ہے۔ سب سے گہرا گھاؤ تو ممتا کے سینے پر ہی لگتا ہے۔ شفقت بی بی جان لیوا شاک سے تو بچ گئی تھیں مگر مسلسل گہرے دکھ کے گھیرے میں تھیں۔

میں اس بات کا کھوج لگا رہا تھا کہ جس قرضے نے چوہدری بشیر کی کمر توڑی ہوئی ہے، وہ کس نوعیت کا ہے اور چوہدری کو اس سے کیسے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ میرے بوسیدہ سے بیگ کے دہرے پیندے میں اب بھی بڑے کرنسی نوٹوں کی شکل میں خاطر خواہ رقم موجود تھی اور میری خواہش تھی کہ وہ سیفی کے گھر والوں کے کام آ جائے۔

وہ ستمبر کی آخری تاریخوں کی ایک بڑی سہانی رات تھی۔ چوہدری بشیر کا کاماں ہاشو اپنی لاڈلی بیوی کے ساتھ ڈیرے کے کمرے میں تھا۔ کبھی کبھی دونوں کے ہنسنے کی آواز ابھرتی تھی اور ماحول کو رومان انگیز بناتی تھی۔ چودھویں کا چاند کھیتوں کھلیانوں، درختوں اور میدانوں کو دور تک روشن کر رہا تھا۔ تاجور بھی اسی فضا میں سانس لے رہی تھی اور یہی چاندنی اس کے گھر کے آنگن کو بھی روشن کر رہی تھی۔ میں لوڈر میں بیٹھا تھا۔ بڑی دھیمی آواز میں ریڈیو لگا رکھا تھا اور ساتھ ساتھ تاجور سے فون پر رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر رابطہ ہو گیا۔ وہ دکھی آواز میں بولی۔ ''آپ آگ سے کھیل رہے ہو، اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''آگ سے نہیں کھیل رہا، میں خود آگ

ہوں اور یہ آگ ان دارابیوں کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتی ہے۔ شاہی کی آوازیں میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں۔ وہ سب کچھ مجھے بتا گیا ہے۔ وہ سؤر کا پُتر شکیل داراب ہی تھا جس نے یہاں سکھیرا گاؤں میں تمہارا کھوج لگایا اور تمہیں جاماجی پہنچا کر جان اور عزت کے شدید ترین خطرے سے دوچار کیا۔ اب اسی شکیل کا بھائی تم پر فریفتہ ہوا پھرتا ہے۔ میں نے سنا ہے چند ہفتوں میں تمہاری منگنی دھوم دھام سے دارج داراب کے ساتھ ہونے والی ہے؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں صرف اتنا کہتی ہوں کہ مجھ پر اور میرے گھر والوں پر رحم کریں۔ یہ بہت سخت لوگ ہیں۔ کسی وجہ سے بپھر گئے تو آپ کی جان تو جائے گی ہی ہم پر بھی کوئی آفت ٹوٹ سکتی ہے۔ ہم پہلے ہی بڑے ''مرے گئے'' ہیں اور صدمہ نہیں سہہ سکتے۔''

''میری محبت بے لوث ہے تاجور۔ اس محبت نے نہ شاہ زیب کی زندگی میں تم سے کچھ مانگا نہ اب مانگے گی۔ تمہاری شادی کہیں اور ہو رہی ہوتی تو شاید میں چپ ہو کر کسی کونے میں بیٹھ جاتا...... لیکن...... ان دارابیوں کے سلسلے میں، میں چپ نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے تمہیں لوٹ کا مال سمجھا ہے اور میں تمہیں لٹنے نہیں دوں گا۔''

''آپ کو اس طرح کی بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ فیصلہ میرے ماں باپ کو کرنا ہے۔''

''اور وہ ان لٹیروں کے سامنے بچھے جا رہے ہیں۔ ان کی زبردستی پر اپنی رضامندی کا پردہ ڈال رہے ہیں۔ کیا انہیں پتا نہیں کہ ان دارابیوں میں بے شمار دوسری برائیوں کے علاوہ ایک برائی یہ بھی ہے کہ یہ ایک دو بیویوں پر بس نہیں کرتے۔ یہ عیاشی کے لیے بھی شادیاں کرتے ہیں۔ چھ نسلوں تک ان کے شجرے کو دیکھ لو۔ درجنوں میں بس دو چار ایسے ہوں گے جو اپنی شریکِ حیات پر سوکن نہ لائے ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ تم دلہن سے ''سوکن'' بننے تک کا سفر بس پانچ چھ مہینے میں ہی طے کر لو۔''

''خدا کے لیے...... ایسی باتیں نہ کریں۔ ان سے کچھ حاصل نہیں۔''

''حاصل ہو بھی تو سکتا ہے تاجور بی بی...... ابھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو کلیئر نہیں۔''

''کیا مطلب...... کون سی باتیں؟'' وہ الجھے لہجے میں بولی۔

''مثلاً شاہ زیب کی موت۔''

''آ...... آپ کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' وہ ہکلائی۔

''خبروں سے پتا چلتا ہے کہ شاہ زیب کی جان کے دشمن ابھی تک اس کی ٹوہ لگانے سے پیچھے نہیں ہٹے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کے ذہنوں میں ابھی تک شک موجود ہے۔''

''لیکن...... اب تو سب کچھ ثابت ہو چکا ہے۔ ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا ہے...... اب ایسی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟'' تاجور کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ایسی اموات میں تھوڑی بہت آس تو باقی رہتی ہی ہے ناں۔ شاید ایسا ہو گیا ہو...... شاید ایسا ہو گیا ہو۔''

وہ دل فگار لہجے میں بولی۔ ''آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں...... کیا آپ کو بھی کسی طرح کا شک ہے؟''

یوں لگتا تھا کہ وہ رو پڑے گی۔ بات کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اسے ''لائٹ'' کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''بھئی! فلموں، ڈراموں میں بھی تو اس طرح کی سچویشن آتی ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ ہیرو مر گیا ہے۔ ہیروئن بعد میں ہیرو کے قریبی دوست سے شادی کر لیتی ہے لیکن پھر ایک دن ہیرو واپس آ جاتا ہے اور گڑمس مچ جاتا ہے۔''

''آپ اس طرح کی بات کیوں کر رہے ہو؟ یہ کوئی مذاق والا معاملہ ہے؟'' اس کی آواز اضطراب آمیز غصے کی وجہ سے کانپ رہی تھی۔

چند لمحے توقف کے بعد میں بولا۔ ''ویسے اگر غور کیا جائے تاجور بی بی تو یہ کوئی ایسی انہونی بھی نہیں ہے۔ اس طرح کے واقعے ہوتے رہتے ہیں۔ ہم دور کیوں جائیں۔ جاماجی میں بھی تو اس سے ملتا جلتا سلسلہ ہو گیا تھا۔ زینب کو مردہ سمجھ لیا گیا تھا مگر ایک دن پتا چلا کہ وہ زندہ ہے۔ وہ نہ صرف زندہ نکلی بلکہ اس کی شادی اس کی مرضی کے عین مطابق ہزہائی نس ابراہیم سے بھی ہو گئی۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ محبت میں طاقت ہو اور جنون ہو تو انہونیاں ہوتی ہیں اور دیواریں بھی رستہ دیتی ہیں......''

میں نے ایسا تاثر دیا جیسے اچانک کوئی آ گیا ہو۔ میں نے کہا۔ ''اچھا میں فون بند کر رہا ہوں۔ دوبارہ بات کریں گے۔''

میں نے کال ڈس کنیکٹ کر دی۔

مجھے اندازہ تھا کہ تاجور شدید اضطراب میں مبتلا ہو گئی ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ اب وہ خود کال کرے۔

بمشکل پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ اس کے نمبر سے کال آ گئی۔ دوسری کال پر میں نے فون اٹھایا۔

''ہیلو...... میں تاجور بول رہی ہوں۔'' آواز سے اس کی ہیجانی کیفیت کا سراغ ملتا تھا۔

''ہاں تاجور، کہو۔''

''آپ ایسی اُلجھن کیوں ڈال رہے ہو۔ کیا آپ کو کوئی شک ہے شاہ زیب کے بارے میں۔ اگر شک ہے تو پھر اس کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟''

''اوہ، تم بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو تاجور! میں نے تو ایک رسمی سی بات کی تھی جو اور بھی کئی لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہو گی۔ وہ میرا جگری یار تھا۔ میرے کانوں میں ابھی تک اس کی آوازیں گونجتی ہیں۔ ہر دستک پر اور فون کی ہر گھنٹی پر ایسے لگتا ہے کہ وہ آ گیا ہے۔''

''نہیں وقاص صاحب...... آپ...... کسی اور انداز میں بات کر رہے ہیں...... آ...... آپ...... ان کے ''جنازے'' میں گئے تھے۔ آپ نے اُن کا چہرہ یا ان کی میت دیکھی تھی؟''

میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''ایسے واقعات میں 'چہرہ' کہاں ہوتا ہے تاجور بی بی۔ اتنے بندے مرے شاید ایک آدھ کی شکل ہی پہچانی گئی ہو۔''

تاجور کی بھرائی آواز ابھری۔ آپ کہہ رہے ہو کہ ان کے دشمن ابھی بھی لاہور اور کراچی وغیرہ میں انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟''

''یہ مطلب تو ان ڈھونڈنے والوں سے ہی پوچھا جا سکتا ہے۔''

اسی دوران میں کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ تاجور نے کہا۔ ''شاید کوئی آ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں میری طرف بھی کوئی آ رہا ہے۔ دوبارہ بات کریں گے۔'' میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

تاجور کا بے پناہ اضطراب بتا رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں اس کی کال دوبارہ آ جائے گی۔ میں نے فون اپنے ہاتھ میں ہی رکھا۔ دل کہہ رہا تھا کہ کال آ رہی ہے۔ آ...... رہی ہے...... میں الٹی گنتی گننے لگا۔ تھرٹی ٹائن...... تھرٹی ایٹ...... تھرٹی سیون......''

ابھی گنتی ٹوئنٹی فور تک ہی پہنچی تھی کہ کال کے سگنل آ گئے۔ ''ہیلو وقاص بول رہے ہیں؟''

''ہاں بول رہا ہوں۔''

''ہیلو وقاص صاحب بول رہے ہیں؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں بھئی، کہہ تو رہا ہوں۔'' میں نے ذرا جھنجلاہٹ دکھائی۔

''در...... اصل...... آپ ذرا ناک میں بولتے ہیں ناں، اس لیے...... سمجھ نہیں آئی۔'' وہ گڑبڑا کر بولی۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''شروع میں آپ نے کیوں کہا ہے کہ بہت سی باتیں کلیئر نہیں ہیں؟ اس کا مطلب ہے آپ کو کچھ معلوم ہے۔'' اس کی آواز کی کپکپاہٹ نمایاں تھی۔

''اگر مجھے کچھ معلوم ہو گا بھی تو وہ ایک شک ہی گردانا جائے گا ناں۔''

''لل...... لیکن...... کیا معلوم ہے آپ کو؟'' وہ رو دینے کے قریب تھی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور بی بی...... اس طرح کی بات میں ایسے فون پر شیئر نہیں کر سکتا۔ اگر کبھی دوبارہ تم سے ملنے کا موقع ملا تو بات کر لیں گے۔''

وہ تڑپ کر بولی۔ ''اگر یہ کوئی مذاق ہے تو...... خدا کے لیے اسے یہیں روک دیں اور اگر واقعی کوئی بات ہے تو پھر مجھے بتائیں۔''

''بات تو ہے...... لیکن کوئی بہت بڑی بھی نہیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

اگلے پانچ منٹ تک اسی موضوع پر گفتگو ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ مجھے جو بتانا ہے فون پر بتا دوں مگر میں کہہ رہا تھا کہ یہ بات میں مل کر بتا سکتا ہوں۔ یہ گفتگو بے نتیجہ ختم ہو گئی لیکن اگلے روز صبح سویرے پھر تاجور کی کال آ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے رات کا زیادہ حصہ جاگ کر ہی گزارا ہے۔ وہ جیسے ہارے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ اس نے مجھے وہ طریقہ بتایا جس کے مطابق میری اور اس کی ایک اور ملاقات ہو سکتی تھی۔

اس نے بتایا کہ جس بزرگ کی فوتیدگی کے سلسلے میں گھر والے گوجرانوالہ گئے تھے اب ان کے چالیسویں کی رسم ہے۔ گھر والوں کو پرسوں صبح بالکل شام تک جانا ہے۔ اس دوران میں گھر کی ملازمہ فردوس گھر میں ہو گی یا پھر دین محمد صاحب کا ایک چچازاد بھائی ہو گا۔ تفصیل بتاتے ہوئے تاجور نے کہا کہ وہ فردوس کے ساتھ چھت پر ہی سو رہی ہے مگر رات کو ٹھنڈ کا بہانہ کر کے کمرے میں چلی جائے گی۔ فردوس رات کو کھانسی والی دوائی کھاتی ہے۔ وہ کہہ سن کر اسے کچھ زیادہ دوائی کھلا دے گی تاکہ وہ اطمینان سے سوئی رہے۔

میں نے جواباً تاجور سے وعدہ کیا کہ اسے چھونا تو

درکنار میں اس کے قریب بھی نہیں بیٹھوں گا۔ (اس کے ذہن میں پہلے والا تجربہ موجود تھا۔ برساتی میں اس پر پوری طرح حاوی ہو جانے کے باوجود میں نے اسے کوئی گزند نہیں پہنچایا تھا)

مجھ سے ایک دو قسمیں لینے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ میں اس کے لیے کسی بھی طرح کے خطرے کا باعث نہیں بنوں گا۔ پولیس اہلکاروں کی نظر سے بچنا بھی ضروری تھا، وہ بولی۔ ''آپ خوانخواہ دیوار ناپنے کا خطرہ مول نہ لینا۔ پچھلی گلی میں گھر کا ایک چھوٹا دروازہ بھی ہے۔ جب فردوس سو جائے گی تو وہ میں اندر سے کھول دوں گی۔''

وہ ہر طرح کا رسک لے رہی تھی اور اس کے لیے مجبور تھی۔

گھر والے اگلے روز شام کو ہی چلے گئے۔ اس مرتبہ دونوں بچے بھی گئے تھے مگر پروگرام کے مطابق اگلے روز ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ عقبی گلی جہاں سے مجھے تاجور کے گھر میں جانا تھا، شامیانے لگ گئے۔ وہاں ذکر اذکار کی کوئی محفل تھی۔ بھاری آواز والے ایک مولانا رات گئے تک لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کرتے رہے۔ ایسی باتیں کر رہے تھے جن کا اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو سرے سے لغو قرار دے رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کر نجانے کیوں میرا دھیان ایک بار پھر ٹیکساری گینگ کے خوفناک برکاروں کی طرف چلا گیا۔ میڈیکل سائنس بھی تو خدا کا بخشا ہوا علم ہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اس کا استعمال کیسے کرتا ہے۔ ٹیکساری گینگ نے اس کا استعمال برے طریقے سے کیا۔ وہ ایک جیسے انسان، ایک جیسی شکلیں، ایک جیسی وحشی ذہانت۔ میں وہ سب کچھ یاد کر کے کانپ سا گیا۔

اگلے روز صورتِ حال سازگار تھی۔ رات دس بجے تاجور سے میرا ٹیلی فونک رابطہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس نے فردوس کو ڈبل ڈوز دے دی ہے۔ وہ سوئی پڑی ہے۔ چاچا چاچی نیچے کمرے میں ہیں۔ اس نے عقبی دروازے کی کنڈی کھول دی ہے۔

میری دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ میری اور تاجور کی یہ ملاقات بڑی انکشاف انگیز ثابت ہونے والی تھی۔ میں اب تاجور سے اپنی شناخت تادیر نہیں چھپا سکتا تھا۔ دارابی فیملی بڑی تیزی سے تاجور کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہی تھی۔ دارج داراب ایک عقاب کی طرح تھا اور سکھیرا گاؤں کی اس رنگین چڑیا کو دبوچنے کے لیے مسلسل اُڑانیں بھر رہا تھا۔

خنکی تھوڑی سی بڑھ چکی تھی۔ میں نے اپنا ڈبی دار صافہ سر پر لپیٹا۔ شلوار قمیص کے اوپر چادر کی بکل ماری۔ بیگ کے پیندے میں سے اپنا ریوالور نکال کر قمیص کے نیچے لگایا اور اپنی زندگی کی ایک اہم ترین رات کی تاریکی میں نکل کھڑا ہوا۔

دین محمد صاحب کے گھر میں داخل ہوتے وقت مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پولیس کے دو اہلکار اہلِ خانہ کے ساتھ ہی گوجرانوالہ گئے تھے صرف ایک یہاں موجود تھا اور وہ سامنے کی طرف چارپائی پر ٹانگیں پسارے چوکیدار سے گپ شپ کر رہا تھا...... دوسری منزل کے کمرے میں مطلوبہ دروازہ مجھے بند ملا لیکن میری ہلکی سی دستک کے بعد کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی تاجور تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لالٹین کی لو نہ ہونے کے برابر تھی۔ مجھے اس کے تاثرات تو ٹھیک سے نظر نہیں آئے مگر اس کی حرکات سکنات سے عیاں تھا کہ وہ بری طرح سہمی ہوئی ہے۔ جب میں نے اندر سے کنڈی چڑھائی تو وہ مزید سہم گئی۔ اس نے دوپٹا بڑی مضبوطی سے اپنے سر اور چہرے کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ شاید میرے آنے سے پہلے نفل وغیرہ پڑھ رہی تھی۔

اس کا خوف دیکھ کر میں نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال کر زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''یہ بھرا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر میری طرف سے ذرا بھی خطرہ ہو تو بے دھڑک میری چھاتی پر فائر مار دینا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور ریوالور جلدی سے تپائی پر رکھ دیا۔ میں نے اسے اٹھا کر دوبارہ اس کی گود میں رکھ دیا۔

''مجھ سے ڈرو گی تو پھر کیا کرو گی...... ہم تو کوئی بات ہی نہیں کر سکیں گے۔'' میں بدستور بدلی آواز میں بات کر رہا تھا۔

اس نے آنکھیں پوری کھول کر میری جانب دیکھا اور ہولے سے بولی۔ ''شاہ زیب، آپ کے کزن تھے؟''

''ہاں کزن بھی اور گہرا دوست بھی۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''آپ...... کی شکل...... کچھ کچھ ملتی ہے۔''

''اندھیرے میں کیا پتا چلے گا۔ لالٹین کی لو کچھ اونچی کر لیں۔'' میں نے کہا۔

''نن...... نہیں...... روشنی ٹھیک نہیں۔ چانن نیچے تک جائے گا۔ چاچا چاچی جاگ سکتے ہیں۔''

نیچے سے کسی بوڑھے بندے کے کھانسنے کی آواز آئی اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ دیہاتی خاموشی بڑی مکمل تھی۔ کسی گاڑی کی آواز نہیں تھی۔ کسی مشین کا شور نہیں تھا۔ کہیں کوئی ٹی وی بھی نہیں چل رہا تھا۔ بس کبھی کبھار کسی گلی میں کوئی آوارہ کتا اپنی موجودگی کا احساس دلا کر چپ ہو جاتا تھا۔

''آپ شاہ زیب کے حوالے سے کیا بات کرنا چاہ رہے تھے؟'' تاجور نے منمناتی آواز میں کہا۔

''یہی بات کہ شاید ابھی امید پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس دھماکے میں مرا نہ ہو۔ صحیح سالم رہا ہو یا پھر زخمی حالت میں کہیں موجود ہو۔ ایک دن اچانک سامنے آ جائے۔''

''کیا...... آپ کے اس شک کی کوئی وجہ ہے؟'' وہ اٹک اٹک کر اور نہایت ہراساں لہجے میں بول رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے ہراس کی ایک وجہ میں خود بھی ہوں۔ وہ میرے سلسلے میں شدید الجھن میں نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر احرار نے یہی کہا تھا جب لوگ کاسمیٹک یا پلاسٹک سرجری کے بعد اپنی شباہت بدلتے ہیں تو انہیں جاننے والے انہیں دیکھ کر عجیب اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر ٹیک لگا لی تھی۔ تاجور چند فٹ دور چارپائی کے بالکل ایک سرے پر اکڑوں بیٹھی تھی، جیسے ابھی اٹھ کر باہر نکل جائے گی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تاجور بی بی! تم سے میرا لگاؤ اور میری محبت اپنی جگہ ہے لیکن فی الحال اگر میں داراب یوں کو تم سے دور رکھنا چاہ رہا ہوں تو اس کی وجہ صرف یہی ہے جو میں نے ابھی تمہیں بتائی ہے۔ کیا پتا، ابھی ہمارا شاہ زیب ہماری زندگیوں سے نکلا نہ ہو۔''

''ہم...... میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو کسی حد تک سنبھالا ہے وقاص صاحب۔ آپ مجھے پھر کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔ اگر واقعی...... کوئی بات...... آپ کے علم میں ہے...... تو بتائیں...... ورنہ پلیز اس بارے میں چپ رہیں۔''

میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے آہنگ میں کہا۔ ''تاجور، تم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ پسرور میں تمہاری ایک چچا زاد بہن ثمینہ تھی۔ چنے ابالتے ہوئے پریشر ککر پھٹ گیا تھا اور اس کے چہرے پر جلنے کے گہرے زخم آئے تھے۔ بعد میں اس کے بھائی اسے لاہور لے گئے تھے اور وہاں اس کی سرجری ہوئی تھی۔''

''ہاں...... لیکن...... یہ بات اس وقت آپ کیوں کر رہے ہیں؟'' (وہ یقیناً اس بات پر بھی حیران تھی کہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی مجھے معلوم ہیں)

''میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ دس پندرہ سال پہلے کی بات ہے، اب تو یہ ڈاکٹری اور بھی جدید ہو گئی ہے۔ بگڑے ہوئے چہروں کو بدلا جا سکتا ہے۔ قریبی جاننے والے بھی پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں۔''

وہ بس میری جانب دیکھتی جا رہی تھی۔ جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ میری ان بے ربط باتوں کے جواب میں کیا کہے۔ میرا اپنا دل بھی بے طرح دھڑک رہا تھا مگر میں نے اپنے لہجے کا ٹھہراؤ برقرار رکھا ہوا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا پتا تاجور! شاہ زیب بچ گیا ہو اور اس نے اپنے جانی دشمنوں سے بچنے کے لیے اپنے چہرے میں تبدیلیاں کروالی ہوں۔ وہ آس پاس ہی کہیں موجود ہو۔ اپنے پیاروں کے سامنے آنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہو۔ کوئی ایسا موقع جب ٹیکساری گینگ کے زہریلے سانپ اس کی طرف سے مایوس ہو کر واپس اپنے بلوں میں گھس جائیں......''

''میرے...... دل کو کچھ ہو جائے گا۔'' وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے ڈر آ رہا ہے آپ سے...... آپ کون ہیں؟'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی اٹھی اور اس نے لالٹین کی لو اونچی کر دی۔ اس کی آنکھیں خوف سے کھلی ہوئی تھیں۔ نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ سرتاپا لرزاں تھی۔ ان لمحوں میں کائنات کی گردش بھی جیسے تھم گئی۔ تاجور حرکت کرنا چاہتی تھی مگر حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ بولنا چاہتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی۔ بس میرا چہرہ تھا اور اس کی نگاہیں تھیں۔

میں نے اسے کندھوں سے تھاما۔ ''شکلیں بدل جاتی ہیں تاجور...... لیکن انسان تو وہی رہتا ہے...... پہچان تو وہی رہتی ہے۔'' اس مرتبہ میں اپنی اصل آواز میں بولا تھا۔

تاجور نے ہیجانی انداز میں میرے ہاتھ اپنے کندھوں پر سے ہٹائے اور یوں لگا کہ اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگنا چاہتی ہے۔ ایسی صورت میں شاید وہ چلا بھی اٹھتی، میں نے وہی کچھ کیا جو چند دن پہلے برساتی کی تاریکی میں کیا تھا۔ میں نے اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ دائیں ہاتھ سے اس کے ہونٹ یوں ڈھانپے کہ وہ بند ہو کر رہ گئے۔ وہ گھبراہٹ میں چلائی اور ذرا مچلی بھی، مگر پھر بے جان سی ہو گئی۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''تاجور...... یہ میں ہی ہوں...... میرے نقش کچھ بدلے ہوئے ہیں مگر میری

آواز تو تم پہچان ہی رہی ہو...... پہچان رہی ہو ناں؟''

وہ بدستور سکتہ زدہ رہی۔ پورے جسم میں ایک نمایاں لرزش تھی۔ جیسے لرزے کا بخار چڑھ گیا ہو۔

''...... زندگی میں انہونیاں ہوتی ہیں تاجور...... اور یہ بھی ایک انہونی ہی ہے کہ میں اس حادثے میں بچ گیا ہوں۔ چند معمولی زخم آئے تھے۔ تم جانتی ہو ٹیکساری گینگ کے قاتل کتنے خطرناک ہیں۔ خود کو اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو ان زہریلے ناگوں سے بچانے کے لیے ہی میں چھپا رہا۔ مستقل طور پر چھپے رہنے کے لیے جاماجی کے ڈاکٹر کرنل احرار نے میری مدد کی...... جدید زمانے میں جدید طرح کی مدد۔''

میں محسوس کررہا تھا کہ تاجور کی ہیجانی کیفیت ماند پڑ رہی ہے۔ وہ بالکل مزاحمت نہیں کررہی تھی۔ بس حیرت اور سنسناہٹ کی ایک لہر تھی جو اس کے سر سے لے کر پاؤں تک دوڑ رہی تھی۔

میں نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹالیا مگر جسم پر گرفت برقرار رکھی۔ ہونٹوں پر سے ہاتھ ہٹایا تو اس نے مڑ کر دہشت زدہ نظروں سے میرا چہرہ دیکھا۔ لالٹین کی روشنی کمرے میں تھرتھرا رہی تھی اور شاید اسی طرح تاجور کا دل بھی۔ وہ گنگ سی ہوگئی تھی۔

میں نے بے ساختہ اس کے سر کے بالوں کو بوسہ دیا اور کہا۔ ''تاجور! تم جانتی ہی ہو، ڈاکٹر احرار ایک بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے میرے چہرے میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ میری جلد، داڑھی اور سر کے بالوں کا رنگ بھی بدلا ہوا ہے۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو کچھ اور اونچی کر دی۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر ٹکیں اور چہرے پر یقین و بے یقینی کی عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ کبھی اپنا سر نفی میں ہلانے لگتی۔ کبھی اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں تلے دباتی۔ اس کی حسین آنکھوں میں آنسو امڈنا شروع ہوگئے تھے۔ کرشمے، معجزے اسی دنیا میں ہی تو ہوتے ہیں اور پھر آنسو بڑی تیزی سے امڈے۔ اچانک اس نے گھوم کر اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپالیا اور بازو میرے گرد حمائل کر دیے۔ وہ پہلے سسکی پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کے آنسو ایک آبشار کی طرح تھے جو میرے سینے کے بالوں کو بھگوتے چلے جارہے تھے۔ میں نے بھی اسے بانہوں میں بھرلیا۔ اپنے آپ پر جیسے اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی۔

''آہستہ تاجور...... آہستہ۔'' میں نے اسے بانہوں میں سمیٹا۔

کتنی ہی دیر بعد وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''مجھے یوں لگ رہا ہے...... یہ سب جھوٹ ہے...... یا پھر میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں سمجھتی تھی ایسا نہیں ہوسکتا، صرف...... کہانیوں کی باتیں ہیں یہ...... لیکن آپ زندہ ہیں...... آپ زندہ ہیں اور میں یقین نہیں کرپارہی۔''

یہ جذباتی اتار چڑھاؤ کے لمحے تھے۔ بے حد ہیجان تھا، سنسنی تھی اور حیرت آمیز والہانہ پن تھا۔ جب مدوجزر کا یہ شدید ترین دورانیہ گزر گیا، اور ہم نے دو تین بار ایک دوسرے سے علیحدہ ہوکر ایک دوسرے کو بھرپور نظروں سے دیکھ لیا...... تو تاجور کی ہیجانی کیفیت میں کمی واقع ہونے لگی۔ اس کے چہرے پر حیا اور گریز کی سرخی پھیلنے لگی۔ چہرہ آنسوؤں سے تربتر تھا اور وہ مجھ سے چھوٹے چھوٹے سوال بڑی تیزی سے پوچھتی چلی جارہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تاجور! اتنا کچھ پوچھو گی تو میں کیا بتاؤں گا اور تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا۔ ترتیب سے پوچھو، میں ترتیب سے بتاتا چلا جاتا ہوں۔''

''لیکن نہیں۔'' وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ''پہلے میں رب کا شکر ادا کرلوں۔''

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی اوڑھنی کو اور مضبوطی سے اپنے سر اور چہرے کے گرد کسا، اپنی بکھری ہوئی لٹوں کو بھی اوڑھنی کے اندر گھسایا اور جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔ یہ شکرانے کے نفل تھے۔ وہ سجدے کی حالت میں گئی تو دیر تک اشک بہاتی رہی۔

تب وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ پہلے اوپر جاکر چھت پر ملازمہ فردوس کو دیکھا پھر دس پندرہ زینے اتر کر نیچے اپنے کسی چاچا کی سن گن لی پھر قدرے مطمئن انداز میں واپس کمرے میں آگئی۔ اس مرتبہ اس نے خود ہی اندر سے کنڈی چڑھادی تھی۔

میں نے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکا کر باہر جھانکا۔ درمیانی راتوں کا چاند ٹھٹھرے ہوئے آسمان پر بدلیوں کے درمیان محوِ سفر تھا۔ میں نے پردہ پھر برابر کردیا۔ میں تاجور کو مکمل کر بتادینا چاہتا تھا کہ میں اب ایک نیا شخص ہوں۔ میں ایک نئی زندگی اور ایک نئی پہچان کے ساتھ اس کے سامنے آیا ہوں...... اور اس انقلاب آفریں تبدیلی نے میرے لیے زیست کی کچھ نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اب میں خود کو

زنجیروں کے جکڑ بندوں سے آزاد محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں اس کی تمنا بھی کرسکتا ہوں۔ اگر وہ اس تمنا کو قابلِ قبول سمجھے تو ہم مستقبل میں مشترکہ زندگی کا حسین سپنا دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ سب کچھ، اتنی جلدی کہہ دینا آسان نہیں تھا۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا اور آہستہ آہستہ اصل موضوع کے لیے راہ ہموار کرتا رہا۔ میرے پاس وہ چند فوٹوگرافس بھی محفوظ تھے جو ڈاکٹر احرار نے میری کاسمیٹک سرجری کے دوران میں اتارے تھے۔ ان تصویروں سے پتا چلتا تھا کہ کس طرح آہستہ آہستہ میری شکل میں چند دن کے اندر تبدیلی رونما ہوئی۔ میں نے اسے وہ تصویریں دکھائیں اور اس کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ وہ مجھے ان عارضی تبدیلیوں کے بغیر دیکھنا چاہتی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی کہ فوری طور پر ایسا ممکن نہیں۔ اس کے سوالوں کے جواب میں، میں نے اسے ٹیکساری گینگ سے اپنی ہولناک ٹکر کے بارے میں بتایا، انیق اور سجاول کے بارے میں بتایا۔ وہ یہ جان کر ششدر رہ گئی کہ سجاول اپنے ڈیرے کو چھوڑ چھاڑ کر ایک گاؤں میں چلا گیا ہے اور جاماجی کی حسینہ خورسنہ اس کے ساتھ ہے۔ دونوں شادی کرچکے ہیں۔

''مجھے یقین نہیں آرہا۔ اتنی جلدی...... یہ سب کچھ؟''

''یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا تھا۔ کچھ لوگ خرگوش کی طرح چلتے ہیں اور کچھ میری طرح کچھوے کی رفتار سے۔'' میں نے معنی خیز لہجہ اختیار کیا۔

وہ بولی۔ ''اور سجاول کے درجنوں ساتھی؟ اور اس کی ماں اور بہن وغیرہ؟ وہ تو ایک پورے گروہ کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ......''

''وہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے اُس نے۔'' میں نے تاجور کی بات کاٹی۔ ''اور اس کے ارادوں سے لگتا یہی ہے کہ وہ پرانی زندگی کی طرف واپس نہیں پلٹے گا کم از کم ارادہ تو اس کا یہی ہے...... آگے اللہ جانے۔''

وہ خاموش رہی...... وہ میری باتیں سن تو رہی تھی مگر اس کے اندر ایک بے چینی سی تھی۔ وہ اس ملاقات کو جلدی ختم کرنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ فردوس یا چچا میں سے کوئی جاگ نہ جائے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھی تو اب میرا دل بھی چاہتا ہے کہ سجاول کی طرح کہیں دور کسی گوشے میں نکل جاؤں۔ اس بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ۔ ایک نئی شناخت کے ساتھ۔''

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ یہی بات وہ خود بھی مجھ سے کہا کرتی تھی۔ تو پتا نہیں کہ آج میری بات کا ردِعمل اس پر کیا ہوا تھا؟

اچانک وہ ٹھٹکی۔ مجھے بھی کہیں پاس ہی گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ہارن بجایا گیا۔ ''ہائے میں مرگئی۔'' تاجور نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے۔

''کیا ہوا؟''

''اباجی واپس آگئے ہیں۔ یہ ہماری ہی گاڑی ہے۔''

اسی دوران میں نچلی منزل پر کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ تاجور کے چاچا جاگ گئے تھے اور شاید مین دروازہ کھول رہے تھے۔

''یہ کیا ہوگیا؟'' تاجور دہشت زدہ ہوکر بولی۔ ''ان کو تو کل آنا تھا۔ ہائے ربا! اب کیا ہوگا۔'' پھر اس نے لالٹین بجھائی اور تیز سرگوشی کی۔ ''شاہ زیب! آپ چھت پر چلے جائیں۔ وہاں سے نکل جائیں۔''

''ٹھیک ہے، تم گھبراؤ نہیں، کچھ نہیں ہوگا۔''

میں نے کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ چھت سے فردوس کی آواز آئی۔ وہ پکاری۔ ''تاجور بی بی! کہاں ہو تم...... تاجور......''

''ہائے ربا، فردوس بھی جاگ گئی۔'' تاجور رو دینے والے انداز میں بولی۔ وہ تھرتھر کانپنے لگی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد فردوس بھی کمرے کے دروازے پر تھی۔ اس نے دستک دی۔ ''تاجور...... تم اندر ہو؟ دروازہ کھولو...... تمہارے اباجی آگئے ہیں۔''

میں نے تاجور کو خاموش رہنے کا کہا۔ عین ممکن تھا کہ فردوس دروازے کے سامنے سے ٹل کر نیچے چلی جاتی اور مجھے چھت کی طرف جانے اور گلی میں کود جانے کا موقع مل جاتا۔

فردوس بار بار دستک دینے لگی۔ تاجور بے دم سی ہوگئی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے دونوں بازو اپنے سینے سے لگا رکھے تھے۔ ''یا اللہ خیر...... یا اللہ رحم کر۔'' وہ بار بار کہتی جارہی تھی۔

نیچے برآمدے سے دین محمد صاحب کی آواز آئی۔ فردوس! کہاں ہو تم؟''

''آئی میاں جی۔'' فردوس نے جواب دیا۔

اندازہ ہوا کہ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جارہی ہے۔ یہ امید کی کرن تھی لیکن ابھی وہ تین چار سیڑھیاں ہی اتری ہوگی کہ چھوٹے اسفند کی آواز آئی۔ ''ماسی جی، آپی کہاں ہے؟''

''وہ کمرے میں ہے۔ دروازہ کھڑکاؤ۔'' فردوس

نے کہا اور خود نیچے چلی گئی۔
اب اسفند نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔
’’آپی...... آپی ہم آ گئے ہیں۔‘‘
’’اب کیا ہو گا شاہ زیب۔ مم...... میں نے تمہیں کتنا منع کیا تھا۔‘‘
’’حوصلہ رکھو، کچھ نہیں ہو گا۔ کوئی جرم نہیں کیا ہے تم نے...... یا میں نے۔‘‘
اسی دوران میں دین محمد صاحب بھی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آ گئے اور دروازے کے سامنے پہنچ کر بولے۔
’’کیا بات ہے۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی۔‘‘
’’بڑی پکی نیند ہے جی اس کی۔‘‘ ملازمہ فردوس کی آواز ابھری۔
’’لیکن یہ تو تمہارے ساتھ چھت پر سوئی ہو گی؟‘‘ دین محمد صاحب نے پوچھا۔
’’ہاں جی، ادھر ہی سوئی تھی پھر شاید ٹھنڈ لگی ہے۔ نیچے آ گئی ہے۔‘‘
ایک بار پھر دروازہ زور سے بجایا گیا۔ ’’دروازہ کھولو تاجور۔‘‘ دین محمد صاحب نے بلند آواز میں کہا۔
فردوس نے کہا۔ ’’ہائے اللہ کیا ہو گیا ہے اس کو؟‘‘
اسی دوران میں نیچے برآمدے کی طرف سے تاجور کی والدہ کی پکار سنائی دینے لگی۔ دروازہ نہ کھلنے سے وہ بھی یقیناً گھبرا گئی تھیں اور پوچھ رہی تھیں کہ کیا ہوا ہے۔ بیماری کے سبب وہ سیڑھیاں چڑھنے سے گریز کر رہی تھیں۔
دین محمد صاحب نے جھلا کر فردوس سے کہا۔ ’’جاؤ دیکھو اس کو۔ کہیں اوپر ہی نہ آ جائے۔‘‘ وہ تاجور کی والدہ کی بات کر رہے تھے۔
فردوس پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔ یہ مناسب موقع تھا۔ نکلنے کی کامیاب کوشش کی جا سکتی تھی۔ میں نے تاجور کے کان میں کہا۔ ’’گھبراؤ نہیں۔ تم آرام سے دروازہ کھولو۔ دروازہ کھلے گا تو میں دروازے کے پیچھے آ جاؤں گا اور پھر باہر نکل جاؤں گا۔‘‘
تاجور کی حالت بری تھی مگر اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ جونہی پلائی ڈور کا اکلوتا پٹ کھلا مجھے اس کی اوٹ مل گئی۔ دین محمد صاحب کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ گرجے۔ ’’کوئی ہوش ہے تم کو۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں؟‘‘
’’ب...... بس...... ابا جی...... پتا نہیں چلا۔‘‘ وہ ہکلائی۔
دین محمد اور اسفند اندر آ گئے۔ یہ اچھا موقع تھا۔ میں بڑی صفائی سے دروازے کی اوٹ سے نکلا اور سیڑھیوں پر آ گیا۔ ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا میں برساتی کی طرف لپکا۔ بس آدھے سیکنڈ کا فرق رہ گیا۔ میں برساتی کے دروازے سے ایک قدم دور تھا کہ نیچے سے فربہ انداز فردوس کے چلّانے کی آواز آئی۔ ’’کون ہے...... کون ہے...... چور...... چور......‘‘
جی چاہا، پلٹ کر ایسا گھونسا ماروں اس کے منہ پر کہ چھت سے فرش پر جا گرے اور روزِ حشر تک آنکھ نہ کھولے...... مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں چھت سے گزرا...... اور پہلے کی طرح چھجے پر پہنچ کر بیرونی دیوار پر آ گیا۔ یہاں سے گلی میں کودنا آسان تھا۔
گلی میں خاموشی تھی۔ عقب میں دین محمد کے گھر میں بھی کسی طرح کا شور نہیں مچا تھا اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی تھا۔ میرے لیے بھی اور اہلِ خانہ کے لیے بھی۔
☆☆☆
چوہدری بشیر کے ڈیرے پر پہنچ کر میں اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ یہ بڑا ’’اپ سیٹ‘‘ ہوا تھا۔ مجھے تاجور کی فکر ہو رہی تھی۔ تاجور کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ گھر کے حالات پہلے ہی اچھے نہیں ہیں۔ دین محمد کا رویّہ بہت بدل چکا تھا۔ وہ تاجور سے اکثر و بیشتر خفا رہتے تھے۔
اگلے روز میں نے ہاشو کی بہن انوری سے سن گن لینے کی کوشش کی مگر کسی خاص بات کا پتا نہیں چلا۔ مطلب یہی تھا کہ کل رات والا واقعہ صرف دین محمد کے گھر کے اندر تک ہی رہا ہے۔ فربہ اندام فردوس نے ایک دو بار چور چور کی آواز لگائی تھی لیکن یہ آواز بھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔
دوسرے روز رات دس گیارہ بجے میں نے فون پر تاجور سے رابطے کی کوشش کی مگر فون بند جا رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی خیر خیریت کا پتا کیسے چلایا جائے۔ میں کسی طرح کا رسک بھی لینا نہیں چاہتا تھا۔ دو تین روز اسی گوموں میں گزر گئے۔ دین محمد صاحب کے حویلی نما گھر میں ایک سناٹا سا تھا...... کسی وقت لگتا تھا کہ یہ سناٹا مستقبل قریب میں کسی طوفان کا سبب بنے گا۔
انہی دنوں ایک بڑا اچھا اتفاق ہوا اور مجھے دین محمد صاحب کے گھر کے اندرونی حالات جاننے کا زبردست موقع مل گیا۔ بظاہر تو یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا مگر اس کا نتیجہ میرے لیے غیر معمولی تھا۔ میں ابھی ابھی لوڈر پر سبزی منڈی کا پھیرا لگا کر واپس آیا تھا۔ صبح کے ساڑھے نو بجے

تھے۔ اب رات تک میری کوئی ڈیوٹی نہیں تھی۔ میں آرام کر سکتا تھا۔ میں بستر پر نیم دراز، اپنے اسپائی کیمرے سے چھیڑ خانی کرنے لگا۔ اسے سیل فون کے ساتھ اٹیچ کر کے میں یونہی اس کی سابقہ ریکارڈنگ دیکھنے لگا۔ یہ وہ ریکارڈنگ ...... تھی جو کیمرے نے چند روز پہلے چوہدری بشیر کی بیٹھک میں کی تھی اور جس میں چوہدری بشیر اور منشی منظور میں سیف کے بارے میں ہونے والی رقت آمیز گفتگو بھی شامل تھی۔ یہ ریکارڈنگ بس ایک ڈیڑھ گھنٹے کی تھی۔ باقی پچاس ساٹھ گھنٹے میں کیمرا خالی کمرے کو ہی ایکسپوز کرتا رہا تھا۔
ریکارڈنگ چیک کرتے ہوئے ایک جگہ میں بری طرح چونک گیا۔ میں نے جلدی سے کیمرے کو اسٹاپ کیا اور اسے ریورس کر کے دوبارہ دیکھنے لگا۔ میں ششدر رہ گیا۔ خالی کمرے کے اندر ایک عورت داخل ہوئی تھی اور جھاڑ پونچھ کرنے لگی تھی۔ یہ بھرے بھرے جسم والی ایک جوان ملازمہ تھی۔
پھر ایک اور شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے غالباً دروازے کو کنڈی چڑھا دی تھی کیونکہ کنڈی چڑھنے کی آواز ریکارڈ ہوئی تھی۔ وہ شخص کیمرے کے فریم میں آیا تو میں چونک گیا۔ وہ ہاشو تھا۔ وہی ہاشو جو اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اور ہر وقت اس کی ٹہل سیوا میں لگا رہتا تھا۔ وہ بھوکے شیر کی طرح جواں سال عورت پر جھپٹا۔ دونوں بغل گیر ہو گئے اور پھر چارپائی پر گر گئے۔
’’نہ کر ہاشو۔ چھڈ دے مینوں۔ کوئی آ جائے گا۔‘‘ عورت کی آواز ابھری۔
’’اوئے تیری ایسی کی تیسی۔ آج پورے ایک مہینے کے بعد تو پکڑائی دی ہے تو نے۔‘‘ وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔
کھینچا تانی میں عورت کی قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے اور وہ نیم عریاں ہو گئی۔ عورت نے شوخی بھری ناراضگی کے ساتھ جھاڑ پونچھ والی تاکی اس کے منہ پر پھیر دی۔ وہ اور بھی پُرجوش ہو گیا۔ اچانک باہر کچھ فاصلے سے کسی کی مدھم آواز سنائی دی۔ ’’ہاشو...... اوئے ہاشو۔‘‘
وہ دونوں جلدی سے علیحدہ ہو گئے۔ دونوں نے اپنے لباس درست کیے۔ ملازمہ نے اپنا چاک گریبان اوڑھنی میں چھپایا اور جھاڑ پونچھ میں لگ گئی۔ ہاشو باہر نکل گیا۔ عورت کا چہرہ پوری طرح کیمرے کے سامنے آیا تو میں نے پہچان لیا یہ دین محمد کے گھر کام کرنے والی ملازمہ فردوس تھی۔ اچھا لوسین تھا۔
اس لوسین سے فائدہ اٹھانے کا موقع مجھے دوسرے روز ہی مل گیا۔ انوری کے ذریعے مجھے پتا چل گیا کہ چوہدری بشیر کے ڈیرے کی صفائی ستھرائی کا کام فردوس کی ایک بہن نجمہ کرتی ہے۔ وہ چار پانچ دن کی چھٹی پر ہے اس لیے آج کل فردوس یہاں آ رہی ہے۔

اس سخت اسنیک کو کھانے کے بجائے
جوتے کے تلوے میں لگوانا چاہیے!

وہ دوسرے روز آئی تو میں نے اُسے گھیر لیا۔ کل والے واقعے کی ہوش رُبا تفصیل بتا کر اسے ہینڈل کرنے میں مجھے دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ جب میں نے سیل فون کی اسکرین پر اسے ہاشو والے سین کی جھلک دکھائی تو وہ سخت خوف زدہ ہو گئی۔ منت سماجت کرنے لگی اور سارا الزام ہاشو پر دھرنے لگی۔
میں نے کہا۔ ’’وہ دیکھو، ہاشو کی زوجہ کھڑی ہماری ہی طرف دیکھ رہی ہے۔ یہاں بات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم کل کا کوئی ٹائم بتاؤ۔ آرام سے بات کریں گے۔‘‘
وہ پہلے تو گریزاں رہی پھر مجبوراً مان گئی۔ پانی والے کھالے سے تھوڑا آگے تین چار ٹنڈ منڈ بیریاں تھیں۔ اس سے آگے تھوڑی سی تھور والی زمین تھی اور سرکنڈے تھے۔ سرکنڈوں کی اوٹ میں کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر بات کی جا سکتی تھی اور اگر کوئی ادھر آ جاتا تو پہلے سے اسے دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے فردوس کو پابند کر دیا کہ وہ اس معاملے کے بارے میں ہاشو سمیت کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔
دوسرے روز شام کے وقت وہ ہانپی ہوئی سی وہاں

پہنچ گئی۔ وہ شادی شدہ تھی، دو بچے تھے۔ اس نے ہاتھ پاؤں جوڑے کہ میں اس کی اور ہاشو والی بات اپنے تک ہی رکھوں۔ اس کے لیے میں نے ایک شرط رکھی اور شرط یہ تھی کہ وہ دین محمد کے گھر کے حالات مجھے بتائے گی۔ میں نے اسے یہی باور کرایا کہ میں دین محمد کی بیٹی تاجور پر عاشق ہو گیا ہوں۔

فردوس نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے اور خوف زدہ چہرے کے ساتھ بولی۔ ''توبہ کرو ڈرائیور جی، کس چکر میں پڑ رہے ہو۔ تاجور، چوہدری جی کی دھی ہے۔ ویسے بھی اس کی بات تو لاہور کے بہت وڈے لوگوں میں چل رہی ہے۔ تھوڑے دنوں میں منگنی ہونے والی ہے۔ وہ بہت ہی ڈھاڈے لوگ ہیں۔''

''ڈھاڈا تو میں بھی بہت ہوں۔ میرا میٹر گھوم گیا تو آگا پیچھا نہیں دیکھوں گا۔ یہ موبائل فون سیدھا تیرے بندے کے سامنے جا کر رکھ دوں گا اور تو خود ہی بتا رہی ہے کہ وہ تجھے تین طلاقیں دینے میں تین منٹ نہیں لگائے گا۔''

میرے بے رحم رویے نے فردوس کو بالکل سیدھا کر دیا۔ ویسے بھی وہ کوئی ایسی وفادار یا پرانی ملازمہ نہیں تھی۔ (جب دین محمد صاحب چاند گڑھی چھوڑ کر یہاں سکھیرا آئے تھے، تب ہی اسے ملازم رکھا تھا) وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ بہت جلد میرے ڈھب پر آ گئی۔ اس کے پاس ایک کھٹیچر سا موبائل فون بھی موجود تھا۔ میں نے اس کا نمبر لے لیا۔

وہ جان چکی تھی کہ پانچ روز پہلے دین محمد کے گھر میں گھسنے والا اور پھر خطرہ دیکھ کر بھاگ جانے والا میں ہی تھا۔ وہ اس بات پر بے حد ششدر بھی تھی کہ مجھ جیسے معمولی ڈرائیور کے ساتھ تاجور کا چکر چل پڑا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''وہاں سے میرے آنے کے بعد کیا ہوا؟''

اس نے ذرا دکھی لہجے میں انکشاف کیا۔ ''تاجور بی بی کو اپنے اباجی سے مار پڑی...... وہ بہت غصے میں تھے۔ انہوں نے تاجور بی بی کو تھپڑ مارے۔ میں نے اور اس کی امی نے بڑی مشکل سے انہیں روکا۔''

میرے سینے میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یہ بڑی تکلیف دہ خبر تھی۔ میں نے فردوس سے پوچھا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''گھر میں بڑا سیاپا پڑا ہوا ہے۔ چوہدری جی بہت غصے میں ہیں۔ تاجور بی بی کو منحوس اور پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تاجور کی وجہ سے بار بار ان کی عزت مٹی میں مل رہی ہے۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ تاجور گھر سے باہر قدم نہیں نکالے گی۔ اس کی امی اسے اپنے ساتھ کمرے میں سلا رہی ہیں۔''

''تاجور نے کیا کہا تھا کہ سیڑھیاں چڑھ کر کون بھاگا ہے؟''

''اس وچاری سے تو گل ہی نہیں کی جا رہی تھی۔ اس نے کہا کہ اسے کچھ پتا نہیں، وہ تو ٹھنڈ کی وجہ سے نیچے کمرے میں آ گئی تھی۔ بس اسی بات پر چوہدری جی نے اسے مارنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا ٹیلی فون بھی فرش پر مار کر توڑ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں سے نکل کر بھاگنے والا وہی منڈا ہے جو دو تین دفعہ پہلے بھی تاجور بی بی کے پیچھے یہاں آیا ہے۔''

''کون منڈا؟''

''وہی جو کچھ دن پہلے پولیس والوں سے لڑا تھا اور پھر اسے چوہدری جی نے تھپڑ مارے تھے۔''

میں سمجھ گیا کہ فردوس، انیق کی بات کر رہی ہے۔ شاید چوہدری دین محمد کا خیال تھا کہ اب شاہ زیب کے ''مرنے'' کے بعد اس کا دوست اس کی بیٹی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے غصے میں حق بجانب بھی لگتے تھے۔

فردوس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اللہ رسول کا واسطہ ہے۔ اس معاملے میں میرا نام کہیں نہ لینا۔ چوہدری جی کھڑے کھڑے میری گردن اتار دیں گے۔ انہوں نے مجھے بڑی سختی سے منع کیا ہوا ہے کہ اپنی زبان بند رکھوں۔''

میں نے اس حوالے سے فردوس کو تسلی دی اور اس سے وعدہ لیا کہ جب میں فون کروں گا تو وہ سنے گی۔

کیمرا بڑا زبردست کام کر رہا تھا۔ اب تک میں خود اس سے کام لیتا رہا تھا لیکن یہ آخری کام کیمرے نے خود ہی کر دکھایا تھا۔ ہاشو اور فردوس کو کیپچر کر لیا تھا۔ رات کو ایک بار پھر شازیہ کے محبوب اکبر سے فون پر بات ہوئی۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے بڑی پھرتی سے اپنے کام کو سنبھالا دیا تھا۔ مشینیں وغیرہ آ گئی تھیں۔ خالی بوتلیں اور سوڈا واٹر میں استعمال ہونے والے کیمیکلز بھی اس نے خرید کر لیے تھے۔ حالانکہ سیزن نہیں تھا مگر توقع تھی کہ اس کا کام چل پڑے گا۔

میں نے چوہدری بشیر کے قرضے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کام سجاول کے سپرد کیا تھا۔ قرض خواہ ٹھیکیدار افضل خان کی رہائش اسی قصبے کے پاس تھی جہاں سجاول آج کل نئی شادی شدہ زندگی کے خوشگوار دن گزار رہا تھا۔

سجاول نے فون پر مجھے بتایا۔ ''یونس نے ٹوہ لگا لی ہے۔ قرض تو واقعی اس چوہدری بشیر نے لیا تھا مگر یہ چھ لاکھ روپیا تھا۔ ٹھیکیدار نے سود پر سود لگا کر یہ رقم سولہ لاکھ تک پہنچا دی ہے۔''

''تو پھر؟''

''تم کہو تو وہ ہاتھ جوڑ کر سود معاف کر دے گا اور اللہ نے چاہا تو اصل زر بھی۔''

''یعنی تم اس کو اپنی سجاول والی جھلکی دکھاؤ گے لیکن یہ مجھے منظور نہیں۔ تم جو بنے ہوئے ہو وہی بنے رہو بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ ہمیشہ یہی رہو۔''

''ایسی بات نہیں ہے...... یہیں بیٹھے بیٹھے فیض محمد کی ڈوری ہلا دوں گا...... یا اور بھی کئی ڈوریاں ہیں۔ آسانی سے سارا کام ہو جائے گا۔''

''نہیں یار! اب شرافت کی طرف آئے ہیں تو بہتر ہے جہاں تک بس چلے شریف ہی رہیں۔ یونس کے ذریعے ٹھیکیدار پر بس اتنا دباؤ ڈالو کہ وہ رقم پر معقول منافع لے لے۔''

''بشیر کو کیا بتاؤ گے، ادھار چکانے کے بارے میں؟''

''بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس اسے یہی پتا چلے گا کہ کسی مخیر مالدار نے اس کی کسی پرانی نیکی کا بدلہ چکایا ہے اور خاموشی سے اس کا قرضہ ادا کر دیا ہے۔ مجھے کسی سے کوئی تمغا تو نہیں لینا ہے۔''

''تمہاری معشوقہ...... سوری...... سوری...... تمہاری دوست والے معاملے کی کیا صورت حال ہے؟''

''ابھی تو پیچا پڑا ہوا ہے۔ اگلے دو تین ہفتے بڑے اہم ہیں۔''

''بس کہیں بھی ضرورت ہو...... مجھے آواز دے لینی ہے۔''

''بے فکر رہو۔'' میں نے کہا۔

پس منظر میں خورشنہ اور اس کے بچے کی چہکاریں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں ہنسنے کھیلنے میں مصروف تھے۔ شاید ایک دوسرے کو پکڑ رہے تھے۔ خورشنہ کی دور افتادہ آواز آئی۔ ''شاہ زیب صاحب کو میرا اسلام کہیں۔''

''وہ سلام کہہ رہی ہے۔'' سجاول بھاری آواز میں بولا۔

''میں بھی سلام کہہ رہا ہوں، بلکہ سلامتی کہہ رہا ہوں۔ اللہ اس معصومہ کو تمہاری ساری کرختگیوں اور چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے فون بند کر دیا۔

فردوس سے بات ہوئے آج تیسرا چوتھا دن تھا۔ میں نے اسے کال کرنے کا ارادہ کیا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ امید تو کم ہی تھی کہ وہ فون سنے گی۔ مگر حیرت ہوئی، میری دوسری ہی بیل پر اس کی ڈری ہوئی آواز سنائی دے گئی۔ ''کک...... کون؟''

''ڈرائیور وقاص بات کر رہا ہوں۔''

''کیا بات ہے؟'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''بات تو تم نے بتانی ہے بلکہ باتیں بتانی ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں بڑی پریشان ہوں۔ ابھی تک جاگ رہی ہوں۔ یہاں گھر میں حالات بڑے خراب ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

وہ ذرا رک کر کہنے لگی۔ ''پرسوں چوہدری صاحب نئی گاڑی میں اپنے بھائی کے ساتھ لاہور گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے آٹھ دس دن کے اندر تاجور کے نکاح کا پروگرام بنا لیا ہے۔ خاموشی کے ساتھ پندرہ بیس لوگ آئیں گے اور نکاح ہو جائے گا۔ رخصتی بعد میں پوری تیاریوں کے ساتھ ہو گی۔''

میرے سینے میں دل کے بھاگتے گھوڑے کو جیسے ایڑ لگ گئی اور وہ کچھ اور بھی سرپٹ ہو گیا۔ ''آٹھ دس دن کے اندر نکاح؟ تمہیں کوئی غلطی تو نہیں لگ رہی فردوس؟''

''نہیں ڈرائیور بھائی! سب کچھ ایسا ہی ہے جیسے میں بتا رہی ہوں۔ اب...... تم بھول کر بھی اس طرف آنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب یہاں تین چار گارڈ بھی آ گئے ہیں۔ بڑے خطرناک لوگ لگتے ہیں۔ چنگا یہی ہے کہ تم چوہدری بشیر کی نوکری چھوڑ دو اور نکل جاؤ یہاں سے۔''

''تاکہ تمہاری جان بھی چھوٹ جائے۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''نہیں، نہیں۔ میں اپنے دل کی بات کر رہی ہوں۔ تم سے کوئی غلطی ہو گئی تو سچ کہہ رہی ہوں، جان چلی جائے گی تمہاری۔''

''جان دینے کے لیے ہی تو رکا ہوا ہوں یہاں۔'' میں نے کہا۔

''کسی ماں کے پُتر ہو تم۔ روگ نہ لگا دینا اپنے پیدا کرنے والوں کو۔'' اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

''اچھا، تم یہ ہمدردیاں چھوڑ دو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تاجور کی پوزیشن کیا ہے۔ کیا وہ راضی باضی ہے؟''

میرے سوال پر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوگئی پھر ہولے سے کہنے لگی۔ ''لڑکیوں کی اپنی مرضی کہاں ہوتی ہے۔ جہاں ماں باپ تو رد یں چلی جاتی ہیں۔ اندر کی باتوں کا مجھے زیادہ پتا نہیں ہے۔ ویسے لگتا ہے کہ وہ زیادہ خوش نہیں ہے۔ اسے ڈر آتا ہے ان بہت وڈے لوگوں سے۔''

میں جانتا تھا کہ تاجور اس وقت شدید ترین کشمکش سے دوچار ہوگی۔ میں ایک بار پھر زندہ سلامت اس کے سامنے موجود تھا اور اس بار اس نے میری آنکھوں کے رنگ بھی دیکھ لیے تھے۔ وہی رنگ جن میں ایک محبت بھری آزاد اور حسین زندگی کا اشارہ موجود تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس نے کبھی تم سے یا اپنی والدہ سے بات کی ہے؟''

''میں تو نوکرانی ہوں۔ میری اتنی حیثیت نہیں۔ پر مجھے لگتا ہے کہ وہ ماں کو اپنے دل کا حال بتاتی ہے۔ ماں دھی دونوں پریشان ہیں۔ بلکہ دونوں ماموں اور نانی وغیرہ بھی اس حق میں نہیں۔ ایک ماموں تو بات کرنے، لاہور سے یہاں آئے بھی تھے۔ پر گھر کے سربراہ تو چوہدری دین محمد ہیں۔ ان کے سامنے کسی کی پیش کہاں چل سکتی ہے۔ آج کل تو وہ ویسے بھی بڑے غصے والے ہوگئے ہیں۔''

''تم کہنا چاہتی ہو کہ تاجور کی طرح اس کی والدہ بھی ان وڈے لوگوں میں رشتے سے خوش نہیں ہیں؟''

''اندازہ تو یہی ہو رہا ہے مجھے۔ کل میں نے......'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

میں نے اسے ٹوکا۔ ''دیکھو فردوس! تم نے وعدہ کر رکھا ہے کہ جو کچھ تمہیں پتا چلے گا، مجھے بتاؤ گی۔ میں تمہیں پورا یقین دلاتا ہوں کہ کوئی میرے ٹوٹے بھی کر دے تو بھی تمہارا نام زبان پر نہیں لاؤں گا۔''

کچھ دیر تذبذب کے بعد وہ بولی۔ ''کل میں نے میاں جی اور تاجور کی امی کی کچھ باتیں سنی ہیں۔ میاں جی (دین محمد صاحب) بڑے غصے میں تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اب تاجور کی شادی ہوگی تو یہیں داراہیوں کے گھر میں ہوگی۔ نہیں تو میں اس کے ٹوٹے کر کے نہر میں پھینک دوں گا۔ میں نے قسم کھالی ہے۔ اب کسی صورت اس رشتے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ بہت لاڈ دیکھ لیے ہیں اس بدبخت کے۔ بہت مٹی ڈلوالی ہے سر میں۔ تاجور کی امی نے کچھ کہنا چاہا لیکن ان کو بھی سخت جھڑکیں پڑیں۔''

''اس کا مطلب ہے فردوس کہ دین محمد صاحب من مانی پر تلے ہوئے ہیں۔''

''من مانی تو کر رہے ہیں لیکن وہ بھی کیا کریں۔ لاہور والے وڈے لوگوں کو انکار کرنا ان کے بس میں بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی تاجور بی بی کی طرف سے کئی دکھ ملے ہیں میاں جی کو۔ اللہ کی مرضی ہے ورنہ وہ ایسی بھیڑی بھی نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''فردوس! اگر تم ایک بار کسی طرح میری ملاقات تاجور سے کرا دو تو میں تم سے ایک وعدہ کرتا ہوں۔ مردوں والا وعدہ...... وعدے سے پھر جاؤں تو کہنا کہ کسی لفنگے سے پالا پڑا تھا۔''

''تم کیا بات کر رہے ہو؟'' فردوس کی آواز ابھری۔

''اگر تم تاجور سے میری ایک ملاقات کرا دو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری اور ناشو والی وڈیو تمہارے سامنے صاف کر دوں گا۔ سچے دل سے صاف کر دوں گا۔''

''توبہ توبہ۔'' وہ بولی۔ ''آج کل بڑی سختی ہے تاجور بی بی پر۔ میاں جی تو مجھ کملی کھلوتی کی جان نکال لیں گے، نہ بابا نہ۔''

میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے بتایا کہ تاجور بی بی کا گھر سے نکلنا بالکل بند ہے۔ آخر میں اسے صرف اتنا منا سکا کہ وہ اپنے فون کے ذریعے تاجور سے میری بات کرانے کی کوشش کرے گی۔

میں نے کہا۔ ''اگر فون پر ہی بات کرانی ہے تو پھر ایک آدھ دن کے اندر ہی کراؤ۔''

وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''تاجور بی بی اب امی جی کے ساتھ ان کے کمرے میں سوتی ہے لیکن کل ڈسکے سے اس کی خالہ اور خالہ کی ساس آ رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر وہ آ گئیں تو تاجور بی بی کو میرے کمرے میں سونا پڑے گا۔ اگر ایسی بات ہوئی تو میں اس کی مرضی پوچھوں گی۔ اگر اس کی مرضی ہوئی تو وہ تم سے بات کر لے گی۔''

''صرف مرضی نہیں پوچھنی۔ اُسے راضی کرنا ہے۔ اسے بتانا کہ اگر اس نے بات نہیں کی تو ہو سکتا ہے کہ میں پہلے کی طرح دیوار کود کر اندر آ جاؤں بلکہ یہ بھی کہہ دینا کہ پھر بات بگڑ سکتی ہے۔''

''لیکن پھر تم روز روز یہی بات کہو گے۔''

''نہیں، یہ بھی وعدہ ہے۔ میں پھر اسے مجبور نہیں کروں گا۔ کم از کم تمہیں تو نہیں کہوں گا کہ اس سے بات کراؤ۔''

دوسرے روز رات کو ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سرد ہوا

سردیوں کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ گرم کپڑے نکل آئے تھے۔ رضائیوں نے بھی چارپائیوں پر جگہ بنالی تھی۔ رات دس بجے کے لگ بھگ فردوس کی کال آگئی۔ حاکم علی میں ایک بری عادت تھی۔ وہ سوتے ہوئے خراٹے لیتا تھا مگر اس کی یہ بری عادت میرے لیے فائدہ مند ثابت ہو جاتی تھی۔ اس کے ہلکے خراٹے مسلسل اس امر کی نشاندہی کرتے رہتے تھے کہ وہ سو رہا ہے۔ اس وقت بھی یہی صورت حال تھی۔

میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے فردوس کی آواز آئی۔ ''تاجور بی بی سے بات کرلو۔''

''ٹھیک ہے لیکن تم باہر چلی جاؤ تو زیادہ اچھے طریقے سے بات ہوسکے گی۔''

''میں گرم چادر لے کر چھت پر جا رہی ہوں۔ تم کرو بات۔'' فردوس نے کہا۔

پھر تاجور کی مترنم لیکن سہمی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''ہیلو آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''مجھے بڑا دکھ ہے تاجور کہ اس دن میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔ تمہارے اباجی اتنے غصے میں آگئے کہ انہوں نے تم پر ہاتھ اٹھایا۔''

''مجھے مار ہی ڈالتے تو اچھا تھا۔ میری جان تو چھوٹ جاتی اس روز روز کے مرنے سے۔'' اس کی آواز میں دکھ بول رہا تھا۔

''تاجور! زندگی بار بار نہیں ملتی اور شادی کا فیصلہ زندگی بھر کا ہوتا ہے.... میں چاہتا ہوں کہ تم یہ فیصلہ کسی مجبوری کے تحت نہ کرو۔'' میں اب اپنی اصل آواز میں بول رہا تھا۔

''مجھے کوئی مجبوری نہیں۔'' وہ عجیب انداز سے بولی۔ ''میں اپنے پیدا کرنے والوں کو اور دکھ نہیں دے سکتی۔''

''پیدا کرنے والوں کو یا صرف پیدا کرنے والے کو؟ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اباجی نے ضد پکڑی ہوئی ہے کہ وہ تمہیں ہر صورت اس دارابی کی ڈولی میں بٹھا کر چھوڑیں گے چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔''

''ان کا حق ہے مجھ پر۔ وہ میرے بارے میں ہر فیصلہ کر سکتے ہیں۔''

''کیا کسی اور کا تھوڑا سا بھی حق نہیں؟'' میں نے دل فگار آواز میں پوچھا۔

دوسری طرف خاموشی رہی پھر تاجور نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''جب اس کا وقت تھا شاہ زیب! آپ نے بس دور جانے والی باتیں ہی کیں۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب کچھ نہ کچھ ہو سکتا تھا مگر اب ایک بار پھر وقت ہمارے خلاف ہے۔ شاید...... ملنا ہماری قسمت میں نہیں ہے اور قسمت کا لکھا بھلا کون بدل سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''قسمت کا لکھا میں بدل سکتا ہوں...... اور تاجور بدل سکتی ہے اور ہر وہ شخص بدل سکتا ہے جو سچے دل سے پیار کرتا ہے اور کوشش پر یقین رکھتا ہے۔''

''میں کیا کروں شاہ زیب! میں آپ کو کیسے بتاؤں، آپ کو زندہ سلامت دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ لوگ خوشی کی وجہ سے مر بھی جاتے ہیں۔ مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ شاید میں مر جاؤں گی مگر اب جو حالات بن رہے ہیں، انہوں نے مجھے نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اباجی کسی صورت نہیں مانیں گے۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے اور شاید خود اپنی جان بھی لے لیں گے مگر اپنے ارادے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''

''تو پھر کیا تم بھی اکثر مشرقی لڑکیوں کی طرح ایک جھوٹی زندگی جینا چاہتی ہو؟''

''جھوٹی زندگی بھی جب جینا شروع کر دی جائے تو پھر آہستہ آہستہ سچی ہو ہی جاتی ہے۔''

''تاجور! یہ تو بڑے کمزور درجے کی محبت کرنے والے کرتے ہیں۔ کیا ہماری محبت ایسی ہی کمزور تھی؟''

''آپ اس محبت کی گہرائی کو نہیں جانتے۔'' وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

''تو پھر کیا تم میرا ہاتھ پکڑ کر، حالات کا سامنا کر سکتی ہو؟''

''اگر آپ یہی دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کا حکم مان سکتی ہوں یا نہیں، تو پھر مجھے مرنے کا حکم دیں، میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں، میں کل کا سورج نہیں دیکھوں گی اور یہ کوئی زبانی بات نہیں۔ میں اپنے ہر لفظ کے ساتھ کھڑی ہوں۔''

''میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا تاجور، میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں لیکن ان ''اونچی شان'' والے داراہیوں کی بہو بن کر بھی تم زندہ کہاں رہو گی۔ یہ بھی تو ایک مسلسل موت ہوگی اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالوں گا۔ کوئی ایسا راستہ جس سے تمہارے بڑوں کی عزت پر بھی کوئی حرف نہ آئے اور تم داراہیوں کی کسی عالی شان کوٹھی میں، بھاری گہنوں اور کپڑوں میں دفن ہونے سے بھی بچ جاؤ۔''

''کیا کریں گے آپ......کیا کر سکتے ہیں آپ؟''

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''فرض کرو تاجور، یہ

حرام زادہ دارج خود ہی کہیں دفع ہوجائے تو پھر؟''

''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

''یہ خود ہی تمہاری جان چھوڑ دے۔ تمہیں سونے کے پنجرے میں بند کرنے کا ارادہ ترک کردے؟''

وہ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''مجھے پتا ہے آپ اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ خود کو خطرے میں ڈال کر آپ ایسا کچھ کر سکتے ہیں لیکن اس میں بھی بدنامی ہماری ہی ہونی ہے۔ ہوسکتا ہے...... کہ...... اس کا الزام بھی گھوم پھر کر مجھ پر ہی آجائے۔''

''وہ کس طرح؟''

''آپ کو ہمارے گھر کے حالات کا کچھ علم نہیں۔ پرانی باتیں اباجی کے ذہن سے کسی صورت نہیں نکل رہیں۔ وہ انیق کے سلسلے میں بھی سخت پریشان ہیں۔ مجھے بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے بعد اب آپ کا دوست ان کی عزت مٹی میں ملانا چاہتا ہے، اگر آپ نے دارج کے ساتھ کچھ کیا تو......''

''تو کیا؟''

''اول تو یہ بہت ہی خطرناک کام ہوگا۔ اگر آپ کسی طرح کامیاب ہو بھی گئے تو کیا پتا اس کا الزام اباجی، انیق کو ہی دے ڈالیں اور اس طرح ساری بات پھر مجھ پر ہی آجائے۔ پلیز شاہ زیب! میں اب اور بے عزتی نہیں سہہ سکتی...... نہ ہی اباجی کو کسی تکلیف میں دیکھ سکتی ہوں۔''

میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ ''ایک کام اور ہو سکتا ہے تاجور! کیوں نہ اباجی کو ہی سمجھانے کی کوشش کی جائے...... انہیں حوصلہ دیا جائے کہ وہ دارابیوں کو انکار کر دیں۔''

''انکار تو وہ تب کریں جب وہ انہیں بُرا سمجھیں...... وہ تو بس ان حالات کو برا سمجھ رہے ہیں جو میں نے ان کے لیے پیدا کیے ہیں۔''

''مگر تاجور! انہیں دارابیوں کا سیاہ سفید تو بتایا جاسکتا ہے ناں، انہیں سمجھایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو کن جابر لوگوں کے حوالے کر رہے ہیں۔''

''کون سمجھائے گا انہیں اور کیسے؟''

''میں سمجھاؤں گا۔''

''آپ...... آپ کس طرح سمجھا سکتے ہیں...... لوگوں کی نظر میں تو آپ......''

''مر چکا ہوں لیکن ضروری تو نہیں کہ میں خود ہی ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاؤں۔ کسی ایسے شخص کو بھی ان کی طرف بھیجا جا سکتا ہے جو تمہاری امی اور تمہارے دیگر ننھیالیوں کی طرح اس رشتے کے خلاف ہو۔ مثلاً تمہارے بڑے ماموں جو عالمِ دین ہیں اور لاہور کی ایک بڑی مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں۔''

''آپ کو ان کے بارے میں کیسے پتا چلا؟''

''میں نے اپنے طور پر کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ کچھ دن پہلے یہاں سکھیرا میں آئے تھے اور انہوں نے تمہارے اباجی سے اس بارے میں بات کی تھی۔ دارابیوں کے رہن سہن کے بارے میں بہت کچھ سمجھایا بجھایا تھا۔''

''لیکن اس کا فائدہ کیا ہوا۔ وہ اور بھڑک اٹھے۔ ای سے بھی بہت لڑے۔'' پھر وہ ذرا رک کر بولی۔ ''مگر آپ کو یہ ساری باتیں کیسے پتا چلتی ہیں؟''

''کہتے ہیں تاجور، جہاں چاہ ہوتی ہے وہاں راہ ہوتی ہے۔ بس مجھے بھی تمہارے بارے میں خبر مل ہی جاتی ہے۔''

اتنے میں تاجور اچانک کچھ گھبرا گئی۔ سرگوشی میں بولی۔ ''ایک منٹ۔''

پھر شاید وہ آہٹ وغیرہ سننے کے لیے کمرے کے دروازے کی طرف چلی گئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''لگتا ہے کہ اباجی جاگ گئے ہیں۔ نیچے برآمدے میں گھوم رہے ہیں۔ اوپر بھی آسکتے ہیں۔ اب میں بند کر رہی ہوں۔''

''تاجور پلیز...... میری بات ختم نہیں ہوئی۔ کم از کم ایک دفعہ تم نے پھر بات کرنی ہے مجھ سے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اگر تم میرے ساتھ ہو تو میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا اور یہ ایسا راستہ ہوگا جس میں تمہاری عزت پر ذرا سا حرف بھی نہیں آئے گا۔''

''خدا حافظ۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے کچھ دیر بعد سجاول کو ''مسڈ کال'' دی...... رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ نیا نیا شادی شدہ ہوا تھا اس لیے براہِ راست فون کرنا مناسب نہیں سمجھا اگر وہ فرصت سے تھا تو رابطہ کر سکتا تھا۔ وہ فرصت سے ہی تھا۔ ایک منٹ بعد اس کی کال آگئی۔ ''ہاں شاہی، اتنی رات گئے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھ رہا ہے۔''

''ضروری مروڑ ہے۔ تمہیں تھوڑی سی تکلیف دینی ہے۔''

''شادی شدہ بندہ تو ویسے ہی تکلیف میں ہوتا ہے۔ تم نے اور کیا تکلیف دینی ہے؟''

''میں سنجیدہ ہوں یار، تم انیق سے رابطہ کرو، اور اسے ایک کام پر لگاؤ۔''

''کھل کر بات کرو۔''

''انیق بھی ان دارابیوں کے بہت خلاف ہے۔ میری ''موت'' کے بعد اور زیادہ ہوگیا ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ تاجور ان چنگیز خانوں کے شکنجے میں آئے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔ فون پر اس نے یہ بات کھل کر کہی تھی۔ اسے جتنا دکھ تمہارے ''مرنے'' کا ہے، اتنا ہی اس بات کا بھی ہے کہ تمہارے بعد دارابیوں نے تاجور کو تر نوالہ سمجھا ہوا ہے۔''

''اور یہ حقیقت بھی ہے لیکن ہم اسے تر نوالہ نہیں بننے دیں گے بلکہ ان لوگوں کو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔ تم اپنی طرف سے انیق کی ایک ڈیوٹی لگاؤ۔ وہ دیواروں میں در بنانے والا کریکٹر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دو چار دن میں اس خبیث دارج دارابی کی ایک دو دکھتی رگیں ڈھونڈ لے گا۔ ہمیں اس کے خلاف ایک بھی تگڑا سا پوائنٹ مل گیا تو صورتِ حال بدل سکتی ہے۔''

سجاول میری بات سمجھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر دس پندرہ منٹ بات ہوئی۔ میں نے سجاول سے یہ بھی کہا کہ جب انیق سے بات ہو تو اسے اپنی طرف سے خاص طور سے ہدایت کرنی ہے کہ وہ دوبارہ سکھیرا آنے سے اور کسی بھی طرح کی مہم جوئی کرنے سے باز رہے۔ سجاول کو کچھ ضروری مشورے دے کر اور پھر خورسنہ کی خیر خیریت دریافت کر کے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

مجھے انیق کی تیز طراری اور معاملہ فہمی پر پورا بھروسا تھا (لیکن میں ابھی کسی طور بھی اس کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا) سجاول نے اپنے طور پر اس سے رابطہ کیا اور وہ اپنے کام میں لگ گیا۔

ایک روز چوہدری بشیر کے آرڈر پر میں شفقت بی بی، ان کی بڑی بیٹی شازیہ اور سب سے چھوٹی ارم کو لے کر قریبی گاؤں مہرا پور گیا۔ یہی گاؤں شفقت بی بی کا میکا بھی تھا۔ ان کا دل اپنی بچپن کی سہیلیوں اور دیگر لوگوں سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ سیف کی موت کا غم تو شفقت بی بی کی آنکھوں میں ایک بھاری چٹان کی طرح ٹھہرا ہوا تھا مگر ویسے ان کی طبیعت کچھ بہتر نظر آتی تھی۔ شازیہ نے بتایا کہ وہ کھا پی بھی رہی ہیں۔ راستے میں وہ بڑی اپنائیت کے ساتھ مجھے ''پتر'' کہہ کر باتیں کرتی رہیں۔ ''کسی چنگی ماں کی اولاد ہو تم...... ہمارے لیے اب تم ڈرائیور نہیں ہو۔ گھر کے جی بن گئے ہو۔ پتا نہیں کیوں تمہیں دیکھتی ہوں تو سیف کی یاد آتی ہے۔''

میرے دل پر تیر سا لگا۔ میں نے دل میں سوچا۔ سیف کے قاتل کو دیکھ کر سیف کی یاد نہ آئے گی تو کیا ہوگا۔

شفقت بی بی نے کہا۔ ''پتر! کسی دن اپنے بال بچوں کو لا یہاں۔ ان سے بھی ملیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''ماں جی! آپ کو بتایا ہے ناں کہ بھائیوں میں جھگڑا ہے۔ میں گھر گیا تو پھر کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ ابھی دو چار مہینے دور رہ کر ہی گزارنا چاہتا ہوں۔''

وہ صلح صفائی اور پیار محبت پر زور دینے لگیں۔ پھر سیف کو یاد کرنے لگیں اور اس کی باتیں سنانے لگیں۔ ان کی آواز بوجھل ہونے لگی۔ شازیہ نے بڑی صفائی سے موضوع بدل دیا۔

گاڑی نیم پختہ راستوں پر دھول اُڑاتی چلتی رہی۔ جلد ہی ہمیں مہرا پور گاؤں کے آثار نظر آنے لگے۔ یہی شازیہ کے محبوب اکبر کا گاؤں بھی تھا۔ گاؤں سے باہر ہی پکی سڑک کے کنارے وہ چھوٹا سا پختہ کارخانہ نظر آرہا تھا جہاں اکبر نے کولڈ ڈرنک بنانے کا کام شروع کیا تھا۔

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ شازیہ اپنے اُڑتے بالوں کو سنبھال رہی تھی اور تعریفی نظروں سے اس کارخانے کو بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آس امید کی روشنی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس سلسلے میں، میں نے اکبر کی مدد کی ہے۔ شفقت بی بی گاڑی کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بولیں۔ ''یہ شاید کسی نے چھوٹی سی فیکٹری بنائی ہے۔''

''ہاں ماں جی، بوتلیں وغیرہ بنانے کا کارخانہ ہے۔ لگتا ہے کہ کسی پڑھے لکھے لڑکے نے کاشت کاری کرنے کے بجائے نئی لائن شروع کی ہے۔'' میں نے کہا۔

''چلو اللہ اُسے کامیاب کرے۔ رب سوہنا ہر ماں کا کلیجا ٹھنڈا رکھے۔ کسی کو اولاد کا دکھ اور پریشانی نہ دکھائے۔'' ان کی آواز پھر بھرانا شروع ہوگئی۔

شازیہ نے کہا۔ ''امی جی! تھوڑا سا جوس پی لیں۔''

وہ انہیں جوس پلانے لگی۔ ان کی حالت بہت اچھی نہیں تو بری بھی نہیں تھی۔ انہیں باتیں کرتے اور چلتے پھرتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔

گاؤں سے ہم سہ پہر کے وقت واپس سکھیرا روانہ ہو گئے۔ راستے میں شازیہ کی چھوٹی بہن کا فون آگیا۔ وہ گھر سے بول رہی تھی۔ دونوں بہنوں کے درمیان ہونے والی

گفتگو سے پتا چلا کہ چھوٹی بہن شازیہ کو کسی خوش خبری کا بتا رہی ہے اور یہ خوش خبری وہی تھی جس کا انتظام میں نے سجاول سے مل کر چند دن پہلے کیا تھا۔ خستہ حال چوہدری بشیر کا قرضہ بڑی خاموشی سے ادا ہو گیا تھا۔ سجاول کے ساتھی یونس نے اسٹامپ پیپر پر اقرار نامہ وغیرہ لکھوا کر چوہدری بشیر کو ارسال کر دیا تھا۔ اب یہ اقرار نامہ ہی تھا جس نے اس گھر میں خوشی کی لہر دوڑائی تھی۔

شازیہ نے فون پر لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''لیکن...... کتنی عجیب بات ہے۔ اباجی کو بھی پتا نہیں کہ ٹھیکیدار کو رقم واپس دینے والا کون ہے؟''

جواب میں چھوٹی بہن نازو کی باریک آواز فون کے اسپیکر سے نکل کر سنائی دی۔ ''لگتا ہے کہ اباجی کا کوئی پرانا جاننے والا ہے۔ شاید اباجی نے کبھی کوئی احسان کیا ہے اس پر جس کا اس نے بدلہ اتارا ہے۔ اصل بات تو اباجی کو ہی پتا ہوگی۔''

شفقت بی بی نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''شازیہ! کیا بات کر رہی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟''

وہ ماں سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''امی جی! گھر جا کر بتاتی ہوں۔ اچھی خبر ہی ہے۔''

میں لاتعلق بیٹھا، ڈرائیو کرتا رہا۔ ہم گاؤں میں داخل ہونے والے تھے۔ شازیہ بدستور جذباتی لہجے میں چھوٹی بہن سے باتیں کر رہی تھی۔

اس گھرانے کو خوش دیکھ کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا اور یہی میرا مقصد تھا۔ رات تک سب کچھ ٹھیک تھا مگر صبح شفقت بی بی کے بارے میں پتا چلا کہ وہ چل بسی ہیں۔

ہاشو کی بہن انوری نے مجھے جھنجوڑ کر یہ خبر سنائی۔ میں کتنی ہی دیر سکتہ زدہ رہا۔ دنیا میں ہر آنے والے انسان کو ایک دن تو جانا ہی ہوتا ہے مگر کچھ موتیں دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔ ''کیا ہوا اُن کو؟'' میں نے انوری سے پوچھا۔

وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''شازیہ نے صبح اٹھ کر ساتھ والے بستر پر دیکھا تو وہ نہیں تھیں۔ وہ اللہ بخشے سیف والے کمرے میں تھیں۔ سیف کی چیزیں صندوق سے نکال نکال کر اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ اس کی ایک چادر پر لیٹی تھیں اور گزر چکی تھیں۔''

''او گاڈ۔'' میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

گھر میں رونا دھونا مچا ہوا تھا۔ لوگ اُمڈے آ رہے تھے۔ حاکم علی نے رقت زدہ آواز میں کہا۔ ''بڑی نیک بی بی تھیں۔ بس پُتر کا دکھ کھا گیا ان کو۔ اللہ ماں پُتر دونوں کی بخشش کرے۔''

ہاشو نے کچھ مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''بچیوں نے انہیں سیف والے کمرے میں جانے سے منع کیا ہوا تھا، پر رات کو وہ پتا نہیں کیسے تالا کھول کر چلی گئیں۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ پورے کمرے میں سیف صاحب کی چیزیں پڑی تھیں۔ ان کے کپڑے، ان کا ریڈیو، گھڑی، ان کے کبڈی والے کپ...... اور پتا نہیں کیا کچھ۔ سیف کی کالی چادر کے اوپر ہی لیٹی ہوئی تھیں، قبلے کی طرف منہ کر کے، جیسے پتر سے ملنے جا رہی ہوں۔''

میرے سینے سے ہوک اٹھی اور سیف کا مسکراتا چہرہ ایک بار پھر نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ رنگ رنگیلا پنجابی گبرو جس کے انگ انگ میں زندگی لشکارے مارتی تھی...... وہ جوش اور جذباتیت کا شکار ہو کر ایک انہونی کے تعاقب میں چل نکلا اور آخر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے واپس آنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ دن قیامت صغریٰ کی مثال ہی تھا جب سمندر کے کنارے نیم بے ہوش سیف نے میری طرف دیکھا تھا اور کہا تھا...... ''آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟''

اس وقت میرا دل میرے سینے میں پھٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ میں اُسے کیسے بتاتا کہ میں ناراض نہیں ہوں...... لیکن ہم دونوں موت کے راہی بن چکے ہیں اور میں اسے بے پناہ اذیت سے چھٹکارا دلانے کے لیے زہر دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اب وہ کبھی اپنے گھر کی طرف اور اپنی منتظر ماں کی طرف نہیں لوٹ سکے گا۔

میں نے یورپ میں جو ہنگامہ خیز زندگی گزاری تھی، اس میں درجنوں سنگین ترین مرحلے آئے تھے۔ کئی لوگوں نے مجھے مارنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ نتیجے میں کئی لوگوں کو میں نے بھی موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ان سب کے چہرے اور نام بھی مجھے یاد نہیں تھے مگر سیف کی موت نے مجھے بنیادوں سے ہلایا تھا اور سینے پر اس کی جدائی کا گھاؤ بہت گہرا تھا۔

گلی میں شامیانے لگا دیے گئے تھے۔ عورتیں ٹولیوں کی شکل میں آتی تھیں اور چوہدری بشیر کے گھر میں داخل ہو جاتی تھیں۔ مردوں میں سے زیادہ تر باہر بچھی دریوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ کچھ چوہدری بشیر کے گلے لگ کر روتے تھے یا افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ میں نے چند عورتوں میں لپٹی لپٹائی تاجور کو بھی دیکھا۔ سیاہ اوڑھنی کے نقاب میں سے فقط

اس کی اشک بار آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کی نگاہ ایک لمحے کے لیے مجھ سے ملی پھر وہ عورتوں کے ہجوم میں گم ہوگئی۔

میں اُن کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ چوہدری بشیر سے پوچھا تو انکار نہیں ہوا۔ چند رشتہ دار لڑکے اندر گئے تو میں بھی چلا گیا۔ شفقت بی بی اپنے اُجلے چہرے کے ساتھ مطمئن لیٹی تھیں۔ آنکھوں میں ہلکی سی درز تھی۔ جیسے مرتے مرتے بھی اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔

میں سوچنے لگا...... ماں اور بچے کی محبت کیا ہوتی ہے۔ بچہ پچاس ساٹھ یا ستّر برس کا بھی ہوجائے تو ماں کے لیے بچہ ہی ہوتا ہے۔ وہ اس کی چھوٹی سی تکلیف پر تڑپ جاتی ہے۔ یہ مائیں کیوں ہوتی ہیں ایسی؟ قدرت نے اتنا درد، اتنا گداز کیوں چھپایا ہوتا ہے ان کے سینوں میں؟ کیوں جوان اولاد کی موت کے بعد وہ خود بھی زندگی کو بوجھ سمجھنے لگتی ہیں۔

شام کو بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی شفقت بی بی کے جنازے میں شریک تھا۔ غیر ہونے کے باوجود میں نے ایک قریبی عزیز کی طرح ان کی چارپائی کو کندھا بھی دیا۔ وہ آسودۂ خاک ہوگئیں۔ زندگی کے سارے جھمٹوں سے ان کی جان چھوٹ گئی۔ رات کو ڈیرے پر دیر تک ان کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہاشو اس کی بیوی رخشندہ، الوری، حاکم علی سب موجود تھے۔

الوری نے سوگوار لہجے میں کہا۔ ''شازیہ بتارہی تھی۔ پرسوں سے بڑی بے چین تھیں وہ۔ کہتی تھیں میں نے اپنے سیف کی ڈھیری (قبر) دیکھنی ہے۔ چوہدری جی نے اور لڑکیوں نے بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ اس کی قبر بہت دور ہے۔ ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے۔''

رخشندہ بولی۔ ''ہاں یہی بات ایک دن مجھ سے بھی کہہ رہی تھیں۔ بڑبڑا رہی تھیں۔ میرے سیفی کو کہاں چھوڑ آئے ہیں، کیا پتا وہ ابھی زندہ ہی ہو۔ کہیں پھنسا ہوا ہو۔ مجھے اس کی قبر بھی تو نہیں دکھاتے۔ جب تک قبر نہ دیکھ لوں گی مجھے چین نہیں آئے گا۔''

الوری نے کہا۔ ''پرسوں سے کہہ رہی تھیں۔ وہ اکیلا ہے۔ وہ مجھے بلاتا ہے۔ آوازیں دیتا ہے، مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔''

باتیں ہوتی رہیں لیکن میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور کمبل سر تک تان کر لیٹ گیا۔ عجیب سے دکھ آمیز پچھتاوے دل و دماغ کو گھیر رہے تھے۔ میں نے کیوں زہر دیا اُسے؟ کیوں تھوڑی دیر اور انتظار نہ کرلیا۔ شاید اس کے بچنے کی کوئی سبیل نکل آتی؟

مگر پھر دل کے اندر سے ہی آواز آئی کہ اس کا بچنا محال تھا۔ اس وقت جاجا جی کا قصائی لوبنگ اور اس کے ماتحت وحشی ہو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کیپٹن تبارک کے بعد سیف بھی تشدد سے مرگیا تو کوئی بات نہیں۔ میں ابھی باقی تھا اور میں ان کے لیے ترپ کا پتا تھا۔ میں اگر ناقابلِ بیان تشدد کے باوجود زندہ رہا تو اس کی یہی وجہ تھی کہ میری شکل میں ان کے پاس آخری سراغ تھا۔ انہوں نے ٹمپر بچر سیل میں مجھے زندگی اور موت کے درمیان تو لٹکائے رکھا مگر مارا نہیں۔

☆☆☆

تیسرے چوتھے روز کی بات ہے، سجاول کی دبے دبے جوش والی آواز میرے موبائل پر گونجی۔ ''اوئے شاہی، یہ کیا چیز پال رکھی ہے تونے۔ مجھے تو تیرا یہ کوشہزادہ کسی جن کا بچہ لگتا ہے...... اور کچھ بھی ایسا جو حمل کے ساتویں مہینے میں ہی پیدا ہوجاتا ہے۔ قربان جاؤں اس کی پھرتیوں کے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ نو مہینے والا حمل پتا نہیں جنوں میں ہوتا بھی ہے یا نہیں، خیر چھوڑو اِن الٹی مثالوں کو۔ تم بات بتاؤ۔''

''اس نے ایک ہی ہفتے میں تمہارے کام کی ایک دو چیزیں ڈھونڈ لی ہیں...... ایک وڈیو ہے...... دو تین کاغذ ہیں...... دو چار تصویریں بھی ہیں شاید تمہارے کام آجائیں۔''

''وڈیو کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں خود یہاں آنا پڑے گا۔ خورسنہ بھی تم سے ملنا چاہ رہی ہے۔ اس نے پاکستانی کھانا بنانا سیکھا ہے اور تمہیں اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلانا چاہتی ہے۔''

''یہاں میری ڈیوٹی سخت ہے...... لیکن چلو...... کوئی وقت نکالتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اسی روز میں نے چوہدری بشیر سے ایک روز کی چھٹی مانگی اور اس قصبے کی طرف روانہ ہوگیا جہاں ماضی قریب کا بے رحم ڈکیت ایک حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا شکار ہوکر ایک نئے روپ میں ایک نئے انداز کے شب و روز گزار رہا تھا۔ میرا اپنا بھی دل چاہ رہا تھا کہ ان دونوں سے ملوں اور دیکھوں کہ وہ مجھے کس حد تک پہچان پاتے ہیں۔ ہاشو کے پاس ایک موٹر سائیکل تھی جو اس کی ''پیاری بیوی'' کے بھائیوں نے اسے گفٹ کر رکھی تھی۔ ہاشو سے موٹر سائیکل ادھار لے کر میں سکھیرا سے روانہ ہوا اور قصبے میں پہنچ گیا۔ اس سفر میں مجھے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

میں شلوار قمیص میں تھا۔ گرد و غبار سے بچنے کے لیے سر پر ڈبے دار صافہ بھی باندھ رکھا تھا۔ ایک ہلکی سی شال، شانوں پر تھی۔ یہ صبح ساڑھے آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ سجاول کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ میں مقررہ وقت سے قریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے ہی سجاول کے دولت خانے پر پہنچ گیا تھا لیکن ابھی گھر کے اندر جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے گھر سے کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل بڑے اسٹینڈ پر کھڑی کی اور اس پر بیٹھ گیا۔ یہ قصبے کی ایک بارونق جگہ تھی۔ دائیں طرف رہائشی مکانات تھے، بائیں جانب ایک بازار تھا۔ کہیں پاس ہی کسی چائے خانے سے ناشتے کی خوشبو آرہی تھی۔

مجھے پتا تھا کہ ابھی کچھ دیر میں سجاول گھر سے باہر نکلے گا۔ وہ ناشتا بازار سے ہی لیتا تھا۔ مجھے موٹر سائیکل پر بیٹھے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہٹا کٹا سجاول، پینٹ شرٹ اور سویٹر میں ملبوس باہر نکلا۔ اس نے چپل پہن رکھی تھی۔ وہ میرے قریب سے گزر کر ایک حلوہ پوری والے کے پاس چلا گیا اور بھاری بھرکم ناشتا شاپر میں ڈلوایا۔ واپس گھر کی طرف آتے ہوئے وہ ذرا ٹھٹک کر ایک ریڑھی کے پاس رک گیا۔ ریڑھی پر پیاز اور لہسن وغیرہ کا ڈھیر تھا۔ ''آؤ پہلوان جی۔'' ریڑھی والے نے ہاتھ اٹھا کر سجاول کو سلام کیا۔

سجاول پیاز چھانٹ چھانٹ کر شاپر میں ڈالنے لگا۔ میرا دل مسکرانے کو چاہ رہا تھا۔ کل کا نامور مجرم اور خطرناک ڈکیت جس کی دہشت سے لوگوں کے پسینے چھوٹ جاتے تھے، آج گھر گرہستی کے لیے ایک ریڑھی سے پیاز اور لہسن خرید کر رہا تھا۔ پیاز اور لہسن تلوا کر سجاول نے اپنی جہازی سائز کی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سبزی فروش کو ادائیگی کی۔ نوٹ ذرا بڑا تھا۔ سبزی فروش نوٹ تڑوانے کے لیے پاس والے جنرل اسٹور کی طرف گیا۔ اب سجاول اکیلا ریڑھی کے پاس کھڑا تھا۔ میرا موڈ ذرا شرارتی ہوگیا۔ میں نے ریڑھی پر جا کر کہا۔ ''ہاں بھئی...... کیا بھاؤ دے رہے ہو یہ سڑے ہوئے پیاز؟''

سجاول نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''ریڑھی والا اُدھر گیا ہے۔'' اس نے جنرل اسٹور کی طرف اشارہ کر کے بھنّائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اوہ پتا نہیں چلا...... ویسے شکل تو تمہاری بھی......''

میں کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

اس مرتبہ سجاول نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے قہرناک انداز میں مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ اپنے طوفانی مُکّے سے میرے جبڑے کو چکنا چور کردے گا لیکن پھر اس نے صبر کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اس دوران میں ریڑھی والا بھی آگیا تھا۔ ''لو پہلوان جی۔'' اس نے سجاول سیالکوٹی کو بتایا تھمایا۔

سجاول نے باقاعدہ اپنا غصہ زمین پر تھوکا اور دونوں شاپر زلے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ ہاں یہ وہی سیالکوٹی تھا جو نگاہوں نگاہوں میں بندے کا خون پی جاتا تھا۔ ایک دلکش عورت کی محبت نے اور محبت کی گہرائی نے اسے کس قدر بدل ڈالا تھا۔ ریڑھی سے آٹھ دس قدم دور جا کر اس نے مڑ کر مجھے دیکھا...... وہ رک سا گیا تھا۔ میں دھیمے قدموں سے اس کی طرف بڑھا اور عین سامنے پہنچ کر بولا۔ ''جو مجھے اس طرح گھورتے ہیں میں ان کے ڈیلے نکال لیا کرتا ہوں۔''

سجاول کے چہرے کا رنگ پہلے پھیکا ہوا...... پھر سرخ ہوا۔ وہ بڑی توجہ سے مجھے دیکھتا چلا جارہا تھا۔ تب اس کی آنکھوں میں ایک مختلف چمک نمودار ہونا شروع ہوئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کی یلغار سی ہونے لگی۔ وہ مجھے پہچاننے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ ہاں آنکھوں کی ایک اپنی ساخت اور شناخت ہوتی ہے۔ وہ میری آنکھوں میں ہی دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے اپنے شاپرز ایک طرف چبوترے پر رکھ دیے اور میری طرف اپنی انگلی اٹھائی۔ ''تم...... تم......'' وہ لرزاں آواز میں اتنا ہی کہہ سکا۔

''ہاں...... میں شاہ زیب ہی ہوں سیالکوٹی صاحب۔'' میں نے اصل آواز میں کہا۔

ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے۔ ''تم نے تو واقعی کھو پڑا گھما دیا۔'' وہ بولا۔

میں گھر میں خورسنہ کی بھی ایسی ہی آزمائش کرنا چاہتا تھا مگر وہ پہلے ہی جان گئی۔ جب میں اور سجاول بغل گیر ہوئے وہ تیس چالیس میٹر دور اپنے گھر کی ادھ کھلی کھڑکی سے ہمیں دیکھ چکی تھی۔

وہ بڑی گرمجوشی لیکن مؤدبانہ انداز میں مجھ سے ملی۔ اس نے حسبِ سابق میری چادر کے پلّو کو بوسہ دیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

''ایسا نہ کیا کرو خورسنہ، مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

”لیکن مجھے یہ اچھا لگتا ہے جی۔ آپ ہمارے لیے ہیرو ہو، آپ کی تصویر ہمارے شہر کی دیواروں پر ہی نہیں ہمارے دلوں پر بھی لگی ہے۔“

”اس کا بس چلے تو تمہارا کوئی بت وغیرہ بنا کر یہاں رکھ لے۔“ سجاول نے پاٹ دار آواز میں کہا۔

”دیکھو خورسنہ، تمہارے اصل ہیرو کو تکلیف ہوئی ہے۔“

اس نے پیار سے سجاول کی طرف دیکھا اور غیر ملکی لہجے کی اردو میں بولی۔ ”یہ میری زندگی اور میرے دل کے ہیرو ہیں۔ آپ ہمارے جاماجی کے ہیرو ہیں اور اُن سپنوں کے ہیرو ہیں جو ہم جاماجی والے دیکھتے ہیں۔“

”تھینک یو۔“ میں نے کہا پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔ ”ذیشان کہاں ہے؟“

”ابھی سو رہا ہے۔“ سجاول نے کہا۔ ”یہ خورسنہ اپنے ساتھ کافی سارا جاماجی بھی پاکستان لے آئی ہے۔ کئی چھوٹی رسمیں ہیں۔ یہ کہتی ہے کہ اگر مرد بدھ کے روز رات کو دیر تک جاگے اور صبح کو دیر تک سوئے تو اس کی یادداشت بہت اچھی ہو جاتی ہے۔“

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور بولی۔ ”اور یہ سجاول میری بات نہیں مانتے، اس لیے ان کی یادداشت بالکل اچھی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”آج بدھ نہیں ہے۔ ذیشان ویسے ہی دیر تک سو رہا ہے۔“

اس مرتبہ خورسنہ کے ساتھ میں بھی ہنس دیا۔ میں نے اس طویل عرصے میں پہلی بار سجاول کے چہرے پر بھی غیر محسوس سی مسکان دیکھی۔

میری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ یہ سجاول کی بے پناہ محبت ہی تھی کہ اس تھوڑے سے عرصے میں خورسنہ بڑا اچھا مقامی پلاؤ اور قورما وغیرہ بنانا سیکھ گئی تھی۔ وہ پہلے سے کچھ اور بھی نکھر گئی تھی۔ جاماجی جزیرے کا ایک خوشنما پودا یہاں لالہ موسیٰ کی زمین پر لہلہا رہا تھا۔ خوبرو ذیشان سے بھی دلچسپ ملاقات رہی۔

میں یہاں جس مقصد کے لیے آیا تھا، وہ میری توقع کے عین مطابق پورا ہوا بلکہ شاید توقع سے تھوڑا بڑھ کر۔ بند کمرے میں سجاول نے مجھے وہ ثبوت دکھائے جو اسے انیق نے دارابی دارج کے خلاف مہیا کیے تھے۔ سب سے پہلے ایک اچھے موبائل فون پر بنائی جانے والی ایک وڈیو تھی۔ یہ لاہور ہی کا کوئی فارم ہاؤس تھا۔ جہاں نائٹ لوش کی ایک نجی تقریب برپا تھی۔ پتا نہیں کہ انیق یہاں کیونکر اور کیسے داخل ہوا۔ وڈیو کلپ میں گھریلو خواتین رقص کر رہی تھیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین میں سے بھی کچھ ڈرنک فرما رہی تھیں۔ دارج صاف طور پر دھت نظر آتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلاس دوسرے میں سگریٹ تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے بیش قیمت سیل فون سے چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ تب نہایت بے ہودہ لباس میں ایک لڑکی جو غالباً کوئی ماڈل گرل تھی، اس کے پاس آ کر مسکرائی۔ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ رقص کرنے لگا اور ساتھ ساتھ سیل فون پر کسی سے بات بھی کرنے لگا۔

یہ اس دارج دارابی کا اصل چہرہ تھا جو عوامی تقریبات میں شرافت کا پتلا نظر آتا تھا اور پیروں فقیروں کے مزار وں پر حاضریاں دے کر اپنا شریفانہ تشخص ابھارتا تھا۔

انیق کے فراہم کردہ مواد میں چند تصویریں بھی تھیں اور یہ بھی دراج کی آزاد طبع اور رنگین مزاجی کو ظاہر کرتی تھیں۔ سب سے اہم چیز وہ چند کاغذات تھے جو انیق نے جانے کیسے حاصل کیے تھے۔ ان میں تین چار میڈیکل رپورٹس تھیں اس کے علاوہ ایک پرانی ایف آئی آر کی کاپی تھی۔ ان کاغذات سے پتا چلتا تھا کہ تین ساڑھے تین سال قبل دارج نے اپنے گھر کی ہی دو جوان ملازماؤں سے ناجائز تعلقات رکھے تھے۔ یہ دونوں آپس میں سگی بہنیں تھیں۔ یکے بعد دیگرے دونوں ہی حاملہ ہوئی تھیں اور پھر لاہور ہی کے ایک اسپتال میں ان کا اباشن ہوا تھا۔ اس حوالے سے لڑکیوں کا دادا کسی طرح دارج کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر بعد میں اس سارے معاملے کو ہی دبا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

میں سکھیرا میں اپنے ٹھکانے پر واپس آ چکا تھا۔ کچھ ایسی اطلاع بھی مل رہی تھی کہ دارج دارابی سے تاجور کا نکاح چند دن کے لیے ٹل گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ شفقت بی بی ... کی توحید گی بھی تھی۔ بہرحال انیق کے ذریعے سجاول نے جو اہم مواد حاصل کیا تھا، وہ بھی اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔ اس مواد کی مکمل نقل میرے پاس موجود تھی اور اصل مواد سجاول کے کارندے یونس کے ذریعے لاہور پہنچ گیا تھا۔ یہ مواد اب تاجور کے بڑے ماموں مولوی حبیب اللہ کے پاس تھا جو باقاعدہ ایک عالم دین اور پیش امام تھے۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ مولوی جی پہلے ہی اس بات کے خلاف ہیں کہ تاجور کا رشتہ اتنے بڑے خاندان میں

اور ایسے دبنگ لوگوں سے کیا جائے، ان کو یقین تھا کہ یہ بے جوڑ رشتہ مستقبل میں بے انتہا خرابیوں اور پریشانیوں کا سبب بنے گا۔ اب یہ مواد ملنے کے بعد ان کی اور ان کے ہمنواؤں کی آواز میں مزید طاقت آ سکتی تھی۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ میں لوڈر پر سبزی منڈی سے واپس آیا تو ہاشو کی بہن انوری نے مجھے ایک بریکنگ نیوز سنائی۔ اس نے کہا۔ ”وقاص! کچھ پتا چلا تمہیں، رات کو چوہدری دین محمد کے گھر کیا ہوا؟“

”کیا ہوا؟“

”بڑا سخت جھگڑا ہوا۔ دین محمد اپنی دھی کا رشتہ لاہور کے وڈے لوگوں میں کر رہا ہے پر کڑی کے ماموں اور نانی وغیرہ اس کے سخت خلاف ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہوگا شاید، تاجور کے وڈے ماماجی لاہور کی ایک وڈی مسجد میں پیش امام ہیں اور ایک مانے ہوئے عالم بھی ہیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

انوری بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”کل رات مولوی جی اور دو تین اور لوگ گاؤں آئے تھے۔ انہوں نے چوہدری دین محمد کو ایک بار پھر ان کے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے مگر دین محمد اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ لوہے کا بن گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سارا پاکستان بھی خلاف ہو جائے مگر تاجور کا رشتہ وہیں پر ہوگا۔“

”تاجور کی ماں کس طرف کی بات کرتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی اس رشتے کے سخت خلاف ہے مگر اس وچاری کی پیش کہاں چلتی ہے۔ سنا ہے کل رات والے جھگڑے میں تو اسے دین محمد نے ایک دو چپیڑیں بھی ماری ہیں۔ اس کے بعد بات اور بڑھ گئی۔ مولوی صاحب نے کہا ہے کہ وہ خاندان کے سارے وڈوں کا اکٹھ کریں گے اور پھر بھی بات نہ بنی تو پنچایت بلائیں گے۔“

بات میری سمجھ میں آ رہی تھی، جو ثبوت مولوی حبیب صاحب کے پاس پہنچے تھے یقیناً انہوں نے اپنا اثر دکھایا تھا۔

انوری بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مجھے دوسرے ذریعوں سے بھی پتا چلا کہ مولوی جی واپس لاہور نہیں گئے۔ یہیں پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اب وہ اس بات کو کسی کنارے پر ہی لگا کر جائیں گے۔ اگلے روز میں نے ان کی ایک جھلک بھی دیکھی۔ وہ مسجد سے باہر تشریف لا رہے تھے۔ جسم تھوڑا سا فربہ تھا مگر بلند قامت کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتا تھا۔ داڑھی میں زیادہ تر بال سفید تھے۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھے اور بارعب نظر آتے تھے۔

اسی روز رات کو چوہدری دین محمد کے گھر میں خاندان کے کئی لوگ اکٹھے ہوئے۔ (یہ بات اب ہرگز راز نہیں رہی تھی کہ چاند گڑھی کا چوہدری دین محمد خاموشی سے یہاں سکھیرا آ کر آباد ہو گیا ہے اور دین محمد کو اب یہ راز کھلنے کی زیادہ پریشانی بھی نہیں تھی۔ دارابی خاندان اس کی ”بیک“ پر آ چکا تھا۔ عالمگیر اور پیر ولایت جیسے چھوٹے دشمن اب اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے) گھر میں ہونے والی بات چیت کا نتیجہ ایک بار پھر جھگڑے کی صورت میں ہی نکلا۔ میں نے ہاشو سے ٹوہ لی تو اس نے بتایا۔ ”چن جی! وہاں لمبا ہی بکھیڑا پڑا ہوا ہے۔ پتا چلا ہے کہ مولوی حبیب جی نے دین محمد صاحب کے ہونے والے داماد کے بارے میں کچھ خاص باتیں ”اکٹھ“ میں بتائی ہیں۔“

”کس طرح کی باتیں؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”یار! وہی باتیں جو ان وڈے لوگوں کی ہوتی ہیں بلکہ یہ تو بہت ہی وڈے لوگ ہیں۔ ان کی باتیں بھی بہت وڈی ہیں۔ عیش عشرت، عیاشی اور بھنڈے بازیاں، مجھے تو لگتا ہے کہ مولوی جی اپنے آپ کو کسی وڈی مصیبت میں ڈال لیں گے، ان کو اس طرح ان دارابیوں کے خلاف نہیں بولنا چاہیے۔“

”اب نتیجہ کیا نکلا ہے؟“

”ابھی تو کل بات چل رہی ہے۔ مولوی جی اور ان کے حمایتی جو بات کر رہے ہیں، وہ ہے تو سولہ آنے ٹھیک مگر ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے بھی جگرا چاہیے۔“

ہاشو جو...... مولوی جی کو خطرے والی بات کہہ رہا تھا، اس میں بہت وزن تھا اور اس کا ثبوت تیسرے چوتھے روز ہی مل گیا۔

ناکام کوششوں کے بعد مولوی حبیب صاحب اور ان کے گھر والے لاہور واپس جا چکے تھے۔ چوہدری دین محمد کے گھر میں عجیب سا سناٹا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ گھر نہ ہو کوئی جیل ہو۔ مقامی پولیس کے اہلکار اپنے ایس ایچ او سمیت گھر کے اردگرد چوکس کھڑے رہتے تھے۔ اضافی احتیاط کے طور پر پرائیویٹ گارڈز بھی موجود تھے۔ کسی کو تلاشی اور پوچھ گچھ کے بغیر اس گلی میں ہی جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ابھی ابھی لوڈر پر بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے آیا تھا۔ کبھی کبھی چہرے کے مرمت شدہ

حصوں میں ہلکی سی اینٹھن محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ بدلتا ہوا موسم تھا۔ میں ایسے میں کرنل احرار کی تجویز کردہ کریم یا لوشن چہرے پر اپلائی کرتا تھا، میں آج کل مسلسل آواز بدل کر بول رہا تھا۔ اس کی وجہ سے کسی وقت گلے میں ہلکی سی خراش بھی محسوس ہوتی تھی۔ اب بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ میں ان دونوں مسئلوں کا حل سوچ رہا تھا جب دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ہاشو تیزی سے اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ بولا۔ ''چن جی، تمہیں کہا تھا ناں کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوگی۔ یہ دیکھو، مولوی جی کی تصویر چھپی ہے اور ساتھ ہی یہ جھوٹم جھوٹ بھی لکھا ہوا ہے۔''

میں نے خبر پڑھی اور خون کھول گیا۔ خبر کچھ اس طرح تھی۔ ''معروف عالم اور نیو سوسائٹی مسجد کے پیش امام مولانا حبیب صاحب پر چندے کی رقوم میں خرد برد کے الزام نے پھر سر اٹھا لیا۔ مسجد کمیٹی کے ایک اہم رکن نے مولانا کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر درج کرادی۔''

خبر کی تفصیل میں درج تھا...... یاد رہے کہ دو سال پہلے بھی اس طرح کی خبروں نے گردش کی تھی اور مولانا نے مسجد کی کمیٹی اور دیگر امور سے کنارہ کش ہونے کا اعلان کر دیا تھا مگر پھر کمیٹی کے مخالف ارکان کوئی بھی ثبوت فراہم کرنے میں ناکام رہے تھے اور مولانا کے عقیدت مندوں نے بصد اصرار انہیں دوبارہ فرائض کی انجام دہی پر مجبور کیا تھا۔

متن کے ایک حصے میں یہ بھی درج تھا کہ مولانا کی ضمانت قبل از گرفتاری ہو گئی ہے اور ان کے عقیدت مند نہایت غم و غصے میں ہیں۔

سینے میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ بااختیار اور طاقتور لوگوں کا یہی مکروہ چہرہ تھا جس نے وطنِ عزیز کے طول و عرض میں ہر جگہ مجھے اپنی جھلک دکھائی تھی۔ ہر کرپٹ شخص یہی کہتا دکھائی دیتا تھا، مجھے نہ چھیڑو...... میں تمہیں نہیں چھیڑوں گا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ مولوی جی کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک ہونے والا ہے۔ انہوں نے ایک خونخوار درندے کی دم پر پاؤں رکھا تھا۔ وہ خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ شاید مولوی جی سے غلطی ہی ہوئی تھی کہ انہوں نے بھانجی کی محبت میں اور حق سچ بات کہنے کی خواہش میں ایک بہت ہی طاقتور شخص سے ٹکر لے لی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے لاہور پہنچنا چاہیے۔ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور وہ تاجور کے ماموں تھے۔

☆☆☆

یہ نیو سوسائٹی کی ایک کافی بڑی مسجد تھی اور بارونق علاقے میں تھی۔ مولوی حبیب اللہ قریباً پینتیس برس سے یہاں نہایت خوش اسلوبی اور وقار کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ جب بااختیار لوگ اپنے نظر نہ آنے والے ہاتھوں کے ساتھ ڈوریاں ہلاتے ہیں تو حالات کس طرح بدلتے ہیں اور شریف ترین لوگ بھی کس طرح مجرم گردانے جاتے ہیں۔ چند ہی دنوں میں اس وسیع جامع مسجد کی کمیٹی اور اہلِ علاقہ دو دھڑوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک دھڑا مولانا کو ہر صورت مشکلات میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔

پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ دو چار روز مولانا کے اردگرد ہی رہوں۔ میں نے بیوی کی بیماری کا عذر کر کے چوہدری بشیر سے تین چار دن کی رخصت لے لی تھی اور اپنی ایک دو ڈنے داریاں ٹریکٹر ڈرائیور حاکم علی کو سونپ دی تھیں۔ (جس طرح وہ وقتِ رخصت مجھے سونپ جاتا تھا) مولوی جی کی رہائش گاہ مسجد کے ساتھ ہی واقع تھی۔ مجھے یہاں کے حالات کشیدہ نظر آتے تھے۔ مسجد کے سامنے ہی ایک بازار تھا۔ ایک اچھا اتفاق یہ ہوا کہ مجھے مسجد کے قریب ہی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرا کرائے پر مل گیا۔ یہ دوسری منزل کا کمرا تھا۔ ہوٹل کا مالک حاجی منیر بھی مولوی جی کے عقیدت مندوں میں شامل تھا۔ اس نے گفتگو کے دوران میں بتایا۔ ''لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولوی جی کے خلاف کہیں اوپر سے اشارے ہو رہے ہیں۔ ان کو ایک پرانے معاملے میں زبردستی گھسیٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

''سنا ہے کہ مولوی جی کی ضمانت بھی ہو چکی ہے۔''

''یہ کچی ضمانت ہے لیکن پکی بھی ہو تو بڑے لوگوں کے لیے کون سا کام مشکل ہوتا ہے۔ اب سنا ہے کہ ان کی کسی پرانی تقریر کا مسئلہ دوبارہ کھڑا کیا جا رہا ہے۔ اور ان پر ایک اور کیس کی تیاری ہو رہی ہے۔ اصل بات کا ہر ایک کو پتا ہے۔ دارا ب فیملی کا ایک اوباش امیرزادہ مولوی جی کے خاندان کی کسی لڑکی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

یہ دوسری رات، دو ڈھائی بجے کا واقعہ ہے۔ میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ رہ رہ کر تاجور اور اس کی مسکین صورت والدہ کا خیال آتا تھا۔ پتا نہیں کہ ان پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اچانک میں نے مسجد کے سامنے سنسان سڑک پر پولیس کی ایک موبائل کو رکتے دیکھا۔

انداز مشکوک سا تھا۔ کہیں آدھی رات کے بعد یہ لوگ مولوی جی کو گرفتار کرنے تو نہیں آگئے تھے؟

ایسا ہو بھی سکتا تھا کیونکہ سارا دن تو مولوی جی کے پرستار اور عقیدت مند اُن کے اردگرد رہتے تھے، رات کے اس پہر ان پر ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا۔

میں کمرے کی کھڑکی میں سے صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا۔ کچھ دیر بعد میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ پولیس موبائل چلی گئی مگر پھر...... دس پندرہ منٹ کے بعد ہی ایک اسٹیشن ویگن خاموشی سے آئی اور تقریباً اسی جگہ کھڑی ہوگئی۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ اس ویگن میں آگے سے پیچھے تک بندے ٹھسے ہوئے تھے پھر ویگن کے دروازے کھلے اور وہ جیسے افراد کو اگلنے لگی۔ ان سب افراد کے ہاتھوں میں مجھے ڈنڈے اور آہنی سلاخیں وغیرہ دکھائی دیں۔ یہ لوگ جیسے پہلے سے بنے ہوئے پلان کے تحت تیزی سے مولوی جی کی رہائش گاہ کی طرف لپکے۔ ان میں سے زیادہ تر نے اپنے چہرے پگڑیوں اور منڈاسوں وغیرہ میں چھپائے ہوئے تھے۔

میں نچلی منزل پر آیا اور سوئے پڑے حاجی منیر کو جھنجوڑ کر جگایا۔ ''اٹھو...... اٹھو مولوی جی خطرے میں ہیں۔ کچھ لوگ اُن کے گھر میں گھس رہے ہیں۔''

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم دوسرے لوگوں کو جگاؤ اور پولیس کو فون کرو...... جلدی۔''

اس کے ساتھ ہی میں باہر کو دوڑا۔ میری لمبی قمیص کے نیچے بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ میں نے تیزی سے سڑک پار کی اور مسجد کے پہلو میں مولوی جی کی رہائش پر پہنچا...... بلوائی بیرونی دروازہ توڑ کر اندر گھس چکے تھے۔ اب وہ ان سیڑھیوں پر کھڑے تھے جن کے آخر میں مولوی جی کے رہائشی پورشن کا آہنی دروازہ تھا۔ وہ للکار رہے تھے۔ ''دروازہ کھولو نہیں تو توڑ دیں گے...... باہر نکلو۔''

ایک شخص گرجا۔ ''اگر باہر نہیں نکلتا تو آگ لگا دو۔ اندر ہی جل جانے دو ان جہنمیوں کو۔''

''ہاں آگ لگا دو۔'' کئی آوازیں ابھریں۔ یقیناً وہ لوگ ہراساں کرنا چاہ رہے تھے۔ پھر دروازے پر زوردار ضربیں رسید کی جانے لگیں۔

اندر سے مولوی جی کے اہلِ خانہ کے چلّانے اور رونے کی مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ میں لپک کر گیا اور بلوائیوں کی طرف منہ کر کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے سب سے آگے والے افراد کو دھکے دیے۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اگر کسی نے مولوی جی اور ان کے گھر والوں کو ہاتھ بھی لگایا تو لاشیں گر جائیں گی۔''

میرے لب و لہجے نے چند لمحوں کے لیے مشتعل لوگوں کو ٹھٹکایا لیکن پھر وہ سنبھلے اور پھیلی ہوئی داڑھی والا ایک کیم شحیم شخص دہاڑا۔ ''اوئے پیچھے ہٹ جا...... نہیں تو مارا جائے گا۔ آج ہم اس مکار کے ہاتھ پیر توڑے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔''

ایک دم دو افراد مجھ پر پل پڑے۔ وہ بے خبر تھے کہ ''مدِمقابل'' کو چوٹ لگانا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے لاٹھی کے ایک زوردار وار سے بچتے ہوئے حملہ آور کے سینے پر ٹانگ رسید کی اور وہ سیڑھیوں کی ریلنگ کے اوپر سے ہوتا ہوا فرش پر گرا، دوسرے نے میرا گریبان پکڑنا چاہا تھا، اس کے جبڑے پر طوفانی گھونسا پڑا اور وہ لڑکھڑا کر اپنے پیچھے کھڑے ساتھیوں پر گرا۔

''مارو اس حچے کو۔'' کسی نے غضب ناک انداز میں ہدایت جاری کی۔

لوگ ہلا بول کر میری طرف آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے اور نوک دار آہنی سلاخیں تھیں۔ میں نے قمیص کے نیچے سے ریوالور نکالا اور تین ہوائی فائر کیے۔ دھماکوں سے قرب و جوار لرز گئے۔ سیڑھیوں پر چڑھے ہوئے افراد گھبرا کر پیچھے ہٹے اور ایک دوسرے کے اوپر گرے۔

''ہمت ہے تو بھاگو مت...... آؤ آگے...... ہاتھ لگا کر دکھاؤ مولوی جی کو۔'' میں نے ایک اور فائر کرتے ہوئے کہا۔

اس اثنا میں بازار میں ہلچل مچ چکی تھی۔ اردگرد کی رہائشی عمارتوں میں سے لوگ نکل رہے تھے اور مولوی جی کے گھر کی طرف لپک رہے تھے۔ حملہ آور سمجھ گئے کہ رکنا اور مزاحمت جاری رکھنا خطرناک ہے۔ وہ اپنی اسٹیشن ویگن کی طرف جھپٹے اور بھرا مار کر اندر گھس گئے۔ یقیناً ان کے پاس بھی کم از کم ایک آتشیں ہتھیار تو موجود تھا کیونکہ اسٹیشن ویگن پر راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے رائفل کی ایک گولی انہوں نے بھی چلائی۔ یہ بھی ہوائی فائر تھا۔

مولوی جی اور ان کے اہلِ خانہ یقیناً کھڑکیوں میں سے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اب اندر سے دروازہ کھول دیا۔ مولوی جی حیرت اور تعریف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مولوی جی کے بہت سے حمایتی گھر سے باہر اور مسجد کے صحن میں جمع ہو

گئے تھے۔ وہ غم و غصے میں دکھائی دیتے تھے۔ مولوی صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”تم کو، شاید دیکھا ہے کہیں۔“

”جی میں آپ کی محترمہ ہمشیرہ کے گاؤں سنگھیرا میں ہی رہتا ہوں۔ یہاں لاہور ایک کام سے آیا ہوا ہوں۔ کل آپ کے پیچھے نماز بھی پڑھی ہے میں نے۔ وہ سامنے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں...... شور سن کر جاگ گیا اور یہاں پہنچ گیا۔“

مولوی جی نے میرا شانہ تھپکا اور دعا دی۔ ہم لوگ مسجد کے صحن میں آگئے۔ اسی دوران میں پولیس کی ایک موبائل بھی وہاں پہنچ گئی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ وہی گاڑی تھی جو اس وقوعے سے چند منٹ قبل مشکوک انداز میں یہاں کھڑی رہی تھی۔ بہت بڑے منہ والا ایک تندخو انسپکٹر گاڑی میں سے اترا اور واقعے کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوائی فائر کس نے کیے تھے؟“

”میں نے کیے تھے جی...... اور انہوں نے بھی گولی چلائی تھی۔“

”تمہارا ہتھیار کہاں ہے؟“

”میرے پاس ہے، لائسنسی ریوالور ہے۔“

”درشن تو کراؤ۔“ وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، کراچی میں کاسمیٹک سرجری کے دوران میں، میں نے کچھ رقم خرچ کی تھی اور وقاص کے نام سے اپنے کئی شناختی کاغذات بنوا لیے تھے۔ جن میں شناختی کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس، اسلحہ لائسنس اور ڈومیسائل وغیرہ شامل تھے۔ میں نے ریوالور اور لائسنس دونوں دکھا دیے۔ پولیس والوں کے مخصوص انداز میں انسپکٹر اعتراض وغیرہ لگانا چاہ رہا تھا مگر میرا اعتماد اور وہاں موجود لوگوں کا غم و غصہ دیکھ کر کسی کیکنگی سے باز رہا۔ اسی دوران میں میڈیا کی دو گاڑیاں بھی شور مچاتی موقع پر پہنچ گئیں۔ ان کیل کانٹے سے لیس گاڑیوں کے پہنچنے کا مطلب یہی تھا کہ اب پوری ”کوریج“ ہوگی۔ ایک لحاظ سے یہ میرے اور مولوی صاحب کے لیے اچھا ہی ہوا تھا۔

چوبیس گھنٹے کے اندر ہی میرے اور مولوی حبیب اللہ صاحب کے درمیان اپنائیت اور احترام کا ایک خوشگوار سا تعلق پیدا ہو گیا۔ مولوی جی کا ایک مرید جو مسجد کے قریب ہی رہتا تھا مجھے خستہ حال ہوٹل سے فارغ کرا کے اپنے گھر لے گیا اور خاطر داری کی۔ رات کو مولوی جی نے مجھ سے اپنے حجرے میں ملاقات کی۔ وہ مجھے ایک معمولی ڈرائیور سے کہیں زیادہ اہمیت دے رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

”ماشاء اللہ بہت باہمت اور ہونہار جوان ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم بڑی ترقی کرو گے۔ رب کریم تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔“

انہوں نے مجھے چوہدری دین محمد اور داراب فیملی والے معاملے کی کچھ تفصیل بھی بتائی۔ یہ باتیں تو اب ہر کس و ناکس کو معلوم تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ دین محمد اپنے گھر والوں کو لے کر لاہور آیا ہوا ہے۔ شاید کسی جاننے والے کے ہاں شادی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں مولانا! کہ دین محمد صاحب اس معاملے کی وجہ سے گھبرا گئے ہوں اور ویسے ہی کچھ دنوں کے لیے اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں۔“

”نہیں، شادی والی بات ٹھیک ہی ہے۔ مجھے ایک دوسرے ذریعے سے بھی پتا چلا تھا۔“

میرے اور مولوی جی کے درمیان کافی دیر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے ان اندیشوں کا اظہار بھی کیا جو مخالفین کی وجہ سے پیدا ہو رہے تھے۔ ان کی مسحور کن شخصیت نے مجھے متاثر کیا۔

مولوی جی نے دین محمد کی لاہور آمد کے بارے میں جو اندازہ قائم کیا تھا، وہ اسی رات غلط ثابت ہو گیا۔ میں نے فردوس کو فون کیا۔ پہلی کوشش ہی کامیاب ہوئی اور اس نے فون اٹھا لیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کہاں ہو؟“

وہ حسبِ معمول ڈری ہوئی آواز میں بولی۔ ”یہیں گاؤں میں۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔“

”دین محمد صاحب اور بچے کہاں ہیں؟“

وہ کتنی ہی دیر خاموش رہی پھر دبی آواز میں کہنے لگی۔

”بڑی خاص خبر ہے لیکن اس میں میرا نام آیا تو میں مفت میں ماری جاؤں گی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

میں سمجھ گیا کہ کوئی بہت اہم اطلاع ہے۔ میں نے اسے بمشکل آمادہ کیا۔ وہ بولی۔ ”چوہدری جی اور بچے لاہور نہیں...... اسلام آباد گئے ہیں۔ اب تاجور بی بی کا صرف نکاح ہی نہیں ہوگا...... اسی وقت رخصتی بھی ہو جائے گی۔ بالکل چپ چپیتے...... کل نہیں تو پرسوں یہ سب ہو جانا ہے......“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

اُس کی بات سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

بنا سوچے سمجھے آن دیکھی راستوں پر چلنے والے بھٹک بھی جاتے ہیں... اور ایسے بھٹکتے ہیں کہ پھر سکون و طمانیت کے لمحے زندگی سے نکل جاتے ہیں... ایک ایسی ہی خاتون کی تلاش کا سلسلہ جو رفتہ رفتہ دراز ہوتا چلا گیا... رکا تو ہر طرف تباہی تھی...

کسی کی تلاش سے شروع ہونے والے ڈرامے کا سنسنی خیز کلائمکس......



لمحوں کا کھیل

انجم فاروق ساحلی

نیون سائن پر سرخ اور نیلی روشنیوں میں یہ الفاظ جگمگا رہے تھے۔ ”ونڈر لینڈ ڈانس پیلس“، ”آئیے اور پچاس حسین ترین میزبان لڑکیوں میں سے کسی کو بھی اپنا ہم رقص بنائیے۔“ یہ عبارت پڑھ کر جارج کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری اور وہ رقص گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

ڈانس فلور، عمارت کی بالائی منزل پر تھا لیکن ٹرمپٹ اور ڈرم کی تیز موسیقی نیچے بھی سنائی دے رہی تھی۔ زینہ چڑھتے ہوئے جارج کی ملاقات چند نوجوان سیلرز سے ہوگئی جو جھومتے جھومتے نیچے آرہے تھے۔ جارج کے چوڑے شانے دو سیلرز سے ٹکرائے لیکن خلافِ توقع وہ لوگ اس سے الجھے بغیر چلے گئے۔ اپنے چوڑے شانوں اور دراز قد کے باعث وہ انگریزی کے حرف T کی یاد دلایا کرتا تھا۔ زینہ طے کرنے کے بعد وہ سیدھا بکنگ آفس کی کھڑکی پر چلا گیا جہاں نیلی آنکھوں اور بھرے بھرے ہونٹوں والی ایک لڑکی بکنگ کلرک کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ جارج اس سے کچھ کہتا! وہ میکانکی انداز میں بول اٹھی۔ ”کتنے ٹکٹ چاہئیں آپ کو؟“

”میں یہاں رقص سے لطف اندوز ہونے نہیں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوں خاتون۔“

”پھر بھی ڈانس فلور میں داخلے کے لیے آپ کو ایک ڈالر کا ٹکٹ تو لینا ہی پڑے گا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”اگر مجھے آپ کے میزبانوں کا شربتِ دیدار پینا ہوتا تو میں ٹکٹ ضرور لیتا لیکن مجھے صرف آپ کے منیجر جم براؤن سے ملنا ہے۔“ وہ بولا۔

''اوہ.....آپ کا نام؟''

''جارج کینیڈی..... میں ایک تحقیقاتی ادارے کا انسپکٹر ہوں۔''

لڑکی نے انٹرکام پر منیجر کو جارج کی آمد سے مطلع کیا اور پھر اس کے استفسار پر جارج سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟''

غیر معمولی اور غیر معقول باتوں پر جارج کی بھویں تن جایا کرتی تھیں، سو اس وقت بھی وہ تنے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ ''اسے بتاؤ کہ یہ باتیں ہالشانہ کرنے کی نہ ہوتیں تو میں فون پر ہی کر لیتا۔''

لڑکی نے انٹرکام پر جارج کی بات دہرا دی پھر منیجر کی ہدایت کے مطابق بولی۔ ''وہ اس وقت بہت مصروف ہیں اگر آپ کا ان سے ملنا ضروری ہے تو ڈانس فلور پر چلے جائیں۔ وہ پانچ دس منٹ بعد خود ہی آپ کو بلوا لیں گے۔''

جارج کی پیشانی پر بل پڑ گئے، وہ بولا۔ اس کا آفس کہاں ہے، میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔''

لڑکی نے پہلی بار جارج کو غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ ''آپ شاید پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں اس لیے نہیں جانتے کہ جم پہلی بار آنے والوں کو اپنے دفتر کی جائے وقوع نہیں بتایا کرتا۔''

''مگر کیوں؟'' جارج نے تعجب سے پوچھا۔

''خدا ہی بہتر جانتا ہے یا وہ خود۔ ممکن ہے وہ ڈرتا ہو کہ نئے آنے والے اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔'' یہ بتاتے ہوئے لڑکی کے چہرے سے اکتاہٹ عیاں تھی۔

جارج اس کی بات پر کچھ سوچنے لگا۔ اتنے میں لڑکی پھر بولی۔ ''ذرا سامنے سے ہٹ جائیے، کچھ لوگ ادھر آتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔''

جارج نے دیکھا واقعی کچھ لوگ کھڑکی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ ڈانس فلور کی طرف بڑھ گیا۔ ہال روم میں ٹرمپٹ انتہائی اونچے سروں میں بج رہا تھا اور رقص کرنے والے جوڑے بڑی تیزی سے ڈانس کر رہے تھے۔ موسیقی ناگوار شور میں تبدیل ہو گئی جس سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی پھر ایک تیز آواز کے ساتھ موسیقی کا شعلہ جیسے ایک دم بجھ گیا اور پورے ہال کو گمبھیر خاموشی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ رقص کرنے والے کچھ جوڑے علیحدہ ہو گئے، کچھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ریلنگ کی طرف بڑھے، کچھ بار کی طرف چلے گئے اور چند ایک سوڈا فاؤنٹین کے سامنے نشستوں پر جم گئے۔

جارج آہستہ آہستہ چلتا ہوا ریلنگ کے قریب سے گزرا۔ اگرچہ آدھی رات کا یہ وقت رقص گاہ کے معروف ترین لمحات میں شمار ہوتا تھا لیکن رقص کی پچاس میزبان لڑکیوں میں سے بہت سی مہمانوں کے انتظار میں ریلنگ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ جارج کے عمدہ تراش کے سوٹ اور شخصیت نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان میں سے ایک میزبان لڑکی اس کی طرف بڑھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''میرے ساتھ رقص کرو گے مسٹر (جاسوس)؟''

جارج نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ سیاہ آنکھوں والی دراز قامت لڑکی بڑا دلکش اور شاداب سراپا رکھتی تھی۔ اس کے ابرو خم دار تھے اور بالائی ہونٹ پر ایک تل مسکرا رہا تھا۔ جارج کی نگاہ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں سے پھسلتی ہوئی نیچے اتری تو دل سے تقریباً ایک بالشت اوپر لگے میزبانی کے چمک دار بیج پر اٹک گئی۔ بیج پر یہ الفاظ تحریر تھے۔

''میں ہیلن ہوں۔''

''جب تک میرا ذہن ٹھیک رہتا ہے، میں رقص نہیں کرتا۔'' جارج بولا۔ ''مگر ذرا یہ تو بتاؤ ہیلن، تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ میں پولیس کا آدمی ہوں؟''

''جیسے ہی تم اندر آئے تمام لڑکیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ تم کاپ ہو۔'' وہ بولی۔ ''تحقیقات پولیس والے ہی کیا کرتے ہیں نا؟''

ہیلن کی اس بات پر جارج کو یاد آیا کہ اس نے بکنگ کلرک کو یہی بتایا تھا کہ میں تحقیقاتی انسپکٹر ہوں لیکن یہ خبر یہاں تک کیسے پہنچ گئی؟ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ہیلن بولی۔

''میزبان لڑکیوں کو ہم رقص بنانے کے لیے تم نے جو ٹکٹ لیے ہیں، وہ مجھے دے دو۔ میں تمہارے لیے بہت اچھی ہم رقص ثابت ہوں گی۔''

''سوری مائی ڈیئر! میں نے کوئی ٹکٹ نہیں لیے۔ داخلے کے لیے میرا تعارف ہی کافی ثابت ہوا۔'' یہ کہتے ہوئے جارج کی بھویں سکڑ گئیں۔

اس کی نگاہ ہیلن کے تعاقب میں ایک باوردی بیرے پر جا پڑی تھی جو سگریٹ نکال کر ایک نوجوان فوجی کو دے رہا تھا اور سولجر نے اس سگریٹ کے عوض اسے ایک نوٹ دیا تھا جسے بیرے نے جلدی سے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ ''تم پولیس والے بڑے کنجوس ہوتے ہو۔ بکنگ کلرک لوسی سے کہو کہ وہ تمہیں کچھ فری ٹکٹ دے دے۔ وہ ٹکٹ مجھے دے دینا، رقص کرو یا نہ کرو۔''

فرررررر

بولو آ

جانور ڈاکٹر

جارج کی نگاہیں اب تک اس فوجی پر تھیں جو ہال سے ملحقہ لاؤنج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ہیلن کو جواب دیے بغیر اس طرف چل پڑا۔ ہیلن بھی چہکتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی اور بولی۔ ''دیکھو اس طرح میری کچھ آمدنی ہو جائے گی۔ اس کے بدلے شاید میں تمہیں اس گھناؤنی جگہ کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچا دوں۔'' جارج نے پھر بھی اسے کوئی جواب نہ دیا مگر چلتے چلتے رک گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر وہی فوجی دو نشستوں والے ایک صوفے پر بیٹھا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس کے برابر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے گاؤن پر بھی میزبان والا بیج چمک رہا تھا۔ فوجی نے دو تین کش لگا کر سگریٹ لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی نے دو تین کش لیے اور سگریٹ ایک بار پھر فوجی کی انگلیوں میں آ گیا۔ جارج قریب پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ فوجی ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں مگر ہیلن بن بلائے مہمان کی طرح ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور بولی۔

''دیکھو، تمہارے لیے ان ٹکٹوں کی کوئی اہمیت نہیں مگر میرے لیے وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ آج میرے حصے میں زیادہ مہمان بھی نہیں آئے، پلیز لوسی سے ٹکٹیں لے آؤ اور مجھے دے دو۔''

''کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' جارج نے ایک دم پوچھا تو ہیلن کچھ گھبرا سی گئی۔

''کیا؟..... تم سے شادی؟ مگر کیوں؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''پیسے بچانے کے لیے۔ دیکھو، عزیزمن، میں تمہاری رفاقت حاصل کرنے کے لیے پانچ ڈالر فی گھنٹہ خرچ کرنے کے قابل نہیں۔ میری تنخواہ یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔'' جارج نے جواب دیا۔ ہیلن کچھ بولنے کے بجائے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تو جارج پھر گویا ہوا۔

''میں یہ سارے چکر خوب جانتا ہوں ہیلن۔ چند منٹ بعد تم یہ کہو گی کہ چاہے میں تمہارے ساتھ رقص کروں یا نہ کروں مگر تمہاری رفاقت اور قربت کے مجھے پانچ ڈالر خرچ کرنے ہی پڑیں گے۔ اس لیے اپنا قیمتی وقت مجھ پر ضائع نہ کرو تو بہتر ہے۔''

''اوہ..... تم لوگ ہوتے ہی بخیل ہو۔'' ہیلن اٹھتے ہوئے غصے سے بولی۔ ''تم سب کی سوچیں گھٹیا ہوتی ہیں۔'' وہ مٹکتی ہوئی ہال سے چل دی۔ جارج اسے دیکھتا اور یہ سوچتا رہ گیا کہ اس کا سراپا ہی شاداب نہیں بلکہ اس کی چال میں بھی شاخِ گل کی سی لچک ہے۔ پھر اس کی توجہ ان قہقہوں کی طرف مبذول ہو گئی جو فوجی اور میزبان لڑکی لگا رہے تھے۔

اچانک جارج کو ایسی خوشبو کا احساس ہوا جیسی بوٹ پالش سے آیا کرتی ہے اور پھر اسے ہیلن کی بات یاد آ گئی کہ وہ اسے اس گھناؤنی جگہ کے بارے میں کچھ معلومات بھی فراہم کرے گی۔ کیا وہ یہ بتانے والی تھی کہ اس رقص گاہ میں مہمانوں کو چرس بھرے سگریٹ بھی مہیا کیے جاتے ہیں۔

اتنے میں فوجی اور میزبان لڑکی اٹھے اور ڈانس فلور کی طرف چل دیے۔ جارج اپنی کرسی سے اٹھ کر اس صوفے کے قریب آ گیا جس پر وہ دونوں بیٹھے باری باری سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں پڑا دھواں دے رہا تھا۔ جارج نے اسے اٹھا کر سونگھا اور بجھا کر جیب میں رکھ لیا، پھر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں بعد ایک کوتاہ قد آدمی بے آواز قدموں سے چلتا ہوا آیا اور اس کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ جارج نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بے ساختہ بولا۔ ''واہ..... مسٹر رومالو آج کل یہاں کام کر رہے ہیں؟''

''ہاں۔'' نو وارد نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

''اعتراض تو نہیں۔'' جارج بولا ''مگر یہ کرید ضرور لگ گئی ہے کہ تم جیسے بلا لائسنس پستول بردار محافظ کی ضرورت یہاں کیسے پڑ گئی؟ کیا تم جم براؤن کے باڈی گارڈ ہو؟''

''تم ٹھیک سمجھے جارج۔ اسی نے مجھے بھیجا ہے کہ میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں۔''

''اوہ۔'' جارج اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم ابھی تک اپنی اسی روش پر گامزن ہو۔ سدھر جاؤ رومالو، ورنہ کسی روز مارے جاؤ گے۔''

''میں مارا جاؤں یا نہیں مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی دن میرے ہاتھوں مارے جاؤ۔'' رومالو نے غراتے ہوئے جواب دیا۔ ''آؤ...... میرا خیال ہے کہ باس اس وقت تک کانفرنس سے فارغ ہو چکا ہوگا۔'' جارج ساتھ ہولیا۔ چلتے چلتے جب وہ دفتر کے قریب پہنچے تو بند دروازے سے باہر آنے والی آوازیں اس بات کی مظہر تھیں کہ اندر کانفرنس جاری ہے۔ کانفرنس کی یہ آوازیں چیخنے چلانے کے شور پر مشتمل تھیں۔

''یہ بکواس ابھی تک جاری ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم کچھ دیر انتظار کرلیں۔'' رومالو نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' جارج نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے تائید کی۔ ''زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہم اندر چل کر انتظار کریں اور تماشا بھی دیکھتے رہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اندر چلا گیا۔

اندر دو میزبان لڑکیاں ایک دوسرے سے دست و گریبان تھیں۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کا منہ نوچنے کی کوشش کررہی تھیں جبکہ ایک موٹا آدمی خشمگیں نگاہوں سے گھورتا ہوا انہیں چھڑانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس جدوجہد میں لڑکیوں کے ہاتھ اس پر بھی پڑ رہے تھے۔

''میں تمہاری آنکھیں نکال دوں گی چڑیل۔'' ایک لڑکی چلائی۔

''میں تمہاری بتیسی توڑ دوں گی۔'' دوسری چیخی۔

''میں کہتا ہوں بند کرو یہ بکواس۔'' موٹا آدمی دہاڑا۔

''واہ......! ایک خوش و خرم خاندان کا یہ دلکش ماحول دیکھ کر مزہ آگیا۔'' جارج بولا تو موٹے آدمی نے دونوں لڑکیوں کو پوری قوت سے دھکیلتے ہوئے جارج سے کہا۔

''کیا تم دستک دینا غیر اخلاقی حرکت سمجھتے ہو؟''

''کیا اس شور شرابے میں دستک کی ہلکی سی آواز بھی آپ تک پہنچ سکتی تھی مسٹر جم براؤن؟''

جم براؤن نے قہرآلود نگاہوں سے جارج کو دیکھا مگر کچھ کہے بغیر لڑکیوں کی طرف پلٹا اور بولا۔ ''ہم اس معاملے سے بعد میں نمٹیں گے، اب دفع ہوجاؤ۔''

''نہیں، اس معاملے کا فیصلہ ابھی اور اسی وقت ہوگا۔'' لڑنے والی لڑکیوں میں سے دراز قامت چلائی۔ ''گلڈا تمہاری منظورِ نظر ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ٹکٹوں کے شمار میں بے ایمانی کرتی رہے۔''

''اپنا تھوبڑا بند کرو۔'' چھوٹے قد والی گلڈا چیخی۔ ''تمہیں اپنے حصے کا سب کچھ ملتا رہا ہے۔ سوائے اس کے۔'' اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے لمبی لڑکی کا منہ نوچ لیا۔ وہ کراہتے ہوئے پیچھے ہٹی تو جارج نے دیکھا کہ اس کے میزبانی والے بیج پر ''ٹی ٹی'' لکھا ہوا تھا۔ ٹی ٹی غیظ کے عالم میں دہاڑتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے اپنے لمبے بازو آگے بڑھا کر گلڈا کی گردن دبوچ لی۔ جارج نے یہ دیکھ کر لمبی سانس لی اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''رومالو۔'' جم پوری قوت سے چلّایا۔ ''یہاں آؤ اور ان چڑیلوں کو چھڑانے میں میری مدد کرو۔''

جارج نے دیکھا کہ رومالو تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ ٹی ٹی کی گردن پر رکھ کے بڑے زور سے اسے دھکا دیا تو وہ میز سے جاٹکرائی۔ اس کے برعکس اس نے نرمی سے گلڈا کا بازو تھاما اور ایک طرف ہٹا دیا مگر جارج کے لیے یہ بات بڑی تعجب خیز تھی کہ رومالو کو قریب آتا دیکھ کر دونوں لڑکیاں بری طرح سہم گئی تھیں اور ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔

''جب میں کہتا ہوں کہ بند کرو بکواس تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بکواس بند ہوجانی چاہیے۔ ہم اس معاملے سے متعلق گفتگو پھر کسی وقت کریں گے۔ انہیں یہاں سے لے جاؤ رومالو۔'' جم بولا۔

رومالو نے ٹی ٹی کی طرف دیکھا تو وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ گلڈا نے بھی اس کی تقلید کی۔ ان کے باہر جاتے ہی رومالو نے آگے بڑھ کر زور سے دروازہ بند کردیا۔

جم پھر چیخ اٹھا۔ ''دروازہ آہستہ بند کیا کرو۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر جارج سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں، اب بولو، تم کیا چاہتے ہو؟ تم نے بتایا تھا کہ تم کوئی تحقیقاتی افسر ہو۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟''

جارج کے جواب دینے سے پہلے ہی رومالو بول

اٹھا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کا نام جارج ہے۔ یہ سراغ رساں ایجنسی کا پارٹنر ہے جو انشورنس کمپنیوں کے لیے مختلف قسم کے تحقیقاتی کام کرتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دانت سے اپنا ناخن کاٹنے اور خونخوار نگاہوں سے جارج کو دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے مگر میں نے تمہیں سو بار سمجھایا ہے کہ آداب کا خیال رکھا کرو۔ اس ادارے کا باس میں ہوں، تم نہیں۔'' جم نے رومالو کو ڈانٹا۔ پھر جارج سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''اس وقت میں آپ کے پاس گرانڈ انشورنس کمپنی کے نمائندے کی حیثیت سے آیا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا چند ماہ پہلے اس کمپنی نے زیکوسلوواکیہ کی ایک لڑکی ویسنا کے بارے میں آپ کو خط لکھا تھا جو یہاں کام کرتی تھی۔ ویسنا نے ایک بڑی رقم کا بیمہ کروایا ہوا تھا۔ اس کے وارث نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ مرچکی ہے مگر وہ اس کی موت کا سرٹیفکیٹ پیش نہیں کرسکا۔ گرانڈ انشورنس کمپنی اس لڑکی کے بارے میں تحقیقات کرتی رہی ہے اور میں اس سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔'' جارج نے پوری وضاحت سے اپنی آمد کا مقصد بیان کردیا۔

''ہاں گرانڈ انشورنس کمپنی کا خط مجھے ملا تھا اور میں نے جواب دے دیا تھا کہ اس نام کی کوئی لڑکی یہاں ملازم نہیں تھی پھر اب تم اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟'' جم نے پوچھا۔

''ایسا لگتا ہے ہماری گفتگو خاصا طول کھینچے گی۔'' جارج اپنی جیب سے پائپ نکالتا ہوا بولا۔ ''اس لیے کہ آپ جان بوجھ کر جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' جم اپنی دونوں ہتھیلیاں میز پر ٹیکتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو مسٹر، اس ادارے کا منیجر میں ہوں، تم نہیں... اس لیے تم یہ بات مجھ سے زیادہ نہیں جان سکتے۔''

''اس سلسلے میں، میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ ہمارے پاس اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہے کہ ویسنا یہاں کام کرتی رہی ہے۔ وہ مئی 2015ء کے تیسرے ہفتے میں یہاں موجود تھی۔''

''تم اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ یہاں تھی جبکہ مجھے اس نام کی کوئی لڑکی سرے سے یاد ہی نہیں۔'' جم نے لفافہ کھولنے والے چاقو سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''آپ کو یاد نہیں مگر آپ کی بہن کو بہت اچھی طرح یاد ہے۔'' جارج نے کن انکھیوں سے رومالو کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جو بڑی آہستگی سے اس کی کرسی کی طرف بڑھ آیا تھا۔

''لیکن میری بہن تو یہاں ہے ہی نہیں۔ وہ ملک سے باہر گئی ہوئی ہے۔'' جم بولا۔

''میں جانتا ہوں۔ وہ سوئٹزرلینڈ میں ہے۔ ہم نے اسے خط لکھا تھا جس کا جواب آچکا تھا۔ اسے وہ سارے خط بھی یاد ہیں جو اس نے ویسنا کے بارے میں آپ کو لکھے تھے کہ آپ اس کا خیال رکھیں اور کوئی ملازمت بھی دلا دیں۔ آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ آپ کی بہن ویسنا میں اس لیے دلچسپی لے رہی تھی کہ اس نے اسے زیکوسلوواکیہ سے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔''

''لیکن وہ لڑکی تو مجھ تک پہنچی ہی نہیں حالانکہ میں نے اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی شاید۔''

''بس رہنے دو۔'' جارج نے جم کی بات کاٹتے ہوئے سختی سے کہا۔ ''میں بتا چکا ہوں کہ مئی 2015ء میں وہ یہاں کام کررہی تھی۔ ہمارے پاس اس کا ثبوت موجود ہے۔ لاؤ مجھے لیجر دکھاؤ۔''

جم نے جارج کی بات کا جواب دینے کے بجائے لفافہ کھولنے والا چاقو میز پر پٹخ دیا اور کرسی کی پشت سے سر لگا لیا۔ جارج کافی دیر سے کسی اشارے کی توقع کررہا تھا اور جم کا اس طرح چاقو گرانا رومالو کے لیے اشارہ ہی ہوسکتا تھا۔ جارج نے فوراً سر گھما کر رومالو کی طرف دیکھا جس کا ہاتھ ڈبل بریسٹ کوٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکالنے کے لیے بڑھ رہا تھا۔ اس نے فوراً بڑے زور سے رومالو کے پیٹ میں کہنی ماری۔ رومالو کے منہ سے بے ساختہ اُف کی آواز نکلی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھاما اور آگے جھک گیا۔ جارج نے بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ اس کی گدی پر رکھ کر زور سے جھٹکا دیا تو اس کا سر بُری طرح میز سے ٹکرایا۔ اس نے پیٹ سے ہاتھ ہٹا کر سر تھاما تو بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول جارج کے قدموں میں آگرا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ جم حیرت سے دیکھتا رہ گیا پھر وہ ایک دم کرسی سے اٹھا اور چلّانے لگا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' جارج غرایا۔ ''جب تک تمہارا یہ بونا ملازم گھٹیا حرکتوں سے باز نہیں آتا اسے باہر ہی رہنا چاہیے۔ دفع ہوجاؤ رومالو۔''

''ایک نہ ایک دن تم میرے ہاتھوں ضرور مارے جاؤ گے جارج۔'' رومالو دانت پیستا ہوا بولا۔

"تمہیں یہ موقع کبھی نہیں ملے گا احمق۔" جارج نے دوبارہ اپنے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اور ہاں دروازہ آہستہ بند کرنا، مسٹر جم براؤن شور پسند نہیں کرتے۔"

رومانو نے جاتے جاتے اپنا پستول اٹھانا چاہا مگر جارج نے اس پر پیر رکھ دیا اور بولا۔ "میں اسے اپنے پاس رکھوں گا، کہیں ایسا نہ ہو کسی وقت کوئی پولیس والا تم سے اس کا لائسنس پوچھ بیٹھے۔" یہ کہہ کر وہ اپنا پائپ سلگانے لگا۔ رومانو چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔

"اب ہمیں مطلب پر آجانا چاہیے۔" جارج نے جم سے کہا۔ "میں نے تم سے 2015ء کا لیجر مانگا تھا مگر تم نے لیجر دینے کے بجائے اپنے چمچے کو اشارہ کر دیا...... کیوں؟"

"میں...... میں نے اسے کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں اس نے ایسی حرکت کیوں کی؟" جم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"خیر ہٹاؤ۔ میں جانتا ہوں تم نے اپنی جان چھڑانے کو جھوٹ بولا تھا۔ لاؤ اب لیجر دکھاؤ۔"

"ہم...... ہم پرانے لیجر نہیں رکھا کرتے۔" جم نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تم پھر جھوٹ بول رہے ہو جم...... ریاست کے قانون کے مطابق پرانے لیجر رکھنا ضروری ہوتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں، میں جانتا ہوں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم نے پرانے لیجر تلف کر دیے ہیں۔ پرانے لیجر یہاں نہیں، کہیں اور رکھے ہوئے ہیں۔"

"وہ جہاں کہیں بھی ہوں، 2015ء کا لیجر منگواؤ اور مجھے دکھاؤ۔ ٹالنے کی کوشش مت کرو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس سلسلے میں کورٹ سے آرڈر لاؤں تو میں وہ بھی لا سکتا ہوں لیکن اس طرح تمہارے کاروبار کی بہت سی ڈھکی چھپی باتیں سامنے آجائیں گی۔ مثلاً یہ کہ تمہاری میزبان لڑکیاں آنے والے نوجوانوں کو چرس کا عادی بناتی ہیں اور تمہارے کارندے چرس بھرے سگریٹ بیچتے ہیں جس کا ایک ثبوت یہ ہے اور دوسرا میرے پارٹنر کے پاس جو ڈانس فلور پر رقص کر رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سگریٹ کا ٹوٹا نکالا اور جم کی طرف بڑھا دیا۔ جم یہ ٹوٹا دیکھ کر کرسی سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

"یہ باتیں چھوڑو جم...... میں انسدادِ منشیات کے محکمے سے وابستہ نہیں۔ کسی دن وہ تمہیں خود ہی آ دبوچیں گے۔ اس وقت میں گرانڈ انشورنس کمپنی کے نمائندے کی حیثیت سے آیا ہوں اور مجھے 2015ء کا تنخواہوں کا لیجر دیکھنا ہے۔"

"اچھی بات ہے مسٹر، میں دیکھتا ہوں شاید وہ یہاں ہو۔" جم بولا اور میز کی درازیں دیکھنے لگا پھر گویا ہوا۔ "نہیں، وہ اوپر اسٹور میں ہے۔ تم یہیں بیٹھو، میں جا کر اوپر سے لیجر لے آتا ہوں۔"

"بہتر...... مگر مجھے تم لوگوں کی چالاکیوں اور چالبازیوں نے سخت کوفت میں مبتلا کر دیا ہے۔ خاص طور پر تمہارے بونے محافظ کی حرکتیں ناگوار ہیں۔"

لیکن جارج کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی جم دفتر سے باہر جا چکا تھا۔

'یہ موٹا پکا بدمعاش لگتا ہے۔' جارج نے سوچا اور وہ جھگڑا کیسا تھا۔ ممکن ہے یہ جھگڑا انشورنس والے کیس سے بھی کچھ زیادہ دلچسپ ہو۔ پھر وہ اٹھ کر اس خیال سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا کہ جم یا رومانو کوئی غلط حرکت نہ کریں۔

ویسے اس کا امکان اس لیے کم تھا کہ چرس اور پارٹنر والی دھمکی انہیں ہتھیاروں سے کام لینے یا اسے اغوا کرنے سے باز رکھے گی۔ وہ اس خوف کے سبب کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے کہ اس کا پارٹنر فلور پر موجود ہے اور اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو وہ بچ نہیں سکیں گے۔

دروازے پر نگاہ رکھتے ہوئے اس نے کمرے میں گھوم پھر کر جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کیونکہ اسے آرائشی اشیا پر شبہ تھا چنانچہ یہ دیکھ کر اسے قطعی تعجب نہ ہوا کہ کھڑکیوں کے پردے صرف دھوکا دینے کے لیے آویزاں کیے گئے ہیں ورنہ ان کے پیچھے کھڑکیوں کے بجائے ٹھوس دیواریں تھیں۔ اس نے ان پردوں کو محض نمائشی اس لیے تصور کیا تھا کہ جو شخص رومانو جیسے شخص کو اپنا باڈی گارڈ رکھتا ہے، وہ کھڑکیوں والے کمرے میں کیوں بیٹھنے لگا۔ نئے ملنے والوں کو دفتر کی جائے وقوع سے لاعلم رکھنے والا کھڑکیوں کے امکان کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح کمرے کا جائزہ نہیں لے پایا تھا کہ اسے باہر سے پولیس سائرن کی طویل چیخ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہاں آتے ہوئے ہال سے گزرتے وقت اس نے دفتر کے مقابل پرلے سرے پر واقع ڈریسنگ روم پر نگاہ ڈالی، اس وقت ڈریسنگ روم کا دروازہ بند تھا۔ لیکن اب وہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ اس میں دیوار کے ساتھ طویل ڈریسنگ ٹیبل، آئینے، تیز روشنیاں، لاکرز، کینوس کی کرسیاں اور اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے نسوانی ملبوسات دکھائی دے رہے

تھے۔ جارج ڈریسنگ روم کی طرف بھاگا۔ جب وہ ڈریسنگ روم کے لاکرز کے پاس پہنچا تو اسے ایک میزبان لڑکی گاؤن کے بغیر ساکت و صامت کھڑی دکھائی دی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک اور لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا منہ بھی کھلا ہوا تھا اور اس کے گلے میں ایک چاقو پیوست تھا۔

چاقو کا صرف دستہ ہی باہر نظر آرہا تھا اور اس کے قریب دوسری میزبان لڑکی کا کھلا ہوا منہ چیخیں اگل رہا تھا۔ جارج نے اپنی ہتھیلی اس کے منہ پر رکھ دی اور اسے وہاں سے دوسری طرف کھینچ لے گیا۔ یہ ہیلن تھی۔ جارج بولا۔ "بس اب چیخنا بند کرو ہیلن۔" یہ کہتے ہوئے اس نے منہ سے ہتھیلی ہٹالی۔ ہیلن نے بھی شاید اسے پہچان لیا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی لیکن خوف کے مارے اس کی حالت غیر تھی۔ جارج نے اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور جھک کر دوسری میزبان لڑکی کا جائزہ لینے لگا۔

یہ دوسری میزبان لڑکی گلڈا تھی اور مر چکی تھی لیکن یہ بات تعجب خیز تھی کہ اس کے اردگرد زیادہ خون پھیلا ہوا نہیں تھا۔ حالانکہ چاقو اس کے نرخرے میں اُتر گیا تھا۔ جارج اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کمرے میں اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی کہ شاید اسے واردات سے متعلق کوئی نشان یا بچاؤ کی جدوجہد کے نتیجے میں کچھ شواہد نظر آجائیں لیکن وہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا کیونکہ پورے ڈریسنگ روم میں کرسیاں اور ملبوسات بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ہیلن کے پاس آیا اور اس کے کانپتے ہوئے شانوں کو اپنی گرفت میں لیتا ہوا بولا۔ "ہوا کیا تھا ہیلن؟"

"میں لباس تبدیل کرنے کے لیے یہاں آئی اور جب میں نے اپنا لاکر کھولا تو وہ مجھ پر آگری۔" ہیلن نے رک رک کر خوف زدہ لہجے میں بتایا۔

"میرا اندازہ بھی یہی تھا، خیر...... ڈرو نہیں۔ آرام سے بیٹھو۔" جارج نے اسے تسلی دی اور ایک گاؤن اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا تاکہ وہ اپنا تن ڈھانپ لے۔

پھر وہ طویل ڈریسنگ ٹیبل کے سرے پر رکھے انٹرکام کے پاس آگیا، ایک لمحہ سوچتا رہا پھر بکنگ آفس کا بٹن دبایا اور انٹرکام پر بولا۔ "پولیس ہیڈکوارٹر فون کر دو لوسی اور ان سے کہو کہ وہ لیفٹیننٹ جان کو یہاں بھیج دیں کیونکہ یہاں ایک قتل کی واردات ہو گئی ہے اور ہاں اپنے کارندوں کو بھی مطلع کر دو کہ وہ پولیس کی آمد تک کسی کو باہر نہ جانے دیں۔"

"بہت بہتر مگر...... قتل کس کا ہوا ہے؟ گلڈا کا؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا لوسی؟" جارج نے تعجب سے پوچھا۔

"میری چھٹی حس نے بتایا ہے۔" لوسی نے جواب دیا۔ جارج نے انٹرکام بند کرتے ہوئے سوچا، وہ لیفٹیننٹ جان سے یہ کہنا نہیں بھولے گا کہ وہ لوسی کو کسی قیمت پر بھی نظرانداز نہ کرے۔ ہوسکتا ہے اس کی چھٹی حس نے ہی بتایا ہو مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اس واردات کے پس منظر سے واقف ہو۔

لیفٹیننٹ جان اور اس کے عملے کی آمد کے ایک گھنٹے بعد قتل کی تفصیل معلوم ہو گئی، سوائے اس کے کہ قاتل کون تھا اور اس نے گلڈا کو کیوں قتل کیا۔ اس دوران جارج تین بار پائپ پی چکا تھا۔ اب اس کی زبان جل رہی تھی۔ وہ کینوس کی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنی ٹانگیں ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ لی تھیں۔ قریب ہی لیفٹیننٹ جان بیٹھا میڈیکل ایگزامنر اور اس کے نائب کو لاش کا معائنہ کرتے دیکھ رہا تھا۔

"جم براؤن اور رومانو کا کچھ پتا چلا؟" جارج نے پوچھا۔

"نہیں، کسی نے بھی انہیں باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا اور ہم نے رقص گاہ کی پوری عمارت چھان ماری ہے مگر وہ کہیں نہیں ملے۔" جان نے جواب دیا۔

"میزبان لڑکیوں یا کارندوں سے ڈھنگ کی کوئی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟"

"انہوں نے وہ سب کچھ بڑی تفصیل سے بتایا ہے، جس کا واردات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے بیشتر لڑکیوں اور کارندوں کو جانے کی اجازت دے دی۔"

"تم نے لوسی سے پوچھ گچھ کی؟"

"ہاں، میں اسے مشتبہ سمجھتا ہوں... اس لیے میں نے اسے روک لیا ہے۔"

"گلڈا کے بارے میں کچھ معلومات؟" جارج نے قدرے توقف بعد پوچھا۔

"ہاں۔" جان بولا۔ "جم نے اپنی میزبان لڑکیوں کے ٹکٹوں کا حساب سونپا تھا اور وہ اکثر و بیشتر ٹکٹ شمار کرتے ہوئے ڈنڈی مار جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ جم کی منظورِ نظر بھی تھی۔ اس لیے بہت سی لڑکیاں اسے پسند نہیں کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں وہ یہاں کی سب سے پرانی میزبان تھی۔"

اتنے میں لاش کا معائنہ کرنے والا ایگزامنر جان کی

طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں ایک سراغ مل گیا ہے۔ مقتولہ کے ناخنوں کے اندر کچھ ایسا مواد ملا ہے جس سے قاتل کا پتا چلایا جاسکتا ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ جان نے پوچھا۔

”انسانی جلد کے بہت باریک ٹکڑے، ایسا لگتا ہے کہ مقتولہ نے اپنے بچاؤ کی کوشش کرتے ہوئے قاتل کا چہرہ نوچا تھا۔ یہاں جس چہرے پر خراشیں ہوں وہی اس کا قاتل بھی ہوسکتا ہے۔“

”ویری گڈ۔“ جان بولا۔ ”ہم آسانی سے قاتل تک پہنچ جائیں گے۔“

یہ سن کر جارج مسکرایا اور ایگزامنر سے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے تمہارا سراغ قاتل کی نشاندہی نہیں کرسکتا۔“ پھر وہ جان سے مخاطب ہوا۔ ”گلڈا نے میرے سامنے فی فی کا چہرہ نوچا تھا۔“

”کب، کیوں اور کہاں؟“ جان نے چونک کر پوچھا تو جارج نے اسے جھگڑے کے بارے میں بتادیا جو اس نے جم کے دفتر میں دیکھا تھا۔ جان نے میزبان لڑکیوں اور کارندوں کی فہرست دیکھی اور بولا۔ ”اس فہرست میں تو فی فی کا نام ہی نہیں ہے۔“

”ممکن ہے فی فی اس کا فرضی نام ہو جسے وہ ڈانس فلور کے میزبان کے طور پر استعمال کرتی ہو۔“ جارج کی اس بات پر جان نے اپنے سارجنٹ سے کہا کہ وہ میزبان لڑکیوں سے فی فی کے متعلق معلومات حاصل کر کے اسے بتائے۔ چند منٹوں بعد سارجنٹ واپس آیا اور اس نے بتایا کہ فی فی کا نام لیری گولڈ ہے۔ اور لاش ملنے کے بعد اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے وہ ہمارے آنے سے قبل جا چکی ہو۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر فی فی کے علاوہ جم اور رومانو پر بھی قتل کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ جارج بولا۔ ”اگر یہ واردات جم نے کی ہے تو پانچ منٹ کے اندر اندر ہی کی ہوگی کیونکہ اس کے دفتر سے جانے کے تقریباً پانچ منٹ بعد مجھے ہیلن کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی تھی۔“

”چاقو زنی کے لیے پانچ منٹ بھی بہت ہوتے ہیں جارج۔“ جان بولا۔ ”ویسے مجھے جم سے زیادہ فی فی پر شبہ ہے۔“

جان کی یہ بات سُن کر ہیلن ان کی طرف پلٹی اور بولی۔ ”ارے ہاں، ڈریسنگ روم میں آنے سے دس منٹ پہلے میں نے اسے دیکھا تھا، وہ اپنے عام لباس میں تھی اور شاید گھر جارہی تھی۔“

”اس کی حالت سے کیا اندازہ ہوتا تھا۔“ جارج نے پوچھا۔

”وہ بہت گھبرائی ہوئی اور خوف زدہ لگ رہی تھی۔ اس نے اپنا آدھا چہرہ بھی رومال سے چھپایا ہوا تھا۔ میں سمجھی شاید اس کے دانت میں درد ہے۔“ ہیلن نے جواب دیا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ قتل اسی نے کیا ہے، گلڈا سے اس کی تلخ کلامی ہی نہیں جھگڑا بھی ہوا تھا۔ چنانچہ چاقو زنی کے بعد اسے فرار کا موقع مل گیا اور وہ بھاگ گئی مگر میں اسے فرار کا مزید موقع نہیں دوں گا۔“ یہ کہہ کر جان، سارجنٹ کو اس کے متعلق ہدایات دینے لگا اور جارج کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

جب جان ہدایات دے کر فارغ ہوا تو جارج اس کے قریب آیا اور بولا۔ ”کیا تم مجھے جم کے دفتر کی چھان بین کا ایک موقع دے سکتے ہو جان؟“

”مگر کیوں؟ میرے آدمی پہلے ہی دفتر کا جائزہ لے چکے ہیں۔ وہاں سے کوئی ایسی چیز دستیاب نہیں ہوئی جس کا اس واردات سے کوئی تعلق ثابت ہوتا ہو۔“

”میری چھان بین کا اس واردات سے کوئی تعلق نہیں۔ ابھی ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ اپنی تحقیقات کے سلسلے میں، میں جو لیجر دیکھنا چاہتا ہوں شاید وہ اس میز کی دراز میں موجود ہو اور جم نے جھوٹ بول کر مجھے ٹال دیا تھا۔“

”تم کس کیس کی تحقیقات کر رہے ہو؟“

”یہ ایک لڑکی کی پُراسرار گمشدگی کا معاملہ ہے۔“ جارج نے بتایا۔

”وہ زیکوسلواکیہ والی لڑکی تو نہیں؟ کیا نام تھا اس کا؟“ جان نے پوچھا۔

”ویسٹا۔“ جارج نے بتایا۔

”لیکن اس کے نام کا جم کی اکاؤنٹ بک سے کیا واسطہ؟“ جان جرح کرنے پر تُل گیا۔

”وہ یہاں کام کرتی تھی مگر جم اس سے انکار کرتا ہے۔ اس نے مجھے نہ صرف لیجر دکھانے سے گریز کیا بلکہ اپنے پیچھے سے مروانا بھی چاہا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے یہ سب کیوں کیا؟“ جارج نے وضاحت کی۔

”اچھی بات ہے۔ میں تمہیں اس شرط پر اجازت دے سکتا ہوں کہ جو کچھ تمہیں معلوم ہو، مجھ سے نہیں چھپاؤ گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں جان، تمہیں سب کچھ بلاکم و

کاست بتادوں گا اور اگر کوئی ثبوت ملا تو وہ بھی دکھادوں گا۔“

یہ کہہ کر جارج جانے لگا۔ وہ ہیلن کے قریب سے گزرا تو ہیلن نے اس کا بازو پکڑ لیا اور بولی وہاں مت جاؤ، پلیز۔“

”مگر کیوں؟ جارج نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اب ہیلن کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ پیار بھی تھا۔ وہ بولی۔ ”مجھے ڈر ہے کہ کہیں جم یا وہ بونا شیطان ادھر ادھر چھپے ہوئے نہ ہوں اور تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔“

”مجھے اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کی وجہ سے ہی اچھا معاوضہ ملتا ہے عزیزمن۔ دیکھو تم پریشان اور تھکی ہوئی ہو۔ اگر جان تمہیں جانے دے تو کیا تم مجھے یہ اجازت دو گی کہ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں؟“

ہیلن نے ایک نظر جارج کو دیکھا، اس کے ہونٹ بھنچ گئے پھر وہ نگاہیں جھکاتے ہوئے بولی۔ ”اگر تم ایسا چاہتے ہو تو میں تمہیں منع نہیں کروں گی لیکن اتنا ضرور بتادینا چاہتی ہوں کہ......“

”تم مجبور تو ہو لیکن ادا فروش نہیں۔“ جارج نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے اس کا جملہ مکمل کیا تو ہیلن نے ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی گھٹائیں برسنے کو تیار کھڑی تھیں۔ وہ بولی۔

”اگر میں تن ڈھانپنے یا پیٹ بھرنے اور سر چھپانے کے لیے جم کی مقروض نہ ہوتی تو اس جہنم میں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہرتی جہاں عورت کو قالین سمجھ کر قدموں تلے روندا جاتا ہے۔ جہاں ہر لڑکی پر کال گرل کا لیبل لگا دیا جاتا ہے اور جہاں ہر عورت آبرو باختہ تصور کر لی جاتی ہے۔“ یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی اور سسکیاں لینے لگی۔ جارج نے اس کے کانپتے شانے تھپتھپائے اور بولا۔

”تم نے مجھے غلط سمجھا ہیلن۔ گھر پہنچانے سے میرا مطلب وہ نہیں تھا۔ اچھا اب آنسو پونچھ لو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ہال میں آیا جو اب ہنگامے سے خالی تھا اور پھر جم کے دفتر میں چلا گیا۔

اگرچہ درجن بھر پولیس والے اس دفتر کی تلاشی لے چکے تھے مگر اب بھی وہ تقریباً اس حالت میں تھا جس میں جارج اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ پولیس والوں نے میز کو نہیں چھیڑا تھا۔ اس پر رکھی اشیا اسی طرح دھری تھیں۔ جارج نے دراز کھولنا چاہی تو پتا چلا کہ ساری درازیں مقفل ہیں لیکن اس کی جیب میں ایک ایسی چابی (ماسٹر کی) موجود تھی جس سے بہت سے قفل کھولے جاسکتے تھے۔ وہ چابی یہاں بھی کام دے گئی اور سب سے نچلی دراز سے اسے 2015ء کا لیجر مل گیا۔ وہ دل ہی دل میں جم کو گالیاں دیتے ہوئے لیجر دیکھنے لگا۔ ویسٹا نے واقعی مئی 2015ء میں یہاں کام شروع کیا تھا اور وہ اب تک یہیں کام کر رہی تھی۔ ”او تو وہ خبیث اس لیے لیجر نہیں دکھا رہا تھا لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ویسٹا ابھی تک یہاں کام کر رہی ہو۔“ جارج بڑبڑایا۔ سب کہتے ہیں گلڈا یہاں سب سے پرانی میزبان تھی اور وہی میزبان لڑکیوں کے ٹکٹوں کا حساب بھی رکھتی تھی۔ تو پھر وہ یقیناً ویسٹا کو جانتی ہو گی۔ وہ ایک بار پھر لیجر کا معائنہ کرنے لگا۔

اتنے میں اسے ہوا کے جھونکے کے ساتھ خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے لیجر سے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھنا چاہا لیکن سر اٹھانے سے پہلے ہی کمرے کی روشنی گل ہوگئی۔ اس لمحے جارج نے اپنے آپ کو فرش پر گرادیا۔ اس کی یہ حرکت لاشعوری تھی۔ دوسرے ہی لمحے اسے ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ ہی کسی چیز کے میز سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑی تیزی لیکن خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ اگر فرش پر دبیز قالین نہ ہوتا تو اس کی ذرا سی آہٹ بھی جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی پھر اس کرسی سے دھپ کی آواز آئی جس پر وہ بیٹھا لیجر دیکھ رہا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس گھپ اندھیرے میں جم اس کے لیے فرشتۂ اجل بن کر آیا ہے یا رومانو۔ لیکن اتنا وہ جان چکا تھا کہ قاتل کسی آہٹ اور ذرا سی آواز کا منتظر ہے۔ جارج کی طرح قاتل بھی دم سادھے ہوئے تھا۔ شاید اسے بھی یہ احساس تھا کہ جارج بھی اس کے لیے موت کا فرشتہ بن سکتا ہے۔

ہر لمحہ لمحۂ جاں گسل بنتا جارہا تھا۔ موت اپنے بازو وا کیے کھڑی تھی۔ کسی پل، کسی گھڑی جارج اس کے بازوؤں میں جاسکتا تھا یا کسی لمحے وہ خود اسے دبوچ سکتی تھی۔ موت کی یہ اندھی اور اندھیری آنکھ مچولی جارج سے زیادہ دیر برداشت نہ ہوسکی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کرسی ذرا سی کھسکائی اور فوراً اس جگہ سے ہٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے کوئی چیز کرسی سے ٹکرائی۔ قاتل اس سے بہت قریب تھا۔

جارج نے سوچا جب موت اتنی قریب آچکی ہے تو ایک بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ضرور دیکھنا چاہیے۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو آدمی اندھیروں میں کیوں دم توڑے۔ اس لیے قاتل کا چہرہ دیکھ لیا جائے تو اس کی شناخت کی حسرت باقی نہ رہے گی۔ یہ سوچ کر اس نے اپنا پائپ ایک طرف اچھال دیا تاکہ قاتل آہٹ پر ادھر لپکے تو وہ لائٹ آن کردے لیکن اب کے قاتل ادھر نہیں لپکا۔ جارج کو اپنے قریب سے خوشبو کی ایک لہر گزرتی محسوس

ہوئی، دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور قاتل چشم زدن میں باہر نکل گیا۔ اسے شناخت کرنے کی حسرت جارج کے دل میں ہی رہ گئی۔ جارج نے آگے بڑھ کے لائٹ آن کر دی۔ کمرا پھر جگمگا اٹھا۔ اس نے پلٹ کر میز کی طرف دیکھا۔ سارے لیجر غائب تھے۔ وہ اپنا پائپ اٹھانے آیا تو اس نے دیکھا کہ جو کرسی اس نے کھسکائی تھی اس کے کشن میں ایک چاقو پیوست ہے۔ اس کی نگاہیں چاقو پر جم کر رہ گئیں۔ اوہ تو یہی چاقو اسے ہلاک کرنے کے لیے میز سے ٹکرایا تھا۔ اس نے چاقو نکال کر اس کا پھل غور سے دیکھا تو اس کی بھویں اٹھے بغیر نہ رہ سکیں۔ چاقو احتیاط سے جیب میں ڈال کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھولتے ہی اس کی نگاہ سفید کوٹ والے ان تین آدمیوں پر پڑی جو گلنڈا کی لاش لیے جا رہے تھے۔ جارج نے جلدی سے ان سے آگے بڑھ کر کہا۔ ”رک جاؤ ذرا۔“ پھر جان سے مخاطب ہوا جو ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ”کیا تم نے گلنڈا کی انگلیوں کے نشانات لیے تھے؟“

جان کے بجائے میڈیکل ایگزامنر بول اٹھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے ہم اپنے فرائض نہیں جانتے؟“

”تم برا مان گئے شاید۔“ جارج نے کہا۔ ”میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ غالباً مجھے فنگر پرنٹ کارڈ کی ضرورت پڑے گی۔“

”یہ تو بعد کی بات ہے، پہلے یہ بتاؤ تمہیں جم کے دفتر سے کچھ ملا؟“ جان نے پوچھا۔

”ہاں بہت کچھ۔“ جارج نے اسے حملہ آور کی آمد اور قتل کی کوشش کے بارے میں مختصراً بتاتے ہوئے جیب سے چاقو نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ چاقو دیکھ کر جان بھونچکا رہ گیا۔ یہ وہی چاقو تھا جس سے گلنڈا قتل کی گئی تھی۔ جان چلّایا۔ ”یہ ڈریسنگ روم میں تھا، اسے کس نے چرایا، کون لے گیا جم کے دفتر میں؟“ جان اپنے آدمیوں پر برس رہا تھا اور جارج ڈریسنگ روم کے دروازے سے ہیلن کو دیکھ رہا تھا جو اسی طرح کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک جارج کو خیال آیا، ہیلن کو یہ اندازہ کیوں اور کیسے ہوا تھا کہ جم اور رومانو یہیں کہیں چھپے ہوئے ہوں گے، ہوسکتا ہے وہ اسے نقصان پہنچائیں اس لیے وہ جم کے دفتر میں نہ جائے اور اس کا یہ خیال ٹھیک ہی نکلا تھا لیکن پولیس نے ساری عمارت چھان ماری تھی اور وہ دونوں کہیں نہیں ملے تھے۔ جب وہ باہر بھی نہیں گئے اور اندر بھی دکھائی نہیں دیے تو ہیں کہاں؟ یہ سوچتے سوچتے پہلے تو اس کی بھویں سکڑیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اتنے میں جان کا نائب ہال روم سے ادھر آیا تو جارج کو مسکراتے دیکھ کر بولا۔ ”کیا کوئی لطیفہ ہوگیا ہے؟“

”اگر میں تمہیں یہ بتا دوں کہ جم اور رومانو ابھی تک عمارت میں موجود ہیں تو تم کیا کہو گے، سارجنٹ؟“ جارج نے پوچھا۔

”آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے جناب۔“ سارجنٹ بولا۔ ”میں نے اور میرے آدمیوں نے عمارت کا چپّا چپّا چھان لیا ہے مگر وہ دونوں کہیں نہیں ملے۔“

”اب کیا بحث ہو رہی ہے۔“ جان نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

سارجنٹ نے جارج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کہتے ہیں کہ جم اور رومانو اس عمارت میں چھپے ہوئے ہیں جبکہ ہم نے ہر جگہ دیکھ کر اطمینان کر لیا ہے۔“

”اگر جارج یہ کہتا ہے تو ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ یہ بغیر وجہ کے کوئی بات نہیں کرتا۔“ یہ کہہ کر وہ جارج سے مخاطب ہوا۔ ”کیا تم نے انہیں کہیں چھپے ہوئے دیکھا ہے؟“

”دیکھا تو نہیں لیکن یہ جان گیا ہوں کہ وہ دونوں کہاں چھپے ہوئے ہوں گے۔“ جارج نے جواب دیا۔ ”عام طور پر ہر پبلک بلڈنگ میں ایک جگہ ایسی ہوتی ہے جہاں مرد حضرات اور پولیس والے بھی نہیں جایا کرتے اور وہ جگہ ہوتی ہے لیڈیز ٹوائلٹ۔“

”مگر ہم وہاں گئے تھے۔“ سارجنٹ بولا۔

”تم میرے آدمیوں پر غفلت برتنے کا الزام لگا رہے ہو جارج؟“ جان نے ناگواری سے پوچھا۔

”میں تمہارے عملے پر کوتاہی کا الزام نہیں لگا رہا مگر جان میں مردوں کی فطرت کو سمجھتا ہوں۔ اگر کبھی ہمیں ہنگامی حالت میں لیڈیز ٹوائلٹ (واش روم) جانا بھی پڑے تو ہم جھجکتے ہوئے دستک دیتے ہیں پھر اندر جھانکتے ہیں اور طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے لوٹ آتے ہیں۔ شاید تمہارے آدمیوں نے بھی ایسا ہی کیا ہو۔ آؤ ایک بار پھر لیڈیز ٹوائلٹ کا جائزہ لیتے ہیں۔“

جارج، جان اور سارجنٹ لیڈیز ٹوائلٹ کی طرف بڑھے۔ جارج نے دروازہ کھولا مگر اندر جانے کے بجائے وہیں رک کر بہ آوازِ بلند بولا۔ ”جم اور رومانو کھیل ختم ہوگیا۔ اب شرافت سے باہر آجاؤ۔“ چند لمحے تک کوئی جواب نہ ملا۔ پھر آخری ٹوائلٹ کے کیبن کا دروازہ ذرا سا کھلا اور اس کی درز سے ایک آنکھ جھانکتی دکھائی دی۔ ساتھ ہی پستول کی

نال بھی درز سے باہر نکلی تو جارج ایک دم پیچھے ہٹ کر دیوار سے چپک گیا۔ اسی لمحے سنسناتی ہوئی گولی دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرا کر پھرکی کی طرح فرش پر گھومنے لگی۔

گولی کی آواز پر عمارت کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے سپاہی وہاں آگئے اور گولیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ جارج نے جان سے کہا۔ ”اس بونے شیطان کا ایک پستول تو میں تمہیں دے چکا ہوں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خبیث کے پاس دوسرا پستول بھی موجود تھا۔“

”یقیناً ہوگا ورنہ وہ گولی کیسے چلاتا۔“ جان نے جواب دیا اور اپنے آدمیوں کو گولی نہ چلانے کا اشارہ کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند بولا۔ ”پستول پھینک کر باہر آجاؤ ورنہ ہمیں آنسو گیس استعمال کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔“

جان کا یہ الٹی میٹم کام کر گیا۔ پہلے فرش پر پھسلتا ہوا پستول دروازے سے ٹکرایا پھر جم اور رومانو ہاتھ اٹھائے باہر آگئے۔ پولیس کی فائرنگ سے لیڈیز ٹوائلٹ کیبن کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا جس کی ایک کرچی رومانو کا گال زخمی کر گئی تھی۔ وہ خونخوار نظروں سے جارج کو گھور رہا تھا جبکہ جم بُری طرح خوف زدہ تھا۔ وہ ہانپتے کانپتے بولا۔

”میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ خدا گواہ ہے وہ پہلے سے مری پڑی تھی۔ میں نے اسے راستے سے ہٹانے کے لیے لا کر یہیں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔“

بیشتر اس کے کہ جان، جم سے کوئی پوچھ کچھ کرتا، جارج نے کہا۔ ”سارجنٹ سے کہو، انہیں ڈریسنگ روم میں لے جائے۔“

”اور ہم......؟“ جان نے پوچھا۔

”ہم تھوڑی دیر یہاں رکیں گے۔“ جارج نے جواب دیا۔ جب سارجنٹ اور سپاہی جم اور رومانو کو لے کر چلے گئے تو جارج، جان کے ساتھ ٹوائلٹ میں آگیا جس کا دروازہ ڈریسنگ روم میں کھلتا تھا۔ اس نے پہلے تو پورے ٹوائلٹ روم کا طائرانہ نظروں سے جائزہ لیا پھر کونے میں رکھے ہوئے کچرے کے ڈرم کے پاس آگیا۔

جان تعجب سے اس کی حرکات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ جارج نے ڈرم کا ڈھکنا اٹھایا، اندر دیکھا، ٹاول پیپر کا ایک بڑا سا ٹکڑا کاٹ کر فرش پر بچھایا اور ڈرم اس پر الٹ دیا۔ کوڑے میں وہ لیجر بھی شامل تھے جو جم کے دفتر سے اندھیرے میں کسی نے غائب کر دیے تھے۔ یہ دیکھ کر جان بولا۔ ”سچ تو یہ ہے جارج مجھے اس وقت تمہاری کہانی پر یقین نہیں آیا تھا مگر تم ٹھیک کہتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ جم یا رومانو نے ہی تم پر اندھیرے میں حملہ کیا تھا اور یہ لیجر لے آیا تھا۔“

جارج نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے لیجر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”ان کا خیال رکھنا، یہ بہت اہم ثبوت ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اس چھوٹے سے دیوان کی طرف بڑھ گیا جو ٹوائلٹ اور ڈریسنگ روم کے درمیان دوراہے کے قریب پڑا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر دیوان کا کشن غور سے دیکھا اور پھر اسے الٹ دیا۔ اسفنج کا کشن خون آلود تھا۔

”اوہ......“ جان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تمہیں کس بات نے یہ کشن الٹ کر دیکھنے پر اکسایا؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے مجھے وہ چیز ڈھونڈ لینے دو جس کی مجھے تلاش ہے۔“ جارج بولا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جلد ہی اس کی متلاشی نگاہیں واش بیسن کے قریب ایک دیوار گیر چوبی بکس پر جم کر رہ گئیں۔ وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔

ایسے دیوار گیر چوبی بکس عام طور پر ہر ٹوائلٹ روم میں ہوا کرتے ہیں اور ان میں ٹوائلٹ پیپر اور صفائی کے لیے کام آنے والی اشیا رکھی جاتی ہیں۔ جارج نے اس کا پٹ کھولا تو ٹوائلٹ پیپر کے متعدد رول لڑھک کر فرش پر آرہے۔ کیونکہ یہ اس قسم کی اشیا سے اَٹا ہوا تھا۔ جارج نے باقی ماندہ رول ہٹا کر ایک چھوٹا سا پیکٹ نکال لیا جو ٹاول پیپر میں لپٹا ہوا تھا۔ جارج نے کاغذ پھاڑ کر ایک نظر اسے دیکھا اور جھاڑن میں لپیٹنے لگا تو جان بولا۔ ”یہ کیا ہے، مجھے دکھاؤ۔“

”ذرا صبر سے کام لو جان، کوئی چیز تم سے ڈھکی چھپی نہیں رہے گی، آؤ۔“ جارج بولا اور وہ دونوں ڈریسنگ روم کی طرف چل دیے۔

اس دوران جان کے آدمی ٹی ٹی کو اس کے گھر سے لے آئے تھے۔ وہ بھی ڈریسنگ روم میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ جم اور رومانو کو ہتھکڑیاں لگا دی گئی تھیں۔ وہ بھی وہیں موجود تھے اور ہیلن کے علاوہ لوسی بھی...... متعدد پولیس والے انہیں گھیرے میں لیے کھڑے تھے۔ جب جان اور جارج وہاں آئے تو جان نے ٹی ٹی کو دیکھتے ہی کہا۔ ”تو یہ ہے ٹی ٹی جس کا مقتولہ سے جھگڑا ہوا تھا اور جو مقتولہ کی لاش ملنے سے دس منٹ پہلے فرار ہوگئی تھی۔“

”مگر میں نے اس حرافہ کو قتل نہیں کیا۔“ ٹی ٹی چلّائی۔

”ایسے کام یہ بونا شیطان اور موٹا سُور کرتے ہیں۔“

”بکواس بند کرو۔ تم اسے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہی تھیں۔“ جم ہانپتے ہوئے بولا۔ اس پر جارج نے جان سے کہا۔

’’انہیں اس تُوتُو، میں میں سے روکو جان۔ ابھی قاتل کا پتا چل جائے گا۔‘‘

’’بس اب کوئی نہ بولے۔‘‘ جان نے جم، رومانو اور ٹی ٹی کو حکم دیا اور سوالیہ نگاہوں سے جارج کی طرف دیکھنے لگا۔ جارج ڈریسنگ روم کے کونے پر بیٹھ گیا۔ اس نے وہ چھوٹا سا بنڈل اپنے قریب رکھ لیا جو ٹوائلٹ روم سے لایا تھا پھر اس نے تینوں مشتبہ افراد پر نظر ڈالی اور کہنے لگا۔

’’میرے علم کے مطابق یہ کہانی مئی 2015ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب ویسنا، جم کے پاس آئی تھی اور اس نے میزبان لڑکی کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ ان دنوں جم کا کاروبار مندا تھا اور وہ اسے بند کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن ویسنا میں اسے کچھ ایسی خوبیاں نظر آئیں کہ اس نے کاروبار بند کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ویسنا کے اشتراک سے ایک منصوبہ بنایا۔‘‘

’’کیا گلڈا کا قتل اس منصوبے کے تحت ہوا؟‘‘ جان نے جارج کی بات کاٹی۔

’’ذرا تحمل سے کام لو جان۔ میں جو کہانی بیان کر رہا ہوں، ہوسکتا ہے کہ اس کے تانے بانے میں اس قتل کے تار و پود بھی شامل ہوں۔ ہاں تو جم نے اس منصوبے کے تحت ڈیکوسلوا کیہ کے تارکینِ وطن کی ایک فرضی لبریشن کمیٹی بنائی اور ویسنا کو ایک کروڑ پتی صنعت کار کی بیٹی اور اپنے باپ کے ترکے کی واحد وارث ظاہر کرتے ہوئے اس کی زندگی کا دس لاکھ ڈالر کا بیمہ کروانا چاہا۔ گرانڈ انشورنس کمپنی نے دیگر دو کمپنیوں کے ساتھ مل کر اس کی بیمہ پالیسی منظور کر لی۔ اس پالیسی کے مطابق ویسنا کی موت کی صورت میں بیمہ کی رقم جم باڈلسکی اور نام نہاد لبریشن کمیٹی کو ادا کی جانی تھی۔ جم اور ویسنا کا منصوبہ یہ تھا کہ کچھ عرصے بعد کسی دوسری عورت کی میت کو ویسنا کی لاش بتا کر بیمے کی رقم وصول کر لی جائے لیکن بعد میں انہیں احساس ہوا کہ یہ کام بظاہر جتنا آسان نظر آتا تھا، اتنا ہی مشکل ہے۔ اس میں صرف بیمہ کمپنی ہی نہیں حکومت کے متعدد محکمے بھی تفتیش کریں گے اور ان سب کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ ویسنا غائب ہو جائے اور جب پولیس اس کی تلاش اور بازیابی میں ناکام رہی تو بیمے کی رقم مل جائے گی۔ چنانچہ ویسنا بظاہر غائب ہوگئی۔

’’مگر نام بدل کر اس رقص گاہ میں کام کرتی رہی۔ جم اور ویسنا کو یقین تھا کہ چونکہ میزبان لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ اس لیے یہاں آنے والے مہمان اور دوسرے لوگ بہت جلد ویسنا کا نام بھول جائیں گے لیکن کرنا خدا کا یوں ہوا کہ گلڈا جو جم کی منظورِ نظر تھی اور میزبان لڑکیوں کا حساب کتاب رکھتی تھی، تنخواہ کے رجسٹر اور لیجر میں اس کا اصلی نام ہی لکھتی رہی۔ جم کا خیال تھا کہ رجسٹرا انشورنس کمپنی اور پولیس والے صرف نام نہاد لبریشن کمیٹی کا ریکارڈ ہی دیکھیں گے اور مطمئن ہو جائیں گے۔

’’اس لیے اس نے بھی اس طرف کوئی توجہ نہ دی اور انتظار میں بیٹھا رہا کہ آج نہیں تو کل کورٹ اس کے حق میں فیصلہ دے دے تو بیمے کی رقم اسے مل جائے گی۔ اب گلڈا کی سنیے۔ میں نے ٹی ٹی کے ساتھ اس کے جھگڑے سے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ گینگسٹر ہے اور اس کے ساتھ رومانو کے نرم سلوک سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ ان کی آپس میں ملی بھگت ہے۔ یہ سب دیکھ کر میرے لیے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں تھا کہ رومانو اس کی وساطت سے یہاں آیا ہوگا اور اب دونوں جم کو خوف زدہ کر کے مال بٹور رہے ہوں گے۔‘‘

اتنا کہہ کر جارج نے جم اور رومانو پر نظر ڈالی۔ جم، رومانو کو غصے سے اور رومانو جارج کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔

جان اس طولانی گفتگو سے بور ہو گیا اکتاہٹ سے بولا۔ ’’تمہاری اس روداد کا تعلق انشورنس کے کیس سے ہے، قتل کی واردات سے نہیں اور میں اس واردات سے دلچسپی رکھتا ہوں۔‘‘

’’بس اب میں اسی پوائنٹ پر آنے والا ہوں جان۔ آج جب میں یہاں آیا اور لوسی کو بتایا کہ میں کون ہوں تو ڈانس فلور پر میرے پہنچنے سے پہلے ہی ساری میزبان لڑکیوں اور کارندوں کو میرے بارے میں علم ہو چکا تھا۔ چونکہ جم انشورنس والے منصوبے کی وجہ سے ویسنا کو اہمیت اور فوقیت دیتا رہا تھا۔ اس لیے گلڈا اس سے خار کھاتی تھی۔ چنانچہ رومانو سے میری آمد کا مقصد جان کر اس نے ویسنا کو بھانڈا پھوڑنے کی دھمکی دی تو ویسنا نے اس کی گردن میں چاقو گھونپ دیا۔‘‘

’’اوہ...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ گلڈا کا جم یا رومانو نے نہیں بلکہ کسی لڑکی نے قتل کیا ہے۔‘‘ جان بے ساختہ بول اٹھا اور اس نے وہاں موجود لڑکیوں پر نظر ڈالی۔ ٹی ٹی اور لوسی کا رنگ فق ہو گیا مگر ہیلن اسی طرح بیٹھی رہی۔ جارج پھر بولنے لگا۔

’’ویسنا نے جب گلڈا کی گردن میں چاقو اتارا تو ابلتے ہوئے خون کی دھار خود اس کے گاؤن کو تر بتر کر گئی۔ وہ گلڈا کو وہیں دیوان پر چھوڑ کر جلدی سے ٹوائلٹ میں جا گھسی

اور اپنا گاؤن اتارنے لگی۔ اس دوران جم چھپنے کی غرض سے لیڈیز ٹوائلٹ میں آیا تو اس نے گلنڈا کی لاش دیوان پر پڑی دیکھی۔ اس نے سوچا لاش کی وجہ سے وہاں جمگھٹا لگ جائے گا اور اس کے لیے چھپنے کی جگہ بھی نہیں رہے گی۔ اس لیے اس نے لاش اٹھائی، درمیانی دروازہ کھولا اور اسے ہیلن کے لاکر میں کھڑا کر دیا۔ پھر ٹوائلٹ روم کے آخری کیبن میں چھپ گیا۔ میرا خیال ہے کہ آڑے وقت میں چھپنے کے لیے یہ پناہ گاہ رومانو نے اسے بتائی ہوگی۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔'' جم نے بے ساختہ اس کی تائید کی۔

جارج نے اس کی طرف توجہ دینے کے بجائے بات جاری رکھی۔ ''تو جناب اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ ویسنا کون ہے؟''

''ہاں میں یہی جاننا چاہتا ہوں اور پورے ثبوت کے ساتھ کہ قتل واقعی اس نے کیا ہے۔'' جان نے جارج کی بات اچک لی۔

''ذرا صبر سے کام لو جان۔ تم پولیس والوں اور ہم سراغ رسانوں کی تحقیقات میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے مفروضوں کی بنیاد بظاہر حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تم سے جم کے دفتر جانے اور لیجر دیکھنے کی اجازت مانگی تھی۔''

''ہاں۔'' جان نے تائید کی۔

''اس وقت میرا خیال تھا کہ گلنڈا ہی ویسنا ہے اور بیمہ کمپنی کو دھوکا دینے کے لیے ویسنا نے اپنا نام گلنڈا رکھ لیا ہے۔ لیکن جب میں نے لیجر دیکھا تو اس میں ویسنا کا نام موجود تھا۔''

''ذرا ایک منٹ۔'' جان بولا اور لیجر دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اس میں تو گلنڈا کا نام بھی موجود ہے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں اور ویسنا بھی جانتی ہے اور یہی وہ بنیادی انکشاف ہے جس نے مجھے بتایا کہ ویسنا کون ہے۔''

''اب بتا بھی دو کہ ویسنا کون ہے؟'' جان نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہیلن۔'' جارج نے ڈرامائی لہجے میں کہا تو ہیلن ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور چلائی۔ ''تم جھوٹے ہو۔''

''میرے پاس ایک نہیں کئی ثبوت موجود ہیں ہیلن، وہ چاقو جس سے تم نے گلنڈا کو ہلاک کیا، ایگزامنر نے پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیا تھا، جب میں نے جان سے کہا کہ میں لیجر دیکھنا چاہتا ہوں تو تم نے سوچا کہ اب بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس لیے پہلے تو تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر جب میں چلا گیا تو تم نے ایگزامنر کی آنکھ بچا کر چاقو اٹھا لیا اور ڈریسنگ روم سے ٹوائلٹ روم اور وہاں سے جم کے دفتر آ پہنچیں۔ اگرچہ وقتی بلیک آؤٹ کے باعث میں نہیں دیکھ سکا تھا لیکن خوشبو نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا تھا پھر میں نے سوچا کہ خوشبو تو مرد بھی استعمال کرتے ہیں۔ تم نے میز اور کرسیوں پر چاقو مار کر میری توجہ ذاتی تحفظ تک محدود کر دادی اور لیجر اٹھا کر چلی گئیں مگر جب میں نے لائٹ آن کی اور چاقو دیکھا تو سمجھ گیا کہ تمہاری کارستانی ہے لیکن میں حتمی ثبوت چاہتا تھا اس لیے میں نے چاقو جان کے حوالے کر دیا اور خود ڈرائنگ روم کے دروازے میں آ گیا۔ تم اسی طرح کرسی پر بیٹھی تھیں جیسے میں تمہیں چھوڑ گیا تھا پھر میں نے سوچا کہ تم لیجر یہاں نہیں لا سکتیں۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ شاید جم اور رومانو کہیں ادھر ادھر نہ چھپے ہوں۔ تمہیں کسی شک میں مبتلا کیے بغیر میں جان کے ساتھ جم اور رومانو کی تلاش میں مصروف ہو گیا اور اس کے بعد میں نے تمہارا گاؤن بھی برآمد کر لیا۔'' یہ کہتے ہوئے جارج نے وہ پیکٹ کھول دیا جو اس نے ٹوائلٹ روم کے چوبی دیوار گیر بکس سے برآمد کر لیا تھا۔ یہ واقعی ہیلن کا خون آلود گاؤن تھا۔

''تم وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ میرا گاؤن ہے؟'' ہیلن نے پوچھا۔

''ہاں اس پر تمہارا ٹیگ نہیں ہے۔ اپنا ٹیگ ہمارے حوالے کرو، اس پر گلنڈا کے خون کے دھبے تمہیں قاتل ثابت کر دیں گے۔''

ہیلن نے شکست خوردہ نظروں سے جارج کو دیکھا اور جان نے آگے بڑھ کر اسے ہتھکڑی پہنا دی۔

ڈھلتی رات کے آخری لمحوں میں جارج کی نگاہیں ایک بار پھر اسی نیون سائن بورڈ کی سرخ اور نیلی روشنیوں پر مرکوز تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ ونڈر لینڈ کی پچاس حسین میزبان لڑکیوں میں سے ایک مر چکی ہے اور دوسری گرفتار کر لی گئی ہے لیکن لمحوں کا یہ کھیل اسی طرح جاری رہے گا اور ان کی جگہ دو اور لڑکیاں آ جائیں گی۔ پیٹ بھرنے، تن ڈھانپنے اور سر چھپانے کی خاطر انہیں صرف ہم رقص ہی نہیں بننا پڑے گا بلکہ بقول ہیلن وہ قالین بنا دی جائیں گی اور یہ قالین سکوں کی جھنکار تلے روندے جائیں گے۔

لمحوں کا یہ کھیل نہ جانے کب تک جاری رہے گا؟

باہر قبرستان جیسی خاموشی تھی۔ این موئن اپنے بیڈ روم کی کھڑکی میں بیٹھی سنسان احاطے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سیاح جو دن کی روشنی میں ایمسٹرڈیم کے اس پرانے حصے کو دیکھنے آتے تھے، وہ بھی کافی دیر پہلے جا چکے تھے۔ اس عمارت کے رہنے والوں کو ان سیاحوں کی آمد ناگوار گزرتی اور وہ کہتے ''وہ ہمیں ایسے دیکھتے

بہروپیا

جمال دستی

ضرورتیں نہایت سفاک ہوتی ہیں... جو ایسا بے بس کر دیتی ہیں کہ انسان وہ کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے... جس کے بارے میں عام حالات میں سوچ بھی نہیں سکتا... رشتوں کے ٹوٹنے سے جنم لینے والے حوادث کا عبرت اثر ماجرا...

ہوس زر کا شکار ہو جانے والے مغرب پرستوں کا ایک اور روپ......



ہیں جیسے ہم چڑیا گھر کے جانور ہوں۔" لیکن ان سیاحوں کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ بیگین ہوف نامی یہ تاریخی عمارت سیاحوں کی توجہ کا مرکز تھی اور وہ اسے ایک ہاٹ اسپاٹ سمجھتے تھے۔

چودھویں صدی میں تعمیر ہونے والی یہ عمارت دراصل راہبہ عورتوں کی خانقاہ تھی اور اس میں رہنے والیاں بیگ نن کہلاتی تھیں۔ اب اسے بیوہ اور غیر شادی شدہ بوڑھی عورتوں کی رہائش گاہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا جس کا انتظام ایک بورڈ آف ٹرسٹیز کے سپرد تھا۔ ایمسٹرڈیم کے بہت سے رہائشی یہاں رہنا چاہتے تھے لیکن مکانات کی تعداد محدود تھی اور انتخاب کا طریقۂ کار بھی انتہائی پیچیدہ تھا۔ اس لیے جن عورتوں کو یہاں رہائش مل جاتی انہیں خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔

دوسری عورتوں کے برعکس این سیاحوں کی آمد کو پسند کرتی تھی۔ اس کے خیال میں یہ جگہ واقعی ایک چڑیا گھر کے مانند تھی لیکن ان معنوں میں نہیں جس طرح وہاں کے رہائشی سمجھتے ہیں۔ اس وقت یہ چڑیا گھر بند ہو چکا تھا کیونکہ عمارت کا بیرونی گیٹ پانچ بجے مقفل کر دیا جاتا۔ لیکن وہ دوسری منزل کی کھڑکی میں بیٹھی نیچے دیکھ رہی تھی۔ شاید کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جائے جو اس کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو آتے جاتے عقابی نگاہوں سے دیکھا کرتی۔ کون کس کے پاس جا رہا ہے، وہاں کتنی دیر ٹھہرا۔ انہوں نے کیسا لباس پہن رکھا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

"تم واقعی بہت مصروف رہتی ہو۔" ریبی کلارک نے ایک مرتبہ اس پر طنز کیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ان کے درمیان بات چیت بند نہیں ہوئی تھی۔ ریبی کبھی اس کی بہترین دوست ہوا کرتی تھی لیکن اٹھارہ ماہ قبل اپنے بھائی پیٹر کی وفات کے بعد اس نے دنیا سے ناتا توڑ لیا تھا۔ وہ گھر میں محصور ہو گئی تھی۔ ہفتے میں ایک بار ضرورت کا سامان منگواتی اور این کو اندھیرے میں اس کا سایہ نظر آتا جب وہ سامان وصول کرنے آتی۔ اکلوتے بھائی کی موت نے اس کی روح تک کو کچل دیا تھا اور اس نے تمام پڑوسی عورتوں سے اپنے تعلقات ختم کر لیے تھے۔ این کو اپنی اس دوست سے محروم ہونے کا بہت دکھ تھا لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اس شام این نے ٹیلی وژن پر اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھا۔ یہ ایک برطانوی سراغ رساں سیریز تھی۔ اس میں دکھایا جانے والا علاقہ بہت خوب صورت، پُرامن اور دوستانہ تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہاں رہنے میں کتنا مزہ آتا ہو گا۔ اس کے نواح میں قتل کے واقعات بھی ہوتے لیکن دو ذہین سراغ رسانوں کی بدولت مجرم ہمیشہ پکڑے جاتے۔

نشریات میں وقفے کے دوران وہ ایک کاغذ پر قاتل کی شناخت کے بارے میں اپنے اندازے لکھا کرتی۔ لیکن اس رات یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ کس طرح ایک پادری پر دہرے قتل کا شبہ کر سکتی تھی۔ ڈیڑھ سال پہلے وہ اور ریبی اکٹھے بیٹھ کر یہ سیریز دیکھا کرتی تھیں۔ یہ ان کے لیے ایک کھیل بن گیا تھا کہ ان میں سے کون مجرم کی نشان دہی کرتا ہے۔ این بالعموم جیت جاتی اور ریبی خوش دلی سے اپنی شکست پر بڑبڑانے لگتی۔

وہ بہت اچھے دن تھے جب وہ اور ریبی اپنا بیشتر وقت ایک ساتھ گزارتی تھیں۔ وہ شام کو ایک دوسرے کے گھر چلی جاتیں۔ ایک ساتھ چائے پیتیں اور دیر تک باتیں کرتی رہتیں۔ این کبھی نہ جان سکی کہ اس کی سہیلی بھائی کی موت کے بعد کیوں تارک الدنیا ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ریبی اور اس کے بھائی کی عمر میں زیادہ فرق نہیں تھا لیکن ان میں سگے بہن بھائیوں جیسی قربت نہیں تھی اور جب وہ ساٹھ کی دہائی میں جنوبی امریکا کی ریاست سری نیم چلا گیا تو کئی سالوں تک ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کے درمیان رابطہ اس وقت بحال ہوا جب اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل وہ ہالینڈ واپس آ گیا۔ لیکن اس کی موت کی خبر سننے کے بعد ریبی نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور گوشہ نشین ہو گئی۔

این نے ٹھنڈی سانس بھری اور شہد ملے ہوئے گرم دودھ کا آخری گھونٹ لیا جو وہ ہمیشہ رات کو سونے سے پہلے پیتی تھی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس کے بغیر اسے نیند نہیں آئے گی۔ ہیلتھ سروس کی نرس جیٹ شیلڈرز کا بھی یہی کہنا تھا جو اسے ہفتے میں دو بار دیکھنے آتی تھی کہ ایک گلاس دودھ نیند کی گولی سے بہتر ہے۔

اس کی نظر کھڑکی سے باہر گئی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کوئی شخص ریبی کے مکان میں داخل ہو رہا تھا گو کہ تمام روشنیاں بند تھیں۔ ضرور اس کے پاس مرکزی گیٹ کی چابی ہو گی۔ وہ کوئی ایسا شخص ہے جو رات کے وقت بھی عمارت میں داخل ہو سکتا ہے لیکن وہ یہ شناخت نہ کر سکی کہ آنے والا کوئی مرد ہے یا عورت۔ حالانکہ ریبی کے دروازے کے باہر کھمبے پر لیمپ لگا ہوا تھا لیکن اس کا بلب کئی دنوں سے خراب تھا اور ابھی تک تبدیل نہیں کیا گیا۔ این نے اس کی شکایت کمپاؤنڈ کے منتظم گیرٹ رومیک سے کی لیکن اس نے بھی ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ اتنی رات کو کسی مہمان کا آنا حیران کن تھا اس وقت ریبی کسی کی آمد برداشت نہیں کرتی۔ این کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کیونکہ وہ روزانہ اپنی کھڑکی سے لوگوں کی

آمد و رفت پر نظر رکھتی تھی۔

لمحہ بھر کے لیے اس کے دل میں حسد کے جذبات پیدا ہوئے۔ ویسے تو ریبی نے عرصہ ہوا اس سے ملنا چھوڑ دیا تھا لیکن رات گئے وہ اپنے گھر میں کسی کا استقبال کر رہی تھی۔ این جانتی تھی کہ ایسی افواہیں پھیلتی رہتی ہیں کہ فلاں کے گھر ایک شخص کتنی مرتبہ آیا لیکن ریبی کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور ایک بھائی کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہا تھا۔ این کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔

ریبی کے مکان میں بدستور اندھیرا تھا۔ این نے فیصلہ کیا کہ وہ اجنبی مہمان کے جانے تک کھڑکی میں ہی بیٹھی رہے گی۔ اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی لیکن ذہن میں کئی سوالات اُبھر رہے تھے۔ اس وقت ریبی کے گھر کون آ سکتا ہے۔ وہ کتنی دیر رکے گا؟ ظاہر ہے کہ رات بھر تو نہیں ٹھہر سکتا۔ اس نے اپنی نظریں ریبی کے دروازے پر جما رکھی تھیں لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔

جیٹ شیلڈرز نے اپنی بائیک کو تالا لگایا اور کمپاؤنڈ کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ وہ منگل اور جمعے کو یہاں آتی تا کہ ان عورتوں کا معائنہ کر سکے جنہیں طبی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ ہفتے کے دوسرے دنوں میں وہ دوسرے علاقوں میں اپنے فرائض انجام دیتی۔ آج اسے آنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اس نے این کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ کئی سالوں سے اسے جوڑوں میں درد کی وجہ سے چلنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ اسے دروازہ کھولنے میں تھوڑی دیر لگی۔

"اوہ، تم آ گئیں۔" این نے کہا۔

جیٹ نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "سوا آٹھ بجے ہیں۔ مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں۔" این مڑی اور بڑی مشکل سے لیونگ روم تک پہنچ سکی۔ اسے چلنے میں پہلے سے زیادہ مشکل پیش آ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ کیا تم گر گئی تھیں؟"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں لیکن ریبی...... تم ریبی کو جانتی ہونا۔ وہ سامنے والے گھر میں رہتی ہے۔ وہ...... وہ......" وہ بمشکل بول رہی تھی۔

جیٹ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تم اپنی سانس درست کر لو پھر مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا؟"

این اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے بولی۔ "آج صبح میں نے ریبی کو فون کیا لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے تین مرتبہ کوشش کی لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا۔"

"ممکن ہے کہ وہ گھر پر نہ ہو۔ اپنے کسی عزیز سے ملنے یا کچھ خریداری کرنے گئی ہو۔"

این نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "اس کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے اور نہ ہی وہ کبھی گھر سے باہر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔" اس نے اپنی آواز نیچی کر لی جیسے ڈر رہی ہو کہ کہیں کوئی سن نہ لے۔ "گزشتہ شب کوئی اس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تب میں نے دیکھا۔"

نرس نے دلچسپی سے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"عجیب بات یہ ہے کہ ریبی کے گھر میں اندھیرا تھا اور اجنبی کے اندر جانے کے بعد بھی روشنی نہیں ہوئی۔"

"یعنی وہ ریبی کا کوئی مہمان تھا جو اندھیرے میں آیا۔ تمہیں یقین ہے کہ وہ کوئی مرد تھا؟"

"نہیں، میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن جو کوئی بھی تھا یا تھی، میں نے اسے واپس آتے نہیں دیکھا۔"

"کیا تم رات بھر مکان کی نگرانی کرتی رہیں؟"

"نہیں، میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی تھی پھر میری آنکھ تین بجے کھلی اور میں بستر پر چلی گئی۔"

"تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔"

"پھر میں نے آج صبح اسے تین مرتبہ فون کیا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔" اس کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔ "مجھے ڈر ہے کہ اس کے ساتھ کچھ ہو نہ گیا ہو۔"

"کیا ہو سکتا ہے؟ یہاں رہنے والی عورتیں بالکل محفوظ ہیں۔"

"کیا تم اس کے گھر جا کر نہیں دیکھ سکتیں؟"

"تم خود کیوں نہیں چلی جاتیں؟" جیٹ اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتی تھی کیونکہ ریبی اس کی مریضہ نہیں تھی اور اسے دن میں کئی مریضوں کو دیکھنا تھا۔ اس کے پاس کسی اور کو دیکھنے کے لیے وقت نہیں تھا۔

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ تم چلی جاؤ پلیز۔"

"ٹھیک ہے۔ تم کہتی ہو تو چلی جاتی ہوں۔ شاید اس طرح تمہیں اطمینان ہو جائے۔"

جیٹ نے ریبی کے دروازے کی گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ دوسری اور تیسری بار بھی یہی ہوا۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور

دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شاید مہمان کے جانے کے بعد ربی دروازہ بند کرنا بھول گئی۔ وہ دبے قدموں اندر داخل ہوئی۔ اس نے باری باری کچن اور لیونگ روم میں دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دیکھا کہ لیونگ روم میں رکھی ہوئی لکھنے کی میز کی تمام درازیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور ان کی چیزیں قالین پر بکھری ہوئی تھیں۔

"گھر میں کوئی ہے؟" اس نے سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو کر آواز لگائی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے ایک بار پھر واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن کچھ سوچ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر بیڈ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اسے مزید کھولا اور اندر کا منظر دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بستر پر ربی بے حس و حرکت چت لیٹی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے اس کے پاس گئی اور آواز دی۔

"ربی...... ربی...... مس کلارک......"

پھر اس نے آہستہ سے اس کا کندھا ہلایا لیکن کوئی حرکت نہ ہوئی پھر نبض دیکھی اور مایوسی سے سر ہلا دیا۔ اپنے کام کے دوران اس نے کئی لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ اس کی عادی نہیں تھی۔ اس نے یقین کرنے کے لیے دوسری کلائی کی نبض بھی دیکھی۔ اس نے دیکھا کہ ربی کے بالوں کے ساتھ کوئی معاملہ ہے۔ وہ گھوم کر بستر کے دوسری جانب گئی۔ وہ بال نہیں بلکہ وگ تھی جو مردہ عورت کے بالوں پر ترچھی لگی ہوئی تھی۔ لاش کی گردن پر ایک چھوٹا سا ابھار تھا جو عموماً مردوں میں ہوتا ہے۔ گو کہ وہ جانتی تھی کہ اسے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے پھر بھی اس نے ربی کے گاؤن کا کنارہ پکڑ کر اٹھایا اور اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔

☆☆☆

ربی کے چھوٹے سے بیڈ روم میں سراغ رساں کیرل اسٹیفورڈ اور ٹوم بیکر کے علاوہ ایک ڈاکٹر اور دو فارنسک ٹیکنیشنز بھی موجود تھے۔ انہوں نے پہلی بات یہ دریافت کی کہ بستر پر پڑی ہوئی لاش کسی عورت کی نہیں بلکہ مرد کی ہے اور دوسری یہ کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ مقتول نے نائٹ گاؤن پہنا ہوا تھا اور اس کے سر پر زنانہ بالوں کی وگ تھی۔ قاتل کی تلاش شروع کرنے سے پہلے دونوں سراغ رسانوں کو ان سوالوں کا جواب تلاش کرنا تھا کہ بستر پر لیٹا ہوا مرد کون ہے اور اس نے عورت کا روپ کیوں دھارا۔ اس دوران میڈیکل ایگزامنر نے بتایا کہ یہ موت گزشتہ شب دس اور دو بجے کے درمیان ہوئی ہے۔

اسٹیفورڈ اور بیکر دونوں چلتے ہوئے منتظم کے دفتر آئے لیکن وہاں دروازے پر ہی ایک ٹائپ شدہ نوٹس لگا ہوا تھا جس پر درج تھا کہ گیرٹ روسیک ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے 18 سے 21 اپریل تک زوالی (ZWOLLE) میں رہے گا۔ یہ نوٹس دیکھ کر انہیں بہت مایوسی ہوئی کیونکہ گیرٹ سے انہیں ربی کے بارے میں کافی معلومات مل سکتی تھیں تاہم وہ اکیس اپریل کا ہی دن تھا اور اس کی واپسی آج کسی وقت یا اگلے روز صبح تک ہو سکتی تھی۔

اس کے بعد بیکر نے دوسرے پڑوسیوں کے دروازے کھٹکھٹائے جبکہ اسٹیفورڈ، جیٹ شلڈرز اور این سے ملنے چلا گیا۔ بوڑھی عورت کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ جیٹ کافی بنا کر لائی تو اسٹیفورڈ نے پہلا گھونٹ لیتے ہوئے این سے پوچھا۔

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ ربی کلارک درحقیقت ایک مرد تھا جس نے عورت کا روپ دھار رکھا ہے؟"

"یہ سراسر بکواس ہے۔" وہ غرائی۔ "ناممکن۔"

"ناممکن کیوں؟"

بوڑھی عورت نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟" اسٹیفورڈ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے لیکن تمہیں اس سوال کا جواب دینا ہوگا۔ یہ ہماری تحقیقات کے لیے بہت اہم ہے۔"

"میں نے اسے دیکھا تھا۔ کئی سال پہلے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ اس دوران میں اسے نہلانے ہفتے میں دو بار جاتی تھی۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "پچھلے پچاس برسوں میں میرا کسی مرد سے واسطہ نہیں پڑا لیکن میں مرد اور عورت کا فرق جانتی ہوں۔"

"مجھے یقین ہے۔" اسٹیفورڈ نے کہا۔ "یہ کب کی بات ہے جب تم نہانے میں اس کی مدد کرنے جاتی تھیں؟"

بوڑھی عورت نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "دو سال پہلے یا اس کے لگ بھگ۔ تب اس کے بھائی کا انتقال نہیں ہوا تھا اور ہم دونوں بیشتر وقت اکٹھے گزارتے تھے۔"

"لیکن اس کے بعد نہیں؟"

"نہیں۔ بھائی کی موت نے اسے بالکل تباہ کر دیا۔ میں بالکل نہیں سمجھ سکی کہ ایسا کیوں ہوا۔ جتنا عرصہ وہ اس سے دور رہا، اس نے کبھی بھائی کی پروا نہیں کی پھر وہ واپس آنے کے چند ماہ بعد مر گیا۔ اس نے بھائی کے مرنے پر مجھے ایک کارڈ بھیجا جو اب بھی میرے پاس ہے۔" اس نے میز کی دراز کھولی اور اسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ رکھا ہوا ہے۔"

بیکر نے وہ کارڈ لے کر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔ "میں انتہائی افسوس کے ساتھ تمہیں اپنے پیارے بھائی پیٹر کلارک کے مرنے کی اطلاع دے رہی ہوں۔"

"کیا تم کبھی اس کے بھائی سے ملی تھیں؟"

"نہیں کبھی نہیں۔"

اسٹیفورڈ نے یہ پوائنٹ اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ جیٹ شیلڈرز اسے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ این نے گزشتہ شب کسی شخص کو ربی کے مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب اس نے این سے کہا کہ وہ خود پورا واقعہ سنائے۔ این نے کچھ ہچکچاتے ہوئے اسے سب کچھ بتا دیا۔

"تم یہ نہیں دیکھ سکیں کہ وہ کون تھا؟ تم نے آنے والے مہمان کو نہیں پہچانا؟"

این نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تم یہ بھی نہیں بتا سکتیں کہ وہ مرد تھا یا عورت؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ ضرور کوئی مرد ہی ہوگا لیکن بلب خراب ہونے کی وجہ سے باہر اندھیرا تھا۔ میں نے گیرٹ سے اس کی شکایت بھی کی لیکن......"

"ٹھیک ہے۔" بیکر نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔"

بیکر اور اسٹیفورڈ نے سارا دن کمپاؤنڈ میں رہائش پذیر عورتوں سے ملنے میں گزار دیا۔ اب وہ سو گز کے فاصلے پر واقع ایک ریستوران میں بیٹھے بیئر سے دل بہلا رہے تھے۔

"یہ عورتیں ایک دوسرے کی زندگی کے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔" بیکر نے کہا۔

"جیسا دیہاتوں میں ہوتا ہے۔"

"لیکن حیرت کی بات ہے۔" اسٹیفورڈ نے کہا۔ "میں نے جس سے بھی بات کی، اسے ربی کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا۔ خاص طور پر اس کے بعد سے جب اس نے بھائی کے مرنے کے بعد ان سب سے دوری اختیار کر لی تھی۔"

"میں نے یہ بھی بات نوٹ کی ہے۔ کسی نے بھی گزشتہ شب نہ کچھ دیکھا اور نہ ہی کوئی آواز سنی۔"

"سوائے این کے۔" اسٹیفورڈ نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کا وہم نہیں بلکہ اس نے واقعی کسی کو دیکھا تھا۔ وہ ممکنہ طور پر قاتل ہی ہوگا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ کیا ربی کے پاس بہت دولت تھی اور یہ قتل کا محرک ہو سکتا ہے؟"

"اسے بہت معمولی پنشن اور سوشل سیکیورٹی کے چیک ملا کرتے تھے اور وہاں رہنے والے سب اس پر متفق ہیں کہ وہ کوئی دولت مند عورت نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے کچھ رقم بچا کر گدے کے نیچے رکھی ہو۔ پرانے زمانے کے لوگ بینکوں پر بھروسا نہیں کرتے۔"

بیکر نے مزید بیئر کا آرڈر دیا۔ "لیونگ روم میں بہت زیادہ گڑبڑ نظر آئی۔" اسٹیفورڈ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "فرش پر ہر طرف کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ یقیناً قاتل کو کسی چیز کی تلاش تھی۔ ممکن ہے کہ ربی نے مستقبل کے لیے کچھ رقم پس انداز کر رکھی ہو یا پھر کوئی دستاویزات وغیرہ۔"

"یا پھر وہ اسے ڈکیتی کا رنگ دینا چاہتا ہو۔"

"لیکن اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ربی اچانک ہی عورت سے مرد کیسے بن گئی۔ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق پچھتر برس تھی اور یہ نہیں ہو سکتا کہ ان دو سالوں میں اس نے جنس کی تبدیلی کا آپریشن کروایا ہو۔ اس سے پہلے این اسے نہلاتے وقت برہنہ حالت میں دیکھ چکی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ کوئی اور شخص اس کے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔" بیکر نے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کون؟ اور ربی کے ساتھ کیا ہوا؟ اگر وہ کہیں چلی گئی ہے تو اس کا تعلق بھی قتل سے جوڑا جائے گا۔ ممکن ہے کہ اس کے بستر پر لیٹا ہوا شخص اس کی گمشدگی کے بارے میں جانتا ہو۔ اس لیے اسے راستے سے ہٹانا ضروری ہو گیا۔ اگر اس قتل کا محرک پیسا نہیں تو کوئی اور بات ہوگی۔ یہ کوئی شوقیہ جرم نہیں۔"

اسٹیفورڈ نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "وہ تنہا رہتی تھی۔ اس کا کوئی خاندان نہیں صرف ایک بھائی تھا جو ڈیڑھ سال پہلے فوت ہو گیا۔ ہمیں اس کی لاش قبر سے نکال کر مقتول کے ڈی این اے سے موازنہ کرنا چاہیے۔ اس پورے منظر نامے میں کوئی عجیب بات نظر آ رہی ہے۔"

"ایک اور سوال۔" بیکر نے کہا۔ "این کے بیان کے مطابق قاتل یا مقتول گیارہ بجے کے قریب کمپاؤنڈ میں تھے جبکہ اس کے مرکزی گیٹ پر پانچ بجے تالا لگا دیا جاتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ اسی کالونی میں رہتا تھا یا......"

"وہاں صرف عورتیں رہ سکتی ہیں۔" اسٹیفورڈ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"پھر اس کے پاس چابی ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہاں رہنے والوں کے علاوہ گیٹ کی چابی کس کے پاس ہوتی ہے؟"

"ہم کل صبح گیرٹ سے ان لوگوں کی فہرست لیں گے۔ امید ہے کہ وہ اس وقت تک واپس آ چکا ہوگا۔"

"اور وہ نرس...... جیٹ شیلڈرز؟"

"ہاں، اس سے بھی کچھ سوال کرنا ہیں۔"

☆☆☆

جیٹ نے باری باری دونوں پولیس والوں کو دیکھا۔ اس وقت وہ پولیس اسٹیشن کے تفتیشی کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''تمہارے پاس اس کمپاؤنڈ کی چابی ہے؟'' سراغ رساں بیکر نے پوچھا۔

''ہاں بالکل۔ ایمرجنسی کی صورت میں اگر پانچ بجے کے بعد مجھے وہاں جانا پڑ جائے تو میرے پاس چابی ہونی چاہیے کیونکہ گیٹ میں تالا ہوتا ہے۔''

اسٹینفورڈ نے پوچھا۔ ''پیر کی شام تم کہاں تھیں؟''

''تم نے یہ کیوں پوچھا؟''

''یہ معمول کا سوال ہے۔'' اسٹینفورڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کیا اس میں کوئی راز ہے؟''

جیٹ ہاں کہنا چاہ رہی تھی لیکن اس نے ارادہ بدل دیا اور بولی۔ ''گھر پر تھی۔''

''تنہا؟''

''ہاں۔''

''کوئی شخص تصدیق کرسکتا ہے کہ تم سچ بول رہی ہو؟''

''نہیں۔'' جیٹ نے کہا۔ ''بدقسمتی سے کوئی نہیں۔'' وہ انہیں کسی بھی صورت ایرک کے بارے میں نہیں بتا سکتی تھی جس کے ساتھ اس نے وہ شام گزاری۔ ممکن ہے کہ پولیس ایرک سے اس کی تصدیق کرتی اور شاید وہ اس کی بیوی سے بھی بات کرتے جس کے اثرات بڑے خطرناک ہو سکتے تھے۔ اس لیے جیٹ نے ایرک کا نام لینا مناسب نہ سمجھا۔

سراغ رسانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اسٹینفورڈ بولا۔ ''تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ پیر کی شام تم اس علاقے میں موجود نہیں تھیں؟''

''بالکل میرے وہاں جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔''

''تم نے ریبی کے بیڈروم میں لاش دیکھی اور یہ یقین کر لیا کہ یہ کسی عورت کی نہیں بلکہ مرد کی لاش ہے۔ کیا یہ درست ہے؟''

''ہاں۔''

''تم نے لاش کو ہاتھ کیوں لگایا۔ پولیس کو فوراً اطلاع کیوں نہیں دی جبکہ تمہیں معلوم ہوگیا تھا کہ وہ مر چکا یا مر چکی ہے؟''

''مجھے کچھ تجسس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عورت ہے لیکن جب میں نے اس کے گلے پر مردوں کے جیسا ابھار دیکھا تو......''

''کیا تم باقاعدگی سے ریبی کو دیکھنے آتی تھیں؟''

''نہیں، پہلے بھی وہ میری مریضہ ہوا کرتی تھی لیکن ڈیڑھ سال پہلے اس نے مجھے بتایا کہ اب اسے میری ضرورت نہیں۔ یہ سن کر مجھے بہت تعجب ہوا کیونکہ وہ مکمل طور پر صحت مند نہیں تھی۔''

''تو تم نے اس کے پاس آنا چھوڑ دیا لیکن تم جانتی تھیں کہ اس کے پاس دولت ہے؟''

''دولت...... نہیں مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اسٹینفورڈ بولا۔ ''فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ تمہارا شہر سے باہر جانے کا کوئی پروگرام تو نہیں۔''

''بالکل نہیں، میں کیوں جاؤں گی؟''

اس کے جانے کے بعد بیکر نے کہا۔ ''اس نرس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

اسٹینفورڈ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ایسی عورت نہیں لگتی کہ قتل یا ڈکیتی کرے لیکن تم نے اس سے ریبی کی دولت کے بارے میں کیوں پوچھا؟''

''جب تم نے اس سے پوچھا کہ پیر کی شام وہ کہاں تھی تو وہ مجھے تھوڑی سی گھبرائی ہوئی لگی اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے لیکن تمہارا کہنا بھی ٹھیک ہے۔ وہ قاتل نہیں ہے۔ اور کافی پیو گے؟''

بیکر کافی لے کر آیا تو اسٹینفورڈ کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ ''یہ وہ کہانی ہے جو این نے ریبی کے بھائی کے بارے میں بتائی ہے۔ مجھے تو یہ بھی عجیب لگتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ اس کا پُراسرار بھائی کافی عرصہ ملک سے باہر رہنے کے بعد اچانک واپس آ گیا اور دو مہینے کے اندر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ این کی نرس نے بھی یہی بات دہرائی ہے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے ہماری توجہ کسی اور جانب کرنے کے لیے یہ کہانی گھڑی ہو۔''

''ہم اسے چیک کر سکتے ہیں۔ ریکارڈ سے پتا چل جائے گا کہ وہ رجسٹرڈ تھا یا نہیں اور یہ کہ اس کی موت کب واقع ہوئی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دوبارہ جائے وقوعہ پر جا رہا ہوں۔'' بیکر نے کہا۔ ''گیرٹ رومیک آ گیا ہوگا۔ شاید وہ ہمیں مزید معلومات فراہم کر سکے۔''

ریکارڈ روم میں بیٹھے ہوئے گنجے شخص نے اسٹینفورڈ کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور بولا۔ ''پیٹر کلارک۔ کیا تمہیں اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات معلوم ہے؟''

''ٹھیک ٹھیک تو نہیں لیکن وہ یقیناً انیس سو تیس اور انیس

سو چالیس کے درمیان پیدا ہوا ہوگا اور تقریباً ڈیڑھ سال پہلے اس کا انتقال ہوا ہے۔''

اس شخص نے کمپیوٹر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس اس نام کے تین لوگوں کا ریکارڈ ہے۔ ان میں سے ایک چھ سال پہلے چوبیس برس کی عمر میں مر گیا تھا جبکہ بقیہ دو ابھی زندہ ہیں۔''

''وہ دونوں کب پیدا ہوئے تھے؟''

''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''ایک انیس سو اکتالیس اور دوسرا دو ہزار چار میں پیدا ہوا۔''

''زیادہ عمر والا کہاں رہتا ہے؟''

اس شخص نے ایک بار پھر کی بورڈ پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ''اس نے انیس سو بہتر میں اپنا نام فہرست سے نکلوا دیا تھا۔''

''وہ کیوں؟''

''وہ کسی دوسرے شہر چلا گیا لیکن اس نے کوئی پتا نہیں چھوڑا۔''

''ممکن ہے کہ وہ اب تک مر چکا ہو؟''

''ایمسٹرڈیم میں تو نہیں اگر وہ یہاں مرا ہوتا تو اس کا نام ریکارڈ میں ضرور ہوتا۔''

''ریبی کے بارے میں تمہارے پاس کیا معلومات ہیں۔'' اسٹینفورڈ نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے ریبی ڈی کلارک؟''

''میرے ریکارڈ میں اس کا نام ریبا میکنا لینا ہے۔ وہ اٹھارہ مارچ انیس سو اتالیس کو پیدا ہوئی اور بیگن ہوف میں رہائش پذیر ہے۔''

''یہ وہی ہے'' اسٹینفورڈ نے کہا اور عجلت میں دفتر سے باہر نکل گیا۔

گیرٹ رومیک اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا جب بیکر وہاں آیا۔ گیرٹ نے اس سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مسز کلارک کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ اس پر مجھے افسوس ہے۔''

''اس سانحے کے لیے افسوس بہت چھوٹا لفظ ہے۔''

''ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس سے پہلے یہاں کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ مجھے اس کے نتائج پر تشویش ہے۔ لگتا یہی ہے کہ سیاح میرے دروازے پر دستک دے کر کہیں گے کہ انہیں وہ مکان دکھایا جائے جہاں یہ وحشیانہ قتل ہوا۔''

بیکر نے نوٹ کیا کہ رومیک کو مسز کلارک کی موت سے زیادہ اپنے کمپاؤنڈ کی ساکھ کے بارے میں تشویش ہے۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ وحشیانہ قتل ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اسے بُری طرح زدوکوب کیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مر گئی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

بیکر جانتا تھا کہ اخبارات نے اس کمرے کی نشاندہی نہیں کی جہاں قتل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ مقتول عورت نہیں مرد تھا۔ این کو تاکید کر دی گئی کہ وہ کمپاؤنڈ میں رہائش پذیر دوسری عورتوں سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرے لیکن وہ جانتے تھے کہ اسے گپیں لگانے کی عادت ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ہدایت کے مطابق اپنا منہ بند رکھا یا نہیں۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ رومیک نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بولا۔ ''مجھے بہت سا کام کرنا ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ کئی دن دفتر سے غیر حاضر رہا۔''

''ہاں جب لاش دریافت ہوئی تو تم شہر سے باہر تھے۔ غالباً کسی کانفرنس کے سلسلے میں زوالی گئے ہوئے تھے۔''

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کانفرنس کا تو بہانہ تھا۔ میں نے اپنی غیر حاضری کو سرکاری بنانے کے لیے کاغذوں میں کانفرنس لکھ دیا۔ دراصل میں اپنے عزیزوں سے ملنے گیا تھا۔ میں زوالی میں پلا بڑھا ہوں۔ والدین اور زیادہ تر رشتے دار وہیں رہتے ہیں۔''

''تب تو تم ثابت کر سکتے ہو کہ پیر کی شام تم وہاں تھے؟''

رومیک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بالکل۔''

''اور تم گزشتہ شب واپس آئے؟''

''ہاں، میں شام کو آ گیا تھا۔''

''بذریعہ ٹرین؟''

''ہاں، میں کار کے ذریعے اتنا طویل سفر نہیں کرسکتا۔''

''تمہارے اور کمپاؤنڈ کے رہائشیوں کے علاوہ بھی کسی کے پاس مرکزی گیٹ کی چابی ہوتی ہے؟''

''مجھے سوچنے دو۔'' رومیک نے کہا۔ ''نرس شیلڈرز، بورڈ آف ٹرسٹیز کا چیئرمین، گرجا کا پادری اور منتظم اور کیئر ٹیکر۔ ان سب کے پاس چابیاں ہیں۔ اب اجازت دو۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔''

بیکر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو رومیک نے سکون کا سانس لیا۔ لیکن دروازے کے پاس جا کر بیکر مڑا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے لیکن یہ بات کسی اور کو مت بتانا۔ ہم فی الحال اسے خفیہ رکھ رہے ہیں۔''

اس نے آواز نیچی کرتے ہوئے کہا۔ ”ربی کلارک عورت نہیں مرد تھا۔“

رومیک پر اس اطلاع کا غیر معمولی اثر ہوا۔ اس کا سرخ چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن واپس کرسی میں گر گیا۔

☆☆☆

”اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ لاش ربی کی نہیں تو وہ خود کہاں ہے۔ زندہ ہے یا مر گئی۔ اگر مر گئی ہے تو اسے کہیں نہ کہیں دفن کیا گیا ہوگا۔ میں ایمسٹرڈیم کے قبرستانوں میں فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔“ اسٹینفورڈ نے بیکر سے کہا۔

”بشرطیکہ اسے جلایا نہ گیا ہو؟“

”ٹھیک ہے۔ ہم شمشان گھاٹ بھی دیکھ لیں گے۔“

”جیٹ شیلڈرز کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ بیکر نے کہا۔

”ہم اسے اس کیس سے الگ نہیں کر سکتے لیکن مجھے یقین نہیں کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔“

”اور رومیک؟ گو کہ میں اس پر بھروسا نہیں کرتا۔“

”تم زوالی میں اس کے گھر والوں کو چیک کرو۔“

”میں نے اس کے بھائی سے پوچھا ہے۔ گیرٹ پیر کی شام وہیں تھا لیکن اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ رات کا کھانا کھاتے ہی سونے چلا گیا اور صبح ناشتا پر بھی دیر سے آیا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ زرد تھا۔“

”اگر اس نے ٹرین سے سفر کیا ہے تو OV چپ کارڈ سے اس کی نقل و حرکت کا پتا چل جائے گا۔“

OV چپ کارڈ کا نظام 2011ء میں رائج ہوا اور 2014ء میں نیشنل ریل روڈ نیٹ ورک نے اسے اپنا لیا۔ اس نظام میں مسافر ایک دفعہ رقم ڈال کر بسوں، ٹراموں اور ٹرین کے ذریعے سفر کر سکتے تھے اور ان کا کرایہ خودکار طریقے سے منہا ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کارڈ رکھنے والے کو معلوم ہو جاتا کہ اس کے کارڈ میں کتنی رقم باقی ہے۔

ٹرانس لنک سسٹم کا دفتر ایمسٹرڈیم کے جنوب مشرق میں تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ انہیں وہاں تک پہنچنے میں ایک گھنٹا لگا لیکن جیسے ہی انہوں نے متعلقہ فرد کو اپنے شناختی کارڈ دکھائے تو اس نے پندرہ منٹ میں مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔

گیرٹ رومیک موڈین کے علاقے میں ایک جدید فارم ہاؤس میں رہتا تھا۔ جب اس نے گھنٹی کی آواز سن کر دروازہ کھولا تو اپنے سامنے ان دونوں سراغ رسانوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”میں اس وقت مصروف ہوں۔“ اس نے ترش لہجے میں کہا۔ ”اور میرے پاس تمہارے لیے وقت نہیں ہے۔ کیا تم کل دفتر نہیں آ سکتے؟“

اسٹینفورڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کسی کے پاس وقت نہیں ہوتا بلکہ وقت نکالا جاتا ہے۔“

رومیک نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ”میں عام طور پر گھر پر کام نہیں کرتا مگر آج......“

”میرا خیال ہے کہ تمہیں بہت زیادہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔“ بیکر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ربی کا مکان خالی کروا کر اسے دوسرے مکین کے لیے تیار کرنا ہے۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

”اور اس کے گھر کے سامنے والی اسٹریٹ لائٹ کب ٹھیک ہوگی۔ اس کا بلب تبدیل کرنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگنا چاہیے۔“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“

”پھر تم نے پچھلے ہفتے اس پر توجہ کیوں نہیں دی جب این نے اس کی شکایت کی تھی؟“

”وہ بڑھیا ہمیشہ کوئی نہ کوئی شکایت کرتی رہتی ہے۔“

”تم نے آج صبح بتایا تھا کہ پیر کی شب زوالی میں تھے؟“

”ہاں یہ سچ ہے۔ تم میرے بھائی سے پوچھ سکتے ہو۔“

”ہم پوچھ چکے ہیں۔“ اسٹینفورڈ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”تم ریل کے ذریعے گئے تھے اور تم نے اپنا چپ کارڈ استعمال کیا۔“

”ہاں۔“

”کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“

”کیوں؟“

”دراصل مجھے دو دن کے لیے چاہیے۔“

”مجھے کام پر جانا ہوتا ہے۔“ رومیک نے اعتراض کیا۔ ”میں اسے روزانہ استعمال کرتا ہوں۔“

”تم کل ایک عارضی کارڈ خرید لینا۔ ہم تمہارا کارڈ چیک کر کے دیکھنا چاہتے ہیں کہ کمپیوٹر سے ملنے والی معلومات درست ہیں۔“

رومیک حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیسی معلومات؟“

”بہت سے مسافر اس بارے میں نہیں جانتے۔“ اسٹینفورڈ نے کہا۔ ”لیکن چپ کارڈ صرف کرایہ کا ریکارڈ ہی نہیں رکھتا بلکہ وہ آنے جانے کا وقت اور جگہ بھی نوٹ کر لیتا ہے اور کمپیوٹر ریکارڈ کے مطابق تمہارا کارڈ منگل کی شب نو بج کر اٹھارہ منٹ پر زوالی سے ایمسٹرڈیم آنے کے لیے اور اس کے بعد بارہ بج کر بائیس منٹ پر زوالی واپس جانے کے لیے استعمال ہوا۔“

”تم یہ کیسے معلوم کر سکتے ہو؟“ رومیک نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”ہم معلومات کر چکے ہیں۔“ بیکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”صرف یہی نہیں بلکہ تم نے اس کارڈ کے ذریعے دو نمبر ٹرام میں سینٹرل اسٹیشن سے اسپوئی تک کا سفر کیا اور اس کے بعد پانچ نمبر ٹرام کے ذریعے نصف شب کے قریب اسٹیشن واپس آ گئے۔ اگر ٹرام کے اسٹاپ سے کمپاؤنڈ تک آنے جانے کا وقت شمار کیا جائے تو تمہیں اپنا مقصد پورا کرنے میں بیس منٹ لگے۔“

”لیکن میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ میں......“ جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اسے چکر آیا اور وہ بے ہوش کر زمین پر گر گیا۔

جیمن شیلڈرز نے کافی بنائی اور این ان کے لیے بسکٹوں کی پلیٹ لے کر آئی۔

”تم دونوں نے ہی فون کر کے ہمیں بلایا تھا۔“ اسٹینفورڈ نے کہنا شروع کیا۔ ”لہٰذا ہمارا خیال ہے کہ سب سے پہلے تمہیں یہ کہانی سنائی جائے۔ ربی کے بیڈروم میں ملنے والی لاش اس کے بھائی پیٹر کلارک کی تھی۔“

”لیکن وہ تو ڈیڑھ سال پہلے مر چکا تھا۔“ جیٹ نے کہا۔

”نہیں، وہ ربی تھی۔“ اسٹینفورڈ نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”جب پیٹر ڈیڑھ سال پہلے اس کے دروازے پر آیا تو تیس سال بعد بھائی کو دیکھ کر اسے شاک لگا اور وہ دل کا دورہ پڑتے ہی مر گئی۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اسے دل کا دورہ پڑا تھا؟“ نرس نے پوچھا۔

”ہمیں اس کی لاش مل گئی تھی جسے پلاسٹک میں لپیٹ کر تہ خانہ کے کونے میں دفن کر دیا گیا تھا۔ میڈیکل آفیسر کا بھی خیال ہے کہ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس کے جسم پر کسی تشدد کے آثار نہیں پائے گئے۔“

اسٹینفورڈ نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”پیٹر ایک سستے سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس کے پاس گزر اوقات کے لیے رقم نہیں تھی۔ وہ یہ امید لے کر بہن کے پاس آیا تھا کہ وہ اسے نئے سرے سے قدم جمانے میں مدد دے گی۔ شہر کے وسط میں اس کا خوب صورت مکان دیکھ کر پیٹر کے دل میں لالچ آ گیا۔“

”لیکن ان مکانوں میں صرف عورتیں رہ سکتی ہیں۔“

”بالکل، پیٹر نے مکان کی تلاشی لی اور اسے کچھ نقد رقم کے علاوہ چابیاں بھی مل گئیں۔ پھر وہ بازار جا کر پلاسٹک کا ایک رول اور بیلچہ لایا۔ ہوٹل کا حساب کیا اور اسی رات بہن کے مکان میں منتقل ہو گیا۔“

”اور اس نے ربی کا روپ دھار لیا۔“ این بولی۔

”اسے یہی کرنا تھا۔“ بیکر نے کہا۔ ”تاکہ ربی کی پنشن اور سوشل سیکیورٹی چیک آتے رہیں۔“

”پھر اسے کس نے قتل کیا اور کیوں؟“

”یہاں سے کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے۔“ اسٹینفورڈ نے کہا۔ ”جب ربی نے یہ کہا کہ اس کا بھائی پیٹر مر گیا ہے اور گوشہ نشین ہو گئی تو گیرٹ کو کچھ شبہ ہوا۔ اس نے اپنے طور پر جاسوسی کی اور جان گیا کہ پیٹر اپنی بہن ربی کا بھیس بدل کر یہاں رہ رہا ہے۔ اس نے اسے بے نقاب کرنے، مکان سے بے دخل کرنے اور فراڈ کرنے کے علاوہ ناجائز طریقے سے لاش ٹھکانے لگانے کے الزام میں گرفتار کرانے کی دھمکی دی۔ اس پر پیٹر نے اس کا منہ بند رکھنے کے لیے رقم ادا کرنے کی پیشکش کی اور گیرٹ جو مالی مشکلات کا شکار تھا، اس پر رضامند ہو گیا۔“

”گویا وہ اسے بلیک میل کر رہا تھا۔“ این نے سرگوشی کی۔ ”یہ بہت خوفناک بات ہے۔“

بیکر نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ”پیٹر نے ہر مہینے ربی کی سوشل سیکیورٹی اور پنشن سے حاصل ہونے والی آدھی رقم اسے دینا شروع کر دی پھر ایک ہفتہ پہلے گیرٹ کے دل میں لالچ آیا اور اس نے مزید رقم کا مطالبہ کر دیا جسے پورا کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ گیرٹ کی رپورٹ بورڈ آف ٹرسٹیز میں کام کر دے گا اور اس کی ملازمت ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد اس کے ساتھ جو ہوگا، وہ اسے بھگتنے کے لیے تیار رہے۔“

”گیرٹ پیچھے ہٹ گیا۔“ بیکر نے بتایا۔ ”لیکن اسے ڈر تھا کہ پیٹر اس کی رپورٹ ضرور کرے گا چنانچہ اس نے بدنامی سے بچنے کے لیے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے جائے وقوعہ سے غیر موجودگی ظاہر کرنے کے لیے زوالی کا سفر کیا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ چپ کارڈ استعمال کرنے سے اس کی نقل و حرکت ریکارڈ ہو رہی ہے۔“

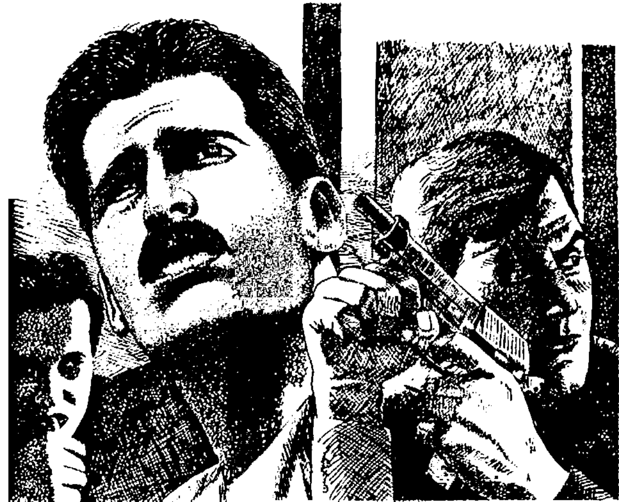
”مجھے خوشی ہے کہ تم نے اسے پکڑ لیا۔“ این نے کہا۔ ”مجرم خواہ کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔“

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی | قسط نمبر: 45

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن سے ابھرتا دوبینا دلچسپ سلسلہ...



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا، اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو، تیمی شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا رول چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پادر کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیمونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فنگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ ادیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ناک آؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھگوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فنگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فنگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی ادیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فنگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام مجنگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے بشام نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھگوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹکسی کے چیف سی جی بھگوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے [illegible] قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن [illegible] سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ قومی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں [illegible] منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر واک [illegible] کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس پری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی [illegible] بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُر فریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھگوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ شہزی، ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا

ہے۔ ریتا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھگوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھگوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھگوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھگوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کل منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھگوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا ٹھکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گینگسٹر تھا۔ نانا ٹھکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا ٹھکور کے ہمراہ کل منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا ٹھکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چپالی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا ٹھکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھادھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا مجاہد نولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم بری مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کل منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کل منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کر کے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ اور بینکاک ائرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سائکی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسا کو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ وزیر جان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے شہزی کار میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک برج پر شہزی، وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔ اس طرح وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ جو کوئی بھی تھا، اس کا چہرہ دکھائی دینے سے قبل، اس کے سائلنسر لگے پستول کی سیاہ نال پہلے مجھے دکھائی دی تھی، بعد میں اس کا چہرہ...... جو بغیر نقاب کے تھا۔

''کوئی حرکت کیے بغیر چپ چاپ اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔'' وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔

''حرکت کیے بغیر کیسے اُٹھوں میں؟'' میں نے بظاہر ہونق بن کے کہا۔ کیونکہ ابھی میں اس کے بارے میں کچھ طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔

''چالاک بننے کی ضرورت نہیں۔'' وہ غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ اس کے ساتھ ہی وہ نہایت محتاط انداز میں چند قدم پیچھے کو سرک گیا۔ ''جو کہا گیا ہے وہ کرو..... جلدی۔''

میں اُٹھ کر بیڈ پر پاؤں جھلائے بیٹھ رہا۔ جاگنے کے عمل سے گزرنے کے بعد میرے ہوش پوری طرح ٹھکانے آئے تو مجھے اپنی بائیں ٹانگ کے زخم سے ہلکی سی ٹیس اُٹھتی محسوس ہوئی۔ مگر اس سے بڑھ کر مجھے ایک اور جھٹکا لگا تھا۔

وہاں اس کے علاوہ دو اور مسلح افراد کھڑے تھے۔ شاید یہ اس کے ساتھی ہی تھے، ان کے ہاتھوں میں بھی جدید گنز دبی نظر آرہی تھیں لیکن مجھے جو جھٹکا لگا تھا، وہ آخرالذکر ان دونوں آدمیوں کو دیکھ کر لگا تھا، کیونکہ یہ دونوں مختلف حوالوں سے میرے شناسا تھے۔ ''مختلف حوالے'' سے میری مراد یہی تھی کہ میں نے ان دونوں مذکورہ افراد کو مختلف اوقات اور مختلف جگہوں پر الگ الگ دیکھا تھا اور یوں انہیں پہچانتے ہی بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہوگئی تھی۔

آخری الذکر آدمی سے شناسائی میری اسی حد تک تھی کہ وہ جہنم واصل وزیر جان کے پیلس میں کاساپوکو کے ساتھ آئے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک تھا جبکہ دوسرا شناسا آدمی بھی کاساپوکو کا ہی تھا جس سے میری مڈبھیڑ شاپنگ مال میں ہوچکی تھی۔ اس کے دھمکی آمیز وہ الفاظ ہنوز مجھے ازبر تھے جو اس نے اس وقت مجھ سے انتہائی قہر آلود وہ انداز میں کہے تھے...... ''تم نے کاساپوکو کے اہم آدمی کو ہلاک کرکے بڑی بھیانک غلطی......''

یہ وہی وقت تھا جب موت کے ہرکاروں کے ایک لیڈر اور کاساپوکو کے ایک اہم آدمی کو میں ہلاک کرچکا تھا۔

''کاساپوکو سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہوتی تو میں اسے وزیر جان کے پیلس میں ہی ختم کرسکتا تھا۔'' انہیں پہچانتے ہی میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ وہ تینوں اب مجھ سے بے حد محتاط نظر آرہے تھے۔ وہ میری خطرناکی سے واقف ہوچکے تھے۔

''چپ چاپ اور بغیر کوئی چالاکی دکھائے حکم کی تعمیل کرو، یہی تمہارے لیے بہتر ہوگا۔'' پہلا والا ہی مجھ سے مخاطب تھا۔

میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں یہی سوال اُبھرا تھا کہ یہ منوج کمار کی رہائش گاہ تک کیسے پہنچ سکتے تھے؟ اس کا جواب بھی عیاں تھا۔ جب میں وزیر جان کی محل نما رہائش گاہ سے کار پورچ سے اس کے تعاقب میں نکلا تھا تو اس وقت کاساپوکو بھی اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ بڑی سی گاڑی میں کوچ کرنے کی تیاری میں تھا اور میری کار کا اگلا بمپر اس کی گاڑی کے پچھلے حصے سے ٹکرایا تھا۔ کیا خبر وہیں سے ہی کاساپوکو نے میرا تعاقب شروع کردیا ہو اور میں اس تعاقب پر دھیان دینے کی پوزیشن میں بھی کب تھا؟ میں اس وقت اپنے اہم شکار (وزیر جان) کے تعاقب میں تھا۔ پھر وہاں سے میرے ٹیکسی میں سوار ہونے تک انہوں نے یہاں تک تعاقب کیا ہوگا اور پھر دوبارہ مکمل کانٹوں سے لیس ہوکے لوٹے تھے۔ مقصد مجھے یرغمال بنانے کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ پتا نہیں اب ان تینوں نے منوج کمار کا کیا حشر کیا ہوگا؟

میں بظاہر ان کا حکم ماننے کے لیے بیڈ سے خاموشی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ میری بائیں ٹانگ کا زخم بہت بہتر تھا۔

''یہاں ایک اور آدمی بھی تھا۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے مخاطب سے استفساریہ کہا۔ میری مراد منوج کمار سے تھی۔

''اسے ختم کردیا گیا......'' مخاطب نے بڑی سفاکی سے کہا اور میرا دم گھٹنے لگا۔ ان خونی ہرکاروں سے اور کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ مجھے ''گریٹ روبری'' کے موجد کی مختصر کہانی کے عبرت انجام پر افسوس تھا۔ پتا نہیں بے چارہ اپنی زندگی بنانے کے لیے چوری کا کون سا بڑا منصوبہ بنائے ہوئے تھا۔ پتا نہیں بدنصیب منوج کمار مجھ سے کیا کام لینا چاہتا تھا اور اس کے بدلے میری امریکا روانگی کا بھی اس نے بندوبست سوچ رکھا تھا۔ اب وہ سب سبوتاژ ہوچکا تھا۔ تقدیر نے ایک بار پھر میری امریکا یاترا کی راہ کاٹ ڈالی تھی۔

''اس بے چارے کا کیا قصور تھا۔ وہ میرا ساتھی تو نہیں تھا۔'' میں نے اسے ایک بار پھر مخاطب کیا۔

''ہم اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے، نہ ہی تمہیں کسی قسم کا جانی نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ.... رکھتے ہیں۔ لیکن تمہارے اس ساتھی نے ہم پر حملہ کرنے کی بے وقوفانہ کوشش کی تھی۔'' اس نے سرد سی متانت سے کہا مگر مجھے اس کے لہجے سے دروغ گوئی کی بُو آتی محسوس ہورہی تھی۔

''میں نے کہا نا کہ وہ میرا ساتھی نہیں تھا۔''

''ٹھیک ہے پھر تمہیں اس کی موت کا افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہم تمہارا بھی یہی حشر کرسکتے ہیں، بہ شرطیکہ تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش چاہی تو...... اس لیے اس رعایت سے فائدہ اُٹھاؤ۔''

میں نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ مگر اس نے مجھے مزید بولنے سے روک دیا۔

''بس! اب دروازے کی طرف اپنا منہ کرکے دونوں ہاتھ پیچھے موڑ لو۔'' اس بار وہ غراتے ہوئے لہجے میں بولا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ میں ان پر حملہ کرنے کے...... عوامل پر غور کرنے لگا۔ لیکن ان کی حد سے زیادہ محتاط روی آڑے آرہی تھی، یہی سبب تھا کہ جب میں نے اس کے حکم کی تعمیل میں دروازے کی طرف اپنا منہ موڑا تو اس دوران ان تینوں کی ''اسٹینڈنگ پوزیشن'' کا اندازہ بھی لگانے کی سعی چاہی تھی۔ جو میرے ان پر اچانک حملہ کرنے کے جارحانہ انداز میں مانع ہورہی تھی۔

کیونکہ یہ تینوں اسلحہ بدست تھے۔ وہ تھوڑا دائیں جانب ہوگیا تھا۔ یوں میں اس کے دونوں اسلحہ پوش ساتھیوں کے نشانے پر تھا۔ جس وقت میرے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں میں آہنی زنجیروں کے کڑے ڈالے جانے لگے تب تک میرے ذہن رسا میں ایکشن دکھانے کا منصوبہ آچکا تھا۔

میں جانتا تھا کہ پہلے والے نے کس مقصد کے تحت اپنے پستول پر سائلنسر.... چڑھا رکھا تھا، تاکہ ایسی کسی سچویشن پر وہ بے آواز مجھ پر فائر کرکے بے بس کرے۔ باقی دونوں میں سے ہی یقیناً ایک کو اس نے اشارہ کیا تھا۔ اور وہ میری پشت پر کھڑا میرے اُلٹے ہوئے ہاتھوں میں ہینڈکف پہنا رہا تھا۔ ابھی ایک ہی حلقے میں میرا ہاتھ ڈالا تھا کہ میرے بظاہر خاموش کھڑے وجود میں جیسے بجلی کے بل پارا سرایت کرگیا۔ اپنی داہنی ٹانگ پر میں بہ سرعت ہی گھوما اور میرے دائیں بازو کی کہنی کا وار پشت پر کھڑے ہینڈکف پہناتے ہوئے ہرکارے کے پہلو پر پڑا۔ وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی آواز خارج کرکے جھکا۔

یہ حملہ کرتے ہی میری محتاط گردشی نظروں نے سب سے پہلے اسی ہرکارے کو لیا تھا جس نے خاص مقصد کے لیے اپنے پستول پر سائلنسر چڑھا رکھا تھا۔ زد میں آئے ہرکارے کو میں نے کچھ اس طرح دھکیلنے کے انداز میں نشانہ بنایا تھا کہ میرے بجائے وہ دوسرے ہرکارے کے نشانے پہ آجائے۔ یہ بھانپتے ہی اس نے مجھ پر گولی چلانے کے لیے اپنی اسٹینڈنگ پوزیشن بدلنے کی کوشش چاہی تھی کہ تبھی میں مضروب کو اپنے کندھے کی زوردار ٹھوکر رسید کرکے اس پر اچھال چکا تھا۔

وہ اس سے ٹکرایا اور گرا، تب تک میں نے اس پر لانگ جمپ لی اور اسے رگیدتا ہوا دوسری طرف کی دیوار سے ٹکرایا۔ تیسرے ہرکارے کی طرف سے بھی میں کسی خوش فہمی کا شکار نہ تھا کہ وہ اپنی بغیر سائلنسر لگی گن سے فائر نہیں کرسکتا تھا۔ ممکن تھا کہ کوئی راستہ نہ پاکر وہ اپنی رائفل سے برسٹ فائر کرکے اُبھرنے والی گولیوں کی ''دھمن گرج'' کا رسک لینے پر تیار ہو بھی جاتا۔ اسی لیے میں نے سائلنسر لگے پستول والے ہرکارے کو زد میں لیتے ہی اس سے گن جھپٹنے کی کوشش چاہی مگر وہ کم بخت بھی کم تربیت یافتہ نہ تھا۔ اس نے ایک ذرا سا موقع پاتے ہی اسی گن کا دستہ میری پیشانی پر دے مارا۔ شدتِ تکلیف کے باعث میرے حلق سے چیخ خارج ہوگئی۔ باقی دونوں سنبھلتے ہی مجھ پر پل پڑے۔

ضربِ شدید کے باعث میرا سر چکرایا ہوا تھا اور یوں میں مار کھا گیا۔ آناً فاناً میرے ہاتھ دربستہ کردیے گئے۔ مجھے اُٹھا کر کھڑا کردیا گیا اور لاتوں اور مکوں سے ان تینوں بدبختوں نے اپنے دل کی خوب بھڑاس نکالی۔ یہاں تک کہ میں نڈھال ہوگیا۔ اس کے بعد مجھے کالر سے پکڑ کر کھڑا کیا تو میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ایسے ہی وقت میں جبکہ میں پاس کے کمرے کے دروازے کے قریب کھڑا تھا، مجھے وہاں سے فرش پر پڑی بدنصیب منوج کمار کی لاش دکھائی دے گئی۔

یہ لوگ مجھے باہر لے آئے۔ سامنے سیاہ وین کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہونے کے بعد یہ لوگ روانہ ہوگئے۔ شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ میری آنکھوں پہ انہوں نے پٹی باندھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ شاید اسی لیے کہ میں اجنبی ہی تھا یہاں...... کہاں کہاں اور کون کون سی جگہیں ازبر کرتا۔ یہاں کا تو ایک ایک چپا میرے لیے اجنبی تھا۔ فوری طور پر گزرے اور دیکھے بھالے علاقوں اور مقامات کی

الگ بات تھی۔

اس وقت بھی مجھے جن راستوں پر لے جایا جا رہا تھا، وہ میرے لیے اجنبی راہیں تھیں۔ چمکتے دمکتے نیون سائن، جلتے بجھتے دیوزاد بورڈز اور چمکتی ہوئی اسکرینز۔ نہروں کے جھلملاتے کنارے اور وہاں بنے ہوئے پارک پر لوگوں کی آدک جاوک...... معروف شاہراہیں اور ان پر دوڑتی بھاگتی گاڑیاں......

ایک مقام پر جہاں سے دین کی رفتار کم ہوئی تو وہ موڑ کاٹنے لگی۔ اس کے دائیں جانب مجھے کسی بڑے معبد خانے کی عمارت دکھائی دی۔ جس کی پیشانی پر ''تریمتر میوزیم'' درج تھا۔ یہ میں سائن میں نے ذہن نشین کرلیا۔ یہاں سے بعد کا اختتامی سفر بمشکل پندرہ بیس منٹ کا ہی رہا تھا اور ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہوگئے جس کے اطراف میں پام کے درخت اور وسیع وعریض قطع اراضی میں باغیچے پھیلے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان سے گزرتی ایک کنکریٹ کی پختہ روش پر وین رینگنے کی رفتار سے ایک سفید رنگ کی بیش قیمت...... لکڑی کی عمارت کے بڑے سے گیٹ کے سامنے رکی جس کا رنگ سیاہ تھا۔ دین ابھی گیٹ کے قریب ہی تھی کہ دونوں دروازے دائیں بائیں سلائڈ ہوگئے۔ دین رکے بغیر اندر داخل ہوگئی۔ سامنے ہی مجھے وسیع سوئمنگ پول نظر آیا۔ وہاں روشنی تھی۔ باقی لان میں بھی مدھم سی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہاں میں نے چار پانچ خوفناک شکاری جبڑوں والے جرمن شیفرڈ کو آزادانہ منڈلاتے ہوئے دیکھا۔ دو دھاری دھار بھاری جسامت کے چیتے بھی مجھے سرگشت کرتے دکھائی دیے۔ اصل رہائشی عمارت اندر کی۔ کچھ مستعد اور مسلح افراد بھی تنے کھڑے نظر آئے تھے۔ ایسے ہی باہر کے گیٹ پر بھی موجود تھے۔

سامنے لمبا چوڑا شطرنج بورڈ جیسی ٹائلوں والا فرش پھیلا ہوا تھا جہاں ایک خوب صورت مگر بھاری بھرکم محرابی دروازہ تھا۔ اس کے دائیں بائیں چنگھاڑتے ہوئے درندوں کے سنگی مجسمے بنے ہوئے تھے۔ یہی گل دان کا بھی کام دے رہے تھے۔ ان پر خوش رنگ پودے اور پھول نظر آ رہے تھے۔

اس مرکزی دروازے سے ہم اندر داخل ہوگئے۔

بینکاک کے ایک خطرناک گینگسٹر کے ٹھکانے پر......

میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیات ہونے لگی تھیں۔ کاسپاکو جیسے سفاک اور درندہ صفت آدمی سے کسی بھی قسم کی بربریت کی توقع کی جا سکتی تھی۔ بدیس کی اجنبیت ایک الگ سی پریشانی اور دل میں فطری طور پر ایک عدم تحفظ کا ڈر سا اُبھار رہی ہے۔

ہم ایک بڑے سے شاہانہ طرز کے کمرے میں آگئے۔ شکر تھا کہ مجھے کسی تہ خانے نما قید خانے یا زنداں کی نذر نہیں کیا تھا جس کا مطلب میری عقل میں یہی آتا تھا کہ کاسپاکو...... کا ارادہ کم از کم فوری طور پر مجھے نقصان پہنچانے کا نہیں ہے۔ ورنہ مجھے نیند کے عالم میں ہی ان ہرکاروں کا ہلاک کرنا کیا مشکل ہوتا۔

مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میرے دونوں ہاتھ ہنوز پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں اسی طرح ہی بیٹھ گیا تھا۔ ان تینوں میں سے دو میرے دائیں بائیں عقب میں کھڑے ہوگئے تھے۔ جبکہ تیسرا (سائلنسر پستول والا) میرے سامنے والے ایک خالی صوفے کے قریب خاموش کھڑا ہو گیا۔ میری زیرک اور چست نظروں نے ان کی اس انداز کی مخصوص پوزیشنیں سنبھالنے پر فوراً ہی محسوس کیا تھا کہ کسی کی آمد جلد ہی متوقع ہے پھر ذرا ہی دیر میں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ جب میں نے دائیں جانب کے دروازے سے کاسپاکو کو ایک وہیل چیئر پر نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ خودکار وہیل چیئر تھی۔ جسے وہ خود ہی ایک ہاتھ سے اس کی ہتھی پر لگے لیور سے چلا رہا تھا۔ تاہم اس کی چیئر کے ہمراہ دو عدد طرح دار تھائی دوشیزائیں بھی تھیں۔ دونوں چست اور مختصر لباس میں تھیں۔

کاسپاکو جیسے آدمی کو وہیل چیئر پر دیکھ کر مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ میں اس کی وجہ جانتا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی اور دائیں ٹانگ کی بھی یہی حالت تھی۔ وزیر جان کی کل نمار ہائش گاہ پر جب اس نے پھرتی سے پلٹ کر...... اپنے خطرناک پسٹل سے وزیر جان پر فائر جھونکنے کی کوشش چاہی تھی تو وزیر جان کے چھپے ہوئے شوٹرز نے دو گولیاں اس پر داغ ڈالی تھیں جو اس کے ایک پستول والے ہاتھ پر اور دوسری دائیں ٹانگ پر لگی تھیں۔ یہ انہی کا زخم تھا۔

وہیل چیئر مذکورہ صوفے کے قریب آکر رکی۔ دو افراد تیزی سے آگے بڑھے اور کاسپاکو کو سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا۔ وہ بہرحال معذور نہیں تھا۔

اب وہ صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے میرے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ میری یک ٹک نظریں بھی اس کے چہرے پر مرکوز رہی تھیں۔ ایک آدمی نے، موٹا اور سستی

رنگ کا سگار اس کے لبوں سے لگا کر لائٹر دکھا دیا۔ وہ دائیں ہاتھ سے دو تین سگار کے طویل کش لگانے کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔

''میں آدمی کی قدر جانتا ہوں، اسی لیے تم یہاں پر زندہ لائے گئے ہو۔'' اس نے حسب سابق پُرغرور لہجے میں کہا۔ ''ایک بات ذہن میں رکھنا، ابھی میں ایسا صرف سوچ رہا ہوں۔ تمہارے سلسلے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم ہو کون......؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور کس گینگ سے تعلق رکھتے ہو؟''

میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ میں یہاں لانے تک قیاس آرائی کے بل بوتے پر سوچ چکا تھا کہ وہ مجھ سے کیا اور کس قسم کے سوالات کر سکتا ہے۔ میری ''خطرناکی'' کے وہ دو شواہد، جن میں ایک غائبانہ اور دوسرا نظری تھا، سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''میں اسی شخص کے گینگ کا ایک اہم رکن تھا جس سے بات کرنے تم کل آئے تھے۔''

''ہوم...... ہم!'' سگار کے سیاہ گاڑھے دھوئیں کے لچھے فضا میں چھوڑتے ہوئے اس نے گمبھیر انداز کی ایک ہنکاری لی تھی۔

''اس سے منحرف ہونے کی وجہ......؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''دشمنی۔''

''دشمنی کی نوعیت؟''

''میری اب تک کی قربانیوں، وفاداریوں اور جاں نثاری کا بدلہ...... ایک نئے شامل ہونے والے آدمی کو مجھ پر ترجیح دینا تھا۔'' میں نے اسی انداز میں دروغ گوئی سے کام لیا جس انداز اور ''فیل'' کا یہ مجھے سمجھے ہوئے تھا۔

''یہ تو دشمنی کی اتنی بڑی وجہ نہیں محسوس ہوتی کہ تم اپنے ہی باس کو ہلاک کر ڈالو......؟'' وہ بولا۔

بلاشبہ کاسپاکو...... گھاگ آدمی تھا۔ وہ نوعیت تاڑنے کی کوشش کر رہا تھا نیز اسے بھی پتا چل چکا تھا کہ میں وزیر جان کو جہنم واصل کر چکا ہوں، اسی سبب میرا یہ اندازہ بھی درست ہی ثابت ہوا تھا کہ اس نے نوکٹ پکیں، ہل ٹاپ سے میرا تعاقب کیا تھا۔

''میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے کہا اور آگے بولا۔ ''ترجیح دینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس آدمی کی شکایات پر میرے خلاف تنظیمی دتادیبی کارروائیاں بھی کی جاتیں۔ یہاں تک کے جب اسی نو وارد نے جب میری فیملی پر بُری نظر رکھی تو...... میں خود پر قابو نہ پاسکا اور اس پر ہلا بول دیا۔ اس کی درگت بنا ڈالی اور باس وزیر جان سے اس کی شکایت بھی کر ڈالی مگر اس نے میرے ہاتھوں بری طرح پٹنے کے بعد باس کو میرے خلاف پوری طرح اُکسا دیا تھا۔ باس نے حسب معمول اسی کی سائڈلی تو میں بددل ہو کے تنظیم سے نکل گیا۔ اس آدمی کو دشمنی نکالنے کا موقع مل گیا اور اس نے میری فیملی کو انتقام کے شعلوں کی نذر کر دیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ ایسا اس نے باس کی شہ اور مدد کے بل بوتے پر کیا تھا۔ اس نے مجھے بھی تنظیم سے انحراف کرنے پر موت کے گھاٹ اُتارنے کا حکم دے رکھا تھا۔ تب سے میں اپنے سینے میں انتقام کی آگ لیے ہوئے انڈیا سے اس کے پیچھے یہاں تک چلا آیا تھا۔''

میں اچھی خاصی دروغ گوئی سے کام لینے کے بعد چپ ہو رہا اور اس کے چہرے پر اپنی بات کے ردعمل کا جائزہ لینے لگا۔ وہ مجھے لامحالہ ہی سہی جس فیل کا سمجھے ہوئے تھا، میں...... اُسے اسی انداز میں ہی مطمئن کر سکتا تھا۔

وہ اپنے پھولے ہوئے پپوٹوں تلے اُبلی ہوئی آنکھوں سے کسی مینڈک کی طرح مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد سگار کا ایک طویل کش لیا۔

''میری معلومات کے مطابق تم یہاں اس کی قید میں بھی رہ چکے تھے۔ میرے آدمی موتو کی مداخلت سے تم آزاد ہوئے۔ پھر پتا نہیں تمہارے اور موتو کے درمیان کس طرح کی ٹھن گئی تھی کہ...... تم اس کے نرغے سے بھی فرار ہو گئے۔ تم نے اسے شدید زخمی بھی کر دیا۔ یہ سارا کیا چکر تھا؟''

میں نے یہ حقیقت بلاکم وکاست...... صاف گوئی سے بتا ڈالی کہ اس کی ساچی نامی گرل فرینڈ تمہارے قبضے میں تھی اور موتو اسی لیے مجھے وزیر جان کے ایک آدمی کی مدد سے چھڑا کر تمہارے حوالے کرنا چاہتا تھا۔''

میں جانتا تھا کہ یہ حقیقت بھی اسے معلوم ہوگی، لہٰذا اس معاملے میں جھوٹ بولنا میرا خود کو پھنسانے کے مترادف ہوتا۔

''صحیح...... بالکل صحیح......'' کاسپاکو معنی خیز انداز میں بولا۔ ''تو گویا اس کا مطلب ہے کہ وہ لڑکی ساچی تمہاری کچھ نہیں لگتی تھی۔''

''ہرگز نہیں، وہ تو اتفاق سے میرے ساتھ اُس روز

شاپنگ مال میں پھنس گئی تھی۔ چونکہ ہم سب یرغمال تھے تو لامحالہ ایک ہی کشتی کے سوار کہلائے تھے۔ ورنہ میرا تو وہاں کسی سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔" میں نے بہت محتاط انداز میں اُس کی آخری بات کا جواب دیا۔ کیونکہ میری اور کاسپا کو کی دشمنی کی بنیاد ادھر سے ہی پڑی تھی۔

"صحیح...... بالکل صحیح......" کاسپا کو ایک بار پھر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ یہ شاید اس کا تکیہ کلام تھا۔

"وہاں تمہارے ہاتھوں میرا ایک اہم مشن فیل ہو گیا اور ایک اہم آدمی بھی ہلاک ہوا تھا۔" اس بار وہ سرسراتے لہجے میں کہہ رہا تھا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ کیونکہ گفتگو کی نہج بدل رہی تھی۔ وہ جواب طلب انداز میں یہ بات کہہ کر میرے چہرے پر اپنی سنانے دار نظریں مرکوز کیے رہا تو میں نے ہولے سے کھنکھار کر جواب میں کہا۔

"میری تم سے یا تمہارے آدمیوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں نے اُس روز وہاں جو کچھ کیا تھا وہ اپنی جان بچانے کے ایک فطری تقاضے کے تحت کیا تھا۔ اس میں کسی دشمنی کا کوئی بھی دخل نہ تھا۔"

"صحیح...... بالکل صحیح......" کہتے ہوئے وہ پھر اپنا سر دھننے لگا۔

میری انتہائی حساس آبزرویشن...... اس کی باڈی لینگویج اور لب و لہجہ سے پتا چل رہا تھا وہ اب تک میرے سارے سوالات سے مطمئن رہا ہے۔ تبھی اس نے اپنے ان دو آدمیوں، جو میرے صوفے کے عقب میں دائیں بائیں مستعد کھڑے تھے، ان میں سے ایک کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور میرے ہاتھوں کے ہینڈکف کھول دیے۔ میں نصف آزاد ہو گیا۔ دل کچھ مطمئن ہوا، خلاصی ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں اب بینکاک کا یہ گینگسٹر مجھ سے اور کیا چاہتا تھا۔ مجھے رہا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا بھی کہ نہیں لیکن اس کی پہلی بات اس سلسلے میں آڑے آرہی تھی جو اس نے میرے ساتھ اپنی گفتگو کی ابتدا میں کہی تھی۔

"میں آدمی کی قدر جانتا ہوں اسی لیے تم یہاں پر زندہ لائے گئے ہو۔"

اس کے بعد اس نے اپنے پاس کھڑے اسی آدمی کی طرف دیکھا جو مجھ سے مخاطب رہ چکا تھا۔ وہ فوراً ہی نہایت احترام سے اس کی بات سننے کے لیے ذرا سا جھکا۔ پتا نہیں کاسپا کو نے اس سے کیا کہا، وہ فوراً پلٹ گیا۔ ایک دوسرے دروازے تک گیا وہاں اس نے کھڑے ہو کے کسی کو سر اور ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہا اور واپس آکر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں کئی ثانیوں کے لیے گمبھیر تا سی خاموشی طاری رہی۔ اس دوران میں کاسپا کو موٹے سگار کے کش لگاتا رہا اور گاڑھے کثیف دھوئیں کے لچھے دار بادلوں کے عقب سے میرے چہرے کو بھی گھورتا رہا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک اور طرح دار سی حسینہ ایک دروازے سے نمودار ہوئی۔ وہ مختصر اور چست لباس میں تھی۔ جسم بھرا بھرا تھا۔ عریاں حصے انگاروں کی طرح دہکتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ ایک نفیس قسم کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی لا رہی تھی۔ اس پر انواع و اقسام کے کھانے پینے سجے ہوئے تھے۔ شراب کی بوتلیں۔ خالی پیگ۔ بھنے گوشت کے پارچے اور نجانے کیا کیا۔

میرا خیال تھا کہ حسینہ ٹرالی کو کاسپا کو کے قریب لا کر چھوڑ دے گی مگر ایسا نہیں ہوا، وہ اسے میرے قریب لے آئی اور ٹھہر گئی۔ میری طرف اس نے ایک دلنشیں مسکراہٹ سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بڑی کشادہ اور سیاہ چمکتی ہوئی تھیں جن میں مجھے ایک عجیب سی بھوک کی چمک محسوس ہوئی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو احترام کے انداز میں خفیف سا خم کیا اور پھر واپس لوٹ گئی۔ مطلب یہی تھا کہ یہ سارا کچھ میری ضیافت کے لیے تھا۔

میں کھانے کی ٹرالی کی طرف دیکھنے لگا۔ بھوک مجھے تھی لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ میں ایک فرنگی ملک میں تھا جہاں کی کافی سے زیادہ چیزیں...... میرے لیے ممنوع ہو سکتی تھیں، شاید میری اس تردد آمیز بے چینی کو کاسپا کو بھانپ گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کی کھرکھراتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"بے فکر رہو...... اس میں سوائے شراب کے تمہارے مذہب کی کوئی شے ممنوع نہیں ہے۔ گوشت بکرے کا ہے، ہرن کے پارچے ہیں۔ نیل گائے کا روسٹ اینڈ فرائڈ قیمہ ہے ڈبل بریڈ کے ساتھ اور بیئر کے دو ٹن بھی نان الکوحل ہیں۔"

وہ رکا پھر بولا۔ "آرام سے کھاؤ اور جی بھر کر...... مجھے خوشی ہوگی۔ باقی کی اہم باتیں تم سے صبح ہوں گی۔ تمہارے آرام کا بندوبست کیا جا چکا ہے۔"

میں اُس کی بات پر چونکا...... اور کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔

وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح واپس لوٹ گیا۔ باقی بھی چلے گئے۔ میں کھانے میں مشغول ہو گیا۔ شراب اور

بیئر کو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ باقی سب مزے دار اور قوت بخش تھا۔ بڑے عرصے بعد ایسا پُرتکلف کھانا ملا تھا یوں بھی میں کھانے پینے کا شوقین تھا...... خوب ڈٹ کر کھایا کہ پتا نہیں بعد میں ایسا کھانا نصیب میں ہوگا بھی کہ نہیں۔

حسبِ فطرت کھانا کھاتے ہی مجھ پر گویا "خمارِ گندم" طاری ہونے لگا، یعنی نیند نے آلیا۔ مجھے شاید کہیں سے خفیہ طور پر "واچ" کیا جا رہا تھا، کیونکہ کھانا ختم کرتے ہی...... وہی طرح دار حسینہ اندر داخل ہوئی جو میرے لیے ضیافت کا یہ سامان لائی تھی۔

خمارِ گندم صرف نیند نہیں دیتا، ہوش بھی کھوتا ہے۔ میری نیم بازسی نظریں غیر ارادی طور پر اس کے سیاہ رنگ کے منی اسکرٹ سے جھانکتی ہوئی ٹانگوں پر تھیں۔ اس نے بڑی شستہ انگریزی اور مترنم لہجے میں کہا۔

"آیئے میں آپ کو کمرے تک لیے چلتی ہوں۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ٹرالی پر جھکی اور شراب کی بند بوتل کو چھو کے بولی۔ "او...... آپ نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا؟ چلو کمرے میں شغل کر لینا۔" کہتے ہوئے اس نے بوتل، پیگ اور باؤل اُٹھا لیا۔ ایسے میں اس کا گریبان جھکنے کی وجہ سے بڑا حشر ساماں منظر پیش کرنے لگا تھا۔ وہ بڑے گداز حسن کی مالک تھی۔ ایسی توبہ شکن کہ بڑھ کر دبوچ لو۔ میرے وجود میں نیند کے خمار کے باوجود سنسنی دوڑ گئی۔

"نہیں رہنے دو...... پلیز......! میں شراب نہیں پیتا۔" میں نے کہا۔

"واٹ......؟" وہ یوں چونکی جیسے میں نے اُسے زہر پینے کا کہہ ڈالا ہو......"

"انتہائی غیر یقینی...... ٹھیک ہے تم مسلم ہو مگر......"

"مگر میں...... نہیں پیتا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اوکے...... تشریف لایئے۔" کہتے ہوئے اس نے وہ سامان پھر جھک کے ٹرالی پر رکھا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں دوبارہ اس کا توبہ شکن نظارہ کرنے سے خود کو نہ روک سکا۔ بس، دیکھنے کی حد تک ہی سب کچھ تھا، ورنہ میں اس فطرت کا انسان کہاں تھا۔ وہ بھی نظر بھٹک جاتی تب......

وہ مجھے ایک دروازے سے گزار کر چکنے فرش والی چمکتی رہداری میں لے آئی۔ وہاں سے ایک کمرے میں لے کر داخل ہوئی۔ کمرا دیکھ کر ہی میں دنگ رہ گیا۔ اس قدر آرام دہ اور ضرورت کی ہر شے سے آراستہ تھا کہ نیند آپوں آپ غلبہ پانے لگتی تھی۔

اس کی دیواریں سفید تھیں۔ دو کھڑکیاں تھیں سلاخ دار...... ایک گول روشندان، چھت اُونچی مگر محراب نما ڈھلوانی تھی۔ سائڈ میں آرام دہ ڈبل بیڈ تھا۔ صوفہ تھا۔ اٹیچ باتھ، واٹر ڈسپنسر اور نجانے کیا کیا۔ فریج تھا۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ ایک کونے میں بارٹینڈر کا وائن کاؤنٹر تھا جس کے شیلف میں بھانت بھانت موٹی، لمبی، مخروطی وہسکی کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔

"یہاں آپ آرام کریں...... کل صبح آپ کو جگا دیا جائے گا۔" وہ نرم سی مسکراہٹ سے بولی پھر میری طرف مصافحے کے لیے اپنا نرم و نازک ہاتھ بڑھایا۔

"میرا نام...... سون ہے۔" اس نے شاید لگے ہاتھوں اپنا تعارف بھی کرا دیا۔ میں نے مسکرا کر اس سے مصافحہ کیا تو جیسے میرے پورے وجود میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔ کس قدر نرم و گداز ہاتھ تھا اس کا...... حرارت سے بھرپور...... نرم گرم سا... جذبات کو بے اختیار دہکاتا ہوا...... میرا دل تھرانے لگا تو میں نے فوراً اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ کیونکہ اس نے ہاتھ اپنا میرے ہاتھ میں ہنوز دے رکھا تھا۔

میں "شکریہ" کہتا ہوا بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔

"باتھ روم میں وارڈ روب ہے۔" سون ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"وہاں ہر سائز کے دھلے ہوئے سلیپنگ سوٹ موجود ہیں۔ پہلے تم فریش ہو کر آ جاؤ، پھر میں بھی اپنا یہ لباس بدل کر نائٹی پہن لیتی ہوں۔ ویسے تمہیں کون سے رنگ کی نائٹی پسند ہے؟"

اس کی بات سن کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ گویا سارا نشہ ہی اُتر گیا۔

"کک...... کیا مطلب......؟" میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے اس طرح بوکھلانے پر ہنسی۔ اس کے سیبوں جیسے گالوں پر ایک گڑھا پڑا۔ سفید دانتوں کی قطار...... بہت بھلی لگی۔ نرم و گداز لب اور زیادہ رسیلے محسوس ہوئے۔

"جی ہاں! باس نے مجھے تمہارے ساتھ رات گزارنے کا حکم دیا ہے۔ تمہاری خاطر مدارت اور ضروریات سے لے کر ہر چیز کا خیال رکھنے کا حکم ملا ہے مجھے۔"

"لل...... لیکن میں تو ایسا کچھ نہیں چاہتا...... تم الگ کمرے میں جا کر سو جاؤ، میں کوئی بچہ نہیں ہوں، جو مجھے ڈر

لگے گا۔'' میں نے ذرا لہجے میں .... تلخی سموتے ہوئے کہا۔ تا کہ اس کا دل خراب ہو جائے مگر وہ قتالہ جہاں اور عذاب جاں بدستور ہنس کر بولی۔

''انجان مت بنو، باتھ روم جاؤ اور چینج کر آؤ، اس کے بعد مجھے جانا ہے۔'' یہ کہہ کر سون دروازے کی طرف بڑھی اور اس نے وہ بند کر دیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی طرف تکتا رہ گیا۔

''جاؤ......!'' وہ دوبارہ میرے قریب آ کر بولی۔ مگر میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا اور اس بار اس سے تلخ لہجے میں بولا۔

''اے...... مس! میں اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ آپ مہربانی کر کے یہاں تشریف لے جائیں۔''

''بے وقوف مت بنو!'' سون اس بار سنجیدہ ہو کے بولی۔ ''یہ باس کا حکم ہے۔ ورنہ وہ ناراض ہو جائے گا۔ وہ اس میں مجھے خطاوار سمجھے گا اور میری شامت آجائے گی کہ میں تمہیں پسند نہیں آئی۔ وہ اس میں اپنی ہتک سمجھے گا، پلیز!

تم ... سمجھو بات کو...... باس ایسی ہی عجیب فطرت کا ہے، اُسے یقین ہی نہیں آئے گا کہ تم اور مزاج کے ہو، سارا نزلہ اس کا مجھ پر گرے گا۔ پلیز، میں الگ سو جاؤں گی، مگر مجھے آج کی رات یہاں گزار لینے دو......'' اس کے لہجے میں التجا اتر آئی تھی، میں بھی ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہ گیا اور شاید اس کی ''مجبوری'' بھی سمجھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر میں بولا۔ ''میں صوفے پر سوؤں گا تم بیڈ پر سو جانا۔''

''نہیں، میں صوفے پر سوؤں گی، تم بیڈ پر...... جاؤ اب لباس بدل لو، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔'' سون بولی۔

باتھ روم میں داخل ہوا یوں لگا جیسے باتھ روم میں نہیں بلکہ کسی اور کشادہ کمرے میں آ گیا ہوں۔ ایک طرف بڑا سا کشتی نما اور خوش نگاہ باتھ ٹب تھا۔ فینسی اسٹائل کی بیش قیمت اور دیدہ زیب سینیٹری نصب تھی۔ میں نے گرم پانی سے غسل کیا، ہلکا پھلکا لباس پہنا اور نکل آیا، جب وہ جانے لگی تو میں نے اس سے ''احتیاطاً'' کہہ ڈالا۔

''نائٹی پہننے کی ضرورت نہیں تمہیں، ڈھنگ کا لباس پہن لینا مناسب ہوگا۔ اسے میری شرط سمجھو۔''

وہ عجیب عجیب سی نگاہوں سے مجھے تکتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی، میں بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ میں اس کے نکلنے کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ برآمد ہوئی۔ اس کے بال لمبے تھے، جو بکھر کر شانوں سے بھی نیچے جھول رہے تھے۔ اس نے لمبا سا کوئی فراک پہن لیا تھا۔ گریبان اس کا بھی کشادہ تھا مگر یہ بہرحال نائٹی سے بدرجہ بہتر تھا۔ میں نے اس کے سراپا پر سرسری سی نظر ڈالی اور بیڈ سے اُٹھ کر سونے کے لیے صوفے کی طرف جانے لگا تو وہ مترنم سی آواز میں بولی۔

''تم بیڈ پر ہی لیٹو، صوفے پر میں سو جاؤں گی، تم پورے نہیں آؤ گے۔ نیند میں خلل پیدا ہوگا۔'' کہتے ہوئے وہ عجیب سی نگاہوں سے میرے لمبے چوڑے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی بات صحیح تھی۔ صوفہ لیٹنے کے لیے نہیں تھا، میں سکڑ سمٹ کر ہی سو سکتا تھا۔ جبکہ وہ پوری آسکتی تھی۔ میں دوبارہ بیڈ کی طرف پلٹ گیا۔

اس نے بیڈ سے لحاف اُٹھایا اور صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے اس کا موڈ ذرا آف سا لگ رہا تھا۔ نجانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی میرا ذہن اس کے بارے میں کچھ سوچنے پر مجبور ہونے لگا تھا۔ میری پیش رفتہ حیات ہا ہی...... میں جہاں دوست میرے کام آتے رہے تھے وہیں دشمنوں کے ساتھی بھی کسی نہ کسی حوالے سے مجھے مدد دیتے رہے تھے، کیا شک تھا اس میں کہ ایسا میری ذہنی فراست کے بل بوتے پر ہی ہوتا رہا تھا۔ چنانچہ میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ سون کو اگر میں شیشے میں اُتارنے کی کوشش کرتا تو وہ میرے کسی ''کام'' آسکتی تھی لیکن دیکھنا یہ تھا کہ یہ کمرا ''بگڈ'' تھا یا نہیں۔

میں نے بیڈ پر لیٹے لیٹے اس کی طرف پہلو کر کے دیکھا۔ وہ صوفے پر گھٹنے سمیٹے لیٹی تھی اور اس پہلو پر تھی کہ وہ بھی مجھے بیڈ پر لیٹا دیکھ رہی تھی۔ ہماری نگاہیں ملیں تو اس نے ہونٹوں کی ایک باچھ کو تھوڑا سا یوں خم دیا کہ جیسے وہ مجھ سے ناراض ہو۔ اس کی ''دعوت'' ٹھکرانے پر شاید اس کی کسی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ایسی عورتوں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا میں نے مسکرا کر بیڈ پر لیٹے لیٹے اس سے کہا۔

''ناراض ہو؟''

''نہیں۔''

''دیکھو، تم بہت اچھی لڑکی ہو اور بہت حسین بھی، لیکن...... تمہیں جو حکم تھا، وہ تم کرنے پر مجبور تھیں۔ اس میں تمہارا یا میرا کوئی دوش نہیں......'' میں نے اس کی انا کو جملوں کی جادوگری سے تھپتھپایا کہ اس کے اندر کی عورت کچھ سوچنے پر مجبور ہوتی۔ عورت چاہے کسی دیس کی ہو، کسی زمین کی ہو، یہ بات طے ہے کہ وہ ''عورت'' ہے اور اُسے صرف خدا نے ہی بنایا اور اس کی فطرت بھی نسوانی اعتبار

سے یکساں، ماحول کے اثرات کی بات الگ ہوتی کہ کوئی انسان کیسے اپنے آپ کو اس میں ڈھالتا ہے۔ سون بھی خدا کی بنائی ہوئی ایک عورت تھی۔ یہاں کے ماحول میں اس نے جو رنگ ڈھنگ اپنایا تھا، وہ الگ بات تھی۔ اس کے اندر کی عورت وہی تھی۔ ایک ''سوفٹ کارنر'' رکھنے والی۔ سوچنے اور سمجھنے والی۔

''میں اچھی یا حسین ہوتی تو تم یوں مجھے نہیں دھتکارتے۔'' بالآخر سون کا شکوہ اس کی نوک زباں پر آہی گیا۔

''ہرگز نہیں، میں نے تمہیں بالکل نہیں دھتکارا......'' میں نے مسکرا کر کہا۔

چال چلنے کے خیال اور سوچ نے میری نیند کسی حد تک بھگا دی تھی۔ آگے بولا۔ ''میں پھر یہی کہوں گا کہ تم تو اس قدر حسین ہو کہ کوئی بھی مرد یہ خوشی تمہیں اپنی بانہوں میں لینا اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔ مگر دیکھو ہر مرد کا ایسا معاملہ نہیں ہوتا۔ میں دراصل کسی کے ساتھ ''چیٹنگ'' CHEATING (بے ایمانی) نہیں کرسکتا۔ میں کسی میں انوالو ہوں......'' کہتے ہوئے میں نے چالاکی سے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر چھت کی طرف دیکھا۔ مگر میری آنکھوں کے کونے سے مجھے کچھ ایسی جھلک متحرک سی محسوس ہوئی تھی جیسے سون صوفے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی ہو۔ میں نے اسی طرح پہلو بدلتے ہوئے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔ اس کے نرم لبوں پہ اس بار مسکراہٹ تھی۔ جواباً میں بھی پھیکے پھیکے انداز میں مسکرا دیا۔ اگر یہ جملہ میں کسی عام لڑکی یا عورت سے کرتا تو شاید اس کا ردعمل اس کے برعکس ہوتا، مگر سون جیسی آبرو باختہ عورت کا معاملہ کچھ اور تھا۔ بے شک اس کے پیچھے اس کی کوئی مجبوری ہوتی۔

''میں جانتی ہوں......'' وہ ہولے سے بولی اور میں کچھ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''مم...... میں سمجھا نہیں؟''

''تمہارے پاس آسکتی ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''شیور...... آجاؤ......'' میں نے جلدی سے کہا اور بیڈ پر اس کے لیے جگہ چھوڑ کر اس کی طرف پہلو کیے ذرا پیچھے کو سرک گیا۔ وہ صوفے سے اُٹھ کر میرے بیڈ کے قریب آئی اور پھر میرے برابر میں بیٹھ گئی۔

''یہاں سر رکھ کر لیٹ جاؤ۔'' میں نے ساتھ کے نرم سے تکیے کو ہاتھ سے تھپتھپایا۔ وہ لیٹ گئی اور اب اپنے ایک ہاتھ کی کہنی بیڈ کے گدے پر ٹکا کر میری جانب پہلو کیے بولی۔

''تمہاری محبوبہ کو میں جانتی ہوں، وہ باس کی قید میں ہے ناں......!'' اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا لگا، حالانکہ میرے...... ذہن میں عابدہ کا تصور تھا لیکن اس کی بات نے مجھے کچھ چونکایا تھا۔ فوراً ہی پھر میرا خیال موتو کی گرل فرینڈ سانچی کی طرف چلا گیا تھا۔ جس کے بارے میں اب تک خیال کچھ ایسا ہی اذیت انگیز تھا کہ پتا نہیں وہ اب تک زندہ بھی تھی کہ نہیں...... تب ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا...... اگر اسی حوالے سے میری سون کے ساتھ گفتگو آگے بڑھ کر کسی نتیجہ خیز حالات کی طرف بڑھ سکتی تھی تو کیا حرج تھا۔

وہ اگر سانچی کو ہی میری محبوبہ سمجھے ہوئے تھی تو میرا کیا جاتا تھا؟ برسبیل تذکرہ ہی سہی...... گفتگو آگے بڑھانے اور اسے تھوڑا ''اپنا'' بنانے کو یہ بہت تھا۔ اسی سبب میں نے دانستہ اور فوراً اپنی ''بے چینی'' اور ''دلچسپی'' دکھاتے ہوئے اس سے کہا۔

''تت...... تو...... کک...... کیا تم سس...... سانچی کی بات کررہی ہو......؟''

''ہاں......!'' اس نے ہولے سے کہا تو میں نے موقع تاک کر اگلا وار کیا۔

''یہ کمرا بگڈ تو نہیں......؟''

''نہیں......''

''سس...... سانچی کیسی ہے؟ مم...... مجھے بتاؤ...... پلیز!'' میں نے ژولیدہ لہجے میں پوچھا تو اس کے چہرے پر ایکا ایکی کچھ متاسفانہ اثرات...... اُبھرے۔ مجھے سانچی کی طرف سے دھڑکا بھی لگا کہیں وہ بے چاری اس سفاک انسان کی قید میں ''کام'' تو نہیں آچکی تھی؟ میری اس کے ساتھ مختصر ملاقات سہی، لیکن جتنی بھی رہی تھی وہ میری حسین یادوں کے ایک قابل ذکر باب کی حیثیت تو ضرور اختیار کرگئی تھی۔ وہ جن حالات کا شکار ہوئی تھی، اس میں اس کی اپنی بے وقوفی کا دخل زیادہ تھا۔ سون کو شاید یہ معلوم نہ تھا کہ سانچی درحقیقت میری نہیں بلکہ موتو کی محبوبہ تھی۔ بقول موتو کے وہ اس سے بھی روٹھ گئی تھی کہ وہ ایک گینگسٹر سے تعلق رکھتا تھا۔ جبکہ موتو اب بھی اس سے محبت کرتا تھا اور اس کی خاطر اس نے اپنی جان بھی داؤ پر لگائی تھی۔

''سانچی زندہ ہے...... مگر......'' سون بولتے بولتے رکی۔

''مگر کیا......؟'' میں نے بیقراری دکھائی۔ تاہم اندر سے مجھے بھی اس بے چاری کے لیے پریشانی تھی۔

''وہ زندوں سے بدتر ہے یا پھر حالات سے سمجھوتا کرچکی ہے۔'' سون بولی۔

''تم مکمل کر کہہ ڈالو...... پلیز سون! میں تمہارا مشکور رہوں گا۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''باس (کاساکو) اسے پہلے جان سے مارنا چاہتا تھا، مگر پھر جیسے کہ اس کی فطرت ہے، وہ ایسے خوب صورت اور نازک اندام شکار کو پہلے روندتا ہے، اس کے بعد بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے، اس نے بھی سانچی کو اپنی ہوس کے پیروں تلے خوب روندا تھا۔ اس کے بعد پتا نہیں کیا ہوا کہ اس نے سانچی کو ہلاک کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ سانچی کے حسن کا جادو شاید کچھ زیادہ ہی باس کے سر چڑھ گیا تھا کہ اس نے سانچی کو اپنی داشتہ بنالیا۔ سانچی نے بھی شاید حالات اور موقع دیکھتے ہوئے سمجھوتے سے کام لیا اور دیکھا کہ ایک بڑا گینگسٹر اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوچکا ہے تو وہ بھی اسے کیش کرنے لگی اور بالآخر اس نے باس کے دل و دماغ پر اپنا سکہ بیٹھا دیا۔ اب وہ اس کی گرل فرینڈ کی بھی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔'' سون نے اپنی بات مکمل کی اور میں اس کی طرف دکھ بھری اور غیر یقینی نظروں سے دیکھنے لگا پھر لہجے میں غمناک سی اُداسی سموتے ہوئے بولا۔

''کک...... کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟ سانچی کے ساتھ واقعی ایسا ہوا ہے؟''

''ہاں! مگر تمہیں اس کے لیے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ اب شاید اپنی اس زندگی سے خوش ہے۔'' سون نے کہا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

سون کا سانچی کے بارے میں یہ سب مجھے بتانا ظاہر کرتا تھا کہ وہ سانچی کے حوالے سے میرے بارے میں چاہے محدود سہی، اتنا ضرور جانتی تھی کہ سانچی کے بارے میں کاساکو کو جو غلط فہمی تھی، ابھی تک وہ قائم تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس ''غلط فہمی'' سے میں کیونکر فائدہ اُٹھا سکتا ہوں، سردست تو...... اسی باعث میں یہاں کاساکو کا قیدی نما مہمان بنا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے اب کیا چاہتا تھا۔ اس نے کل صبح مجھ سے کس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کرنا تھی.. باقی کے اچھے بُرے حالات کا تعین تب ہی کیا جاسکتا تھا۔ تاہم سون مجھے کیا بتاسکتی تھی، وہ میں اس سے پوچھنے کی کوشش ہی کرسکتا تھا۔

لہٰذا لہجے میں مایوسی سموتے ہوئے بولا۔ ''سون! مجھے معلوم ہے کہ سانچی بہ جبر خوش رہنے پر مجبور ہے۔ لیکن یہ بات مجھے سمجھ میں نہیں آئی کہ کاساکو نے اگر اسے زبردستی اپنی داشتہ بنا ہی لیا ہے، دوسرے لفظوں میں اس نے اسے مجھ سے چھین لیا ہے تو میری اور اس کی دشمنی ختم ہوجانی چاہیے تھی، اس نے مجھے کیوں پھر یرغمال بنایا؟'' میں اُسے آہستہ آہستہ اپنے مطلب کی باتوں کی طرف لا رہا تھا۔ وہ ایک گہرا سانس خارج کرکے بولی۔

''پتا نہیں کیا بات ہے، مجھے تم سے اور سانچی سے ایک ہمدردی سی ہونے لگی ہے۔ شاید دو پیار کرنے والے جدا کردیے جائیں تو سب کو ہی اس کا دکھ ہوتا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے ایک ذرا توقف کیا اور پھر کہنا شروع ہوئی۔

''رہی بات باس کی تو وہ تب تک تمہارا دشمن نہیں ہے جب تک تم اس کی بات نہیں مان لیتے۔ کیونکہ باس تم سے اور تمہاری دلیری اور چابک دستی سے بہت متاثر ہوا ہے۔''

''وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟'' بالآخر میں نے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

وہ کچھ سوچنے کے انداز میں چپ سی رہی۔ ہم دونوں ڈبل بیڈ پر آمنے سامنے اور پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے۔ اس کی طرح میں نے بھی اس سے دھیمے لہجے میں بات کرنے کے لیے...... اپنی ایک کہنی بیڈ پر ٹکا رکھی تھی اور ہاتھ اپنے چہرے پر...... وہ ایک تیار خوان کی طرح میرے بالکل نزدیک تھی۔ اس کی سانسوں کے جواں اور گل بدن وجود سے مدہوش کردینے والی خوشبوؤں کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ اس کا کشش انگیز دمکتا ہوا گل نار سا چہرہ میرے قریب...... بہت قریب تھا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین مگر ''کڑا'' امتحان بنی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا......؟ تم خاموش کیوں ہوگئیں؟'' میں نے بدستور اس کے دلکش چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ جو بات کاساکو مجھ سے کل کرنا چاہتا تھا وہ میں ابھی جان لوں، تاکہ مجھے سوچنے کا موقع مل جائے اور میں بہ احسن وخوبی اس پر کوئی بہتر فیصلہ کرسکوں......

''آں...... نن...... نہیں، بس! پتا نہیں تمہارے اندر ایسا کیا ہے کہ...... دل خود ہی تم سے تعاون پر مائل ہونے لگتا ہے لیکن مجھے باس سے ڈر بھی لگتا ہے۔ وہ بہت سفاک اور اس سے زیادہ کینہ پرور انسان ہے۔ اگر اسے بھنک بھی پڑ گئی کہ میں نے تمہیں قبل از وقت اس بات سے، جو وہ کل صبح تم سے کرنا چاہتا ہے، آگاہ کرڈالا ہے تو صرف اتنی سی بات پر وہ مجھے عبرت ناک انجام سے دوچار کردے گا۔''

''اُس...... اوکے! میں اتنی سی بات کے لیے تمہیں

کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گا، یہ خود غرضی ہو جائے گی۔" میں نے چالاکی سے کہا۔ "میں تو صرف...... اتنا چاہتا تھا کہ ابھی میں وہ بات جان لوں تو مجھے صبح تک کوئی مناسب فیصلہ کرنے کا موقع مل جاتا۔ تم صوفے پر چلی جاؤ اور آرام کر لو، میں کسی سے کچھ بھی نہیں کہوں گا۔"

"یہاں ہمارے علاوہ کون ہے جو ہماری باتیں سن رہا ہو......" صوفے پر جانے کا سن کر اس نے آہستگی سے کہا۔ "یہ کمرا ابھی بگڈ نہیں...... مگر دیکھو...... کل صبح باس تم سے وہ بات کرے تو اسے ذرا بھی اس بات کا شک نہ پڑنے پائے کہ تم پہلے سے کچھ جانتے تھے۔"

"کیا تم مجھے بتا رہی ہو......؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ہاں سنو......" وہ بولی۔ "باس تم سے وہی کام لینا چاہتا ہے جو تمہاری وجہ سے خراب ہوا۔ گوانگ مال میں عام لوگوں کو یرغمال بنانا اور خون ریزی پھیلا کر وہ یہاں کی پولیس انتظامیہ کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کے ایک اہم آدمی الفاسٹو کو رہا کرنے پر مجبور ہو جائیں مگر تمہاری مداخلت اور دلیری کے سبب نہ صرف باس کا یہ منصوبہ بُری طرح ناکام ہو گیا بلکہ اس کا ایک اہم آدمی رچی سن تمہارے ہاتھوں ہلاک بھی ہو گیا۔"

"تو کیا اب مجھے اُسے چھڑانا ہوگا؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر فوراً کہا۔

"نہیں......" سون نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ "الفاسٹو اب زندہ نہیں رہا۔" سون کے اس انکشاف پر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔

"کیا مطلب......؟"

"اُسے جیل میں ہی ہلاک کر دیا گیا ہے۔" سون نے بتایا۔

"کس نے ہلاک کیا اُسے......؟ باس کے دشمنوں نے......؟"

"خود باس نے......"

"کیا......؟"

"ہاں......!" سون نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "الفاسٹو کی پولیس قید اس کے لیے روز بروز گلے کا پھندا بنتی جا رہی تھی۔ اس نے گوانگ مال سے پہلے بھی اسے چھڑانے کے بہت سے طریقوں پر عمل کیا تھا مگر ناکام رہا۔ یہ آخری طریقہ بھی ناکام ثابت ہوا تو اس نے اسے رہا کرانے کی کوشش ترک کر ڈالی، کیونکہ اب اسے رہا کرانے کے بجائے ہلاک کروانا زیادہ آسان تھا۔"

"او...... کیا اس طرح اس کے باقی ساتھیوں کے دل میں اس کے خلاف بددلی پیدا نہیں ہو سکتی ہے؟" کسی خیال کے تحت میں نے سون کے چہرے کو بہ غور گھور کر کہا۔

"باس کو اس کی پروا کب ہوتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "بس چند ہی اس کے ساتھی ہیں جو سائے کی طرح اس کے اردگرد اور اس کے ایک اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔"

"لیکن پھر باس مجھ سے اب کونسا کام لینا چاہتا ہے؟" میں اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"وہ کام اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور تمہارے لیے فائدہ مند بھی۔" سون کا لہجہ پُراسرار ہونے لگا۔ مجھے فقط کام جان لینے کی حد تک دلچسپی تھی۔ رہی فائدے کی بات تو کاسپاکو جیسے بگ کریمنل سے بھلا مجھے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

"تمہیں جسے راری کی صورت میں ایک بہت بڑی دولت مل سکتی ہے۔" سون نے پھر کہنا شروع کیا۔ "کاسپاکو کا یہ کام تم نے کر دیا تو سمجھو تم اس کے گروہ کے نائب کی حیثیت حاصل کر لو گے، باس یوں بھی تم سے بہت متاثر ہے، اس کے دشمن وزیر جان کو ہلاک کر کے تم نے اس کے دل میں کافی جگہ بنا لی ہے۔"

"مجھ سے باس کیا کام لینا چاہتا ہے؟"

"گوتم بدھ کا ایک مجسمہ ہے...... جو پورا سونے کا ہے۔"

"اسے چوری کرنا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، وہ چوری کیا جا چکا ہے، اسے کہیں پہنچانا ہے۔"

"کہاں......؟"

"امریکا......" سون نے جواب دیا اور میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا، میں نے اپنے سینے میں یکایک اُٹھنے والی ہلچل پر بمشکل قابو پاتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"امریکا......؟ مگر کیسے؟"

"جب تم باس کے سامنے ہامی بھر دو گے تو وہ تمہیں اس کی تفصیل بھی بتا دے گا۔"

"لیکن ایک چوری شدہ شے کو بینکاک سے امریکا پہنچانا بچوں کا کھیل تو نہیں ہو سکتا؟"

"ہاں! لیکن باس کو یقین ہے کہ تم یہ کام خوش اسلوبی سے کر لو گے۔"

"میرے اندر باس نے ایسی کون سی خوبی دیکھ لی ہے جو اس قدر مشکل اور خطرناک کام میرے ذمے سونپنا چاہتا ہے؟ اس کے اور ساتھی بھی تو ہیں۔" میں نے سون سے ایسا دانستہ کہا تھا۔ ورنہ امریکا جانا تو میرے اہم مفادات میں مقصدِ اول کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن میں اپنی دلچسپی ظاہر کیے بغیر محض معروضی سوالات کر کے عمومی جھجک ظاہر کر رہا تھا۔ ورنہ تو مجھے معلوم تھا کہ میں کاسپاکو جیسے خطرناک گینگسٹر پر اپنی دھاک بٹھا ہی چکا تھا، وہ جیل میں اپنے اس اہم آدمی کو بھی خود ہی ہلاک کروا چکا تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے کافی خون ریزی پھیلا رکھی تھی، مسلسل ناکامی کی صورت میں اس نے الفاسٹو کو مروا ہی ڈالا تھا کیونکہ بقول سون کے...... پولیس کی قید میں اس کا زیادہ عرصہ رہنا خود اس کے لیے خطرناک تھا۔

چنانچہ اب وہ اپنی کسی کسوٹی پر مجھے پرکھ چکا تھا اور الفاسٹو کی رہائی پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کا قصہ ہی پاک کروا چکا تھا، یوں اب میں اسے "کام" کا آدمی نظر آ رہا تھا۔

"بالکل بچوں والا سوال پوچھا ہے تم نے......" سون جھلا کر بولی۔ "کیا اب بھی تمہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت تھی؟"

"او...... شاید تم نے صحیح کہا۔" میں خفیف سا ہو کے بولا۔

"اب تم سوچ لو ساری رات پڑی ہے۔" وہ دلنشین انداز میں مسکرائی۔ "لیکن...... اب سانچی کا خیال اپنے دل سے نکال دو......"

"ہم...... یہی کرنے کے علاوہ اور چارہ بھی کیا رہ گیا ہے میرے پاس...... مگر مجھے دکھ رہے گا کہ سانچی کو اتنی جلدی ہمت نہیں ہارنا چاہیے تھی۔" میں نے مغموم اور مایوس لہجہ اختیار کیا تو وہ گویا اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولی۔

"سانچی سے زیادہ حسین و جمیل لڑکیاں تمہاری قربت کے ایک اشارے کی منتظر ہوں گی۔ ایک سانچی ہی تو نہیں رہ گئی ہے دنیا میں......"

"ہاں...... یہ بات بھی ہے۔" میں نے اس کی بات سے اتفاق کرنا ضروری سمجھا۔ تب ہی وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

"کیا اب بھی میں تمہارے ساتھ رات نہیں گزار سکتی؟"

اس کی بات پر میں نے چونک کر سون کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مستیوں کے ڈورے سرخ ہونے لگے تھے۔ بھرے بھرے چمکتے گداز لبوں پر دعوت انگیز ارتعاش سا ابھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے انتہائی نزدیک آ گئی تھی۔ میں اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"دل و دماغ پریشان اور جان کا خوف ہو تو کہاں کس محفل میں مزہ آتا ہے۔ میں یہ کام شاید نہیں کر پاؤں گا اور تمہارا باس مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

یہ کہہ کر میں سیدھے رخ پر ہو کے اپنی پیشانی پہ ہاتھ ملنے لگا۔ اس کی برہنہ ٹانگ کو میں نے آہستگی سے پرے ہٹا دیا تھا۔

"سردمہر۔" وہ یہ کہہ کر میرے بیڈ سے اُتر گئی۔ اور صوفے پر جا کر لیٹ گئی۔ میں بھی بظاہر سوتا بن گیا مگر آنکھیں موندے اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے لگا، پھر نجانے کب میری بھی آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح سون نے ہی مجھے جگایا تھا۔ وہ ہلکے پنک کلر کی نائٹی میں تھی۔

"جاگ جاؤ...... ٹھیک ایک گھنٹے بعد تمہیں باس کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود ہونا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ میں دوبارہ اس کی طرف نظر ڈالے بغیر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے غسل وغیرہ کر کے اپنے لیے ایک ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پسند کی اور تقریباً گھنٹے بھر بعد باہر نکلا۔ تب تک سون نسبتاً ڈھنگ کے لباس میں آ چکی تھی۔

"تمہاری تھکن اور پریشانی یقیناً ختم ہو چکی ہو گی۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ وہ میرے قریب آ گئی تھی۔ اس کا موڈ اس تھوڑے سے وقت کو بھی "کشید" کرنے کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی گھاگ نگاہوں نے شاید میرے چہرے کی فریش نیس کو دیکھ کر میرے اندر کی طمانیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ میں نے بات بنائی اور یکایک فکرمندی سی چہرے پہ سجاتے ہوئے بولا۔

"ابھی کہاں...... پریشانی تو تب ختم ہو گی جب تمہارا باس میری جان چھوڑے گا۔ چلو...... میں نہیں چاہتا اُسے ناشتے کی میز پر میرا انتظار کرنا پڑے۔"

"سنو......! باس کو میرے سلسلے میں مثبت جواب دینا۔" وہ ایک دم سنجیدہ سی ہو کے بولی۔

"او کے...... ڈونٹ وری......" میں اس کی بات کا

مطلب سمجھ کے بولا۔
تھوڑی دیر بعد میں اور کاساپاکو ناشتے کی میز پر تھے۔ میز مستطیل تھی۔ جس کے ایک سرے پر وہ اور دوسرے سرے کی کرسی پر میں بیٹھا تھا۔ درمیان میں ایک کرسی اور تھی۔ وہاں مجھے ایک میرے جیسا ہی گرانڈیل اور تنومند شخص بیٹھا نظر آیا۔ اگرچہ عمر میں مجھ سے آٹھ دس سال بڑا ہی نظر آتا تھا۔ بال اس کے ہلکے تھے۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ جبڑے سکڑے ہوئے اور ناک تھوڑی لمبی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کونے غیر معمولی طور پر کھنچے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ جب میں ''گڈ مارننگ'' کہتا ہوا اپنی کرسی پر براجمان ہوا تو وہی شخص میری طرف ذرا سی گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر اچانک مسکراہٹ سی اُبھری۔ جواب میں، مسکرا کے میں نے بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی تھی۔ وہ تھائی باشندہ کہیں سے بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کورین یا ویت نامی باشندوں کے نقوش لگتے تھے اس کے، لیکن پھر میں نے اپنا یہ خیال بھی رد کر ڈالا، کیونکہ کورین یا ویت نامی اتنے گرانڈیل اور تنومند نہیں ہوتے۔ کچھ امریکی شبہات کی طرف میرا دھیان گیا تو میں اسے رد نہ کر سکا۔
''یہ روڈلف ہے۔ جان روڈلف......'' میرے سامنے اور میز کے دوسرے سرے پر براجمان کاساپاکو نے گمبھیر آواز میں اپنے بائیں بازو اور میرے دائیں بازو کی کرسی پر بیٹھے اسی شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تعارفاً کہا۔
''اور یہ...... ہیں...... مسٹر شہزاد......!'' کاساپاکو نے روڈلف سے میرا تعارف کرایا اور میں ذہن پر زور دینے کی کوشش کرنے لگا کہ کاساپاکو کو میرا نام کس طرح معلوم ہو سکتا ہے؟
پہلا خیال سانچی کا ہی آتا تھا۔ ممکن تھا بعد میں کسی اور ذرائع سے بھی پتا چلا ہوا سے۔
''ناشتا شروع کرو...... بعد میں آرام سے گفتگو ہوتی ہے اور تفصیلی تعارف بھی۔'' بالآخر کاساپاکو نے کہا۔
ناشتے میں بھانت بھانت کے لوازمات تھے۔ گھونگھے فرائڈ تھے۔ ایک گول سفید ڈش میں برف کی ٹکڑیوں پر چار پانچ ثابت آکٹوپس رکھے ہوئے تھے۔ ایک دو کے تو ٹینٹیکلز بھی میں نے ہلتے دیکھے تھے۔ اُف یہ وحشی آدمی...... زندہ آکٹوپس کھانے کا عادی تھا۔ مجھے اُبکائی سی آنے لگی۔ میں نے فوراً اس کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور پھر ڈھنگ کی چیزیں اپنی طرف سرکا کر ناشتے میں محو ہو گیا۔ ایک گلاس جوس پیا، ایک بریڈ بٹر کے ساتھ کھائی اس کے بعد...... چائے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔
ہماری میز کے گرد چار افراد فدویانہ انداز میں کھڑے تھے۔ ان میں ایک سون بھی تھی۔ کاساپاکو نے ایک زندہ آکٹوپس اُٹھا کے منہ میں لیا اور سارا اندر لے گیا۔ چبانے کے دوران میں اس کی باچھوں سے نجانے کیا بہنے لگا جو اس نے گود میں بچھے سفید رومال (نیپکن) سے پونچھ لیا۔ پھر ایک نظر سون پر ڈالتے ہوئے منہ چلانے کے دوران میں مجھ سے مخاطب ہو کے معنی خیز لہجے میں بولا۔
''سون نے تمہاری رات بھر خوب دل بستگی کی ہو گی؟''
''ہاں...... ! بہت اچھی اور خدمت گزار لڑکی ثابت ہوئی تھی یہ...... تمہارا شکریہ اسے میرے لیے سرو کرنے کا۔'' میں نے سون کی التجا کے مطابق اسے جواب دیا اور کن انکھیوں سے پاس کھڑی سون کی طرف بھی دیکھا۔ اس نے ہولے سے مسکرا کر کاساپاکو کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی تھی۔
''لیکن...... سون! تمہارے چہرے سے تو داستان شب کچھ اور ہی کہانی سناتی محسوس ہوتی ہے۔'' کاساپاکو نے اچانک عجیب سے لہجے میں کہا تو جانے کیوں مجھے اس کے لہجے سے اسرار بھری سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ سون بھی کچھ گھبرا سی گئی اور میری طرف ایک نگاہ اُٹھا کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ جواب دے کر اس کو مطمئن کرو ورنہ میری شامت آئی کہ آئی۔ لہٰذا میں نے فوراً ہی ہولے سے کھنکھار کر ایک نگاہ سون پر مسکراتی ہوئی سی ڈال کے کاساپاکو سے کہا۔
''ایسی بات نہیں۔ میں دراصل تھکا ہوا تھا بہت...... یہ میری دل بستگی کرتی رہی تھی، پھر آرام دہ ماحول میں سوئے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا اس لیے لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔''
میری بات پر کاساپاکو نے ایک زبردست قہقہہ اُگلا۔ اس کے مینڈک جیسے منہ سے نکلا ہوا الا بلا نظر آنے لگا جسے دیکھ کر میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔
وہ استفہامیہ انداز میں اپنا سر دھننے لگا اور وہسکی کی گولڈن بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا لیا۔
ناشتا ختم ہوا اور ہم تینوں ایک کمرے میں آ گئے۔ اس کی دیواروں پر ہلکا نیلا پینٹ تھا جبکہ چھت پر اپلش کلر کا پینٹ کیا گیا تھا۔ فرنیچر بھی اعلیٰ درجے کا بچھا ہوا تھا۔ چھت

کے وسط میں بیش قیمت اور دیدہ زیب فانوس جھول رہا تھا اور اس کے نیچے ہم، پیالہ نما آرام دہ صوفوں پر دھنس گئے۔ یہاں ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے روڈلف کو بار بار اپنی جانب تکتا محسوس کیا تھا۔ کاساپاکو نے ایک موٹا سا سگار نکال کر سلگایا اور مجھ سے مخاطب ہو کے کھرکھراتے لہجے میں بولا۔
''مسٹر شہزاد! میں وہ سب بھول جاؤں گا جو تم نے میرے ساتھیوں کے ساتھ گوانگ مال میں کیا تھا اور تمہیں بھی بدلے میں بہت سی باتوں کو فراموش کرنا ہوگا۔ کم از کم مساج پارلر والی اس خوب صورت سی لڑکی سانچی کو تو ضرور...... جس کی زندگی تو میں نے بخش دی ہے مگر وہ مجھے اچھی لگی اور میں نے اسے مستقل طور پر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔'' یہ سب کہتے ہوئے اس نے بڑی تیز اور بھانپتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ میں نے بھی اسی اطمینان سے جواب دیا۔
''میں پہلے ہی بتا چکا ہوں جناب! مال میں اُس روز جو کچھ ہوا وہ کسی ذاتی دشمنی کی بنیاد پر نہیں ہوا تھا۔ نہ میں آپ کو پہلے سے جانتا تھا اور نہ ہی آپ مجھے...... وہ سب ایک فطری دفاع کے تحت ہوا تھا۔ رہی اس پارلر والی لڑکی سانچی کی بات تو اس سے میرا تعلق وہی تھا جیسا اس روز مال میں دیگر جانے انجانے لوگوں کا یرغمالیوں کی حیثیت سے آپس میں ہوا تھا۔ کیونکہ میں یہاں اپنے دشمن وزیر جان کے تعاقب میں آیا تھا، عشق لڑانے نہیں......'' ناپے تلے انداز میں یہ سب بتانے کے بعد میں چپ ہو رہا۔ تاہم مجھے احساس تھا کہ میں نے سانچی کے سلسلے میں سخت دلی سے کام لیا تھا۔ میں اور بھلا کرتا بھی کیا۔ سانچی جو کچھ بھگت رہی تھی، وہ اس کا اپنا کیا ہوا تھا۔ اس نے میرے مشورے پر عمل کرنے بجائے مجھے اپنے مشورے پر بہ زور و اصرار اور ضد کے چلانے کی کوشش چاہی تھی اور اپنا معاملہ خود بگاڑ بیٹھی تھی۔
کاساپاکو نے میری یہ بات بڑے غور اور دھیان سے سنی تھی۔ پھر بولا۔ ''تمہاری صاف گوئی مجھے اچھی لگی۔ یوں بھی اتنی حقیقت تو میں بھی اپنے بعض ذرائع سے جان ہی چکا ہوں کہ تم یہاں بینکاک کس مقصد کے تحت آئے تھے اور سانچی تمہاری نہیں بلکہ ہمارے ہی ایک آدمی موتو کی گرل فرینڈ رہ چکی ہے۔ جو اَب ہم سے منحرف ہو چکا ہے۔ خیر......''
یہ کہتے ہوئے اس نے جھک کر سامنے دھری ٹیبل پر



تاوان میں چیک بھی چلے گا، اپنا گھر کا پتا اور وارث کا نام بھی لکھ دینا

رکھے ایک ڈیوائس کا بٹن پش کیا۔ ہلکا سا الارم کی شور اُبھرا۔
اس کے چند ہی سیکنڈوں بعد کمرے میں وہی مخاطب شخص وارد ہوا جو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مجھے یہاں لایا تھا مگر وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ہمراہ ایک دبلی پتلی اور نازک اندام سی خوب صورت لڑکی بھی تھی۔ میں اُسے اور وہ مجھے دیکھ کر چونک اٹھے۔
وہ سانچی تھی......

☆☆☆

سانچی کو میں نے پہلی بار جس روپ میں دیکھا تھا، وہ ایک عام سی لڑکی کا تھا جو عورتوں کے ایک مساج پارلر میں جاب کرتی تھی۔ مگر اب یہاں کاساپاکو جیسے گینگسٹر کے قبضے میں کیا سے کیا بن چکی تھی، مجھے اسے دیکھ کر حیرت سے زیادہ دکھ ہی ہوا تھا۔ وہ جس ''گیٹ اَپ'' میں تھی، وہ یہاں موجود سون...... سمیت کئی دوسری لڑکیوں سے بالکل بھی مختلف نہ تھا۔ گھٹنوں تک سرخ رنگ کے تنگ اور چست سیلولیس میں...... ملفوف اس کا وہ بدن جو عام لباس میں پاکیزگی کا

منظر دکھتا تھا اب جیسے شوپیس بنا دیا گیا تھا۔ اس کی دوشیزگی کا وہ پھول جو تر و تازہ محسوس ہوا کرتا تھا، وہ اب مرجھا گیا تھا۔ آنکھوں کی شوخی اور چنچل سی مسکان جو اس کا خاصہ تھی وہ ویران سی اُداسی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس نے صرف ایک نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور وہ کئی ثانیوں تک میرے چہرے سے ہٹا نہیں سکی تھی۔ ان آنکھوں میں مجھے نجانے کتنے ہی روکھے پھیکے رنگوں کی خزاں اُمڈتی دکھائی دی تھی۔ میرے لیے ان کے پس منظر میں نفرت اور انتہائی درجے کی بے رخی کی جھلک ڈوبتی ابھرتی نظر آئی تھی۔

''کم آن ڈارلنگ!'' کاساپاکو نے بڑی لگاوٹ کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا اور سانچی کے لبوں پر ایکا ایکی دلکش سی مسکان ابھری تھی اور پھر اس نے اپنا مرمریں ہاتھ اس کے کھردرے ہاتھوں میں دے دیا۔ کاساپاکو نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنی گود میں اسے کسی نازک سی گڑیا کی طرح بٹھا لیا۔ سانچی کی... کم مائیگی اور اس کی لاچاری و بے چارگی پر مجھے دکھ ہوا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ جبراً یہ سب کرنے پر مجبور تھی۔ اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔ جان بچانے کی جو صورت اسے نظر آئی تھی، وہ اس پر شاکر تو لگتی تھی مگر دل سے وہ اپنے اس کم مایہ کردار سے خوش نہ تھی۔ میرے حلق سے بے اختیار ایک دبی دبی سی کراہ نما ہنکاری خارج ہوئی تھی۔

''یہ تتلی اب میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ کاساپاکو کا کوئی لڑکی دل جیت لے، یہ ناممکنات میں سے تھا مگر...... اس حسین گڑیا میں نجانے کیا ایسی بات تھی کہ...... بس! اسے میں اپنے قریب کرنے پر مجبور ہو گیا۔'' کاساپاکو نے کہتے ہوئے گود میں بیٹھی سانچی کا نرم و گداز گال چوم لیا۔ وہ ذرا بھی نہیں کسمسائی تھی۔ کاساپاکو نے اس کی لچکیلی اور پتلی کمر کے گرد اپنا ایک ہاتھ حائل کر رکھا تھا۔ اس کے بعد سانچی اس کی گود سے اُٹھ کر ساتھ والے صوفے پر جا بیٹھی۔

''اس سے پہلے سون میرے قریب تھی مگر اس سے میرا جلد ہی دل بھر گیا۔ سانچی میں کوئی ایسی بات، ایسی کشش تو ضرور ہے جس نے مجھے ابھی تک اس کا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ہر بار یہ مجھے نئی لگتی ہے، چاہے خلوت ہو یا جلوت...... اس کا اپنا ہی ایک رنگ ڈھنگ اور مزہ ہے۔''

کاساپاکو کی لغو بیانی جاری تھی اور ایکا ایکی مجھے لگا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا؟ وہ میرے چہرے کے تاثرات بھانپنا چاہتا تھا۔ جلاپے کے یا پھر نفرت و انتقام کے مگر میرے چہرے سے ایسا کچھ بھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔ کاساپاکو بڑا مکار آدمی تھا۔ وہ شاید مجھ سے کوئی اہم کام لینے سے پہلے اپنی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا تھا کہ کہیں میں اس کے ساتھ کوئی دشمنی تو نہیں نکالنے کی کوشش کروں گا؟ جب وہ مطمئن ہو گیا تو اس نے سانچی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ صوفے سے اُٹھی اور جھک کر کاساپاکو کو بوسہ دیا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

کاساپاکو کی فاتحانہ اور تاؤ دلانے والی نظریں میرے چہرے پر گڑھ گئیں۔ پھر اس نے اپنے آدمی کو بھی وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا اور قریب کے صوفے پر مسلسل خاموش بیٹھے ہوئے روڈلف سے مخاطب ہو کے بولا۔

''مسٹر روڈلف! میرا خیال ہے کہ ہمیں اب مسٹر شہزاد سے اصل گفتگو کا آغاز کر دینا چاہیے۔''

''ضرور...... شیور......'' جان روڈلف نے فوراً جواب دیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھنچ گئی تھی۔

جانے کیوں مجھے اس میں مصنوعی پن کا احساس ہوا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی یا پھر میری چھٹی حس کا شاخسانہ کہ مجھے روڈلف کی شخصیت کچھ پُراسرار سی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ کھٹکا دینے والی۔

ایک ہی خیال میرے ذہن طباع میں اُبھرتا تھا کہ روڈلف...... کاساپاکو کا آدمی نہیں تھا، وہ ایک تھرڈ پرسن یا تھرڈ پارٹی تھا۔ وجہ ان سب کی یہی تھی کہ وہ رہ رہ کر میری جانب بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے تک رہا تھا۔ کیوں......؟ مجھے پہلی بار روڈلف کی جانب سے شدید قسم کی نامعلوم سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔

''ہمم......'' کاساپاکو نے ایک گمبھیر ہنکاری لی اور اب براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔

''مسٹر شہزاد! تمہاری طرف سے ہماری مکمل تسلی ہو گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم ہمارے دوست اور ساتھی بن کے ہمیں کتنا فائدہ پہنچاتے ہو لیکن ہم صرف اس میں اپنا ہی فائدہ نہیں دیکھیں گے، تمہارا بھی اس میں پورا حصہ ہوگا۔ کیا تم ہم سے ایک ایسا سودا کرنے کی پوزیشن میں ہو جس سے تمہیں کم از کم دس ملین ڈالر کا مالی فائدہ حاصل ہو؟''

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو رہا اور اپنی نظریں میرے چہرے پر جما دیں۔ مجھے چونکہ گزشتہ شب ہی سون نے اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس میں میرا سب سے اہم مقصد شامل تھا، یعنی امریکا روانگی۔ اسی لیے میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ مقصد نہ بھی ہوتا تو بھی مجھے اسے پھانسا دے کر اس کے

چنگل سے نکلنے کے لیے بھی کچھ کرنا پڑتا۔ میں کاساپاکو کی بات پر اپنے چہرے اور لہجے سے وہی کچھ ظاہر کرنا چاہتا تھا جو ایسے میں ایک لالچی انسان فطری طور پر کرتا ہے۔ بہ صورت دیگر...... کاساپاکو کو اس کی ذرا بھی بھنک پڑ جاتی کہ میں اور ہی مزاج اور دماغ کا آدمی ہوں تو وہ مجھے اِدھر گولی مار کے قصہ ہی ختم کر ڈالتا۔ میں نے اپنے چہرے پہ حیرت سموتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اس کے بعد اپنے چہرے سے کچھ ایسے تاثرات ظاہر کیے جو ایسے مواقع پر ایک حریص اور دولت کے لالچی انسان کے چہرے سے مترشح ہوتا یقینی تھے۔

''کیوں...... یقین نہیں آیا میری بات پر......؟ دہرا دوں دوبارہ......؟'' مجھے خاموش اور سوچتا پا کر کاساپاکو اس بار معنی خیز اور پُرغرور مسکراہٹ سے دوبارہ بولا۔

''آں...... ہاں، نن...... نہیں...... میں سمجھ تو رہا ہوں...... دد...... دس ملین ڈالر کوئی معمولی رقم نہیں۔ اگر یہ سودا ہو جاتا ہے تو یقیناً یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ مجھے کسی ننگے بھوکے ملک واپس لوٹنے کے بجائے کسی اور اچھے، خوش حال اور بڑے ملک میں ساری عمر عیش و آرام سے زندگی گزارنے کا بہترین موقع مل سکتا ہے جو حقیقتاً میری خواہش بھی ہے۔''

میں اس کی توقع کے مطابق وہی کردار ادا کر رہا تھا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔

''بہت خوب...... تم دلیر ہی نہیں، عقل مند بھی ہو۔'' کاساپاکو بولا۔ ''دس ملین ڈالر کی رقم واقعی معمولی نہیں ہے۔'' پھر وہ روڈلف کی طرف دیکھنے لگا جو میری طرف بڑے غور غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میرا خیال ہے مسٹر روڈلف! اصل بات کی طرف آ جانا چاہیے۔'' کاساپاکو نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا جس پر وہ اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے شستہ انگریزی میں بولا۔

''یقیناً...... میرا خیال ہے کہ مسٹر شہزاد اس معاہدے میں اپنی دلچسپی کو واضح طور پر دکھا چکے ہیں۔''

''گڈ۔'' کاساپاکو کے منہ سے نکلا اور پھر براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر بتانے لگا۔

''مسٹر شہزاد! گوتم بدھ کا ایک نہایت بیش قیمت مجسمہ...... جسے ہم نے حال ہی میں تریمیتر کے ایک خفیہ معبد خانے سے چوری کیا ہے، وہ ہم ایک بڑی پارٹی کو فروخت کر چکے ہیں۔ مذکورہ پارٹی نے ضمانتِ خرید کے طور پر ہمیں اصل رقم کا...... دو تہائی ادا کر دیا ہے، باقی رقم رہتی ہے۔ اسی نصف رقم سے پانچ ملین ڈالر تمہیں آن دی اسپاٹ ادا کر دیے جائیں گے، وہ تم رکھ لینا اور باقی کی رقم ویسٹرن یونین بینک کے ذریعے ہمارے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جائے گی۔ اس کے لیے میرے دو آدمی ایک سون اور پاؤ...... تمہارے ساتھ جائیں گے۔ اس کے علاوہ ایک خفیہ ٹیم بھی تمہارے تعاقب میں رہے گی۔ تمہیں انہیں چھیڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ صرف تمہارے دفاع اور مدد کے لیے ہوگی۔ وہ کہاں اور کس حالت میں ہوگی۔ یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تاہم اس کے ذمّے اصل کام یہی ہوگا کہ وہ اس معاہدے میں کسی قسم کی ذرا بھی بدنیتی یا دھوکے بازی کو بھانپ کر اپنا وہ کام کر گزرے گی جس کا افسوس کرنے کے سوا پھر اور کوئی دوسرا راستہ نہ ہوگا۔ بُرا مت منانا دوستو! یہ ضروری ہے، کیونکہ یہ کوئی چند ہزار ڈالرز کا سودا نہیں ہے، ملین ڈالرز کا سودا ہے اور ایسے احتیاطی اقدامات اُٹھانا ہمارا حق بنتا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپ دونوں کو اس خفیہ ٹیم کے بارے میں آگاہ ہی نہ کیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ایسی بدمزہ سوچ بھی کسی کے دل میں کیوں آئے اسی لیے مجھے بتانا پڑا تاکہ باقی کا کام سیدھا اور سہل ثابت ہوتا رہے۔''

وہ اتنا کہہ کر رکا۔ ایک نئی، سنسنی خیز اور خطرناک مہم کے بارے میں جان کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ روڈلف کاساپاکو کا آدمی نہیں تھا بلکہ وہ...... اسی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا جو امریکی تھی اور یہ اُن کا ایجنٹ تھا۔ یقیناً نصف رقم اسی نے ادا کی ہوگی اپنی پارٹی کی طرف سے اور اب وہ معاہدے کے مطابق اس چوری شدہ قیمتی مجسمے کو لینے آیا تھا جسے بہ حفاظت امریکا پہنچانا کاساپاکو کی ذمّے داری تھی اور جو وہ میرے توسط سے پوری کرنا چاہتا تھا۔ کیوں......؟ یہی ایک سوالیہ نشان تھا جو میرے حلق میں آنکڑے کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا۔

مجھ میں آخر کاساپاکو نے ایسا کیا دیکھا تھا کہ وہ اپنے آدمیوں کو چھوڑ کر مجھے آگے لگا رہا تھا؟ جبکہ بقول اس کے چند آدمیوں کی خفیہ ٹیم اس مشن کی نگرانی کے لیے بھی اس نے مامور کر رکھی تھی۔ محض اس لیے کہ کہیں میں یا روڈلف کے ساتھی امریکا پہنچ کر کسی قسم کی دھوکے بازی سے کام نہ لیں۔ لیکن باوجود اس کے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے درپردہ کوئی اور پُراسرار چکر کارفرما تھا اور مجھے اس لیے اس مقصد کے لیے چنا گیا تھا کہ قربانی کا بکرا بنایا جا سکے۔

"اس مجسمے کو بینکاک کے معروف ترین میوزیم سے چرانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔" کاسپاکو اس کی اہمیت جتاتے ہوئے آگے بولا۔ "مہینوں کی طویل منصوبہ بندی کی گئی اور بالآخر خطرناک رسک لے کر اسے اس طرح ترین تر کے معبد سے چوری کیا گیا کہ وہاں کے بھکشوؤں اور پہرے داروں کو اس کے چوری ہونے کی بھنک بھی نہ پڑ سکے۔ فوری طور پر اس مجسمے کی چوری کے بعد فروخت بھی ایک بڑا مرحلہ تھا۔ تب تک مجسمے کی چوری کا شور پورے بینکاک میں ہی نہیں بلکہ تھائی لینڈ میں مچ سکتا تھا۔ بینکاک کا چپاچپا چھانا جاتا اسی لیے ہم نے ڈبل گیم کھیلی...... یعنی اپنے ماہرین سے اصل مجسمے جیسا ہی ایک نقلی مجسمہ بھی ہمیں تیار کرانا پڑا۔ اصل چرانے کے بعد ہم نے وہ نقلی مجسمہ اس کی جگہ رکھ دیا۔ تاکہ فوری طور پر اس گریٹ روبری کا کسی کو پتا نہ چل سکے اور جب تک پتا چلے...... اصل مجسمہ امریکا کی سرزمین پر پہنچادیا جاچکا ہو اور ہم اس کے پیسے بھی وصول کر چکے ہوں۔" یہ کہتے ہوئے کاسپاکو نے اپنی بات ختم کر ڈالی۔

بلاشبہ اس خبیث نے گریٹ روبری کا ایک بڑا بے داغ منصوبہ بنایا تھا اور ہر طرح سے جامع بھی بلکہ اس سلسلے میں وہ اس چوری شدہ مجسمے کو نصف حد تک فروخت بھی کر چکا تھا اور اب باقی کی رقم کے حصول کے لیے اس نے یہ آخری منصوبہ بنایا تھا۔ میں نے کہا۔

"مجسمے کو امریکا لے جانا معمولی بات نہ ہوگی۔ ضرور اس سلسلے میں بھی آپ نے کوئی ٹھوس لائحہ عمل بنایا ہوگا؟" میں نے کاسپاکو سے اپنی دانست کے مطابق سوال پوچھا تو وہ سگار کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"یقیناً...... کیونکہ یہ ہمارے ہی ذمے ہے کہ ہم پارٹی کو معاہدے کے مطابق ان کی خریدی ہوئی امانت بہ حفاظت پہنچائیں۔ اس کے لیے ہم روڈلف کو سب بتا چکے ہیں تمہیں ابھی بتائے دیتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ رکا۔ صوفے پر بیٹھا تھوڑا کسمسایا اور دوبارہ بولا۔

"پہلے ہمارا منصوبہ مجسمے کو خفیہ طور پر کسی کارگو ائرلائن کے ذریعے امریکا لے جانے کا تھا مگر اس میں ہائی رسک تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں...... سب کچھ ہاتھ سے نکل جاتا اور مصیبت الگ گلے پڑ جاتی، بھاری نقصان بھی بھگتنا پڑتا۔ ہمیں کوئی اور صورت نظر نہیں آرہی تھی لیکن ہم مشکور ہیں مسٹر روڈلف اور ان کے ساتھیوں کے جنہوں نے خود ہی ہماری یہ مشکل آسان کر دی۔ منصوبہ ان کا تھا اور خرچہ ہمارا...... ہم نے مجسمے کو مرحلہ دار امریکا پہنچانے کا بندوبست کرنے کا ایک مشترکہ پلان بنایا ہے۔

"اگرچہ یہ نسبتاً ایک وقت طلب کام تھا لیکن مقابلتاً محفوظ بھی۔ وقت ہمارے لیے کوئی بڑا ایشو نہیں، اصل مقصد اس بیش قیمت مجسمے کو مذکورہ پارٹی کے حوالے کرنا اور ان سے رقم کی آخری قسط وصول کرنا تھا۔ ایک دوسرے کے رازداں بننے کے بعد اب...... ہم پر بھی یہ ذمے داری عائد ہوتی تھی کہ یہ سودا کسی صورت میں دونوں پارٹیوں کے لیے خراب نہ ہونے پائے۔ اس صورت میں سب سے پہلے ہمیں بھاری نقصان برداشت کرنا پڑ جائے گا۔ لہٰذا اس کے لیے ہم نے یہ پلان بنایا ہے کہ اس مجسمے کو پہلے سمندری راستے، گلف آف تھائی لینڈ کے نارتھ چینل میں واقع کوماکو کے ایک جزیرے تک کسی فشنگ ٹریلر کے ذریعے پہنچایا جائے گا۔ جہاں ایک طیارہ پہلے سے موجود ہوگا، یہ ایک جیولوجیکل سروے ٹیم کے نام پر چارٹرڈ کیا گیا ہے۔ جو ظاہر ہے جعلی ہے۔ یہ سیسنا طرز کا دو انجنوں والا جہاز ہے جو یہاں بینکاک سی پورٹ کے ساحل سے تقریباً تیس ناٹیکل میل کے فاصلے پر تم لوگوں کا منتظر ہے۔ وہاں تک میں بھی چلوں گا۔ مجسمہ اس میں رکھوانے کے بعد تم لوگ روانہ ہو جاؤ گے۔ جہاز کو پائلٹ ہمارا ہی آدمی پاؤ کرے گا۔ (پاؤ وہی آدمی تھا جو مجھے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ یرغمال بنا کے یہاں لایا تھا)

"جہاز تھائی لینڈ کی سرحد پار کرتا ہوا کمبوڈیا اور ویت نام کو عبور کرے گا۔ ان ممالک سے فضائی اجازت نامہ حاصل کیا جاچکا ہے۔ اس کے بعد کا سفر قدرے طویل ہوگا، وہاں سے طیارہ مسلسل سمندر کے اُوپر پرواز کرتا ہوا فلپائن کی فضائی حدود کو کراس کرنے کے بعد چار سو ناٹیکل میل دور بحرالکاہل کے ایک گمنام جزیرے پر پہنچے گا جس کا ہم نے شناخت کے لیے خودساختہ نام ڈارک آئی لینڈ رکھا ہے۔ یہ طیارہ سیسنا کاریوال بش، سمندر کی سطح پر بھی اُترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بہرحال اس نامعلوم جزیرے میں تم لوگوں کو کچھ دن رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد تم لوگوں کا امریکا کی جانب سفر شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد کی ذمے داری مسٹر روڈلف کی پارٹی کی ہوگی۔"

کاسپاکو اس مہم کا پورا فریم ورک بتاتے ہوئے بولا۔ اس کے بعد اس نے پاؤ نامی اسی آدمی سے کچھ کہا۔ وہ ایک رول کیا ہوا میپ لے آیا۔ جسے کاسپاکو درمیان میں رکھی گلاس ٹاپ والی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ میپ آپ کی ڈارک آئی لینڈ تک پوری رہنمائی

کرے گا۔"

ذرا دیر بعد کافی کا دور چلا۔ روڈلف شاید پہلے ہی میپ کا جائزہ لے چکا تھا اسی لیے میں ہی اسے بہ غور دیکھنے لگا۔ میپ کسی پروفیشنل آدمی کا ہی بنایا ہوا لگتا تھا۔ امریکا تک پہنچنے کی ایک طویل پلاننگ کی گئی تھی جو بظاہر سیدھی سادی لگتی تھی۔ تاہم میں نے کاسپاکو سے سوال کیا۔

"امریکا تو ہمیں بھی مذکورہ پارٹی تک پہنچنا ہوگا۔ اس کے لیے مخصوص شناختی کاغذات کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کا کیا بنے گا؟ جبکہ ایسے میں ہمیں وہاں کچھ بینکنگ کا کام بھی نمٹانا پڑے گا۔"

"اچھا سوال ہے مگر قدرے بچکانا بھی۔ خیر، یہ سوال ذہن میں ابھرنا بھی چاہیے۔" کاسپاکو عجیب سے لہجے میں بے ربط انداز میں بولا۔ "شناختی کاغذات کا حصول مسٹر روڈلف کی پارٹی کے لیے کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ وہ اس کا بندوبست تمہارے وہاں پہنچتے ہی کر لیں گے۔ یوں بھی تمہیں کون سا اتنا زیادہ عرصہ وہاں رہنا ہوگا۔ بینک کی ایک بڑی اسٹیٹ جینٹ شوگر کے تمہارے کاغذات بنا لیے جائیں گے۔ جو رئیل اور تمہارے ہی نام کے ہوں گے۔"

میں جانتا تھا کہ میرے نام سے ایسے کاغذات کا حصول کس قدر مشکل اور ناممکنات میں سے ہوگا، کیونکہ میرا وہاں کیا معاملہ تھا یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔

"لیکن میں بعض وجوہات کی بنا پر اپنے نام سے وہاں کاغذات نہیں بنوا سکتا نہ کوئی اور...... میں یہ بات پہلے ہی کلیئر کر دینا چاہتا ہوں۔"

"چھوڑو ان فضول چکروں کو۔ اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ وہاں مسٹر روڈلف کی پارٹی کی تمہیں ہر قسم کی فل سپورٹ حاصل ہوگی۔ تم صرف شو مین ہوگے اور بس...... کوشش یہی ہوگی کہ تم، سون اور پاؤ وغیرہ اسی راستے واپس لوٹ آؤ یا پھر تم آگے کہیں نکل جانا چاہو جہاں امیگریشن کی شرائط آسان ہوں، اس ملک کا رخ تم کر سکتے ہو۔ میرا مشورہ تمہیں سوڈان کا ہی ہوگا۔ وہاں کچھ پالیسیاں نرم ہوں گی اور پھر تمہارے پاس روپوں پیسوں کیا کمی ہوگی۔ بزنس انویسٹر کی کسی بھی آسان پالیسی کے ذریعے تم بہت جلد یہ کام کروالو گے۔"

کاسپاکو کی بات سن کر میں خاموش رہا۔

وقت گزرتا رہا۔ ہمارے درمیان اسی سلسلے میں تقریباً مزید ڈیڑھ دو گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد...... نشست برخاست کر دی گئی۔

گوتم بدھ کے اس چوری شدہ مجسمے کے سلسلے میں جو بعد میں مزید تھوڑی بہت تفصیل مجھے معلوم ہوئی، اس کے مطابق...... یہ مجسمہ...... ڈیڑھ میٹر اونچا اور ڈیڑھ میٹر ہی گولائی میں ایک ایسا مجسمہ تھا جو خالص سونے کا بنا ہوا تھا۔ اس مجسمے کا وزن تقریباً پچیس، تیس ٹن تھا۔ یہ مجسمہ تیرہویں صدی میں بنایا گیا تھا لیکن شمالی حملہ آوروں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر سیمنٹ کا پلستر کر دیا گیا۔

گزشتہ صدی میں اس مجسمے کو تھائی لینڈ کے دارالحکومت کے ایک ایسے مندر میں منتقل کر دیا گیا جو برسوں سے غیر آباد تھا۔ 1935ء میں گوتم بدھ کے اس مجسمے کو ایک قدیم مندر میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ 1955ء میں گوتم بدھ کے اس مجسمے کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی کوشش میں یہ زمین پر گر پڑا، جس کے نتیجے میں اس کا پلستر ایک طرف سے تھوڑا سا اکھڑ گیا۔ اس کے اندر کا سونا چمکتا ہوا نظر آیا تو یہ انکشاف ہوا کہ یہ مجسمہ پورا کا پورا خالص سونے کا بنا ہوا ہے۔ یہ انکشاف ہوتے ہی مجسمے کو فوراً قومی ملکیت کی حیثیت دے دی گئی اور اسے اہم تھائی نوادرات میں شمار کیا جانے لگا۔

مجسمے سے متعلق یہ ساری تفاصیل کاسپاکو نے اس امریکی جان روڈلف کو بتائی تھی اور پھر اس کے ذریعے یہ مجھے معلوم ہوئی۔ بلاشبہ کاسپاکو نے میرے کاندھوں پہ بھاری ذمے داری دے دی تھی۔ اس کی مہمان نما قید سے رہائی کا معاملہ میرے لیے ثانوی حیثیت رکھتا تھا مگر اس خطرناک مشن میں میرا اپنا بھی مفاد کارفرما تھا۔ کاؤشی کی ہلاکت اور پاکستان میں زورآور کے قتل کے بعد میری امریکا یاترا کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ جبکہ نئے سیٹ اَپ کے لیے مجھے یوزن کی ضرورت پڑتی۔ اس میں بہت وقت لگتا اور کوئی ضمانت بھی نہ تھی کہ دوسری بار بھی زورآور خان جیسا کوئی قابل اعتبار اور پروفیشنل آدمی ملتا۔ ایسے میں جبکہ کبیل دادا اور شکیلہ امریکا پہنچ چکے تھے، لیکن بقول وزیر جان کہ، انہیں اس کے ساتھیوں یا ٹائیگر ٹیگ نے ٹریپ کر لیا ہوگا۔ آنسہ خالدہ کہاں تھی اور عابدہ کس حال میں تھی، کچھ پتا نہ تھا۔ وزیر جان کی ہلاکت کے بعد دشمنوں نے میرے خلاف کون سا نیا لائحہ عمل تیار کیا ہوگا۔ یہ بھی اندھیرے میں تھا۔ اب تک یقیناً ان تک وزیر جان کی میرے ہاتھوں ہلاکت کی خبر پہنچ چکی ہوگی اور یہ بھی کہ میں امریکا روانگی کے لیے پاکستان کی سرحدیں عبور کر چکا تھا۔

ایسے میں کاسپاکو کی یہ گوتم بدھ والی خطرناک مہم کو سر

کرنا، میرے اپنے مفاد میں بھی تھا بشرطیکہ اس میں کسی قسم کی چال یا دغابازی کی سازش کارفرمانہ ہو۔ چنانچہ مجھے ہر سے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا تھیں اور کان ہر اس ساعت پر چوکس رکھنا تھے جو ذرا سی بھی مشتبہ آہٹ پر کھڑے ہوجاتے تھا۔

گلف آف تھائی لینڈ میں واقع کو ماگو جزیرے تک اس مجسمے کو پہنچانے کے لیے ہم سب روانگی کے لیے تیار تھے۔ کاسپاکو کے مطابق اس چوری شدہ مجسمے کو ایک قدیم مندر کے کھنڈرات کے ایک خفیہ تہ خانے میں چھپا کر رکھا گیا تھا۔ اس جگہ کا اس لیے انتخاب کیا گیا تھا کہ برسوں سے ان ویران کھنڈرات کی طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا تھا۔

ٹھیک شام چھ بجے لیموزین اور کریسیڈا گاڑیاں کاسپاکو کی قلعہ نمار ہائش گاہ سے نکل رہی تھیں۔

☆☆☆

لیموزین ہم سے آگے تھی۔ اس میں کاسپاکو، اس کی محبوبہ سانچی، پاؤ اور ڈرائیور سوار تھے۔ ان سے پیچھے کریسیڈا میں، میرے علاوہ، سون، گرانڈیل امریکی جان روڈلف اور کاسپاکو کے دو آدمی براجمان تھے جن میں سے ایک کار ڈرائیو کررہا تھا۔ دوسرا اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں کھڑکی کی سائیڈ پر عقبی نشست سنبھالے ہوئے تھا، سون درمیان میں تھی اور جان روڈلف دوسری کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔

ہماری منزل بینکاک کی جنوبی مضافات میں واقع مندر کے کھنڈرات تھے۔ جہاں تک کا فاصلہ تقریباً تیس پینتیس کلومیٹر تھا۔ ابھی ہم مین شاہراہ پر تھے۔

ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ ایک انٹرپاس سے گزر کر ہم جیسے ہی مضافات کی طرف جانے والی لمبی چوڑی دورویہ شاہراہ پر پہنچے تو...... اچانک عقب سے ایک منی کار گو ٹرک ہارن بجاتا ہوا تیزی سے گزرا......

آگے جا کر وہ انڈی کیٹر دیتا...... لیموزین کو بھی کراس کرتا ہوا ہماری لائن پر آ گیا۔

”یہ ٹرک ہمارا ہی ہے۔“ میرے ساتھ بیٹھی سون نے ہولے سے کہا تو امریکی جان روڈلف نے مسکرا کے اضافہ کیا۔

”مسٹر شہزاد ٹرک کو دیکھ کر کچھ چونکا سے نظر آنے لگے تھے۔“ وہ شاید میرے چہرے سے گھبراہٹ کی ہلکی سی رمق کو بھی بھانپ گیا تھا۔ تاہم مجھے اس کا میرے بارے میں یہ تبصرہ فضول لگا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، البتہ سون معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔

دس کلومیٹر بعد دونوں کاریں دورویہ سڑک سے دائیں جانب ایک ذیلی سڑک پر آ گئیں۔ یہ ون بیلٹ روڈ تھی اور دور تک ویران نظر آتی تھی۔ ٹرک بہت آگے جا چکا تھا اور اب اس کی ٹیل لائٹس ہی نظر آرہی تھیں تاہم دونوں گاڑیوں کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ میرا دل کچھ بےچینی سی محسوس کرنے لگا۔

ہمارے دائیں جانب پہاڑی سلسلہ تھا جہاں سورج کی نارنجی پڑتی روشنیاں جیسے سنگلاخ ڈھلانوں پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ بائیں جانب کہیں کہیں بنجر زمین اور چھدری چھدری گھاس والا میدان تھا۔ پھر اچانک ہی گھنے جنگل کا سلسلہ شروع ہوا جو جلد ہی اختتام پذیر ہوا اور اب اس کی جگہ ٹیلوں ٹبوں نے لے لی تھی۔

ادھر سے ہی آگے جانے والی لیموزین نے بائیں جانب کا انڈیکیٹر دینا شروع کر دیا ساتھ ہی اس کی رفتار بھی بتدریج آہستہ ہونے لگی۔ ہماری کار کے ڈرائیور نے بھی کار آہستہ کردی تھی۔ کارگو ٹرک نظر نہیں آرہا تھا، وہ شاید بہت آگے نکل گیا تھا۔ خالی تھا اسی لیے اس کی رفتار خاصی تیز تھی یا پھر اسے دانستہ آگے نکل جانے دیا گیا تھا۔

کار ناپختہ راستے پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ رفتار آہستہ ہی تھی۔ کچھ تنگ موڑ بھی راہ میں تھے۔ شام ڈھلنے لگی تھی۔ کار کے شیشے بند تھے۔

”کیا ہماری روانگی کی ابتدا ہو چکی ہے؟“ میں نے سون کی طرف گردن موڑ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہاں!“ اس نے مختصر جواب دیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی اور جان روڈلف بھی اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے تھا۔ مجھے دونوں کے چہرے کے تاثرات یکساں محسوس ہوئے تھے جیسے وہ مشترکہ طور پر ایک ہی نقطے پر سوچ بچار میں محو ہوں۔

میں گردن گھما کر کھڑکی سے باہر ویرانے میں دیکھنے لگا۔

دونوں گاڑیاں بھی ٹیلوں ٹبوں کے درمیان سے گزرنے لگیں۔ یہاں کوئی کوئی باقاعدہ سڑک نہ تھی۔ بس میدانی سا کھلا راستہ تھا۔ ہماری کار کا ڈرائیور ہم سے آگے جانے والی لیموزین کو فالو کر رہا تھا۔ جلد ہی ٹیلے ٹبوں کا سلسلہ پیچھے رہ گیا اور سامنے ہی مجھے اپنی جانب ذرا دور شام کے دھندلکوں میں کسی عمارت کے کھنڈرات نظر آنے لگے۔ وہی کارگو ٹرک بھی مجھے وہاں کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے گرد

چند لوگوں کے ہیولے بھی متحرک نظر آئے۔ کارگو کا پچھلا دروازہ اُوپر کو اُٹھا ہوا تھا اور وہاں سے ایک تختہ لگا کر کوئی کرین نما شے نیچے اُتاری جارہی تھی۔

کاریں اس کے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گئیں۔ انجن بند ہوئے اور ہر سو یکلخت دھڑکا دینے والی اسرار بھری خاموشی طاری ہوگئی۔

ہم سب نیچے اُتر آئے۔ فضا مرطوب اور رکی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔ ہم تینوں کاسپاکو کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ کرین نیچے اُتاری جا چکی تھی اور اب اس میں ایک آدمی سوار ہو چکا تھا جو کرین کو کھنڈر کے ایک بڑے سے کھلے مگر منہدم حصے سے اندر لے جارہا تھا، باقی افراد جنہوں نے مخصوص چست ورکرز ٹائپ لباس پہن رکھے تھے، کرین کے ساتھ ساتھ اندر جارہے تھے۔ پاؤ ان کے ہمراہ تھا۔ کاسپاکو کے دو ساتھیوں نے جلدی سے وہاں ہمارے بیٹھنے کے لیے پانچ عدد فولڈنگ چیئرز لگا دیں۔ ہم سب ان پر براجمان ہوگئے۔ چار آدمی جن کے گلے میں انفراریڈ دوربینیں جھول رہی تھیں اور ہاتھوں میں گنز تھیں، وہ دائیں بائیں بکھر کر بہت آگے تک نکل کر تھوڑی دور جا کھڑے ہوئے۔ یہ پہرے پر تھے۔

کاسپاکو نے سگار باکس نکال کر سلگایا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا۔ ”اس قیمتی اور نایاب مجسمے کو چھپانے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ آج سے کئی سو سال پہلے یہ ادھر ہی سے دریافت کیا گیا تھا۔“ کہتے ہوئے اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا۔

”آپ کی عقل مندی کی داد دینی پڑتی ہے مسٹر سپاکو! واقعی اس طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جاسکتا۔“ روڈلف بولا۔ سون نے بھی اپنے باس کی تعریف میں کم و بیش ایسا ہی جملہ ادا کیا تھا۔ میں جبکہ خاموش رہا۔ میری خاموشی کو کاسپاکو بھانپتے ہوئے بولا۔

”تمہیں کوئی حیرت نہیں ہوئی ہماری اس چال پر؟“ اس کی خود پسندی پر میں نے بےتاثر سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

”میں شاید ذہنی طور پر ابھی حالات کا صحیح اندازہ نہیں کر پا رہا ہوں مسٹر کاسپاکو......! ورنہ تو اس میں کیا شک ہے کہ آپ نے ایک بیش قیمت اور نادر و نایاب چیز کو چھپائے رکھنے کی ایسی جگہ تلاش کی ہے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی یہ جگہ......“

اسکول، اسکول...... وہاں جا کر میرا سارا دن برباد ہوجاتا ہے!

”ہاہا...... ہاہا...... خاصے محتاط مگر بہت مکار آدمی ہو تم......“ کاسپاکو نے قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا تو میں سنجیدگی سے بولا۔

”یہ مکاری نہیں ہے جناب! احتیاط پسندی ہے۔ زیادہ بہتر ہوتا کہ...... اس جگہ سے صرف آپ اور آپ کے چند قریبی ساتھی واقف ہوتے مگر یہاں تو میں سب کا مجمع دیکھ رہا ہوں لیکن شکر ہے پھر بھی کہ......“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ کھنڈرات کے اس کھلے حصے سے پاؤ بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ اس کے سر پر چرمی بیلٹ کے ساتھ ہیڈلائٹ بندھی ہوئی تھی۔ وہ چیختا چلاتا ہوا ہمارے قریب آیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

”غضب ہوگیا باس! مجسمہ اپنی جگہ پر نہیں ہے۔“

اس نے جیسے ایٹم بم سے بھی بڑا دھماکا کر ڈالا۔ کاسپاکو کو جیسے ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا۔ اس ناقابلِ یقین سی اطلاع پر وہ کرسی سے یوں اُچھل کر کھڑا ہوگیا جیسے...... اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

”کیا بکواس کررہے ہو پاؤ......؟ یہ کس طرح ہوسکتا

ہے؟"

ہم سب کھڑے ہو گئے تھے۔ میں کاساپاکو کے سامنے یونہی روا روی میں جس شبہے کا ثانوی سا اظہار کرنے والا تھا، وہ اتنی جلد حقیقت میں بدل جائے گا، مجھے اس کی رتی برابر بھی اُمید نہ تھی۔ اسی سبب خود میرا بھی وہاں موجود سب کی طرح منہ حیرت وتشویش کے باعث کھل گیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے قریب کھڑے جان روڈلف کی طرف دیکھا تھا۔ میری یہ حرکت لاشعوری نہیں تھی بلکہ تحت الشعور میں چھپے ایک گمان آمیز تشکیک کے زیرِ اثر تھی۔

روڈلف کے چہرے پر مقابلتاً وہ تاثرات اُس تیزی سے نہیں چمکے تھے جس اسپارکنگ اسپیڈ سے پہلے کاساپاکو اور پھر میرے چہرے سے مترشح ہوئے تھے۔ جبکہ روڈلف کے چہرے پر چونکنے کے تاثرات میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ یوں...... جیسے وہ بناوٹی ہو۔ تب ہی پل کے پل میری مشاق اور بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے سے پھسل کر سون کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس کے چہرے پر بھی بلاشبہ پریشانی کے آثار نمایاں تھے لیکن اس کی ماہیت میں کسی دبے دبے خوف کا عنصر غالب تھا۔

چہرہ شناسی میں "فیشیل ایکسپریشن" کو اولیت حاصل ہے۔ جو میری تربیت کا حصہ تھی۔ جبکہ کاساپاکو کے ساتھ لگی بیٹھی ساپچی کے چہرے پر معمولی تاثرات تھے جیسے اُسے ان معاملات تو کیا اپنے آپ سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔

کاساپاکو نے تیزی سے قدم اُٹھائے تھے اور اس کے ساتھ ہی ہم نے بھی۔

اندر روشنی کا بندوبست ایک چھوٹا جنریٹر چلا کر کیا گیا تھا۔ ایک تنگ سے کھنڈر نما راستے سے تیز تیز قدموں سے گزرتے ہوئے ہم نسبتاً ایک کھلی جگہ پر پہنچے۔ وہاں کی زمین کھدی ہوئی تھی۔ ایک طرف کرین کھڑی تھی جسے دوسرے راستے سے اندر لایا گیا تھا۔ ہم سب نے گڑھے کے اس سرے پر آکر نیچے جھانکا۔ اندر بھی لوگ موجود تھے۔ انہوں نے بھی ہیڈ لائٹس پہن رکھی تھیں۔ جس کی روشنی میں اندر کا منظر کسی خفیہ تہ خانے کا سا منظر پیش کرتا تھا۔ وسط میں بہت سی جگہ خالی تھی۔ اندر رسی کی سیڑھیاں جھول رہی تھیں۔

ٹھیک اسی وقت باہر سماعت شکن دھماکا ہوا۔ کھنڈرات کے درودیوار لرزنے لگے۔ ہم خود بھی کھڑے کھڑے اپنی جگہوں پہ ہل کر رہ گئے۔ کاساپاکو جو شاید جوش

خفیہ تلے گڑھے کے سرے کے بالکل قریب آن کھڑا ہوا نیچے جھک کر تکنے میں محو تھا، وہ سیدھا اندر جا گرا...... ساپچی کے حلق سے چیخ سی اُبھری تھی۔ جبکہ ہم ابھی سنبھلنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ دوسرے دھماکے کی آواز اُبھری جو ہمارے بالکل عقب میں ہوا تھا۔ ساپچی ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی اور اس کی زبان پہ میرا نام تھا۔

"شش...... شہزاد......" پھر وہ شاید بے ہوش ہو کے گر پڑی تھی۔

اندر بارود کا دھواں سا بھر گیا۔ کئی لوگ کھانسنے لگے۔ مجھے بھی ٹھسکا لگا۔ یکلخت برسٹ چلے...... میں اپنی جان بچانے کی غرض سے دوڑا تھا کہ روڈلف مجھ سے ٹکرایا اور میں گڑھے میں گرتے گرتے بچا۔ صاف لگا تھا مجھے کہ یہ اس کی دانستہ حرکت تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، یہ تصدیق ہوتے ہی کہ میں ابھی باہر ہی تھا، وہ دوبارہ میری جانب لپکا، اس بار اس کا انداز واضح طور پر جارحانہ تھا۔ میں اسے تاکنے کے لیے تیار تھا کہ اسی وقت آٹھ دس اسلحہ بدست افراد اندر داخل ہوئے۔ وہ تاک تاک کر کاساپاکو کے آدمیوں کا نشانہ لینے لگے۔

پاؤ نے خطرہ بھانپتے ہی پستول نکال لیا تھا مگر اسے استعمال کرنے کا اسے موقع نہ مل سکا، نامعلوم حملہ آور کے ایک ہی برسٹ نے اس کا وجود اُدھیڑ ڈالا۔ سون اپنے کانوں پہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں رکھے چیخنے لگی۔ وہ اکڑوں بیٹھ چکی تھی۔ میں نے پلک جھپکتے ہی محسوس کیا تھا کہ نامعلوم حملہ آور روڈلف اور سون کو اپنی بربریت کا نشانہ بنانے سے کترا رہے تھے۔ ایک نے کوئی بم سا نکال کر اس کی پن دانتوں سے نکالی اور گڑھے کے اندر پھینک دیا۔

اندر دھماکے کے ساتھ ہی لرزہ دینے والی انسانی چیخیں برآمد ہوئیں۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ اندر کاساپاکو تھا، جانے اس دھماکے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ ایک نے مجھے اپنی گن سے نشانہ بنانا چاہا تھا لیکن تب تک جان روڈلف مجھے گڑھے میں دھکا دینے کے لیے میرے قریب آچکا تھا اور چونکہ میں اس کی پہلی "حرکت" کے بعد اس سے یک دم محتاط ہو گیا تھا۔ اسی لیے جیسے ہی یہ میرے قریب آیا میں نے اسے بڑی چابک دستی کے ساتھ دبوچ لیا۔

مجھ پر برسٹ چلانے والا حملہ آور جہاں کا تہاں رک گیا تھا۔ اس کی گن کا رخ ہنوز میری طرف ہی تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب روڈلف نے یہ نازک اور سنگین لمحہ پانے کے

لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میں بھانپ گیا کہ وہ کیا نکالنا چاہتا تھا، میں نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ شے نکال لی جسے ہاتھ میں لینے کی وہ حسرت ہی کرتا رہ گیا۔ وہ ایک کے اُوپر تال والا خطرناک قسم کا ڈبل بیرل "آرسنل پسٹل" تھا۔ ایسے اسلحوں کے استعمال میں تو مجھے یدِطولیٰ حاصل تھا۔ جو ہاتھ آتے ہی دشمنوں کے خلاف میری رگوں میں قہر وغضب کی بجلیاں دوڑا دیا کرتا تھا۔

ایک زبردست ایکشن اسالٹ کے تحت میں نے سب سے پہلے اپنے ایک بازو کی آہنی گرفت...... روڈلف کی گردن کے گرد حائل کر کے اسے اپنی ڈھال بنایا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل سے ان نامعلوم حملہ آوروں پر یکے بعد دیگرے گولیاں برساتا چلا گیا۔ خطرناک آرسنل مجھ سے زیادہ غضب ناکیاں بکھیرنے لگا۔ اس کی دونوں فولادی سلائیڈز تیزی سے آگے پیچھے حرکت کرنے لگیں۔ اور اس کے ایجیکشن پورٹ سے گولیوں کے خول اچھل اچھل کر نیچے گرتے رہے۔ نامعلوم حملہ آور رقصِ اجل کرتے گرتے چلے گئے، باقی چند نے جان بچانے کی غرض سے دائیں بائیں سرکنے میں ہی عافیت جانی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں پسپائی اور موت کے ڈر سے وہ لوگ بے دریغ مجھ پر گولیاں نہ برسانا شروع کر دیتے۔ اس صورت میں اگرچہ سب سے پہلے روڈلف ہی جان سے جاتا مگر میں بھی نہیں بچتا لیکن شکر ہوا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔

اُدھر روڈلف بدستور میرے بازو کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں تھا کہ اس کا داؤ چل گیا۔ کم وہ بھی نہ تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی اپنے دائیں بازو کی کہنی میرے پیٹ پر رسید کرنا چاہی تھی کہ میں نے اسے اسی ہاتھ کے شکنجے میں زور سے گھما دیا۔ اس صورت میں اس کی کہنی کی جان کش ضرب سے تو میں بچ گیا مگر وہ بھی میرے ہاتھوں سے نکلا چلا گیا۔ یہ میرے لیے نہایت خطرناک صورتِ حال تھی۔ کھنڈرات کے شکستہ ستونوں کے عقب میں باقی ماندہ چھپے ہوئے حملہ آوروں میں سے کوئی بھی مجھ پر برسٹ فائر کر سکتا تھا۔

اور وہی ہوا۔ روڈلف کی "ڈھال" سے محروم ہوتے ہی مجھ پر برسٹ فائر ہوا، میں چونکہ اس پوزیشن کی خطرناکی کا پہلے ہی ادراک کر چکا تھا اسی لیے میں نے قلیل ترین لمحات میں پلٹ کر اپنی جگہ بدلنے کی کوشش کی اور ایک طرف جمپ لگائی مگر میرا ایک پاؤں گڑھے کے سرے پر پھسلا، میرا توازن بگڑا، خود کو بارودی دھوئیں سے اٹے پڑے گڑھے میں گرنے سے بچانے کی اپنی سی تگ ودو چاہی تھی مگر بے سود...... میں سنبھلتے سنبھلتے بھی بالآخر گڑھے میں جا گرا......

☆☆☆

گڑھے میں گرتے ہی میں نے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے خود کو کسی ٹھوس شے کی زد میں آنے سے بچانے کی کوشش جاری رکھی تھی کہ میں دھپ سے کسی نرم شے پر گرا اور مجھے اس "شے" کی کراہ بھی سنائی دی۔ میں اسے پہچان گیا، یہ کاساپاکو کا بھاری بھرکم وجود تھا۔ گویا اس بم کے دھماکے کے بعد بھی اس میں زندگی کی رمق موجود تھی۔ جبکہ مجھے دھوئیں اور گرد وغبار کے سوا اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ بارود کی ناگوار بو سے میرا دم گھٹنے لگا۔ شکر تھا کہ گڑھے میں گرنے سے مجھے چوٹ نہیں آئی تھی۔

آرسنل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر قریب ہی گرا تھا مگر میں نے اسے ٹٹولنے اور اُٹھانے میں چنداں دیر نہیں لگائی تھی۔ تاہم میں کاساپاکو کے جسم سے اُتر آیا اور اسے جھنجوڑتے ہوئے ہولے سے پکارا......

"مسٹر کاساپاکو......! تم ٹھیک ہو؟"

وہ حلق سے غوں غاں کی آوازیں نکالنے لگا۔ مجھے اس کے جسم اور کپڑوں پر ہلکی سی چپچپاہٹ کا احساس بھی ہوا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ زخمی تھا۔

آتشیں ہتھیاروں کی گھن گرج اور انسانی چیخوں کے شور وشغب کے بعد دل دھڑکا دینے والا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ کاساپاکو کی غوں غاں اُونچی ہونے لگی تو میں نے اسے سرگوشی میں مخاطب کر کے کہا۔

"مسٹر کاساپاکو! آواز مت نکالو...... اُوپر دشمن ہماری خون کی بو سونگھ رہے ہیں۔" وہ میری آواز شاید پہچان گیا تھا، گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"مم...... میری جیب میں...... پپ...... پستول موجود ہے۔"

"اوکے......" میں نے ہولے سے کہا۔

اچانک ایک غراتی سی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ "وہ نیچے گر پڑا ہے۔ جلدی نیچے جاؤ۔ اس کا ہلاک ہونا ضروری ہے۔ گڑھے کے سرے کے چاروں طرف کھڑے ہو کر اندھا دھند فائرنگ کر ڈالو......"

یہ آواز سن کر میں لرز اُٹھا۔ یہ آواز اسی خبیث اور دغا باز امریکی جان روڈلف کی تھی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میری اس گڑھے میں کھلی قبر بننا یقینی امر ہوتا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن

سے کام لیا۔ تلے اُوپر نال والا خطرناک آرسنل ہنوز میرے دائیں ہاتھ میں موت بکھیرنے کے لیے متحرک رہا تھا۔ دوسرے ..... ہاتھ سے میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ قریب بے سدھ پڑے کاسپاکو کی جیبوں کی تلاشی لی اور میری توقع کے عین مطابق اس کی جیب سے بھی ایک عدد پستول برآمد ہو گیا۔

دونوں ہتھیاروں کو ہاتھوں میں لیے میں اوپر گڑھے کے سرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور تب ہی مجھے وہاں اسلحہ بدست ملگجے سے ہیولے کھڑے دکھائی دیے۔ میرے ہونٹوں پہ سفاک مسکراہٹ کھیل گئی۔ رگوں میں خون مثلِ پارہ کی طرح گردش کرنے لگا۔ وہ سب غالباً اس زعم میں میرے نشانے پر آگئے تھے کہ ان کا خیال تھا، میں نیچے گر کے بے ہوش ہو گیا ہوں یا بے سدھ......

پھر اس سے پہلے کہ اُوپر سے مجھ پر فائرنگ ہوتی، میرے دونوں پستول والے ہاتھ اُوپر اُٹھتے چلے گئے اور اگلے ہی لمحے وہ...... آتشیں قہقہے اُگلنا شروع ہو گئے۔

میرا نشانہ بھی ملگجے ہیولے تھے۔ دشمنوں کی اس آخری کھیپ کی تعداد بہت محدود تھی۔ اس میں ظاہر ہے میری ہی چابک دستی کا کمال تھا ورنہ یہ لوگ، جو بلاشبہ..... اس امریکی جان روڈلف کے ہی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ میری قبر بھی کھود ہی چکے تھے۔

مجھے ان کی کریہہ انگیز چیخیں سنائی دیں، ان میں دو ایک نیچے بھی گرے...... میں فوراً ان پر چیتے کی طرح جھپٹا اور ایک کی گن قبضے میں کر لی۔

”مسٹر کاسپاکو.....! ہوش میں رہنے کی کوشش کرو...... میں نے ان نامعلوم دشمنوں کا حملہ ناکام بنا دیا ہے۔ میں ایک شکار کے پیچھے اُوپر جا رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں گڑھے کے سرے سے جھولتی ہوئی رسی کی طرف بڑھا اور تیزی سے چڑھتا ہوا جیسے ہی سرے پر پہنچا، میری سماعتوں سے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز اُبھری۔

”فرار.....!“

ایک ہی لفظ میرے تھکے ہوئے ذہن میں اُبھرا تھا اور پھر جیسے یکلخت میرے وجود میں بجلیاں دوڑ گئیں۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ کون فرار ہونے کی کوشش کر سکتا ہے۔ تاہم پھر بھی میں نے گردشی نظروں سے صرف چند ثانیوں کے لیے اردگرد کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے اطراف میں بکھری ہوئیں لاشوں میں جان روڈلف کی لاش نظر نہیں آئی تھی، ہاں..... البتہ ایک طرف ان میں ساچی ضرور بے سدھ پڑی دکھائی دی تھی، پتا نہیں وہ زندہ تھی یا نہیں، کیونکہ وہ پہلے ہی اس اچانک اُٹھنے والے بربریت زدہ طوفان پر ہسٹریائی چیخیں مار کے غش کھا کر گر پڑی تھی۔ ممکن تھا اسے بے سدھ پا کر کسی نے اسے نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی ہو، ہاں ایک بات پر میں ٹھٹکا ضرور تھا کہ ان میں مجھے سون نظر نہیں آئی تھی۔

اسی وقت گاڑی کے ٹائر چرچرانے کی آواز اُبھری اور میری ٹانگوں میں جیسے بجلیاں دوڑ گئیں۔ میں نے کاسپاکو کا ہلکی ساخت والا پسٹل اور اپنا آرسنل بیلٹ میں اڑس لیا تھا اور...... ہیوی مشین گن ہاتھوں میں تھی، اسی لیے میں کھنڈرات کے بیرونی حصے کی طرف دوڑا۔ مجھے ایک کھنڈر کی آڑ سے ایک بڑی سی وین حرکت کرتی نظر آئی، میں نے تیزی سے ایک منہدم شدہ دیوار پھلانگی اور گھٹنوں کے بل اکڑوں بیٹھ کر میں نے وین کے ٹائروں کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔

شام رات کی تاریکی میں ڈھل چکی تھی۔ اترتے ہوئے انہی اندھیاروں میں میری گن سے یکلخت شعلوں کی زبان لپلپانے لگی اور اس کے اگلے ہی لمحے پے بہ پے دو دھماکے ہوئے۔

ریورس ہو کر ایک دم آگے بڑھتی ہوئی وین ان دھماکوں کے بعد ایک طرف کو جھک گئی اور گول گھومنے لگی۔ میں نے اس کی جانب دوڑ لگا دی۔

اسی وقت میں نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلتے اور اس کے اندر سے جان روڈلف کو ہاتھ میں گن لیے ہوئے اُترتے دیکھا۔ اس نے محض ایک اندازے سے مجھ پر فائر کھول دیا مگر اس کی یہ کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ میں نے اس سے پہلے ہی اس کا نشانہ لیتے ہوئے اپنی گن سے ایک برسٹ فائر کر دیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور گن ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی...... اس کا وہ ہاتھ خون کے لوتھڑے کا منظر پیش کرنے لگا۔ لیکن وہ بھی بڑا ڈھیٹ ثابت ہوا، یا پھر شاید اسے اپنی یقینی موت صاف نظر آنے لگی تھی۔ وہ اسی طرح ہی اذیت تلے چیختا ہوا گن اُٹھانے کو لپکا اور اس کا بایاں ہاتھ گن اُٹھانے کے لیے آگے کو اُٹھا ہوا تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے بڑے اطمینان سے گن کو سنگل شاٹ پر سیٹ کیا اور اس کی ایک ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ اس کی دوبارہ اذیت تلے چیخ اُبھری اور وہ نڈھال ہو کر گر پڑا۔ میں نے اس کی گن لات مار کے پرے تاریکی میں اچھال دی۔

ٹھیک اسی وقت میں نے وین کی ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والے دروازے کو کھلتے دیکھا۔ وہاں سے اُتر کر کوئی تاریک ویرانوں کی طرف دوڑا۔ میں نے فوراً اس کا تعاقب کیا۔ وہ سون تھی۔ انتہائی خوف زدہ اور بدحواس ہو رہی تھی اور شاید اسی سبب اس کا ایک پاؤں بھی دوڑتے ہوئے رپٹ گیا اور وہ گر پڑی۔ میں نے اسے چھاپ لیا اور اس کی گردن دبوچ کر اسے کھڑا کر دیا۔ اس کا لباس مَسل چکا تھا اور گرد و غبار سے اَٹا پڑا تھا۔ میں نے کسی عقاب کی طرح اسے جھپٹ لیا اور دبوچ کر کھڑا کر دیا۔

”تم اس دغاباز امریکی کے ساتھ کہاں بھاگ رہی تھیں؟ چلو میرے ساتھ۔“ میں غرایا۔

”نن...... نہیں، مجھے جانے دو، میں تمہاری منت کرتی ہوں...... وہ...... وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ دہشت زدہ لہجے میں ہکلا کے بولی۔

”خاموش رہو، ورنہ تمہاری گردن توڑ ڈالوں گا۔“ میں خونخوار لہجے میں غرایا۔ وہ سہم گئی۔ میں اسے دبوچے واپس پلٹا۔ روڈلف بے سدھ پڑا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ میں اسے گھسیٹتا ہوا کرسیڈا تک لایا اور اس کے بے ہوش زخمی وجود کو کھینچ کر عقبی سیٹ پر ڈال دیا۔ ڈکی میں رسی پڑی تھی۔ اس سے میں نے اس کی مشکیں کس ڈالیں۔

”وہ...... دیکھو...... سب مر چکے ہیں۔ ہمیں بھاگ جانا چاہیے۔“ سون بولی۔

”کہا نا میں نے...... خاموش رہو۔“ میں نے اسے پھر جھڑکا اور پھر اسے دبوچے اندر کھنڈر میں لے آیا۔

”ب...... باس زندہ ہے یا مر گیا؟“ وہ بولی۔

”وہ زندہ ہے اور زخمی حالت میں گڑھے کے اندر پڑا ہے۔ اسے نکالنا ہوگا۔“ میں نے قدرے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”نن...... نہیں، وہ...... وہ مجھے بڑی اذیتیں دے کر ہلاک کرے گا۔ مم...... مجھے جانے دو......“ وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی اور میری گرفت سے نکلنے کے لیے مچلنے لگی۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے نازک اندام چہرے پر جڑ دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ میں وقت ضائع کیے بغیر اندر گڑھے میں کود گیا۔ اب بارودی دھواں چھٹ چکا تھا۔ جنریٹر کی روشنی ہو رہی تھی۔ کاساپوکو میں نے سہارا دے کر اُٹھایا، وہ خاصا زخمی تو نظر آ رہا تھا مگر زندہ تھا اور ہوش میں بھی تھا۔ میں اسے کھینچ کھانچ کر کسی طرح گڑھے سے باہر نکال لایا۔

سانچی کو ہوش آ چکا تھا وہ پھٹی پھٹی دہشت زدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ سب کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ خود ہم بھی تو ایک بھیانک موت کے منہ سے بال بال بچے تھے۔ میں ان سب کو لیے کار میں آ گیا۔ بعد میں بے ہوش سون کو بھی اُٹھا لایا۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی اور پھر سب ایک ہی کار میں ٹھنس ٹھسا کر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

کاساپوکو کی رہائش گاہ پہنچے تو جیسے ہلچل مچ گئی۔ کاساپوکو سمیت سب نے دیکھا تھا کہ میں ہی ان سب کو بچا کے لایا تھا اسی لیے میرا حکم وہ سب بغیر کسی چوں و چرا ان کے ماننے لگے۔ کاساپوکو کو فوراً طبی امداد کے لیے کسی دوسرے گوشے میں لے جایا گیا تھا، مجھے اسی کے ساتھی سے پتا چلا تھا کہ وہاں ڈاکٹرز سمیت تمام طبی سہولیات موجود تھیں۔

جبکہ روڈلف اور سون کے سلسلے میں، میں نے یہی حکم دیا کہ ان دونوں کو الگ الگ بند کمروں میں قید اور کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔ (روڈلف کو بھی میرے ہی حکم سے طبی امداد دینے کے لیے لے جایا گیا تھا)

کاساپوکو کے ساتھی حیران و پریشان تھے کہ یہ سب ہوا کیا تھا۔ کچھ ادراک تو تھا کہ یہ سب کسی دھوکے بازی کا ہی پیش خیمہ ہو سکتا ہے، لیکن روڈلف اور سون کو قیدی کی حیثیت سے بند کرنے کا حکم، ان کے لیے اچنبھے کا ہی سبب بنا تھا۔

چند گھنٹوں بعد حالات معمول پر آئے۔ میں بھی غسل وغیرہ کر کے تازہ دم ہو گیا۔ کاساپوکو کے آدمی میری ایک ایک ضرورت اور بات کا خیال کر رہے تھے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے سرغنہ کو زخمی حالت میں میرے ساتھ دیکھا تھا اور یہ بھی کہ میں اس کی جان بچا کے اسے یہاں تک لایا تھا۔

اس کے بعد میں سون سے ملنے اس کے کمرے میں جا پہنچا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ ایک کونے میں سکڑی سمٹی فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک ہی بلب روشن تھا۔ آہٹ پا کر وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور سر اٹھا کر اس نے دیکھا۔ وہ خاصی دہشت زدہ اور سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور وہ کونے میں دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ اس کا شارٹ اسکرٹ گھٹنوں سے اُونچا ہو گیا تھا۔ میں چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے اس کی طرف دیکھتا رہا، اس کے بعد ہولے سے بولا۔

”سون! میں نے ابھی کاساپوکو اور اس کے کسی آدمی کو تمہاری غداری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔“ میں نے اندھیرے میں مگر بڑا اچھا تُلا تیر پھینکا۔ یہی وجہ تھی وہ اس کے چہرے کی مردنی اور پژمردگی لمحہ بھر کے لیے حیرت آمیز مسرت کے تاثرات میں بدلی اور وہ کونے کی دیوار سے سہارا لینے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑی ہونے لگی تو میں نے قدرے جھک کر آگے بڑھتے ہوئے اس کا مرمریں بازو تھام لیا۔ وہ جلد ہی سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کی حالت خاصی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔

”کک...... کیا تم س...... سس...... سچ بول رہے ہو......؟“

”میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ وقت بچانا چاہتی ہو تو میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا جس طرح تمہیں مجھ سے ہمدردی تھی اسی طرح مجھے بھی تم سے ہمدردی ہے۔ مگر مت بھولنا کہ ایک ذرا جھوٹ بھی بولا تو نقصان تم اُٹھاؤ گی، میں نہیں چاہتا ہوں کہ تم کاساپوکو کی بربریت کا نشانہ بنو، روڈلف ہماری قید میں ہے اور اس سے بھی ہم بہت کچھ اُگلوا لیں گے۔ مگر تم اپنے حصے کا کام کر کے میرے دل میں جگہ بنا لو تاکہ میں تمہیں بچا سکوں۔“ میری نپی تلی گفتگو نے سون کو سکتا کر رکھ دیا۔ اس کی گھنیری پلکیں اشک بار ہو گئیں۔

”کہا نا...... میں نے کہ وقت ضائع مت کرو...... جتنی جلد تم بات ختم کرو گی اُتنا ہی آسانی سے میں تمہارا دفاع کر سکوں گا مگر شرط وہی ہے کہ سچ بولنا ہے۔“

”لل...... لیکن وہ، روڈلف...... میرے بارے میں سب بتا دے گا۔“ اس نے امکانی پہلو کی طرف توجہ دلائی تو میں اسی اطمینان سے بولا۔

”مت پروا کرو اس کی، وہ کاساپوکو کا ایک انتہائی معتوب مجرم بن چکا ہے، میں کوشش کروں گا کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے کہ وہ تمہارے بارے میں کسی بات کا بھانڈا پھوڑ سکے، اگر ایسا کیا بھی اس نے تو تم میں وہ سچویشن سنبھال لوں گا۔ کاساپوکو مجھ پر اب اندھا بھروسا کرنے لگے گا اور...... اگر تمہارے حقیقت اُگلنے سے...... میں وہ بیش قیمت مجسمہ برآمد کر لوں تو مجھے پورا یقین ہے کہ کاساپوکو...... صرف میرے ہی نام کی مالا جپتا رہے گا۔“

”کک...... کیا خبر تم مجھے بہلا پھسلا کر......“

”او کے...... تمہاری مرضی......“ میں نے اس کی بات کاٹ دی اور پلٹا تو عقب سے اس کی لرزتی آواز اُبھری۔

”ٹھ...... ٹھہرو...... پلیز!“

تب تک میں چند قدم بڑھا چکا تھا۔ اس کی آواز سن کر رکا اور وہیں کھڑے کھڑے اس کی جانب پلٹا۔

”میں سب بتانے کو تیار ہوں۔“

”ہاں! تو بتاؤ کہ سب کیا چکر تھا......؟ تمہیں کیسے روڈلف نے اپنے ساتھ ملا لیا؟ اور وہ مجسمہ کہاں چھپا رکھا ہے؟ مگر یہ سب مجھے مختصر لفظوں میں بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

وہ بتانے لگی۔

”کاساپوکو کے پاس میں اُکتا چکی تھی۔ جب تک اس نے مجھے گروہ میں ایک ”مادام“ کی حیثیت دے رکھی تھی تو سب ٹھیک تھا، لیکن پھر جانے کیا ہوا اس نے گروہ میں میری حیثیت روز بروز ڈی گریڈ کرنا شروع کر دی۔ پھر سانچی کی آمد نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ کاساپوکو نے مجھے اپنی خلوتوں سے ہی نہیں بلکہ جلوتوں سے بھی دور کر دیا اور میں فقط اس کے مہمانوں کی راتیں گرم کرنے والی ایک طوائف بن کر رہ گئی، یہی نہیں گروہ کا ہر وہ ادنیٰ سے ادنیٰ فرد جو کبھی مجھ سے بات کرنے کی جرات نہیں کرتا تھا، مجھے اس کے حوالے کر دیا جاتا۔ میں ٹوٹ کر رہ گئی۔ یا تو ابتدا سے ہی مجھے ایسا ہی رہنے دیا جاتا تو میری انا اور خودی کو اتنا دھچکا نہیں پہنچتا، لیکن ایک بڑے مقام سے بغیر کسی وجہ کے مجھے گرا دینا میرے لیے زیادہ تکلیف کا سبب بنا۔“ وہ اتنا کہہ کر رکی۔ میں بدستور مستفسرانہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف تکتا رہا۔

وہ ذرا ٹھہر کر دوبارہ بتانے لگی۔

”روڈلف بھی کاساپوکو کا مہمان تھا۔ وہ اس پارٹی کا آدمی تھا جن سے کاساپوکو نے وہ چوری شدہ مجسمہ فروخت کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ وہ بیعانے کے طور پر چوتھائی رقم لے کر آیا تھا اور اس نے مجسمہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی درخواست کی تھی، جسے کاساپوکو نے بہ خوشی قبول کر لی تھی۔ بدھا کا وہ بیش قیمت مجسمہ اور وہ مقام (کھنڈرات) دیکھنے کے بعد...... اس نے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ روڈلف جیسا شاطر آدمی شاید تب تک میری اندرونی کیفیات اور یہاں سے بیزاری کو بھانپ چکا تھا۔ ایک رات جب میں اس کے ساتھ تھی تو اس نے مجھے ایک راز سے آگاہ کر دیا۔ اس نے

بتایا کہ وہ یہ مجسمہ چوری کرنا چاہتا ہے جس کا وہ امریکا سے پہلے ہی ایک مربوط پلان بنا کرلایا ہے۔ نیز اس نے اپنے بارے میں مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ ایک بڑے بین الاقوامی نوعیت کے گروہ کی طاقت اس کی پشت پر ہے، وہ آج رات (اس دن کی رات جب کاسپاکو نے روڈلف کو وہ مجسمہ اور جگہ دکھائی تھی) اس کے ساتھی وہ مجسمہ چوری کر چکے ہوں گے کیونکہ وہ انہیں اسی دن ساری انفارمیشن خفیہ طور پر دے چکا تھا۔

”روڈلف نے مجھے مجبور کیا کہ میں کسی طرح کاسپاکو کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالوں تاکہ ایک تو اسی افراتفری میں روڈلف یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا، کیونکہ وہ چوری شدہ مجسمہ اور اس کا جائے مقام دیکھ لیے جانے کے بعد روڈلف پر کاسپاکو نے کڑی نگرانی مقرر کر دی تھی، وہ ایک طرح سے یہاں نظر بند تھا جب تک کہ مجسمہ وہاں سے نکال کر امریکا نہ روانہ کر دیا جاتا۔ میں کاسپاکو کو زہر دینے کا کام نہیں کر سکتی تھی۔ یہ میرے لیے ناممکن حد تک مشکل تھا۔ درحقیقت روڈلف کے لیے کاسپاکو کی ہلاکت ضروری تھی، اس کے سوا وہ مجسمہ امریکا نہیں لے جا سکتا تھا، اس صورت میں کاسپاکو ان کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا تھا۔ یہاں چور کو مور پڑنے والی بات ہو گئی تھی۔ شکار کو ایک دوسرے خطرناک شکاری کے منہ سے نوالہ بنا کے چھینتا تھا۔

”بہرطور میرے انکار کے بعد روڈلف نے یہ گیم کھیلی تھی جو آج ہوا۔ کیونکہ کاسپاکو کے ساتھ آدمی کم تھے لیکن روڈلف کو کیا معلوم تھا کہ ایک تم ہی سب پر بھاری پڑ جاؤ گے۔ اس کا سارا منصوبہ فیل ہو گیا بلکہ وہ خود بھی گرفت میں آ گیا۔“ وہ اتنا بتا کر رکی، میرا ذہن اس کی باتوں پر مسلسل غور کرنے میں مصروف تھا، وہ ذرا سانس لینے کو رکی اور......

پھر آخر میں مجسمے سے متعلق بتانے لگی کہ اسے روڈلف نے آخری وقت تک کچھ نہیں بتایا تھا کہ اس کے آدمیوں نے مجسمہ چوری کر کے کس مقام پر رکھا تھا۔ لیکن آج جب روڈلف نے اپنے اس خون ریز منصوبے کو آخری شکل دی تو تب ہی اس نے سون کو بتایا تھا کہ وہ لوگ سب کو ہلاک کرنے کے بعد...... مل ٹاپ کے علاقے، نوکٹ پیلس روانہ ہو جائیں گے اور اب بھی یہ پسپائی اختیار کرنے کے بعد یہ دونوں (روڈلف اور سون) فرار ہو کر وہیں جا رہے تھے.... جب سون نے مجھے اس جگہ کا پتا بتایا تو مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ یہ رہائش گاہ وزیر جان کا ٹھکانا تھی...... جہاں گوتم بدھ کے دوسری بار چوری شدہ مجسمے کو ایک خفیہ تہ خانے میں رکھا گیا تھا......

☆☆☆

میرے لیے یہ ایک چونکا دینے والا اور سنسنی خیز انکشاف تھا۔

اسپیکٹرم کے کئی ونگز مختلف اوقات میں بیک وقت اور ہمہ وقت سرگرم رہتے تھے۔ میری معلومات کے مطابق روڈلف یقیناً اسپیکٹرم کے لیلڈ اسکواڈ کو کا کوئی گروپ چیف ہو سکتا تھا۔ یاد رہے کہ یہ وہی اسکواڈ تھا جس کی فعال رکن اور ورکر...... سوشیلا اور بشام پھلگری بھی رہ چکے تھے۔ ان کا کام دنیا کے کسی بھی کونے سے نوور یافت شدہ اور بیش قیمت نوادرات کو چوری کر کے...... انہیں اسی ملک کے حوالے کرنا ہوتا تھا، تاکہ اسپیکٹرم کی ”شریفانہ“ ساکھ قائم رہتی اور اس کے لیے دنیا کے ہر ملک سے ”فارن فنڈنگ“ کے راستے کھلے رہتے۔

بڑی زیرک دماغی کے ساتھ میں نے سون کی بتائی ہوئی باتوں کا تجزیہ کر کے یہی حل نکالا تھا کہ عنقریب اسپیکٹرم کو ایک عالمی سطح پر اس کا اصل مکروہ چہرہ بے نقاب کرنے کا خاطر خواہ موقع مل رہا تھا۔ لیکن درمیان میں کاسپاکو کی تیزہ آڑے آئی تھی، اگرچہ کاسپاکو کو ٹھکانے لگانا اب میرے لیے چنداں مشکل نہ تھا لیکن مسئلہ میری امریکا روانگی کا تھا اور یہ راستہ اب کاسپاکو ہی میرے لیے آسان کر سکتا تھا۔ اسی لیے ابھی اس سے دوستی کی فضا کو جاری رکھنے میں میرا اپنا مفاد بھی تھا۔

میں نے اب نئے حالات وموقع محل کے مطابق سون کو کچھ ضروری ہدایات دیں، اسے کچھ سمجھایا اور پھر اس کی آزادی کا حکم دے ڈالا......

کاسپاکو کا ایک خاص کار پرداز جو میرے سارے احکامات بڑی خنداں پیشانی سے بجا لا رہا تھا۔ وہ ڈین چنگ نام کا ایک ٹھگنا آدمی تھا۔ میں نے اس سے یہی کہا تھا کہ مجھے سون کے سلسلے میں جو غلط فہمی ہوئی تھی، وہ اب رفع ہو چکی ہے۔ وہ حیران تو ہوا تاہم اس نے وہی کیا جو میرا حکم تھا۔ یوں بھی وہ کاسپاکو کے پاس تھا اور کاسپاکو نے اسے میری طرف سے یقیناً ”فری ہینڈ“ رہنے کا کہہ رکھا ہوگا۔ میں کاسپاکو پر اپنے اعتماد اور ”کارکردگی“ کی ایک اور مثال پیش کرنے کے لیے بے چین تھا لہٰذا ڈین چنگ کے ساتھ فوراً اس کے روبرو حاضر ہو گیا۔

وہ گوشہ...... جہاں کاسپاکو کا علاج ہو رہا تھا۔ اس محل نما رہائش گاہ کے عقب میں اوپری منزل پر تھا۔

کاسپاکو بیڈ پر دراز تھا۔ وہاں ایک نرس موجود تھی۔ ڈین چنگ میرے ہمراہ تھا۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی تھیں اور جسم کے کئی حصوں پر پٹیاں اور بینڈیجز بندھی ہوئی تھیں۔ اتنی جلدی اس کی قدرے بہتر حالت کو دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں ابتدائی طبّی امداد کے سلسلے میں کاسپاکو نے خاطر خواہ بندوبست کر رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا تھا کہ کاسپاکو اس سلسلے میں خوش قسمت رہا ہو کہ ایک تو دو دشمنوں کے حملے سے بال بال موت کے منہ میں جانے سے بچا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کے زخم زیادہ گہرے یا مہلک نہ ہوں۔ جبکہ بروقت اور جدید طبّی سہولیات کا فوری حصول بھی اس میں کارفرما ہو سکتا تھا۔

وہ اس وقت بیڈ پر نیم دراز تھا اور اس کے سینے پر اسٹینڈ کے ذریعے ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی جس پر فروٹ جوس اور سوپ تھا، وہ سوپ پینے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

”کم...... کم آن...... مسٹر شہزادا! بہادر اور جاں نثار آدمیوں کے سلسلے میں میرا انتخاب کبھی بھی غلط ثابت نہیں ہوا ہے، میں تمہیں بلوانے ہی والا تھا۔“ وہ بولا۔

”سب سے پہلے میری مبارک باد قبول کریں مسٹر کاسپاکو!“ میں نے اس کی بات پر دل میں ہنستے ہوئے مگر بظاہر باادب ہو کے اس سے کہا۔

”نئی زندگی مبارک ہو۔ میں ایک اہم اور فوری معاملے کے سلسلے میں خود بھی آپ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔“

”دشمن نے ہمارے خلاف دھوکا دہی کی بڑی زبردست چال چلی ہے۔“ وہ فکرمندی سے بولا۔ ”اس قیمتی مجسمے کی چوری نے زخموں سے زیادہ میری کمر توڑ ڈالی ہے۔ لیکن ان کا آدمی ہماری گرفت میں ہے اور کتیا سون...... اسے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے والا ہوں۔ اس فیچ نے دشمنوں سے ساز باز کر کے کاسپاکو کے قہر وغضب کو للکارا ہے۔“

”لیکن...... حقیقت اس کے برعکس ہے مسٹر کاسپاکو......!“ میں نے اچانک کہا اور وہ قدرے چونک کر الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں! مسٹر کاسپاکو! لیکن ابھی یہ وقت زیادہ تفصیلات میں ضائع کرنے کا نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے پتا چلا لیا ہے کہ وہ مجسمہ اس وقت کہاں اور کس جگہ رکھا ہوا ہے۔“

میری اس بات پر حسبِ توقع کاسپاکو کو ایک



یہ لباس ہے دفتر آنے کا

زبردست جھٹکا لگا۔ سوپ کا چمچ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔

”کی کی...... یہ کیا کہہ رہے ہو......؟ کک...... کیا واقعی تم نے ہمارے چھینے ہوئے نوالے کا سراغ لگا لیا ہے؟“ وہ غیر یقینی لہجے میں بولا۔

”مسٹر کاسپاکو! اس سے پہلے کے دشمنوں کی بچی کھچی تعداد پھر سے یکجائی اختیار کر لے، مجھے اسی وقت نکلنا ہوگا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا اور پھر کاسپاکو نے اسی وقت ڈین چنگ کو مجھ سے ہر طرح کے تعاون کی سختی سے ہدایات کر ڈالی۔

”میری کامیابی کی دعا کیجیے گا مسٹر کاسپاکو!“ بالآخر میں کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا تو اس نے کہا۔

”تمہارا یہ مجھ پر دوسرا بڑا احسان ہوگا۔ میرے جتنے آدمی اپنے ساتھ لے جانا چاہو لے جا سکتے ہو، اور ایک کارگو ٹرک بھی ہوگا۔ اس کے اندر کرین پہلے سے موجود ہوگی۔ مجسمہ اسی کارگو میں لوڈ کرنے کے بعد اسے ادھر ہی لے آنا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔“ میں نے اچانک کہا۔ کاسپاکو سمیت ڈین چنگ بھی میری طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں آگے بولا۔

”گوتم بدھ کا یہ مجسمہ صرف قیمت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ یہاں کی سرزمین کے لوگوں کے لیے مذہبی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہی نہیں اسے بینکاک کی ایک معروف عبادت گاہ کے مندر سے چرایا گیا ہے۔ لہٰذا میں نہیں سمجھتا کہ اس کی چوری زیادہ عرصہ چھپی رہ سکتی ہے۔ بے شک اس

کی جگہ ایک ایسا ہی نقلی مجسمہ وہاں رکھ دیا گیا ہے۔''

''تو تم پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟'' کاساپاکو نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اس مجسمے کو واپس اسی جگہ رکھنا ہوگا۔ یعنی ان کے کھنڈرات میں۔''

''کیا......؟'' کاساپاکو کا منہ کھلا رہ گیا۔

''ہاں! بچے کھچے دشمنوں میں اب اتنا دم نہیں رہا ہوگا کہ...... وہ دوبارہ اسے وہاں سے حاصل کر سکیں۔ نقطہ باریک ہے مگر اسے بڑے دھیان سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان کا چیف جان روڈلف ہماری گرفت میں ہے۔ ہاں! اتنا ضرور کیا جاسکتا ہے کہ اس طرف خفیہ طور پر ہم اپنے مسلح آدمیوں کو نگرانی پر مامور کر دیں۔''

''لیکن...... دشمن ناکامی کی صورت میں انتقامی طور پر شرارت کر سکتے ہیں۔ وہ مقامی انتظامیہ کو گمنام کال یا کسی اور ذرائع سے اس مجسمے سے متعلق مطلع کر سکتے ہیں۔'' ڈین چنگ نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا تو میں نے ترچھی مسکراہٹ سے کہا۔

''میں ان عوامل پر بھی غور کر چکا ہوں۔ یہ خدشہ اپنی جگہ سہی، لیکن اس کے ہونے میں صرف دس سے پندرہ فیصد چانسز ہیں۔ مجسمہ کا حصول ان کا بھی ایک اہم مقصد ہے۔ جس کی وہ تین چوتھائی رقم بھی ادا کر چکے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا بھی نقصان ہوگا، ان سے بات کی جائے گی، ممکن ہے وہ...... اب شریفانہ سودے بازی پر اُتر آئیں یا پھر جان روڈلف ان کی پارٹی سے تعلق ہی نہ رکھتا ہو یا پھر اس کی نیت میں فتور آگیا ہو۔''

''تمہارا خیال ہے کہ ہمیں مذکورہ پارٹی سے بات کرنی چاہیے۔'' کاساپاکو نے خیال آرائی کی۔

''ہاں! یہ بات آپ کریں گے اور پہلے شکا یتاً یہ سب بتانے کے بعد دیکھتے ہیں کہ کیا حقیقت سامنے آتی ہے؟''

''میں سمجھ گیا تمہاری بات...... تم فوراً روانہ ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ دشمن کوئی اور حربہ استعمال کریں۔'' کاساپاکو جلدی سے بولا۔ ''انہیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ معاملہ خراب ہوگیا ہے وہ جتنے بھی ہوں گے، میرا نہیں خیال کہ ان کی تعداد زیادہ ہوگی۔''

اگلے پندرہ منٹوں کے اندر اندر میں ڈین چنگ اور کاساپاکو کے تقریباً پندرہ مسلح آدمیوں کے ٹولے سمیت مختلف گاڑیوں میں سوار آندھی طوفان کی طرح...... ہل ٹاپ کی طرف رواں دواں تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب وہاں کی کیا صورت حال ہو سکتی تھی؟ تاہم میں نے ابھی کاساپاکو کو یہ حقیقت بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ روڈلف کا تعلق وزیر جان کے گروہ سے تھا یا وہ مجسمہ اسی کی رہائش گاہ کے ایک خفیہ تہ خانے میں رکھا گیا ہے۔

ہل ٹاپ پہنچتے ہی ہم نے وزیر جان فوکٹ پیلس والے ٹھکانے پر خاموش کمانڈو ایکشن کیا۔ وہاں دو تین ہی افراد سے ہمارا ٹکراؤ ہوا بلکہ ٹکراؤ کیا ہوا...... ان تینوں نے ہتھیار ہی ڈال دیے۔ ڈین چنگ اور اس کے ساتھی انہیں موت کے گھاٹ اُتار دینا چاہتے تھے، لیکن...... میں نے بلاوجہ کی خون ریزی پھیلانا ضروری نہیں سمجھا۔ ہم نے سیدھا خفیہ تہ خانے کا رخ کیا۔ یہ وہی تہ خانہ تھا جہاں کچھ روز پہلے مجھے یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا۔

وہاں یہ عظیم الشان گوتم بدھ کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی چند ثانیوں کے لیے مسحور سا ہو گیا۔ مجسمہ کیا تھا، چمکتے ہوئے سونے کا ایک چھوٹا پہاڑ سا نظر آتا تھا۔ وہی چھوٹا کارگو ٹرک ہمارے ساتھ تھا۔ آہنی ٹرالی کے ذریعے کرین اُتاری گئی اور پھر اسے اندر لے جایا گیا۔ تہ خانے سے باہر کارگو ٹرک تک اس مجسمے کو نہایت رازداری کے ساتھ لایا گیا اور لوڈ کرنے کے بعد ہم نے وہاں کھنڈرات کا رخ کیا۔

وہاں پہنچتے ہی اسے اسی کھوہ میں ڈال کر اُوپر مٹی کا ڈھیر جما دیا۔ واپس لوٹنے کے بعد ہم نے کاساپاکو کو یہ خبر سنائی تو وہ اس کے فکرمند چہرے پر یکلخت بشاشت دوڑ گئی۔ اس نے اپنے چپٹے چہرے کی باچھیں پھیلا کر دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیے۔ وہ بیڈ پر ہنوز نیم دراز تھا اور میں اس کے گلے ملا۔

''مسٹر شہزاد احم نے ایک بڑا کام کیا ہے۔ میں ساری زندگی تمہارا یہ احسان نہیں بھلا سکتا۔''

''احسان کی کیا بات ہے جناب! جب آپ کا دم بھرا ہے تو اسے نبھانا تو پڑے گا ہی۔'' میں مسکرا کر بولا۔ اس وقت ساچی وہیں قریب ہی اس کے بیڈ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے گاہے بگاہے چبھتی ہوئی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

''مسٹر کاساپاکو!'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ کی مذکورہ پارٹی سے کوئی بات ہوئی؟''

''ہاں! میں وہی تمہیں بتانے والا تھا۔'' وہ ایک دم بولا۔ ''مسٹر جوشوا سے میری بات ہوئی تھی۔ تمہاری والی

بات درست تو ثابت ہوئی ہے۔ لیکن...... مجھے اب بھی اس میں دغابازی کی بُو آتی ہے۔ اس نے صاف کہہ ڈالا کہ روڈلف کی نیت میں فتور آگیا ہوگا اس لیے وہ اب تمہارا مجرم ہے اور ہم اس کے ساتھ کچھ بھی سلوک کر سکتے ہیں۔''

''روڈلف کے ساتھ کیا کیا آپ نے......؟'' میں نے فوراً کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''میں اس کی موت کے احکامات جاری کرنے والا ہوں اور سون بھی اس کے ساتھ ہی مرے گی۔'' کاساپاکو نہایت سفاکانہ لہجے میں بولا۔

''نہیں جناب!'' میں نے فوراً اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔

''مجھے معلوم تھا تم یہی کہو گے۔''

''شکریہ جناب!'' میں نے بھی جواباً خفیف سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''دراصل میں کسی بھی حالات اور ایسے معاملات میں جلدبازی سے کام نہیں لیا کرتا۔ بالخصوص جب ہمارا مجرم ہماری گرفت میں ہو تو اسے ٹھکانے لگانے سے پہلے چند دوسرے عوامل پر غور کرنا...... بہتر ہی ہوتا ہے۔''

''گڈ...... مجھے تمہاری یہ عادت پسند آئی۔ شاید تمہاری حیران کن کامیابی کا یہی راز ہے کہ تم جلدبازی سے کام نہیں لیتے۔'' وہ ستائشی لہجے میں بولا۔

''میں روڈلف سے ملنا چاہوں گا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''شیور...... ڈین چنگ تمہیں اس خبیث سے ملوا دے گا۔'' وہ بولا۔

''جوشوا سے کسی نئی سودے بازی کی بات ہوئی؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری امریکا یاترا کا یہ معاملہ بھی نہ کھٹائی میں پڑ جائے جو تقریباً پڑ ہی چکا تھا، تاہم مجھے ایک بات کی تسلی تو تھی ہی کہ کاساپاکو اب میرے کسی مشورے کو رد نہیں کر سکے گا اور میں اسے سابقہ پلان پر عمل پیرا ہونے کے لیے رضامند کر ہی لوں گا۔ میرے استفسار پر وہ بولا۔

''سودے بازی کے سلسلے میں وہ یہی کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ اب بھی اس پر قائم ہیں لیکن ہمیں چوں اب ان سے تحفظات تھے اس لیے میں نے سب سے پہلے تو ان کی بیعانہ کے طور پر دی ہوئی رقم کو ہرجانے کی مد پر لوٹانے سے صاف انکار کر دیا اور اب نصف بیعانہ دینے کا تقاضا کر دیا۔ جبکہ مجسمہ پہنچانے کی ذمے داری بدستور ہماری ہی ہوگی۔''

کاساپاکو کی اس آخرالذکر بات پر میں نے بے اختیار دل ہی دل میں طمانیت کی سانس لی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے شہزی! کیا روڈلف نے واقعی اپنے ہی آدمیوں سے غداری کی تھی یا پھر جوشوا کی بات جھوٹ ہے......؟'' کاساپاکو نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد مجھ سے پوچھا۔

''سرِدست تو دونوں ہی باتیں ممکن ہوسکتی ہیں۔ میں روڈلف اور سون سے ایک ملاقات کروں گا اور اپنے طور پر ان سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد ایک ذرا توقف کے بعد نہایت محتاط لہجے میں دوبارہ بولا۔

''سون کے سلسلے میں مجھے ایک شبہ ہے کہ وہ کسی غلط فہمی کے تحت نرغے میں آگئی ہے لیکن بہرحال میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے کاساپاکو کی طرف دیکھا تھا۔ میں سون کے سلسلے میں اس کے چہرے کے تاثرات بھانپنا چاہتا تھا مگر اس کا چہرہ سپاٹ رہا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں روڈلف کے سامنے تھا۔ وہ ایک عجیب ساخت کی آہنی کرسی پر رسن بستہ حالت میں بیٹھا تھا۔ اس کا سر کرسی کی پشت پر ٹکا ہوا تھا اور وہ اُوپر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں چونکہ کسی حد تک روڈلف کی اصلیت بھانپ چکا تھا اسی لیے ابھی میں اس پر ایسا کچھ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ کمرے میں میری آہٹ پاکر بھی اس طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ شاید منصوبے کی بُری طرح ناکامی نے اسے مایوس کر ڈالا تھا یا پھر اندر سے توڑ ڈالا تھا۔ بہرطور...... اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے میں تھوڑا سا کھنکھارا بھی تھا۔ پھر بھی اس نے سامنے دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی تو میں نے اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا۔

''مسٹر روڈلف!''

وہ شاید میری ہی آواز پر متوجہ ہوا۔ اس نے اپنا سر سیدھا کیا اور مجھے گھورنے لگا۔ تب ہی میں نے اس کی آنکھوں...... میں نفرت و غیظ کی لہر اُمڈتی محسوس کی تھی۔

''ہماری جوشوا سے بات ہوئی تھی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے تم سے قطع تعلق کا اظہار کر ڈالا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں ذرا رکا اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگا۔ جہاں مجھے خفیف سے اتار چڑھاؤ کا احساس ہوا تھا۔ میں آگے بولا۔

''اور تم جو بیعانے کی رقم لائے تھے، وہ بھی تمہاری بدعہدی کی وجہ سے ہرجانے اور جرمانے کے طور پر قطع کر لی گئی ہے۔ جوشوا نے تمہارے سلسلے میں مسٹر کاسپاکو سے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ یہ معاملہ ایک فرد کی بدنیتی کا ہے اسی لیے اس عظیم سودے کو برقرار رکھا جائے، حتیٰ کہ وہ اب نصف رقم پیشگی دینے کو بھی تیار ہو چکا ہے۔''

''میرے سلسلے میں جوشوا کی آخری ہدایت کیا تھیں؟'' روڈلف نے پہلی بار لب کشائی کی۔

''یہی کہ...... جو ہم چاہیں تمہارے ساتھ سلوک کریں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''میں تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتا۔'' جانے کیا سوچ کر وہ ایک دم بولا۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ مجھے اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔

''اگر تم یہ سمجھتے ہو تو پھر میں نے یقیناً کاسپاکو کے ان آدمیوں کو روکنے کی سخت غلطی کی جو اس کے حکم پر تمہیں اور سون کو گولی مارنے کے لیے آ رہے تھے۔''

میری اس بات پر روڈلف نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تمہیں بھلا مجھ سے اس قدر ہمدردی کیسے ہو گئی؟''

''اس لیے کہ میں سمجھ رہا ہوں تمہیں یوز کیا گیا ہے اور اب ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا گیا ہے۔'' میں نے لاجواب ہوئے بغیر فوراً کہا۔

''ایسا خیال میرے دل میں جوشوا سے بات کرنے کے بعد آیا تھا۔''

اس کے چہرے پر لمحہ بھر کو تاثر کی رمق ابھری تھی۔ بولا۔ ''اب مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟''

''فقط اتنا کہ...... مجھے حقیقت بتا دو، کیا تم واقعی اسپیکٹرم کے لیے کام کرتے ہو اور مزید یہ کہ تمہاری نیت میں فتور آیا تھا یا اس میں تمہاری تنظیم کے حکم کا دخل تھا؟''

میں نے دانستہ اسپیکٹرم کا ذکر اچانک اور عمومی انداز میں کیا تھا۔ حسبِ توقع وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

''جب تم ساری بات سمجھ ہی رہے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ کاسپاکو اسپیکٹرم کی حقیقت نہیں جانتا۔ اس نے وزیر جان سے ٹکر لینے کی کوشش کی تھی، وزیر جان کے لیے سپاؤ جیسے گینگسٹر ایک مکھی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔''

''تم نے تو اسے ہلاک کر کے اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کر لی اور کاسپاکو کے دل میں بھی جگہ بنا لی ہے لیکن تمہارا امریکا پہنچنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ عنقریب اسپیکٹرم کی ایک نئی کھیپ تمہیں اور کاسپاکو کو ٹھکانے لگانے کے لیے پہنچنے والی ہے۔'' اس کے لہجے میں اسپیکٹرم کے عہدے داروں والا غرور تھا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ میرے ''جھانسے'' میں نہیں آیا تھا۔

''اسپیکٹرم کے ہر عہدے دار کو یہی غرور ہوتا ہے، وزیر جان کو بھی یہی غرور تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تم......'' کہتے ہوئے .... دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا اور ایک گہری ہنکاری خارج کر کے واپس لوٹنے لگا تو اس نے مجھے پکارا۔

''رکو مسٹر شہزاد......!'' اس کی آواز سن کر میں پلٹا۔

''کاسپاکو سے میری جان چھڑا دو میں تمہیں عابدہ کے ایک اہم راز سے آگاہ کر دوں گا جس کا جاننا تمہارے لیے اشد ضروری ہے۔'' اس نے جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کر دیا۔

عابدہ...... میری زندگی کی ایک اہم حقیقت، میرے ہوش و حواس کا ایک اہم جزو...... میرے وجود کا ہی نہیں میرے دل اور روح کا ایک عنصر...... وہ کہاں کس حال میں تھی فی زمانہ میں اس سے نابلد تھا۔ عابدہ کے سلسلے میں اس کا جاننا، صاف ظاہر کرتا تھا کہ یہ اسپیکٹرم کا ہی نہیں بلکہ اس کے ونگ کے ایک ایسے اہم رکن یا عہدے دار کی حیثیت رکھتا تھا جو بالخصوص میرے اور عابدہ کے خلاف ایک کاز میں مصروفِ عمل تھے۔ یہ سچ تھا کہ میں ہنوز عابدہ سے متعلق تازہ کار حالات وہیت سے واقف نہ تھا اور نہ ہی مجھے ابھی تک آنسہ خالدہ کے سلسلے میں کچھ پتا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔

روڈلف...... مجھے عابدہ سے متعلق کسی تازہ حالات سے ''اَپ ڈیٹ'' کرنا چاہتا تھا تو اس سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر ہو کے سوچتا تو یہ بات واضح ہوتی تھی کہ میں روڈلف کو بہکانے میں کامیاب رہا تھا جس کا ثبوت یہی تھا کہ وہ مجھ سے ایک طرح اپنی جان بچانے کی بھیک مانگ رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''دیکھو روڈلف! عابدہ اور مجھ سے متعلق یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ...... میں اسے امریکن سی آئی اے بالخصوص باسکل ہولارڈ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے ہی امریکا روانگی کے لیے کربستہ ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ اس وقت عابدہ کہاں اور کس حال میں ہے؟ آیا زندہ بھی ہے یا نہیں۔ تم اگر اس سے متعلق مجھے کوئی معلومات بہم پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہو جو سچ بھی ہو اور اس سے میں کوئی فائدہ بھی اُٹھانے کی پوزیشن میں ہوں تو پھر میرا ابھی تم سے یہ وعدہ ہے کہ میں نہ صرف تمہیں کاسپاکو کی سفاکیت سے بچا لوں گا بلکہ...... گوتم بدھ کے اس بیش قیمت مجسمے کے سلسلے میں بھی تم سے ون مین شو پارٹنرشپ کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ میں وہ چوری شدہ مجسمہ سون کی مدد سے بازیاب کروا چکا ہوں۔ وہ اب دوبارہ کاسپاکو کے قبضے میں آ چکا ہے، جسے میں نے مل ٹاپ کے نوکٹ پیلس سے جو وزیر جان کی رہائش گاہ تھی، کے خفیہ تہ خانے سے حاصل کیا ہے۔''

میں نے بھی اپنے تئیں اس کی سماعتوں میں دھماکا کر دیا۔ مگر وہ اس کے لیے زیادہ متاثر کن ثابت نہ ہوا۔

''مجھے تمہاری زیرک دماغی اور شاطر مزاجی کا پہلے سے اندازہ تھا کہ تم سون کو چالاکی سے شیشے میں اُتار لو گے۔''

''بس اب مقصد کی بات کرو، وقت کم ہے۔ تا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے مفادات کے لیے کام کر سکیں۔'' میں نے اس بار ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا تو وہ بولا۔

''حقیقت یہی ہے کہ...... اس میں چیف ماسٹر لولوش کا ہی دخل تھا کہ گوتم بدھ کے مجسمے کو دھوکے سے غصب کیا جائے۔ جوشوا...... اسپیکٹرم کے ''فیلڈ اسکواڈ'' ونگ کا چیف ہے جن کا کام دنیا بھر کے ممالک سے ایسے نوادرات چوری کر کے انہیں مسروقہ قرار دے کر لوٹانا ہے اور اپنی عالمی نیک نامی اور فنڈنگ میں اضافہ کرنا ہے۔ یوں وہ نہ صرف نوادرات کی اصل مالیت سے زیادہ دولت...... عالمی فنڈنگ سے کما لیتا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر ذرا خاموش ہوا اور پھر بولا۔

''اسپیکٹرم کا یہ بھی وتیرہ رہا ہے کہ جہاں اس کے مفادات میں ذرا بھی ضرب پڑتی ہے۔ وہ اپنے کارکنوں اور ایجنٹوں کی زندگیاں بچانے کے بجائے انہیں بھی داؤ پر لگانے سے دریغ نہیں کرتا۔ قربانی کے بکرے عموماً نچلی سطح کے ایجنٹوں کو ہی بنایا جاتا ہے اور اسے خفیہ رکھا جاتا ہے۔ لیکن جو اس سے واقف ہیں وہ اسپیکٹرم سے فرار چاہتے ہوئے بھی نہیں فرار ہو پاتے، انہیں فوراً موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ اس لیے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہارے ساتھ یہ خفیہ سودے بازی کیسے کروں، میرے لیے تو دونوں طرف ہی موت ہے۔''

لباس بے ہودہ اور سستا ہے مگر تم پر بہت جچ رہا ہے

روڈلف کی بات نے میرا دل دھڑکا دیا۔ وہ مکمل طور پر میرے ٹرانس میں آ رہا تھا، میں جس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا، وہ ہو چکی تھی۔ یعنی اس دغابازی کا اصل کل اسپیکٹرم کے فیلڈ اسکواڈ جوشوا کا ہی کھلایا ہوا تھا، چہرہ بے نقاب ہونے کے بعد اُنہوں نے نہ صرف اپنے ساتھی روڈلف کو قربانی کا بکرا بناتے ہوئے یہ کہہ کر اس سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا کہ یہ اس کا اپنا فتورِ نیت تھا۔ بلکہ وہ...... نصف رقم بھی دینے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ یوں کاسپاکو کو وہ اپنے ایک ساتھی کی قربانی دے کر بہ آسانی بے وقوف بنا چکے تھے، لیکن میں ان کی یہ چال سمجھ چکا تھا۔ اسی سبب میں نے روڈلف کی کمزوری سے کھیلتے ہوئے اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش چاہی تھی جو خاصی کامیاب ثابت ہو رہی تھی۔

میں نے روڈلف سے کہا۔ ''دیکھو روڈلف! گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ تم میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو، میں اسپیکٹرم کے بھیجے اُدھیڑ ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔ تم نہیں جانتے شاید کہ اسپیکٹرم کی ایک شاخ جو پاکستان میں ایک پڑوسی دشمن ملک کے دیرینہ مقاصد کے کاز کے لیے کام کر رہی تھی، میں نے اس کا صفایا کر دیا، اسپیکٹرم کے ایک اہم اسٹیشن چیف وزیر جان جو لولوش کا قریبی ساتھی جانا جاتا ہے، اس کا پیچھا کرتا ہوا تھائی لینڈ آن پہنچا اور یہاں اسے عبرت ناک انجام سے دوچار کیا۔ میں تن تنہا اسپیکٹرم جیسی عالمی تنظیم کے خلاف علم بلند کیے ہوئے ہوں۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو میرے پاس اس

تنظیم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے ایک ٹھوس لائحہ عمل تیار ہے۔"

"کیسا لائحہ عمل......؟" وہ ایک دم بولا۔

"وقت آنے پر سب بتا دوں گا۔ لیکن ابھی تمہیں کاسپاکو کے شکنجے سے آزاد کرانا ضروری ہے۔ مجھے پہلے اس سلسلے میں منصوبہ بندی کرنا ہوگی جو میں کرلوں گا۔ تم مجھے عابدہ سے متعلق کچھ بتانے والے تھے؟"

وہ بولا۔ "عابدہ کو کوران کی جیل سے غائب کر دیا گیا ہے۔ وہ اب جے بی سی والوں کے قبضے میں ہے۔"

"کیا......؟" میں اس کے اس انکشاف سے سرتاپا لرز اُٹھا۔

"ہاں! یہ کام ٹائیگر ٹیک کے سی آئی اے چیف باسکل ہولارڈ نے کیا ہے۔"

"مگر کیوں......؟ عابدہ کو جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کے حوالے کیوں کیا ہے؟" میں نے جیسے لرزتے دل سے سوال کیا۔

"اس کا مجھے علم نہیں لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لوگ اسے اپنے کسی خفیہ اور اہم مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔" روڈلف نے جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

"لیکن تمہیں عابدہ کے بارے میں ان باتوں کا علم کیسے ہوا؟ جبکہ تمہارا اس ونگ سے کوئی تعلق ہی نہیں؟"

"بے شک میں فیلڈ اسکواڈ سے متعلق ہوں لیکن مجسمے کے سلسلے میں مجھے بینکاک میں وزیر جان کے قریب رہنے کا موقع ملتا رہا تھا۔ اسے میں نے ماسٹر چیف (لولوش) سے ٹیلی فونک گفتگو کرتے اکثر سنا تھا۔ وہ تمہاری طرف سے ایک بہت بڑی "ٹینشن" رکھے ہوئے تھا اور ماسٹر چیف سے عابدہ کے سلسلے میں یہی کہتا تھا کہ عابدہ اس کے دشمن یعنی تمہاری ایک بڑی کمزوری ہے۔ وہ لاشعوری طور پر تم سے بے حد خوف زدہ رہتا تھا۔ اس سلسلے میں جب ماسٹر چیف نے وزیر جان کو بتایا کہ وہ عابدہ کو مکمل طور پر ٹائیگر ٹیک (باسکل ہولارڈ) کے حوالے کر چکا ہے، لہٰذا اب عابدہ پر ان کا (اسپیکٹرم) کا کوئی تصرف نہیں رہا ہے، تو وزیر جان نے ماسٹر چیف کی اس بات سے سخت اختلاف کیا تھا کہ شکار ہمارا اور اس کا فائدہ دوسرا کیوں اُٹھائے تو مسٹر چیف نے وزیر جان کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسے تم سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نیز ماسٹر چیف نے اب وزیر جان کو تمہارے قتل کا نہیں بلکہ اغوا کا پلان دے رکھا تھا۔ وہ تم سے اڑیسہ کمپنی کے شیئرز اپنے نام لکھوانا چاہتا تھا۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگیا۔

میں ہونٹ بھینچے سوچتا رہا۔ وہ پھر بولا۔ "تمہارے ذہن میں ایسا کیا پلان ہے؟"

"تم بس میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو، باقی مجھ پر چھوڑ دو لیکن جیسا میں کہوں اب ویسا ہی تم کو کرنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں اسے کچھ ضروری ہدایات دینے لگا۔ وہ میرا پلان سن کر ایک دم متحیر سا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر تاثر انگیزی طاری ہوگئی۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا لیکن میری باتیں سننے کے بعد اس میں ایک دم زندہ رہنے کی اُمنگ جاگ پڑی تھی۔ فوراً دل گیر لہجے میں بولا۔

"بائی گاڈ......! میں تمہارا پورا پورا ساتھ دینے کو تیار ہوں مسٹر شہزی! یقین کر دمیرا۔ میں ایک حسین اور نہایت محبت کرنے والی بیوی کا شوہر بھی ہوں اور چھوٹے بچوں کا باپ بھی۔ اپنے مرنے کا مجھے افسوس نہ تھا کیونکہ میں اپنے بیوی بچوں کے لیے بہت کچھ چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن......تمہاری باتوں نے میرے اندر زندہ رہنے کی تمنا جگا دی ہے۔ اپنی بیوی اور بچوں کو دوبارہ دیکھنے کی چاہ نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں تمہارا پورا ساتھ دوں۔ تمہاری پلاننگ سے میں پوری طرح مطمئن ہوں اور اس کی کامیابی کے لیے بھی دعا گو رہوں گا۔"

میں نے مسکرا کر اس کا کاندھا تھپتھپایا۔

میں اسپیکٹرم کی قبر کھودنے اور عابدہ کو بچانے کے لیے اپنی امریکا روانگی کا ایک کامیاب مشن تکمیل تک پہنچانے والا تھا۔ اب بس کاسپاکو کو...... مطمئن کرنا تھا جو میرے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ کیونکہ کاسپاکو جیسے جلاد صفت انسان کو میں اپنی مٹھی میں کر چکا تھا۔

میں مطمئن ہو کر واپس پلٹا اور جیسے ہی دروازے پر پہنچا تو اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ دروازہ ایک دم کھلا تھا۔ سامنے کاسپاکو وہیل چیئر پر بیٹھا نظر آیا اس کے دائیں بائیں دو مستعد ہرکارے بھی کھڑے مجھے گھورتے محسوس ہوئے تھے، جبکہ کاسپاکو کے ہاتھ میں خوفناک نال والا پستول تھا جس کی نال کا رخ میری جانب اُٹھا ہوا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ



لمحۂ آخر

شبنم شفیق

سائنس اور عقل دونوں کا سفر ساتھ چلتا ہے... سائنس داں اپنی عقل کی بدولت ہی نت نئی ایجادات کرتے رہتے ہیں... ان سائنسی ایجادات کا تعلق انسان کے مفاد سے جڑا ہوتا ہے... مگر کچھ منفی رجحان کے مالک ......تخیل پرستوں کے نزدیک ذاتی مفاد زیادہ اہم ہوتا ہے... مجرمانہ ذہنیت کے حامل ایک ایسے ہی شخص کی ذہنی اختراعات کا عملی مظاہرہ...

ایک ہی مشن پر کئی سمتوں سے کام کرنے والوں کی ملی بھگت......

وہ سراپا قیامت تھی تو وہ ایسی قیامت کا قدردان۔ اگرچہ حُسن کی کوئی انتہا نہیں ہوتی لیکن لگ رہا تھا کہ آج حسن بھی اپنی بینائی کھو چکا ہوگا۔ وہ اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اس کی جرأت پر حیران بھی تھا۔ اس کے چار عدد ہٹے کٹے باڈی گارڈز کی موجودگی میں بھی وہ جس طرح اس کے ساتھ لفٹ میں داخل ہوئی تھی،

کوئی اور ہوتا تو ریوالور کی زد پر ہوتا لیکن اس ولایتی بوتل کی دیسی شراب نے اس کا ہاتھ روکنے پر مجبور کر دیا۔ باڈی گارڈز اپنی جگہ ساکت ہو گئے اور سب سے زیادہ حیران کن اور چونکا دینے والی اس کی وہ بات تھی جو اس نے آتے ہی کہی۔

''آئی ایم یور نیو سیکریٹری۔'' شستہ انگریزی میں کہے جانے والے جملے کو وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ اسے فیصلہ سنا رہی ہے یا اطلاع دے رہی ہے۔

''اونہہ......'' اس کی اونہہ قدرے طویل تھی۔

''انکل کی چوائس ہمیشہ سے انوکھی رہی ہے لیکن تمہارا یہ ڈریس؟''

''پوسٹ مارٹم بعد میں...... پہلے لنچ...... کیونکہ بھوک کی صورت میں میری عقل کا خانہ بند ہو جاتا ہے۔''

''لیکن میں تو آدھا گھنٹا پہلے لنچ سے فارغ ہو چکا ہوں۔'' وہ ایک نظر اپنی قیمتی رسٹ واچ پر ڈال کر بولا۔

''تب بھی آپ کو میرے ساتھ بیٹھنا ہوگا، یہ آپ کے انکل کی ہدایات ہیں۔''

''انکل جانتے ہیں کہ ان کی ہدایات کو میں نے کبھی فالو نہیں کیا ہے۔'' وہ یک دم بیزار لہجے میں بولا۔

''یہ آپ کا اور آپ کے انکل کا ذاتی مسئلہ ہے میرا نہیں، مجھے آج لنچ میں ویجی ٹیبل رائس ود چکن منچورین لینا ہے۔'' وہ لفٹ سے باہر آتے ہی تیزی سے ریسٹورنٹ کی جانب بڑھی۔

آج ہوٹل سیون اسٹار کی افتتاحی تقریب میں وہ مہمانِ خصوصی تھا۔ یہ ہوٹل اس کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر تھا۔ اس ہوٹل کی تعمیر و آرائش پچھلے تین سال سے ہو رہی تھی۔ آج وہ ایک خوب صورت سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا اور اسی خوشی میں نئی سیکریٹری کی ناز برداری اٹھانے کو بھی راضی ہو گیا۔

''دراصل میں پچھلے آٹھ ماہ سے اپنے تیار کردہ ڈائٹنگ شیڈول پر سختی سے عمل کر رہی ہوں۔ اس لیے آپ کو کافی زحمت دی۔'' وہ کھانا کھاتے ہوئے مسلسل اس کو اپنی طرف دیکھتا پا کر بولی۔

''زحمت خوب صورت ہو تو رحمت بن جاتی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''آپ کے اپنی سیکریٹریز کے ساتھ افیئرز کے قصوں کو میں سن چکی ہوں لیکن آپ کے افیئرز کی عمر کبھی بھی پانچ چھ ماہ سے تجاوز نہیں ہوئی۔'' وہ اس کی بات کو قطعی نظر انداز کر کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ کر بغیر کسی جھجک کے بولی تو اس کا ایک بلند قہقہہ اسے ڈرا گیا۔

''پلیز اپنے قہقہے کا والیم ذرا کم رکھیے، لوگ سمجھیں گے کہ آپ نیا شکار پھنسا رہے ہیں۔''

''شکاری ایک ہی شکار کو ساری عمر تاشا رہے تو وہ شکاری نہیں رہتا۔'' وہ معنی خیز انداز میں اس کے سراپا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

بلیو ٹائٹ جینز اور اسکائی کلر کی ہلکی سی ایمبرائیڈڈ اسٹائلش سی شارٹ شرٹ میں اس کا فگر پاگل کر دینے کی حد تک دلکش لگ رہا تھا۔

''شکاری کی ایک ہی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنا شکار ہی سمجھتا ہے ہوسکتا ہے کہ شکار ہی اصل شکاری ہو۔'' وہ ایک ادا سے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے اٹھتے ہوئے بولی۔

''یہ ہمارا نصیب ہے کہ آپ جیسے شکاری کے ہاتھوں شکار ہو جائیں۔'' وہ لگاوٹ سے بولا تو اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ لیکن وہ ایک شانِ بے نیازی سے چلتی ہوئی باہر گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

وہ اتنا بے پروا نہیں تھا جتنا خود کو ظاہر کر رہا تھا۔ گھر آتے ہی وہ اپنے اسٹڈی روم میں بند ہو گیا اور انٹرنیٹ پر اپنے انکل گلریز آفندی سے رابطہ کیا۔ جواباً انہوں نے اس نئی سیکریٹری کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔

''اس کا نام لویزا تھا اور اپنی بیوہ ماں کے ساتھ حال ہی میں مری سے یہاں منتقل ہوئی تھی۔ ان کے سرپرست پہلے تو ایک بزنس مین ماموں تھے لیکن پھر ان کے انتقال کے بعد ان کا کوئی والی وارث نہ ہونے کی وجہ سے ساری جائداد کی وارث لویزا کو ٹھہرایا گیا۔ اس نے حال ہی میں انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹر کیا ہے اور اب اپنے بل بوتے پر کچھ کرنا چاہتی ہے۔'' گلریز آفندی سے اس کی ملاقات ایک ریسٹورنٹ میں ہی ہوئی تھی۔ اس کی قابلیت نے انہیں اٹریکٹ کیا تو وہ اسے سیکریٹری کی آفر کر بیٹھے۔

اس نے اگرچہ اس کے لباس پر دوبارہ کچھ نہیں کہا تھا لیکن وہ خود ہی سادہ سے پاکستانی ڈریس میں ملبوس اسے اس کے سارے دن کے شیڈیول کے بارے میں آگاہ کر رہی تھی۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ جب تم اچھی خاصی پراپرٹی کی مالک ہو تو یہ سیکریٹری کی جاب کیوں؟'' وہ اسے اپنی نظروں کے فوکس میں رکھتے ہوئے بولا۔

''پراپرٹی کا مالک ہونا اچھی بات ہے لیکن مجھے اس کے ساتھ کچھ تجربہ چاہیے جو آپ کے ساتھ رہ کر یقیناً اچھا ہوگا۔''

''لیکن تمہیں یہاں پر ایک سے بڑھ کر ایک اچھی پوسٹ مل سکتی ہے پھر میری سیکریٹری ہی کیوں؟''

''انکل کو غالباً آپ بہت تنگ کرتے ہیں، یہ بات انہوں نے مجھ سے شیئر کی تو میں نے ہی ان کو آپ کی سیکریٹری کے لیے کہا تھا۔''

''تم کیا مجھے بدل دو گی؟''

''دعویٰ نہیں لیکن یہ میری اسٹیٹمنٹ ضرور ہے۔''

''مثلاً تم کیا کرو گی مجھے بھی تو پتا چلے۔ کیا تم میری ڈرنک چھڑوا دو گی یا افیئرز یا پھر......''

''میں ایسا کچھ نہیں کروں گی۔ آپ کی ذات پر ضائع کرنے کے لیے میرے پاس ایک سیکنڈ بھی نہیں ہے۔'' وہ بے نیازی سے اپنی نوٹ بک اور پنسل اٹھاتے ہوئے بولی۔

''تو کیا تم اپنی اسٹیٹمنٹ بدل دو گی؟'' وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولا۔ اندر ہی اندر وہ اس بدتمیز کے جواب پر تلملا بھی رہا تھا۔

''ہوسکتا ہے میری اسٹیٹمنٹ بدل جائے اور ہوسکتا ہے کہ آپ......'' وہ اس کی طرف انگلی کرتے ہوئے بڑے تفاخر سے بولی تو وہ ایک استہزائیہ ہنسی ہنس دیا۔

''میں تمہیں اس نوکری سے نکال بھی سکتا ہوں لیکن نکالوں گا نہیں۔ تمہارے بیان کی حقیقت دیکھنا چاہوں گا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ وہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ تھی کہ جگنوؤں کا جمگھٹا لیکن اب وہ اس سے خار کھانے لگا تھا۔

''تم بلا کی خوب صورت ہو لیکن میں تمہیں افیئر چلانے کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔'' وہ توہین آمیز لہجے میں بولا۔

''کل شام کو آپ کی بہن کی شادی میں، میں ضرور آؤں گی اور وہاں سے ہمارا افیئر اسٹارٹ ہوگا سر۔'' وہ لفظ چباتے ہوئے بولی اور ایک جھٹکے سے باہر نکل گئی۔ وہ ایک فضائی مکا لہرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

گلریز آفندی ملک کا نامور سائنس داں تھا۔ حال ہی میں اس نے ایک مشہور اینٹی ائیرکرافٹ میزائل میں جدید تبدیلیوں کے ساتھ ایک نیا ماڈل تیار کیا تھا جس نے سائنس کی دنیا میں تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی مصروفیات اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ ذاتی آرام کے لیے بھی اسے ٹائم نہیں مل رہا تھا۔ اب بھی وہ ایک کانفرنس میں شرکت کے بعد فراغت کے کچھ لمحات اپنی رہائش گاہ میں بنے میوزیم میں گزار رہا تھا۔ جب ملازم نے آ کر لویزا کے آنے کی اطلاع دی۔ کچھ دیر تو وہ اس کی آمد کے بارے میں سوچتا رہا پھر اشارے سے ملازم کو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کو کہا اور خود بھی میوزیم سے باہر نکل آیا۔ وہ اپنا میوزیم بہت کم لوگوں کو دکھاتا تھا۔ دنیا کی نایاب چیزیں اس کے میوزیم میں موجود تھیں۔

اصل میں یہ میوزیم اس کے ذہن کو نت نئی تحریکات بھی مہیا کرتا تھا۔ اس میوزیم میں ہر قسم کے میزائل کا نیا پرانا ماڈل موجود تھا۔ لیکن کچھ نایاب نسلوں کے پرندے بھی ایک بڑے جہازی سائز پنجرے میں موجود تھے۔ ایک طرف سنہرے سرخ رنگ کے پتوں والے درخت بھی تھے جن سے ہر وقت بھینی بھینی سی خوشبو اٹھتی رہتی تھی اور میوزیم کو ایک قسم کی تازگی پہنچاتی تھی۔ اس میوزیم میں ایک چھوٹا سا کمرا ہر وقت بند رہتا تھا۔ اس کمرے میں آج تک اس کے سوا کوئی اور نہ گیا تھا۔ اس ایک کمرے میں کئی دفعہ تو وہ تین دن تک بیٹھا رہتا تھا لیکن اس کے ملازمین بھی نہیں جانتے تھے کہ اس کمرے میں ایسی خاص بات یا چیز کیا تھی کہ وہ جب بھی وہاں جاتا دو تین دن سے پہلے باہر نہیں نکلتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ میوزیم ایک عجیب طرح کا خواب ناک تاثر پیدا کیے رکھتا تھا۔

لویزا کو ڈرائنگ روم میں بیٹھے کچھ ہی وقت گزرا تھا جب گلریز آفندی آ گیا۔ وہ ایک چمکدار چہرے اور پُرتجسس آنکھوں والا ساٹھ کے پیٹے میں داخل ہونے والا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کے سر کے گھنے بال اور کشادہ ماتھا اس کی باوقار پرسنالٹی میں بہت اضافہ کر رہے تھے۔ وہ اس کی آمد پر بے اختیار اٹھ گئی۔

''گڈ آفٹرنون سر۔'' اس کی آواز اس کی طرح دلکش تھی۔

''میں ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا کہ تم یہاں آ سکتی ہو۔'' وہ روکھے سے لہجے میں بولا۔

''آئی تھنک میں غلط ٹائم پر آ گئی ہوں...... میں چلتی ہوں۔'' وہ بوکھلائے سے لہجے میں بولی۔

''اب جبکہ تم آ گئی ہو تو بیٹھو۔'' وہ اس کا ایک تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ اب اس کا لہجہ قدرے خوشگوار تھا۔

”تھینک یو سر۔“ وہ صوفے پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

”عفان کے بارے میں کیا پروگریس ہے؟“

”سر وہ میرے بارے میں کافی الرٹ ہو چکا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ کے آرڈرز اور انسٹرکشنز کو کم ہی اہمیت دیتا ہے۔“

”وہ پہلے ٹھیک تھا لیکن اچانک ہی کسی نے اسے میرے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی سیکریٹریز مجھے اس کے بارے میں مخبری دیتی ہیں۔ اس لیے وہ جلد ہی انہیں فارغ کر دیتا ہے لیکن تم کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ ساری پراپرٹی میری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اپنی بے وقوفیوں کی وجہ سے اسے ضائع کر دے۔“

”جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے آپ کی پراپرٹی روز بروز بڑھ ہی رہی ہے۔ وہ پیسا ضائع کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔“

”ہاں میں جانتا ہوں اس لیے تو اس کو اچھے مشورے دینے کے لیے میں اس کی سیکریٹریز خود سلیکٹ کرتا ہوں اور تم تو میری لاجواب سلیکشن ہو۔“ وہ اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تھینک یو سر۔“ لویزا کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک در آئی۔

”لویزا میں تمہیں اس خاندان کا اہم ممبر بنانا چاہتا ہوں۔“ وہ جتنا اچانک بولا اتنا ہی وہ چونکی۔

”میں سمجھی نہیں سر......“ وہ اچنبھے سے بولی۔

”ویری سمپل، تم جتنا عفان کے قریب آؤ گی اتنا ہی اس خاندان کے......“ اس کا انداز معنی خیز تھا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تمہارے جیسی خوب صورت اور ذہین لڑکی ہی میرے خاندان کی بہو بنے۔“ وہ بلا جھجک بولا تو وہ ایک دم سے بلش ہو گئی۔

☆☆☆

”کچھ پتا چلا یزدانی۔“ عفان اس کے آتے ہی بے تابی سے بولا۔

”کافی حد تک، لیکن اس سارے چکر کے پیچھے جس کا بھی ہاتھ ہے وہ کافی پاورفل ہے۔“ پھرتیلے جسم اور تیز دماغ کا مالک یزدانی عفان کا گہرا دوست ہونے کے ساتھ پولیس میں ڈی ایس پی بھی تھا۔

”وہ اپنی انگلیوں پر زیادہ دیر تک نچا نہیں سکتا۔ یزدانی جتنی جلدی ہو سکے مجھے اس کا سراغ دو۔“ عفان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا تھا۔

”عفان ذرا سوچ کر بتاؤ اب تک تمہاری کتنی سیکریٹریز بدل چکی ہیں۔“

”مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں کیونکہ میں نے کبھی اس طرف غور ہی نہیں کیا لیکن اندازاً......“

”اندازاً نہیں یار، مجھے ایگزیکٹ فگر چاہیے، تم اپنے ریکارڈ سے پتا کراؤ۔“

”اوکے، میں ابھی منیجر سے پتا کرتا ہوں۔“ عفان اپنا آفس فون ڈائل کرتے ہوئے بولا۔

”عبدالوحید صاحب مجھے ابھی دیکھ کر بتائیے کہ ہمارے آفس میں اب تک کتنی سیکریٹریز رہ چکی ہیں۔“ عبدالوحید ان کا پرانا منیجر تھا اس لیے وہ احترام سے ہی مخاطب کرتا تھا۔

”جی سر میں ابھی دیکھتا ہوں۔“

”شام کو شاہانہ کی مہندی بھی ہے، مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا میرے یار، جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم فکر کیوں کرتے ہو۔“ یزدانی بولا تو اسی وقت منیجر نے فون کر کے بتایا کہ کل چھ سیکریٹری رہ چکی ہیں۔

عفان ایک دم سے بھڑک اٹھا۔ ”یہ سب کچھ مجھے یہاں سے ہٹانے کی سازشیں ہیں، کوئی ہے جو نہیں چاہتا کہ میں......“

”پلیز یار کول ڈاؤن! میں سب جانتا ہوں اس لیے تو میں اس کیس کی خود تفتیش کر رہا ہوں کیونکہ مجھے پتا ہے کہ تم اس معاملے میں بے قصور ہو لیکن مجھے بھی اوپر سے سخت آرڈرز ہیں کہ جلد از جلد اصل مجرم تک پہنچوں۔ اگر میں اسے جلد حل نہ کر سکا تو یہ کیس کسی دوسرے کو دے دیا جائے گا۔“ یزدانی فکرمند لہجے میں بولا۔ عفان نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر یکدم مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

”ارے دولہا صاحب اتنی فکریں ٹھیک نہیں جب میں بے قصور ہوں تو مجھے پریشانی بھی نہیں ہے۔ تم بھی ریلیکس ہو جاؤ اور ہاں اس کیس کو کچھ دنوں کے لیے بھول جاؤ، اپنی بہن کو میں آج کے بعد خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ارے ہاں یار، مجھے یاد آیا اماں جی نے کہا تھا کہ جلدی گھر آ جانا کچھ شاپنگ ابھی رہتی ہے۔ شام کو مہندی بھی ہے، اُف اتنے کام۔“ یزدانی ایک دم سے مصروف ترین شخص نظر آنے لگا۔ اس کے جاتے ہی عفان گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

”شاہانہ پُرکشش، نازک اندام اور قدرے طرح دار لڑکی تھی۔ اس کے مختلف شوق تھے اور ہر شوق وہ کچھ عرصے بعد بدل لیتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے وہ شوقیہ ماڈلنگ بھی کرتی رہی تھی۔ وہیں اس کی ملاقات راحیل بٹ سے ہوئی تھی تب وہ پہلی ہی ملاقات میں اس کے سامنے اپنا دل ہار بیٹھی اور جب دل کی بیٹری ڈاؤن ہو جائے تو دماغ کا بلب بھی فیوز ہو جاتا ہے۔ وہ بھی راحیل کی محبت میں ایسی ڈوبی کہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی۔

وہ دن اس کی زندگی کا یادگار دن تھا جب ہوٹل سرینا میں راحیل نے اس کو ایک سرپرائز دینے کے سلسلے میں ڈنر پر انوائٹ کیا اور وہ سرپرائز اس کی برتھ ڈے کو سیلیبریٹ کرنا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ بلیک ساڑی پر سلور کام نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

ڈنر کے بعد راحیل اس کو اپنے فلیٹ پر لے گیا جہاں پر اس نے انواع و اقسام کی ڈرنکس سجائی ہوئی تھیں۔

”شاہانہ تم میرے لیے جتنی خاص ہو اتنا ہی آج تمہارا آنا مجھے مسرت دے رہا ہے۔“ وہ اسے ڈرنک سے بھرا گلاس دیتے ہوئے خمار آلود نظروں سے سر تا پیر دیکھتے ہوئے بولا۔ شاہانہ نے بڑی ادا سے گلاس لے لیا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ ڈرنک اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جس سوسائٹی کی پروردہ تھی وہاں یہ سب کچھ عام تھا۔ ایک کے بعد دوسرا گلاس اس نے تیزی سے پیا کیونکہ وہ خود ہی بہکنا چاہتی تھی اور اگر سامنے راحیل جیسا ہینڈسم آدمی ہو تو بہکنے میں حرج ہی کیا تھا وہ بڑی سہولت سے اس کی ساڑی کھینچ کر اتار رہا تھا۔ ساڑی بھی بڑا پُرفریب لباس ہے، پیاز کی پرتوں کی طرح ایک کے بعد ایک زاویہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ وہ اسے کھولتا جا رہا تھا اور وہ کسی آٹومیٹک لفٹ کی طرح کھلتی جا رہی تھی۔

وہ اس رات جب گھر واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ سب کچھ بہت دلفریب تھا اگر اسی طرح رہتا۔ لیکن اگلے ہی دن جب اسے راحیل بٹ کی طرف سے تحفے میں رات کی ساری کارگزاریوں کی فلم ملی تو وہ سٹپٹا گئی۔ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا تھا۔ اس فلم کے اوپر ایک چٹ تھی جس پر لکھا تھا۔ ”یہ تمہارے حسن کے نام وہ ادنیٰ سا تحفہ ہے جس کی جب تک قیمت دیتی رہو گی یہ پیک ہی رہے گا ورنہ......“

وہ اس واضح دھمکی کو محسوس کر چکی تھی اور اس دن سے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس تحفے کی قیمت دینے پر مجبور ہو گئی تھی مگر یہ سلسلہ تو نہ ختم ہونے والا لگ رہا تھا اور وہ اسے اب کسی بھی قیمت پر بند کرنا چاہ رہی تھی کیونکہ اس کی شادی ڈی ایس پی یزدانی سے طے کر دی گئی تھی۔ اس نے جب اس سلسلے میں راحیل سے بات کی تو اس کا جواب اسے مایوس کر گیا۔

”شاہانہ جتنا پیسا تم مجھے دے رہی ہو، یہ تمہارے لیے ایک حقیری پاکٹ منی کے برابر ہے۔ ساری عمر دیتی رہو گی تو میں بھی مزے سے کھاتا رہوں گا۔ ایک ہی دفعہ دو گی تو تم بھی مشکوک ہو جاؤ گی اور میں بھی سنبھال نہیں سکوں گا۔“

”بے غیرت۔“ غصے سے اس کا چہرہ کھول رہا تھا۔ آج اس کی مہندی تھی اور وہ اپنے ماضی کے اس شرمناک قصے کو شادی سے پہلے ختم کر دینا چاہتی تھی اور اب تو وہ ویسے بھی ایک ڈی ایس پی کی بیوی بننے والی تھی جن کی زندگی شک سے شروع ہو کر یقین میں بدلتی رہتی ہے۔ اس نے دوبارہ اس سے رابطہ کیا۔

”دیکھو تم میرے مشکوک ہونے کو چھوڑو اور اپنی ڈیمانڈ بتاؤ، میں آج اس فلم کی ماسٹر کاپی چاہتی ہوں۔“

”اوکے اگر تم اتنا ہی اصرار کر رہی ہو تو مجھے سات بجے فارسٹ پارک میں ملو اسی کنول جھیل کے پاس جہاں ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ ایسے کاموں کے لیے شام کا وقت مناسب ہوتا ہے جانِ من......“

”رقم بتاؤ۔“ وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔

”صرف دس لاکھ۔“

”یہ بہت زیادہ اماؤنٹ ہے۔ میں......“

”اوکے پھر گڈ بائے......“

”ٹھہرو کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے، میرا مطلب ہے کہ......“

”فارسٹ پارک، دس لاکھ روپیا، ٹائم سات بجے۔“ تیزی سے کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

وہ جانتی تھی کہ اس رقم کے بعد بھی وہ اسے بلیک میل کرنا نہیں چھوڑے گا اس لیے اس نے آج اس کا قصہ تمام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

راحیل بٹ جھیل کے کنارے بڑی بے تابی سے شاہانہ کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی کی ہیڈلائٹس کی روشنی میں اس نے شاہانہ کو اترتے دیکھا، وہ گاڑی بند کیے

بغیر ہی جھیل کی طرف آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا، وہ تیزی سے اس کے سامنے آگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو شک بھری نگاہوں سے دیکھا۔

''یہ لو اپنی رقم اور مجھے فلم دو۔'' وہ بیگ اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں لیکن اس سے پہلے میں تمہیں آخری بار چھونا چاہتا ہوں، تم بڑی یادگار چیز ہو۔'' وہ للچائی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہیں، میں بھی تمہارے جیسے شاندار مرد کو یہ آخری موقع ضرور دوں گی۔'' وہ بناوٹ سے بھرپور انداز میں اس کی طرف بڑھی۔ راحیل بٹ نے اس کے رخسار کا بوسہ لیا اور فلم اس کو دے دی۔

''تمہارا شکریہ۔'' وہ فلم لیتے ہی مڑی اور پھر یک دم دوبارہ گھوم کر اس نے اس پر فائر کر دیا۔ گولی راحیل بٹ کو جیسے ہی لگی وہ چھپاک سے جھیل کے گندے پانی میں گر گیا۔ شاہانہ نے جلدی سے جھک کر راحیل کے ہاتھ سے گرا بیگ اٹھا لیا اور اپنی گاڑی کی طرف تیز قدموں سے چل دی۔ اس کا سانس بے ترتیب انداز سے چل رہا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار پستول پکڑا تھا اور پہلی بار ہی گولی چلائی تھی لیکن بہرکیف وہ ایک قتل کر چکی تھی۔

☆☆☆

لڑکے کی طرف سے مہندی بس آنے ہی والی تھی لیکن لویزا ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی بے چین نظریں وقتاً فوقتاً مہمانوں کو دیکھ رہی تھیں اور پھر بالآخر یزدانی مہندی کا لباس پہنے جب ہال میں پہنچا تو وہ قاتل حسینہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ نہ جانے کتنے اس کے حسن کی تاب نہ لا کر گھائل ہوئے ہوں گے۔ آج بھی وہ ارادۂ قتل سے ہی آئی لگتی تھی۔ اس کا حسن اس قدر پُرشباب تھا کہ عفان کی نظر بار بار بھٹک رہی تھیں۔ یزدانی سے گلے ملتے ہوئے وہ دانستہ اسے اگنور کر رہا تھا۔

''عفان اس سے ملو، میری کزن لویزا۔'' یزدانی، عفان سے اس کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ لویزا معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

''سر مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں یزدانی۔'' وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''سر......'' یزدانی چونک اٹھا اور عفان کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''یہ میرے آفس میں ہوتی ہیں۔''

''سیدھی طرح بتایئے نہ کہ میں آپ کی پرسنل سیکریٹری ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی تو سب چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔ عفان کو عجیب سا لگا۔ یزدانی حیرانی کا اظہار کرنے لگا۔

''ایکچوئلی کچھ دن پہلے ہی انہیں اپائنٹ کیا ہے، تم سے تذکرہ نہیں ہو سکا۔'' عفان اب وہاں مزید ٹھہرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

''ایکسکیوزمی، میں ذرا آنٹی انکل سے مل آؤں۔'' وہ یزدانی کے والدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

''سر، میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔'' وہ اس کے پیچھے ہی لپکی۔

''یہ آفس نہیں ہے۔ تم مجھے عفان کہہ سکتی ہو۔'' وہ اچٹتی نظر اس پر ڈال کر بولا۔ اسی وقت ایک جرنلسٹ ان کے پاس آگیا وہ فنکشن کی کوریج کے لیے آیا تھا۔

''سر، صرف دو سوالوں کا جواب۔'' اس کے ساتھ کیمرامین نے ان کی تصویر لے لی۔ عفان کا یک دم ہی موڈ آف ہو گیا۔

''کیا پوچھنا ہے؟'' وہ اب استفہامیہ انداز میں جرنلسٹ سے بولا تو وہ خواہ مخواہ ہی مسکرا دیا۔

''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی سیکریٹریز کی گمشدگی میں آپ کا ہاتھ ہے، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔'' وہ بولا تو عفان کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا۔

''بکواس ہے سب، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں، وہ سب گم ہونے سے پہلے ہی اپنی جاب چھوڑ چکی تھیں اس کے بعد ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے کیا نہیں میں اس کا جواب دہ نہیں ہوں۔'' اس کے لہجے میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔

''سر، تعلق تو بہت گہرا ہے، گم ہونے والی تمام لڑکیاں آپ کی کمپنی میں آپ کی پرسنل سیکریٹریز رہ چکی ہیں۔'' وہ خباثت سے بولا۔ ''یہ ایک کوانسی ڈینٹ ہے اور کچھ نہیں پھر بھی اس کیس کی انوسٹی گیشن ڈی ایس پی یزدانی خود کر رہا ہے جلد ہی حقیقت سامنے آجائے گی۔''

''ڈی ایس پی صاحب تو آپ کے دوست اور اب عنقریب بہنوئی بننے والے ہیں، وہ آپ کی فیور......''

''میرا خیال ہے آپ کے دو سوال پورے ہو چکے ہیں۔'' عفان دوٹوک آواز میں بولا تو وہ ایک مرتبہ پھر مسکرا دیا۔

''تھینک یو سر۔'' اب وہ لویزا کی طرف متوجہ تھا۔

''میڈم آپ عفان صاحب کی نئی پرسنل سیکریٹری ہیں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔'' لویزا کا چہرہ کھل اٹھا۔

''میں اپنی سیکریٹری کو تمہارے کسی بھی سوال کا پابند نہیں سمجھتا، چلو لویزا۔'' عفان نے ایک دم ہی اس کا بازو کھینچا اور وہ اسے لیے آگے بڑھ گیا۔

''لیوی، یہ آپ کیا کر رہے ہیں، سب ہماری طرف متوجہ ہیں۔''

''باقر کم ہیئر۔'' وہ اس کی بات اَن سنی کر کے اپنے ایک گارڈ کو بلانے لگا۔

''یس سر۔'' سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

''کل مجھے کوئی اخباری رپورٹر نظر نہ آئے، سمجھے۔''

''یس سر۔''

''تمہیں کسی رپورٹر کو بیان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ عام سی بات کو مرچ مصالحے کے ساتھ پبلک میں پیش کرتے ہیں۔ شادی بیاہ کو بھی پریس کانفرنس سمجھنے لگتے ہیں۔''

''ایکسکیوزمی سر، سب ہمیں دیکھ رہے ہیں۔'' وہ منمنائی۔

''تو......؟'' وہ یک دم دہاڑا۔

''تو میرا بازو سر۔'' وہ جلدی سے بولی تو عفان نے خجل ہو کر اس کا بازو چھوڑ دیا۔

''سر کل کا نیوز پیپر ضرور پڑھیے گا۔ آپ کے نئے افیئر کی خبر آئے گی۔'' یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی اور عفان بے اختیار ہی اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

شاہانہ نے جلدی سے سگریٹ کے دو تین لمبے لمبے کش لے کر اسے پھینک دیا۔ یہ اس کی زندگی کا آخری کش تھا۔ اس کے بعد اس نے یزدانی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ اسموکنگ نہیں کرے گی اور اب وہ دانتوں پہ برش سے پیسٹ مل رہی تھی۔ آج اس کی سہاگ رات تھی اور اسے پارلر تیار ہونے کے لیے جانا تھا۔ اس سے پہلے اسے ایک پارسل مل چکا تھا جس میں کل رات کی ساری کارروائی کی فلم موجود تھی اور اس کے ساتھ ہی اسے ایک پیغام ملا تھا کہ وہ راحیل کا کوئی دوست ہے جو ساری کارروائی کی فلم بنا چکا ہے اور اب پھر اس کی بلیک میلنگ شروع ہو چکی تھی۔ یہ سلسلہ تو جیسے شیطان کی آنت کی طرح پھیلتا لگ رہا تھا۔ اس کا دماغ مسلسل اپنے لیے خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ پارلر سے وہ میرج ہال پہنچی۔ نکاح ہوا اور پھر رخصتی کے بعد وہ یزدانی کی خواب گاہ میں پہنچی تو سوچتے سوچتے وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ سب کچھ یزدانی کو بتادے گی اور اس کے بعد وہ پُرسکون ہو گئی۔ اب اسے یزدانی کا انتظار تھا۔

☆☆☆

''سر، فارسٹ جھیل سے ملنے والی لاش راحیل بٹ کی نہیں ہے۔ وہ تو جے نائن سیکٹر میں کچرا پھینکنے والے ایک سوئپر کی لاش ہے۔ وہاں کے ایک مقامی سوئپر نے ہی اسے شناخت کیا ہے اور اس سوئپر کی ڈیتھ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق ساڑھے چھ سے سات بجے کے درمیان ہوئی ہے اور ٹھیک سوا سات بجے راحیل بٹ کو گولی لگی لیکن اس کی لاش کے غائب ہو جانے کا مطلب ہے کہ راحیل بٹ کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی اس میں ملوث ہیں۔'' لویزا نے اپنی بات ختم کی تو یزدانی کسی گہری سوچ سے چونکا۔ وہ لویزا کے پاس آگیا جو فارسٹ پارک میں بننے والی فلم کو مانیٹر اسکرین پر دیکھ رہی تھی۔ راحیل بٹ کے جھیل میں گرنے کے بعد شاہانہ اپنا بیگ اٹھا رہی تھی۔

''اسے ریورس کرو جہاں پر راحیل بٹ کو گولی لگی ہے۔ میں اسے غور سے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اور پھر اسے لینز زوم کر کے دیکھنے پر دونوں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ گولی راحیل بٹ کے کندھے کے اوپر سے نکل رہی تھی۔

''یہ زندہ ہے۔'' لویزا تیزی سے بولی۔

''اونہہ......اس کا مطلب ہے کہ یہ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ سے ہوا، اسے پتا تھا کہ شاہانہ اسے ضرور مارنے کی کوشش کرے گی اور اس نے کی بھی لیکن خوش قسمتی سے یہ بچ گیا۔ اسے اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر تلاش کرو، لویزا یہ بندہ ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔''

''یس سر۔'' لویزا کمپیوٹر آف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جے نائن سیکٹر والے سوئپر پر ایک بندہ لگاؤ تاکہ پتا چلے کہ وہ کس لین کا کچرا اٹھاتا ہے اور کس سلسلے میں اسے مارا گیا ہے۔''

''یس سر۔''

''عفان کی چیکنگ رپورٹ کیا ہے؟'' وہ صوفے کی پشت سے اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''میری رپورٹ کے مطابق کافی عرصے سے وہ بھی وقتاً

نوتنا اپنی سیکریٹریز کی گمشدگی کے چکر میں بلیک میل ہوتا رہا ہے۔"

"کیا......؟" وہ بُری طرح چونکا۔ "لیکن مجھ سے اس نے کبھی ذکر نہیں کیا۔"

"اس کا جواب تو وہی آپ کو دے سکتا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ ایک گہرا شخص ہے۔"

"کیا مطلب......؟"

"سر ساغر ایس ٹی نامی ایک اسمگلر سے اس کا خفیہ رابطہ ہے۔ ان کی آپس میں کچھ ڈیلنگ بھی ہوتی رہتی ہیں اور ذرائع سے پتا چلا کہ وہ بیرونِ ممالک سے کچھ امپورٹ بھی کرواتا ہے۔"

"اور یہ تم مجھے اب بتا رہی ہو۔"

"سر، مجھے بھی کچھ دیر پہلے ہی پتا چلا ہے اس لیے میں نے آپ کو بُلوا لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ساغر کی بھرپور چیکنگ شروع کر دو اور اس کی ایک ایک حرکت پر چیک رکھو۔"

"اوکے سر۔" لویزا مؤدب انداز میں بولی۔

"میں چلتا ہوں، شاہانہ میرا انتظار کر رہی ہو گی لیکن اب مجھے اس لڑکی سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"بیسٹ آف لک سر۔" لویزا کی مسکراہٹ حوصلہ افزا تھی۔

☆☆☆

لگ بھگ رات کے ایک بجے وہ گھر پہنچی تو اس کی ماں گیٹ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"مما آپ کو کتنی مرتبہ کہا ہے کہ یہاں مت کھڑی ہوا کریں۔ شہر میں بڑی وارداتیں ہو رہی ہیں، کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔" وہ انہیں لیے اندر آ گئی۔

"میرے ساتھ اب مزید کیا ہو سکتا ہے بیٹی، تم نہیں ہوتی ہو تو میرا وجود مرنا شروع ہو جاتا ہے، تم جلدی گھر آیا کرو۔"

"مما ایسی نوکری میں دیر سویر ہو جاتی ہے، اچھا ہاؤ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" وہ صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا۔ اس میں شاہانہ کی شادی کے فنکشن کی تصویریں تھیں جو کہ کچھ دیر پہلے ہی اس کے اسسٹنٹ نے ڈیولپ کرا کے بھیجی تھیں۔ کھانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک نظر ان تصویروں کو بھی دیکھ رہی تھی۔

"لویزا پہلے کھانا کھاؤ پھر یہ دیکھنا۔" بیگم ثانیہ اس کے ہاتھ سے تصویریں لیتے ہوئے بولیں۔ تو وہ کندھے اچکا کر کھانا ختم کرنے لگی۔

"تم بہت پیاری لگ رہی ہو اس لڑکے کے ساتھ، کون ہے یہ......" وہ تصویر دیکھتے ہوئے بولیں۔

"یہی تو آج کل میرا باس ہے عفان گردیزی۔"

"کیا تم اسے پسند کرتی ہو؟" وہ اچانک بولیں تو لویزا کا زوردار قہقہہ گونج اٹھا۔

"اوہ مما جانی یہ بس میرا باس ہے اور کچھ نہیں۔"

"لیکن میں چاہوں گی کہ تم اسے کچھ اور بنا لو۔" وہ معنی خیز انداز میں بولیں اور ساتھ ہی تصویریں دیکھتی جا رہی تھیں، ایک تصویر پر اچانک ان کا ہاتھ رک گیا۔

"لویزا یہ...... یہ......" ان کا رنگ تیزی سے متغیر ہو رہا تھا۔ لویزا ان کی بدلتی کیفیت کو دیکھتی جلدی سے ان کی طرف بڑھی، اس وقت تک تصویریں ان کے ہاتھ سے گر کر بکھر چکی تھیں۔ بیگم ثانیہ ایک دم سے اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔ ان کی رنگت سفید شیشے کی طرح ہو چکی تھی۔

"مما آر یو آل رائٹ؟" وہ تیزی سے ان کے پاس آ کر بولی لیکن اس وقت تک انہیں دورہ پڑ چکا تھا اور اب ان کے ہاتھ پاؤں مڑ رہے تھے، وہ تیزی سے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی اور اسپتال سے ایمبولینس منگوائی۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اکثر اس کی ماں کو ایسے دورے پڑتے رہتے تھے۔ ڈاکٹروں کے علاج کے باوجود کہیں کوئی خوفناک گرہ ان کے دماغ کے لاشعور میں پڑ چکی تھی کہ وہ مکمل ٹھیک نہ ہو سکی تھیں۔ لویزا کی آنکھیں ان کی حالت پر آبدیدہ ہو گئیں۔

☆☆☆

ساغر ایس ٹی لگژری شپ کے سن روم میں ایک شارٹ پہنے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں سونے کی موٹی چین تھی جس میں موجود لاکٹ پر اس کا نام کندہ تھا۔ ایک قیمتی سگار اس کے منہ میں تھا اور اس کے پہلو میں ایک اسپینش نژاد لڑکی تقریباً برہنہ حالت میں تھی۔ اس وقت اس کا ایک اسسٹنٹ دستک دے کے اس کے پاس آیا اور اس کا موبائل اسے دیا۔

"سر، عفان صاحب کی کال ہے۔"

"جی عفان صاحب کوئی نیا حکم۔" وہ ایک دم مؤدب ہو گیا۔

"مجھے کچھ کیمیکل گیسز کے سمپل چاہئیں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ہو جائے گا بادشاہو، میرا اکاؤنٹ بھر دیجیے تین

دن کے اندر اندر آپ کا کام ہو جائے گا۔"

"ایک بات اور...... تھوڑا احتیاط سے کام ہو ڈی ایس پی یزدانی آج کل بہت متحرک ہو کر کام کر رہا ہے۔"

"اوئے تسی فکر نہ کرو جی، احتیاط سے ہی تو ہمارا کاروبار چلتا ہے ورنہ اب تک حوالات کی سیر کر رہے ہوتے۔" وہ ایک نظر لڑکی پر ڈال کر ہنستے ہوئے بولا۔

"اوکے گڈ بائے۔" دوسری طرف سے کہہ کر کال منقطع کر دی گئی۔

"الو کا پٹھا، پیسے دیتے ہوئے مرنے لگتا ہے سالا کمینہ......" وہ غصے سے بڑبڑایا اور ایک مرتبہ پھر لڑکی کے ساتھ مگن ہو گیا۔

☆☆☆

بیگم ثانیہ کو ڈرپ لگی ہوئی تھی اور وہ قریب ہی ایک اسٹول پر بیٹھی تھی۔ آج صبح سے ان کی حالت کافی بہتر تھی۔ وہ ایک ٹک انہی کو دیکھ رہی تھی جب یزدانی اور شاہانہ کمرے میں آئے۔

"ہاں لویزا، آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے، ہمیں گھنٹا پہلے ہی تمہارے گھریلو ملازم سے فون پر پتا چلا کہ تم رات سے ان کے ساتھ اسپتال میں ہو۔"

"اب پہلے سے بہتر ہیں۔" وہ شاہانہ سے ملتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا تھا انہیں؟"

"کچھ نہیں، آپ لوگوں کی شادی کی تصویریں ہی دیکھ رہی تھیں کہ ایک تصویر پر نظر پڑی اور ان کی حالت خراب ہو گئی۔"

"تصویر کس کی تھی۔"

"میرے دیکھنے سے پہلے ہی سب تصویریں ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور نیچے گر کر مکس ہو گئیں۔ اب یہ ہوش میں آئیں گی تو پتا چلے گا کہ تصویر کس کی تھی جس کی وجہ سے ان کا ری ایکشن اتنا شدید ہوا ہے۔"

"آج تو آپ کے ولیمے کی دعوت ہے آپ جائیے بس کچھ دیر میں ڈاکٹر انہیں ڈسچارج کر دیں گے تو میں آؤں گی آپ کی طرف۔" وہ بولی تو شاہانہ کے چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکان پھیل گئی، وہ کافی خوش نظر آ رہی تھی۔

"جب تک ان کی طبیعت مکمل ٹھیک نہیں ہوتی تمہارا آنا ضروری نہیں ہے۔"

"اوکے۔" وہ ہلکی سی مسکراہٹ سے بولی اور کچھ دیر بعد وہ چلے گئے۔

"لویزا۔" بیگم ثانیہ کے ہونٹوں سے جیسے ہلکی سی آواز نکلی۔ وہ فوراً ان کے پاس آ گئی۔ وہ آہستگی سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ جیسے جیسے سُن رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت بدلتی جا رہی تھی اور پھر انتہائی نفرت کے تاثرات اس کے چہرے پر پھیل گئے۔

☆☆☆

ہوٹل سیون اسٹار کی شاندار بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی شاہانہ تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھی۔ آج اس نے راحیل بٹ قتل کے سلسلے میں بلیک میلر کو اس کی مطلوبہ رقم دینی تھی۔ وہ یہاں یزدانی کے مشورے پر ہی آئی تھی تاکہ بلیک میلر کا پتا چلایا جا سکے۔ اس کو سیفٹی دینے کے لیے دو محافظ بھی اس پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھے۔

تھرڈ فلور پر لفٹ کے رکتے ہی وہ تیزی سے اپنے مطلوبہ کمرے کی جانب بڑھی۔ ایک راہداری کے ختم ہوتے ہی جیسے ہی وہ مڑی، کسی نے تیزی سے اسے کھینچ کر ایک کمرے میں دھکیلا اور دروازہ بند کر دیا۔

"ہوں، تو تم ڈی ایس پی کی بیوی بن کر آئی ہو لیکن مجھے بھی اپنا کام اچھی طرح کرنا آتا ہے۔" بولنے والے نے منہ پر ماسک چڑھایا ہوا تھا۔ وہ کالی لمبا تڑنگا سا نوجوان لگ رہا تھا۔

"م...... میں نے کیا کیا ہے، میں تو تمہیں پیسے دینے آئی ہوں۔" وہ واقعی خوف زدہ ہو چکی تھی۔ نوجوان کے ہاتھ میں پستول اس کے اوسان خطا کر رہا تھا۔

"بہت معصوم بن رہی ہو، اس معصومیت سے تم نے میرے دوست کا قتل کیا ہے۔" وہ اس کے بال کھینچتے ہوئے اسے دیوار کے ساتھ لگا کر بولا۔

"تمہارا دوست قتل نہیں ہوا ہے، وہ تیزی سے بولی اور پھر ساتھ ہی خاموش ہو کر پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ انجانے میں ہی اس نے راز فاش کر دیا تھا۔

"اچھا تو تمہیں پتا چل چکا ہے۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

"نن...... نہیں، مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولی لیکن اچانک ہی اس نے اس کے سر پر پستول کا دستہ دے مارا، درد کی ایک لہر اٹھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

☆☆☆

عفان اپنے آفس میں بیٹھا ایک فائل چیک کر رہا تھا جب زور سے دروازہ کھلا اور یزدانی غصے سے سرخ چہرہ لیے

اندر داخل ہوا۔
”عفان میں تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں۔“
”لیکن کیوں، میرا جرم کیا ہے؟“ عفان حیرانی سے بولا۔
”تمہارا جرم ایک نہیں ہے کئی ہیں۔ سب تھانے جاکر پتا چلے گا، خاموشی سے میرے ساتھ چلو، میں نہیں چاہتا تمہیں تمہارے آفس میں ورکرز کے سامنے بے عزت کروں۔“
”لیکن کیوں، تم اس طرح میرے ساتھ پیش نہیں آسکتے، میری گرفتاری کے وارنٹ ہیں تمہارے پاس؟“
”وارنٹ لے کر ہی آیا ہوں۔“ یزدانی کا چہرہ یک دم جذبات سے عاری ہو چکا تھا۔ عفان نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ تھانے پہنچتے ہی سب انسپکٹر نے اسے بتایا کہ شاہانہ کو اغوا کیا جا چکا ہے۔ وہ یک دم سے غضب ناک ہوگیا۔
”تو تم اپنی بہن کو اغوا کرنے والی گھٹیا حرکت بھی کر سکتے ہو۔ بتاؤ شاہانہ کہاں ہے؟“ یزدانی اپنے مخصوص اسٹائل سے دہاڑا۔
”یزدانی سکون سے یہاں بیٹھو اور مجھے تفصیل سے سب کچھ بتاؤ، شاہانہ کا اغوا کیسے ہوا؟ کس نے کیا، میں کچھ نہیں جانتا بلیوی میرے یار۔“
”شٹ اَپ یو ربادتھ، تم جانتے ہو سب کچھ۔ میں تم سے ایک ایک جرم اگلوا کر رہوں گا۔ پہلے مجھے شاہانہ کا پتا بتاؤ۔“ یزدانی کے تیور ہی آج بدلے ہوئے لگ رہے تھے۔
”شاہانہ میری بہن ہے میں اسے اغوا نہیں کروا سکتا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، تم کیا کہہ رہے ہو؟“ عفان پریشان لہجے میں تقریباً چیختے ہوئے بولا۔
”مجھے پتا تھا تم ایسے نہیں مانو گے لیکن آج تمہیں اعتراف کرنا ہی ہوگا، تمہارے پاس ایک گھنٹے کا وقت ہے اچھی طرح سوچ لو۔ تم مجھے بہت عزیز ہو لیکن میرا فرض مجھے زیادہ عزیز ہے۔“
”خاور ان کا اچھی طرح خیال رکھنا، میں گھنٹے تک آتا ہوں۔“ وہ مڑ کر سب انسپکٹر خاور سے بولا۔
”یزدانی میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
”جب تک شاہانہ مل نہیں جاتی تم کہیں نہیں جاسکتے۔“
”اور تم بھی میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے جب تمہارے پاس ثبوت ہی نہیں ہے تو......“
”میں تمہارے پاس ایک گھنٹے تک آتا ہوں پھر تمہیں تمہارے جرموں کی تفصیل بتاؤں گا۔“ وہ اس کی بات ان سنی کرتا میز سے اپنا موبائل اٹھا کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

ٹارچ سیل میں برقی چیئر کی پٹیوں میں جکڑے راحیل بٹ کا چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس کو بار بار بجلی کے جھٹکے لگائے جا رہے تھے، کچھ ہی دیر میں اس کا ضبط جواب دے گیا۔
”فار گاڈ سیک بند کر دو یہ سب کچھ، میں بتاتا ہوں۔“
وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگا تو اسی وقت لویزا نے جو دوسرے کمرے میں دیوار گیر کی بڑی اسکرین پر دیکھ رہی تھی اٹھ کر برقی بٹن آف کر دیا۔
”جب تک صحیح جواب دیتے رہو گے برقی جھٹکوں سے محفوظ رہو گے ورنہ......“
”میں بتاتا ہوں۔“
”یہ سب کچھ عفان صاحب کے کہنے پر ہوتا رہا ہے۔“ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔
”لیکن شاہانہ تو عفان کی سسٹر ہے پھر یہ سب کیوں؟“
”عفان کے والد اپنی ساری پراپرٹی شاہانہ کے نام کر گئے تھے۔ عفان کو پھوٹی کوڑی تک نہیں ملی تھی۔ اس کے انکل گریز آفندی نے اس کو اپنی پراپرٹی سے بزنس شروع کروایا تھا لیکن شاہانہ جب اپنی عیاشیوں میں پیسا تباہ کرنے لگی تو عفان نے اس سے پیسے ہتھیانے کا طریقہ ڈھونڈ لیا۔“
”لیکن پیسوں کے لیے کوئی اپنی بہن کی عزت سے نہیں کھیلتا۔“
وہ الجھے لہجے میں بولی تو راحیل بٹ کے نیم مردہ چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
”شاہانہ اس کی سگی بہن نہیں ہے۔“
”اوہ......“ سارا معاملہ جیسے کھل کر سامنے آگیا۔ ”تو پھر وہ کون ہے؟“
”وہ اس کے والد کی دوسری بیوی کی اولاد ہے جس سے انہوں نے چھپ کر شادی کی تھی۔ عفان ان سب سے خوش نہیں تھا۔ ان کے آپس میں جھگڑے رہتے تھے جس سے تنگ آکر کمال آفندی اپنی ساری پراپرٹی شاہانہ کے نام کر گئے۔“

”عفان کی سیکریٹریز کے متعلق کیا جانتے ہو؟“
”مجھے براہ راست تو کچھ معلوم نہیں کیونکہ لڑکیوں کے اغوا وغیرہ کا سارا کام مجید سے کرواتا ہے۔ مجید سے میری کچھ یاری بھی ہے وہ پہلے میرے محلے میں ہی رہا کرتا تھا پھر......“
”کام کی بات بتاؤ۔“ وہ غصے سے بولی۔
”مجیدے نے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ زبردستی اپنی سیکریٹریز کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرتا ہے پھر ان کو اغوا کروا لیتا ہے۔“
”وہ ایسا کیوں کرتا ہے اور لڑکیاں کہاں ہیں؟“ وہ تیز لہجے میں بولی، اس کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔
”جی یہ تو مجھے معلوم ہے نہ مجیدے کو۔“
”بکواس بند کرو، سیدھی طرح سے بتاؤ لڑکیاں کہاں ہیں۔“
”جی میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں۔“ وہ گھگیاتے ہوئے بولا۔
”مجید ان لڑکیوں کو اغوا کر کے کہاں لے جاتا ہے یا کہاں پہنچاتا ہے۔“
”جے نائن سیکٹر کی اسٹریٹ ففٹی ایٹ میں ایک خالی کوٹھی ہے جی، وہ بس ان کو وہاں پہنچا آتا ہے اس کے بعد پتا نہیں کب وہ لڑکیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ ہم دونوں نے کئی مرتبہ چیک بھی کیا ہے لیکن شاید بعد میں انہیں وہاں سے کہیں اور شفٹ کر دیا جاتا ہے۔“
”ساغر ایس پی سے اس کا کیا تعلق ہے، وہ اس سے کیا امپورٹ کرواتا تھا؟“ وہ بولی تو وہ حیرانی سے اوپر دیکھنے لگا۔
”جی، وہ تو بڑا خطرناک اسمگلر ہے، مجھے نہیں پتا عفان صاحب اس سے کیا منگواتے ہیں۔“ وہ مارے خوف کے کانپنے لگا۔ لویزا نے اٹھ کر اسکرین آف کر دی۔
”سر یہ اور کچھ نہیں جانتا، میرے خیال میں ہمیں مجیدے کو تلاش کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے کوئی کلیو مل جائے۔“ وہ اے ایس پی کامران حمید سے بولی جس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔
”تمہیں یاد ہے لویزا، وہ سوئپر بھی ففٹی ایٹ کا ہی کچرا اٹھاتا تھا۔“
”سر، ایک منٹ۔“ لویزا نے دوبارہ اسکرین اور مائیک آن کیا۔ راحیل بٹ کے جھکے سر پر جب لائٹ پڑی تو وہ اوپر دیکھنے لگا۔ ”فارسٹ جمیل میں ففٹی ایٹ اسٹریٹ میں کچرا اٹھانے والے سوئپر کو تم نے قتل کیا تھا۔“
”میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا، میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ خوف سے لرزتے ہوئے بولا۔
”سوئپر کا قتل اسی دن ساڑھے چھ سے سات بجے کے درمیان ہوا، اس وقت تم ہی وہاں تھے اگر قتل تم نے نہیں کیا تو کس نے کیا ہے؟“
”م...... میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تو وہاں سات بجنے سے کوئی پانچ سات منٹ پہلے پہنچا تھا۔“
”لیکن جو مووی شاہانہ کو بھیجی گئی وہ کس نے بنائی تھی۔“
”وہ تو مجیدے نے......“ یک دم جیسے اسے یاد آگیا۔
”ہاں، اس دن مجیدے نے وہاں ساڑھے چھ بجے پہنچ کر مووی کے لیے مناسب جگہ دیکھی تھی تاکہ شاہانہ کو بعد

نادیدہ مددگار

امریکا کے دیہات کا ایک کسان خاندان ایک رات کو اپنے گاؤں میں سو رہا تھا۔ گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر کچھ وحشی قبائلیوں نے اس گاؤں پر ڈاکا ڈالنے کا پروگرام بنا رکھا تھا جس کی اطلاع گاؤں کے کسی فرد کو نہ تھی کچھ دیر بعد اچانک اس کسان کی بیوی کا کاندھا پکڑ کر کسی نے زور زور سے ہلایا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی اس نے سوچا کوئی پڑوسن اسے جگانے آئی ہے لیکن تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں، کسی متنفس کا گزر اس کمرے میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر پڑوسن آئی تھی تو پھر غائب کہاں ہوگئی؟ کسان کی بیوی حیرت زدہ سی رہ گئی۔ اس نے سوچا شاید کوئی خواب تھا، لیکن سارے مکان میں گھوم پھر کر اس بات کا اطمینان کر لیا کہ گھر میں کوئی اجنبی تو نہیں گھس آیا تھا مطمئن ہو جانے کے بعد اس نے کھڑکی کھول کر یوں ہی بلا مقصد باہر کی طرف جھانکا تو اسے دور فاصلے پر شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آئے۔ اس نے فوراً پہلے شوہر اور خاندان کے دیگر افراد کو جھنجوڑ کر جگایا نہ ہوتا تو اگلے نصف گھنٹے میں ان وحشیوں نے سارا مال اور اسباب لوٹ لینے کے بعد انہیں قتل کر دیا ہوتا۔

مرسلہ: ظفر سعید، فیصل آباد

میں بھی بلیک میل کیا جا سکے۔" وہ بولا۔ تو لویزا اس سے مجیدے کا پتا پوچھنے لگی اس کے بعد اسکرین آف کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سر! میرے خیال میں مجیدے کو تلاش کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ساغر ایس پی کے بارے میں رپورٹ ملی ہے کہ وہ آج کسی وقت پاکستان آئے گا، اسے بھی گرفتار کرنے کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔"

"مس لویزا، آپ یہاں سے کچھ نفری لے کر مجیدے کی تلاش شروع کر دیں اور میرے خیال میں ہمارا کیس تقریباً حل ہو چکا ہے۔"

"یس سر۔" وہ پُرامید لہجے میں بولی۔

☆☆☆

شاہانہ کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو مکمل تاریکی میں پایا، کچھ لمحے تو اسے بالکل سمجھ نہ آیا کہ وہ کہاں ہے پھر جب اس کے حواس تھوڑے نارمل ہوئے تو اسے یاد آیا کہ وہ کیسے یہاں تک پہنچی تھی۔ یزدانی نے اسے ہوٹل سیون اسٹار بھیجا تھا تاکہ بلیک میلر کو گرفتار کیا جا سکے لیکن بلیک میلر کافی چالاک ثابت ہوا اور نتیجے میں وہ یہاں تھی۔ اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہاں مکمل تاریکی تھی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ تھوڑا کسمسائی تو احساس ہوا کہ وہ بندھی ہوئی نہیں ہے۔ اس خیال سے مسرت ہوئی، وہ اٹھ بیٹھی، اس نے اندھیرے میں ہی ہاتھ پھیلا کر اپنے گرد و نواح کا جائزہ لیا۔ اس کا ہاتھ واپسی پر ایک دبیز سی چیز سے ٹکرایا اس نے ٹٹولا تو وہ کسی صوفے کا سائڈ کونا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھی اور صوفے پر ہاتھ رکھ کے آگے بڑھنے لگی۔ یہ تھری سیٹر صوفہ تھا اس کے خاتمے پر شیشے کا ٹیبل تھا اس پر ایک گلدان اور ایک ایش ٹرے پڑی تھی۔ وہ اندھوں کی طرح ہاتھ پھیر رہی تھی۔ آگے پھر ایک صوفہ تھا یہ غالباً ڈرائنگ روم تھا۔ آگے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کا ہاتھ جیسے ہی دیوار پر پڑا، وہ اس کمرے کا دروازہ تلاش کرنے لگی۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ دروازہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ اسے یہاں قید کرنے والوں نے شاید دروازہ صرف بھیڑنے پر اکتفا ہی کیا تھا۔ وہ جلدی سے باہر نکلی لیکن ہر طرف تاریکی کا ہی راج تھا۔ وہ اس تاریکی سے اکتاہٹ کے باوجود آگے بڑھتی رہی، چلتے چلتے ایک دم ہی اس کا پیر ایک ٹھوس شے سے ٹکرایا۔ وہ لڑکھڑا گئی اور اچانک ہی گرنے سے بچنے کے لیے آگے ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ ایک کھردری سی جگہ سے آلگا۔ اس نے ٹٹول کر جائزہ لیا تو یہ ایک درخت تھا اس کی شاخیں بھی اسے اپنے وجود سے لگتی محسوس ہوئیں۔ "تو کیا میں کسی کھلی جگہ آ چکی ہوں۔" اس نے ایک لمحے کو سوچا۔

خوف کی ایک شدید لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹی اور پورے زور سے کسی سخت چیز سے لگی، اسی وقت جیسے بجلی چمکی۔ روشنی میں اسے اپنے اردگرد عجیب و غریب ہیولے نظر آئے۔ کوئی ہیولا بڑا تھا تو کوئی چھوٹا۔ اسے لگا وہ ایک قبرستان میں ہے، مارے دہشت کے وہ اپنی جگہ ٹھہر گئی۔ اسی وقت کچھ پرندوں کے پھڑپھڑانے کی آواز آئی جو اس تاریکی اور سناٹے میں اور دہشت ناک لگ رہی تھی۔ اس نے جیسے اپنے اندر ہمت پیدا کی اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ وہ اس جنگل سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ چلنے کے دوران بھی وقتاً فوقتاً بجلی چمکتی رہی اور پھر وہ ایک دروازے سے آٹکرائی۔

"جنگل میں دروازہ۔" وہ ٹھٹک گئی لیکن پھر جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی اسے لگا جیسے وہ ایک قبر میں گھس گئی ہو۔ ہر طرف جیسے تازہ مردے منہ پھاڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ کانپ کر دروازے سے لگ گئی۔ لمحاتی روشنی پھر جاگی، ایک جھلسے ہوئے جسم اور بکھرے بالوں والی ڈائن ٹائپ عورت ہل ہل کر اسے بُلانے لگی۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ مارے خوف کے جیسے اس کی زبان گنگ ہو گئی ہو۔ اسی وقت اسپرنگ پر جھولتی دوسری کٹی پھٹی عورت اس پر جیسے گرنے کو بے قرار تھی۔ ایک اور مردے کا گلا کٹا ہوا تھا اور اس سے جیسے خون نکل کر سارے جسم کو بھگو رہا تھا۔ یہ اور اسی طرح دوسرے کتنے ہی اور مردے جیسے اپنی قبروں سے نکل کر اسے دبوچنے کو بھاگنے لگے۔ وہ بے اختیار چیخی اور ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے دیوانہ وار بھاگنے لگی۔ اسی وقت یک دم سارا منظر روشن ہو گیا۔

☆☆☆

ان دونوں کے قہقہوں سے سارا کمرا گونج اٹھا۔

"آئی ایم پراؤڈ آف یو یزدانی، یہ سب تمہاری وجہ سے ہی ممکن ہوا۔" گلریز آفندی ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے بولے۔

"ڈزن میٹر ہاؤ از مائی سو کالڈ وائف۔" وہ استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ بھی ادھر ہی ہے سٹنگ روم میں، میں نے اسے خوف زدہ کرنے کا پورا پلان بنا لیا ہے۔"

"کیا وہ واقعی اپنی پراپرٹی ہمارے نام کر دے

گی۔"

"شیور...... وہ اندھیرے سے بہت ڈرتی ہے۔ میں نے وہاں روشنی کا خاص میکنزم سیٹ کیا ہوا ہے بس آج کی رات اور اگلی دو راتیں مجھے مزید کسی کا محتاج نہیں رہنے دیں گی۔ میں آزاد ہو جاؤں گا، مجھے کسی عفان کی شاہانہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔" گلریز آفندی پُرمسرت لہجے میں بولا۔

"وہ مجھے پیسے پیسے کا محتاج رکھتا تھا۔ پھنسا دیا احمق کو ہمیشہ کے لیے، نہ وہ لڑکیوں کے بارے میں کچھ جانتا ہے اور نہ کسی کو بتانے کے قابل رہے گا۔ پھانسی تو ضرور ہو گی، کیوں یزدانی؟"

"بالکل جناب لیکن میرا حصہ کھرا ہونا چاہیے یونہی تو اس راحیل بٹ کی معشوقہ سے شادی نہیں کی میں نے۔" یزدانی خباثت سے مسکرا دیا۔

"گلریز آفندی کا وعدہ ریت کی دیوار نہیں جو ڈھے جائے، آج رات میرے کچھ غیر ملکی مہمانوں کو میرے میوزیم کی سیر کرنی ہے۔ میں انہیں اپنے سیمپلز سیل کروں گا پھر مجھے یہ ملک چھوڑنے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔" گلریز آفندی رعونت بھرے انداز میں بولا۔

"آپ کے سیمپلز کی تفصیل پوچھ سکتا ہوں سر؟"

"یہاں اس پسماندہ ملک میں میرے جیسے دماغ کی ضرورت نہیں ہے یزدانی، بہت چھوٹا سائز ہے یہاں پر بسنے والی تیسرے درجے کی مخلوق کا۔" وہ ہاتھ کے اشارے سے چھوٹائی واضح کرتے ہوئے بولا۔ "یہ کوئی زعم نہیں حقیقت ہے یزدانی، بتیس سال ہو گئے مجھے یہاں اپنا آپ ضائع کرتے ہوئے۔ میں نے اس ملک کو بہت کچھ دیا لیکن بہرحال جس مقام کا میں حق دار تھا وہ نہیں ملا۔ اب میں بھی اس ملک کو وہ نہیں دوں گا جو شاید اس کی تقدیر بدل دے۔" وہ کچھ ثانیے کو بالکل خاموش ہو گیا۔

یزدانی بڑی اکتاہٹ سے اسے سُن رہا تھا۔ ہر بڑے اور نامور شخص کا یہاں یہی رونا رہا ہے کہ اسے وہ مقام نہیں ملا جس کا وہ متمنی تھا۔ ارے بھئی دوسروں کی تقدیر بدلنے والے کو یہ لوگ پھولوں کے ہار تھوڑا ہی پہنائیں گے۔ وہ اس معاملے میں بڑا خوش قسمت تھا اس نے اسی ملک میں رہتے ہوئے سب کچھ جس کا وہ خواہش مند تھا حاصل کر لیا تھا اس لیے وہ اپنی بیزاری کو چھپا بھی نہیں رہا تھا لیکن بہرحال اسے آفندی کی تقدیر بدلنے والی بات چونکا گئی تھی۔ اب کے وہ کافی پُرسوز لہجے میں بول رہا تھا۔

"سر، واقعی یہ ملک آپ جیسے مایۂ ناز لوگوں کی آماجگاہ کیسے بن سکتا ہے۔ آپ تو اس پرندے کی طرح ہیں کہ جس کے سر پر وہ بیٹھ جائے تخت تختہ سب کچھ اسی کا ہو جائے۔ یو آر ریئلی سپر جینئس سر۔" اس کی تعریف پر گلریز آفندی کے ماتھے کی لکیروں میں کافی بہتری آئی۔

"ساغر ایس پی کی گرفتاری اور عفان کے جیل جانے کے بعد آپ ہر گرفت سے آزاد ہو گئے ہیں۔ آپ کے جے ٹائن سیکٹر والی کوٹھی کے سویپر کے قتل کا معاملہ بھی میں دبا چکا ہوں۔ کوئی اور خدمت۔"

"گڈ! ایکچوئیلی وہ سویپر کافی کچھ جان چکا تھا اور مجھے دھمکی بھی دی تھی بس میں نے مجیدے سے کہہ کر اسے ٹھکانے لگوا دیا۔ اب ایک آخری کام کر دو۔"

"کیا......؟"

"مجھے میرا آخری سیمپل چاہیے۔"

"میں سمجھا نہیں سر۔" یزدانی بے تحاشا چونکتے ہوئے بولا۔

"لویزا...... مجھے وہ حسین چہرہ چاہیے۔ میں اسے تاحیات زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔" گلریز آفندی کے چہرے پر بڑی مقناطیسی چمک ابھری۔

"سر وہ بڑی ٹیڑھی قسم کی چیز ہے۔ معاف کیجیے گا آپ کو کس مقصد کے لیے درکار ہے وہ؟"

"وہ میری ڈرائنگ کا آخری ٹچ ہے۔ مجھے ہر قیمت پر وہ لڑکی چاہیے۔"

"بہتر جناب، اب مجھے اجازت دیجیے، لویزا میرا انتظار کر رہی ہو گی۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ اسی وقت تالی کی آواز پر دونوں چونک اٹھے۔ بیرونی دروازے سے اندر آتی لویزا کی شعلے برساتی آنکھیں ان دونوں پر مرکوز تھیں۔ ان دونوں کے چہرے فق ہو گئے۔

"ویل ڈن...... ڈی ایس پی یزدانی، تمہارا مکروہ چہرہ بے نقاب کرنے کے لیے پچھلے گیارہ ماہ سے میں مسلسل جدوجہد کر رہی تھی، آج اس کا ڈراپ سین ہو گیا ہے۔ تمہاری ہر بات ریکارڈ ہو چکی ہے۔" وہ ریکارڈر لہراتے ہوئے بولی۔

اور گلریز آفندی...... تم سے تو میرا حساب ہی بڑا پرانا ہے۔ میں واقعی تمہاری ڈرائنگ کا آخری ٹچ ہوں......"

"بس بہت ہو چکا، اب یہ ریکارڈر میرے حوالے کر دو۔" یزدانی نے پستول اس پر تان کے کہا۔

"میں اتنی آسانی سے سرنڈر کرنے والوں میں سے

نہیں ہوں ڈی ایس پی یزدانی......" وہ نڈر لہجے میں اپنے پیر پیچھے کو ہٹتے ہوئے بولی تو یزدانی نے فائر کر دیا۔ وہ جھکائی دے کر خود کو بچا گئی۔ یزدانی نے بوکھلاتے ہوئے تین چار فائر اور کیے لیکن وہ الٹی قلابازیاں کھاتی دروازے سے باہر نکل بھاگی۔

"سر میں اسے دیکھتا ہوں لیکن آپ شاہانہ کو یہاں سے نکال لیجیے۔" یزدانی تیزی سے بولتا باہر کی طرف بھاگا۔

☆☆☆

"للی کہاں ہو تم......؟" وہ اسے پیار سے للی کہتا تھا۔ وہ جیسے ہی روشنی میں آئی ٹھٹک گئی۔ اس کے اردگرد چار دیواری تھی۔ وہ پہچان چکی تھی کہ یہ اس کے انکل گلریز آفندی کا میوزیم تھا جسے وہ قبرستان سمجھی تھی۔ گلریز آفندی سے چھپ چھپا کے وہ یہاں آئی رہتی تھی۔ وہ ہیولے مختلف قسموں اور سائز کے میزائل کے نمونے تھے وہی وحشت ناک درخت اور عجیب و غریب پرندے اپنی چونچیں لڑا رہے تھے اور جنہیں وہ قبر سے نکلے مردے سمجھ رہی تھی وہ زندہ لڑکیوں کے مجسمے تھے جو غالباً اس کے انکل کی درندگی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ وہ غالباً ان لڑکیوں کو اپنے تجربوں میں استعمال کرتا رہا تھا۔ ان میں سے صرف ایک لڑکی کا چہرہ قابلِ شناخت بچا تھا جو سبیحہ تھی۔ کچھ عرصے قبل اس کے بھائی کی سیکریٹری رہ چکی تھی اس بے چاری کا پورا جسم تابکاری کی نذر ہو چکا تھا۔ اسے ان سب کو دیکھ کر ابکائی آنا شروع ہو گئی۔

"تو کیا انکل ان سب کو اغوا کرتے رہے اور بھائی ناحق......"

"اف للی جاناں کہاں ہو تم، اب میرے سامنے آجاؤ۔"

آواز قریب آتی جا رہی تھی اور وہ اس آواز کو لاکھوں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی تھی، یہ گلریز آفندی تھا۔ وہ تیزی سے آگے کو بڑھی یہ غالباً انکل کی لیبارٹری تھی وہ یہاں کبھی نہیں آئی تھی۔ یہاں پر بڑے بڑے کیسز تھے اور مختلف قسم کی جدید مشینری رکھی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے ایک بڑی مشین کے پیچھے چھپ گئی اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور دل خوف سے کانپ رہا تھا اس کا انکل اسے ڈھونڈتا ہوا یہیں آ رہا تھا۔

"دیکھو للی مجھ سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، میں تمہیں بہت اچھی حالت میں رکھوں گا میرے سامنے آؤ۔" وہ اب شاید مجسموں والے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ شاہانہ کا مارے خوف کے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے اپنے انکل کی شکل میں ایک ڈریکولا تیزی سے اپنی طرف بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔

"ان خوب صورت مجسموں کو دیکھو گی نہیں کہ میں نے انہیں کیسے امر کر دیا۔ یہ اب کروڑوں میں بکیں گے لیکن میں تمہیں نہیں بیچوں گا تمہیں تو میں اپنے پاس رکھوں گا۔ بہرحال تم تو میرے بھائی کی نشانی ہو۔"

شاہانہ کے پورے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تو کیا انکل مجھے بھی کسی تجربے کی نذر کرنے والے ہیں۔ اس نے تیزی سے کسی ہتھیار کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

"یہ سب بھی اسی طرح چھپتی رہی تھیں۔ بلی چوہے کے کھیل میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ بلی ہمیشہ سپر پاور رہتی ہے ایک چوہے کے لیے...... جیسے اس تھرڈ ورلڈ ملک کو امریکا بلی بن کر نچاتا ہے ایسے ہی...... تم میری بات سمجھ رہی ہو نہ مگر تم ہو کہاں، دیکھو آج میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا۔ تم آرام سے اس کیبن میں آجاؤ میں تمہیں ان سب سے کم تکلیف دوں گا۔" گلریز آفندی کے لہجے کی خوش مزاجی ایک دم کرخت ہونے لگی۔ وہ ایک لمبا سا لوہے کا راڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

"اور ہاں اس کیبن میں جانے سے پہلے تم ان پیپرز پر سائن بھی کر دو تاکہ تمہاری پراپرٹی یزدانی کے نام ہو سکے۔ بہت اچھا بچہ ہے۔ میرے لیے اس نے بہت تعاون کیا ہے، آخر جاتے جاتے اسے کچھ ملنا ضرور چاہیے۔" اس کے لہجے کی خباثت نے شاہانہ کو مزید لرزا دیا۔ اوپر سے یزدانی کے بکنے والے انکشاف پر وہ جیسے ٹوٹ گئی۔ ابھی تک اسے حوصلہ تھا کہ وہ ایک ڈی ایس پی کی بیوی ہے۔ وہ ضرور اس کی بازیابی کے لیے کچھ کر رہا ہوگا لیکن اب وہ جیسے ہمت ہار گئی۔

میں جان چکا ہوں کہ تم یہاں ہو، آرام سے باہر آجاؤ، ورنہ میں بے ہوشی کی گیس پھینک کر بھی تمہیں حاصل کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔" وہ بولا تو وہ ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی جب مرنا ہی ہے تو مقابلہ کرنا چاہیے۔

"گڈ، تم شروع سے ہی اچھی رہی ہو لیکن تمہارا باپ چپکے سے اپنی پراپرٹی تمہارے نام نہ کرتا تو مجھے اتنے پاپڑ نہ بیلنے پڑتے۔ بہرکیف عفان جیل جا چکا ہے اسے کم از کم پھانسی کی سزا ضرور ہو گی۔ یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں

تاکہ تم سکون سے مرو۔ ناؤ کم ہیئر۔'' وہ آہستگی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بھی گولائی میں سرکتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔

''مجھے صرف ایک بات کا جواب دیجیے انکل، آپ نے یہ سب کچھ کیوں کیا۔ ان بے قصور لڑکیوں کو اپنی درندگی کی بھینٹ کیوں چڑھایا؟'' وہ قدرے دلیری سے بولی تو وہ قہقہے لگانے لگا۔

''یہ سب میرے پچھلے تیس سالوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ میں سپر پاورز کو اپنی حیران کن ایجاد بیچوں گا۔ یہ سب لڑکیاں میرے تجربات کی بنیاد فراہم کرتی رہی ہیں۔ میں اب ایک ایسا اینٹی ائرکرافٹ میزائل سامنے لا رہا ہوں جس کے مہلک اثرات انسانی جسم پر اثرانداز نہ ہوں۔ یہ جو لڑکیاں نظر آ رہی ہیں، ان پر میں نے تابکاری، نیوکلیئر، کیمیکل، کیسی اثرات کا تجربہ کیا اور بالآخر میں وہ چیز تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا جس سے انسانی جسم بچے رہیں گے۔ یہ میری حیران کن ایجاد ہے اور اب اس کا تجربہ میں تم پر کرنا چاہتا ہوں، ناؤ کم ٹو می بے بی، اب بہت ہو گیا میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ درشت لہجے میں بولا۔

''لیکن ہمارا تو آپ سے خون کا رشتہ......''

''میرا کسی سے خون کا رشتہ نہیں ہے۔ سمجھیں تم، یہاں سب سے بڑا اور آفاقی رشتہ دولت اور شہرت ہے اور اب بند کرو یہ بکواس۔'' وہ تیزی سے اس کی جانب جھپٹا۔ اس کے چہرے پر موجود درندگی شاہانہ سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے راڈ اٹھا کر اس کے سر پر مارنا چاہا لیکن وہ راڈ پر قبضہ جما چکا تھا اور اب وہ کسی بے آب مچھلی کے مانند تڑپ رہی تھی۔ اس نے گلریز آفندی کے کان پر کاٹ لیا۔ وہ بلبلایا اس کے ہاتھوں کی گرفت جیسے ہی ڈھیلی پڑی، وہ باہر کو بھاگی۔

گلریز آفندی اس کے پیچھے لپکا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ واپس اسی لیبارٹری روم میں پلٹنے پر مجبور ہو گیا۔ باہر پولیس کی بھاری نفری نے میوزیم کو گھیر لیا تھا۔ لویزا کے ریوالور کا رخ گلریز آفندی کی طرف اٹھا، وہ الٹے پاؤں پیچھے بھاگا۔

شاہانہ کو پولیس کی کسٹڈی میں دے کر وہ لیبارٹری میں داخل ہوئی۔ گلریز آفندی بزدلوں کی طرح ادھر ادھر چھپنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔

''دوسروں کی بیٹیوں کو کسی درندے کی طرح چیر نے پھاڑنے والے اپنی بیٹی کو دیکھ...... میں تمہاری موت بن کے کھڑی ہوں۔'' وہ نفرت سے بھرپور لہجے میں بولی۔

''ب...... بیٹی، تت...... تم......'' وہ ہکلایا۔

''ہاں، ثانیہ آفندی کی بیٹی ہوں میں جو تمہارے جیسے وحشی کی درندگی کی نظر ہو کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔'' وہ انکشاف کر رہی تھی اور وہ پھٹی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم میری بیٹی ہو......''

''شٹ اپ! تمہارے منہ سے یہ لفظ بیٹی سجتا نہیں ہے۔ لیکن میں تمہیں آسان موت نہیں دوں گی نہ پولیس کے حوالے کروں گی۔ میں مانتی ہوں کچھ سپر طاقتیں تمہیں بچا لیں گی۔ آج تم اپنی بیٹی کی عدالت سے اپنی سزا پاؤ گے۔'' وہ کڑے لہجے میں بولی۔

''تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تم میری بیٹی ہو، آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ، پلیز......''

''تمہارے سینے سے لگنے سے بہتر ہے خودکشی کرلوں کیونکہ تم وہ سانپ ہو جو اپنے بچوں کو بھی کھا جاتا ہے۔'' وہ پیٹرول کا ایک کین لیک کرتے ہوئے بولی۔

''ارے...... ارے ایسا مت کرو...... م...... میں مر جاؤں گا۔'' وہ اس کی حرکت دیکھ کر تیزی سے بولا۔ فطرتاً وہ بزدل تھا اپنے دفاع کے لیے کچھ کرنے سے قاصر۔

''تم کوئی لافانی زندگی لکھوا کر نہیں لائے ہو جو مرنے سے ڈر رہے ہو۔'' اس کے لہجے میں وحشت تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلی اور لیبارٹری کا دروازہ بند کرتے ہوئے وہ اندر فائر کرنا نہ بھولی تھی۔

لیبارٹری کے اندر دھماکے ہو رہے تھے لیکن بلٹ پروف دیواریں سب کچھ سہنے کی طاقت رکھتی تھیں۔ وہ ثابت کر چکی تھی کہ آفندی ڈرائنگ کا وہ فائنل پچ تھی۔

''میڈم، یہ آپ نے کیا کیا؟'' ایک سپاہی آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''سانپ اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے لیکن یہ بات کبھی الٹ بھی ہو جاتی ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولتی باہر کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے چہرے پر غم کی ایک لکیر بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

''آج عفان کی لویزا کے ساتھ سہاگ رات تھی۔ ڈی ایس پی یزدانی گرفتار ہو چکا تھا۔ شاہانہ ایک نارمل لائف گزارنے لگی تھی اور لویزا نے کسی کو یہ راز نہیں بتایا تھا کہ وہ گلریز آفندی کی بیٹی تھی۔ وہ اپنی زندگی کو مزید تاریک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عفان اپنی سیکریٹری کم بیوی کو انسپکٹر کے روپ میں دیکھ کر پہلے حیران اور پھر قربان ہو گیا۔

اعتراف

محمد فاروق انجم

بعض اوقات انسان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہیں... جو معمولی سا جھٹکا دے کر آگے بڑھا دیتے ہیں اور کچھ جھٹکے ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کا رخ ہی موڑ دیتے ہیں... ایسے ہی ایک جھٹکے کا شکار ہو جانے والے شخص کا احوال... وہ دوست کی کرم نوازی کو بھول کر احسان فراموشی پر اتر آیا تھا...

اس جرم کا ارتکاب جس نے دوستی کے رشتے کو بالائے طاق رکھ دیا تھا......

دیوار پر لگی گھڑی کی سوئی گھوم رہی تھی اور نصیر احمد گھومتی ہوئی سوئی کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس انتظار میں ہو کہ وقت تھم جائے اور جو کچھ پیش آنے والا ہے، اس کا سامنا اسے کبھی نہ کرنا پڑے۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوس بھی رہا ہو کہ اس نے ہر ممکن احتیاط کی لیکن اس کے باوجود غیر متوقع طور پر اس

کے بھید کا ایک سرا دلشاد خان کے ہاتھ لگ گیا۔ نصیر احمد نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بند کیں اور ہونٹ بھینچ لیے۔

دلشاد خان اور نصیر احمد دس سال سے کاروبار میں برابر کے شراکت دار تھے۔ دونوں کا کاروبار خوب چمک رہا تھا اور ایک دوسرے پر اندھا اعتماد بھی تھا۔ نصیر احمد کے دل میں یکدم ایک دن کھوٹ پیدا ہوگیا اور اس نے پہلی بار کاروبار میں دلشاد خان کے علم میں لائے بغیر رقم کا ہیر پھیر کیا۔ اس کی وہ چوری دلشاد خان کی نظروں سے اوجھل رہی۔ اس بات نے نصیر احمد کو اور حوصلہ دیا اور اس نے شاطرانہ انداز میں کاروبار میں غبن شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے اس کام میں اتنا ماہر ہوگیا کہ اس کے سامنے ہیر پھیر کے کئی راستے کھلتے چلے گئے اور دلشاد خان کی ناک کے نیچے نصیر احمد چوری کرتا رہا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا، بڑی ہوشیاری سے کیا تھا لیکن اس کے باوجود دلشاد خان کو اس کی بھنک پڑ گئی تھی۔

دلشاد خان کے کان تب کھڑے ہوئے تھے جب رفتہ رفتہ کاروبار نقصان کی طرف جانے لگا تھا۔ دلشاد خان نے اس بارے میں غور کیا کہ منافع میں جاتا ہوا کاروبار یکدم نقصان کی طرف کیسے چل پڑا ہے۔

اس بات کا ذکر جب دلشاد خان نے نصیر سے کیا تو نصیر نے دلشاد کی توجہ دوسری جانب مبذول کرانے کے لیے ایسی منطق بیان کرنا شروع کر دی جس سے دلشاد کا دھیان اصل معاملے کی طرف جانے کے بجائے دوسرے معاملات میں الجھا رہے اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی رہا۔

دلشاد کی پریشانی اور تفتیش مزید بڑھنے لگی تو نصیر احمد کو بھی فکر لاحق ہونے لگی کہ کہیں دلشاد کی سوچ کا محور بدل کر اس کی جانب ہی مرکوز نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوگیا تو وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا، اس فکر نے نصیر کو پریشان کر دیا تھا۔

نصیر نے سوچا کیوں نہ اپنے گلے کی طرف بڑھتی ہوئی رسی وہ کسی قربانی کے بکرے کے گلے میں ڈال دے۔ اس کی پہلی نظر اپنے اکاؤنٹنٹ کی طرف گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ کسی طرح سے اسے چور ثابت کرنا ہے۔ ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ دلشاد کے ہاتھ میں کچھ ایسے بل لگ گئے جو اصل کمپنی کی طرف جاری ہوئے تھے لیکن وہ بل اس کے آفس میں تبدیل ہو کر ایک بڑی رقم میں منتقل ہو جاتے تھے۔ دلشاد سوچنے لگا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کمپنی کے بل کمپیوٹر کی مدد سے تیار کر کے بوگس تیار کیے جاتے تھے۔ دلشاد نے کچھ اور تحقیق کی تو اسے کچھ دوسری کمپنیوں کے بل بھی بوگس دکھائی دیے۔ ان معاملات کو دلشاد اتنی توجہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ اس شعبے کو اس نے نصیر کے سپرد کیا ہوا تھا اور اعتبار کی فضا ایسی قائم تھی کہ دلشاد کے دماغ میں بھی شک کا سایہ بھی نہیں لہرایا تھا۔

دلشاد کے ہاتھ میں چوری کا سرا آ گیا تھا اور اگر اس نے حساب کتاب کا کھاتا مزید کھول لیا تو نصیر احمد کو شاید اپنی جیب سے رقم دینا پڑے۔ یہ سوچ کر نصیر کانپ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وقت تھم جائے اور دلشاد خان کے ہاتھ میں اب کچھ نہ آئے اور اسے کسی تذلیل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ کچھ بھی کھونے کو تیار نہیں تھا۔ نہ ہی یہ کاروبار اور نہ کمایا ہوا پیسہ۔

نصیر اپنے آفس میں بیٹھا کوئی محفوظ راستہ تلاش کر رہا تھا اور دوسرے کمرے میں دلشاد خان اپنے سامنے فائل کھولے مختلف کمپنیوں کے بلز میں کھویا ہوا تھا۔ پھر دلشاد نے اپنے ملازم کے ذریعے نصیر کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''نصیر احمد میں جتنا حساب کتاب کر رہا ہوں میرے لیے حیرت کے در کھلتے جا رہے ہیں۔ میں نے ان کمپنیوں سے بھی رابطہ کیا ہے اور ان سے ایک ایک بل کی کاپی بھی بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ کچھ بل میرے پاس آ گئے ہیں، ان میں اور ان بلوں میں تو بہت فرق ہے۔'' دلشاد نے اپنی آنکھوں سے عینک اتار کر میز پر رکھتے ہوئے متانت سے اس کی طرف دیکھا۔

نصیر کو دلشاد کی بات سن کر لگا کہ جیسے دلشاد خان کو اس غبن کا شک اس پر نہیں ہے، بلکہ وہ ابھی حساب کتاب میں الجھا ہوا ہے اور کسی نتیجے پر پہنچ کر پھر کسی پر شک کرے گا۔

''یہ سب ذرا مجھے دکھائیے۔'' نصیر نے کہا تو دلشاد نے فائل اس کی طرف بڑھا دی۔

وہ ایک ایک بل الٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کے کرتوت کا ثبوت اس کے سامنے تھا۔ غبن کے چند بل ہی اس فائل میں تھے۔ اگر کمپنیوں نے باقی اصل بل کی کاپیاں بھی مہیا کر دیں تو پھر نصیر کے لیے بچ نکلنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا۔

''یہ تو چند بل ہیں۔ باقی بل کب تک آ جائیں گے؟'' اس نے جاننا چاہا۔

''میری آج بات ہوئی ہے دو دو، چار دن میں بھیج دیں گے۔'' دلشاد خان نے بتایا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

''کیا خیال ہے کہ باقی بل آ جانے پر ہی ہم اس معاملے کو جاننے کی کوشش کریں۔''

''ظاہر ہے باقی بل آئیں گے تو بات کھلے گی۔ کیا خیال ہے ہم کل کسی ایک کمپنی کے ساتھ میٹنگ نہ کریں؟ اور دوسری بات یہ کہ جو بھی کچھ پرچیز ہوتا ہے، اس کا بل تمہیں دیتا تھا۔ تم نے کبھی اس بارے میں تحقیق کیوں نہیں کی؟'' دلشاد خان نے اس کی طرف دیکھا۔

دلشاد کی اس بات نے جیسے نصیر کو چونکا دیا ہو۔ اس کے دماغ میں تو یہ بات ہی نہیں رہی تھی کہ وہ سارا ملبہ پرچیزر پر ڈال سکتا ہے۔ قربانی کا بکرا تو بالکل تیار تھا۔

''ہاں...... یہ میری کوتاہی ہے کہ میں نے اس پر اس طرح سے غور نہیں کیا جس طرح سے مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' نصیر نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کل ہم ایک کمپنی سے میٹنگ کرتے ہیں۔'' دلشاد کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''کل ہم کو اپنے پیارے اور قریبی دوست انوار بٹ کے بیٹے کی شادی میں اسلام آباد جانا ہے۔'' نصیر نے فوراً یاد دلایا۔

''یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا...... وہ شادی ہم کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے۔ کل ہمیں صبح جلدی نکلنا ہے۔'' دلشاد سوچنے لگا۔

انوار بٹ ایک سرکاری عہدے کی اہم سیٹ پر فائز تھا۔ وہ دونوں کا پرانا دوست ہی نہیں بلکہ ان کے کئی سرکاری کام بھی چٹکی بجاتے ہی کر دیتا تھا اس لیے اس کے بیٹے کی شادی پر جانا ان دونوں کے لیے ہر کام سے ضروری تھا۔

''شادی سے فارغ ہونے کے بعد ہم اس معاملے کو دیکھیں گے۔'' نصیر بولا۔

''کل کتنے بجے نکلنا ہے؟'' دلشاد نے پوچھا۔

''صبح چھ بجے ہم اپنی گاڑی میں نکلیں گے۔ میں نے ڈرائیور کو کہہ دیا ہے۔'' نصیر نے کہا۔

کچھ سوچنے کے بعد دلشاد نے اسے جانے کا کہہ دیا اور خود ان بلوں میں کھو گیا۔

نصیر احمد اپنے کمرے میں آ کر سوچنے لگا کہ اب اسے کسی طرح سے پرچیزر کو قربانی کا بکرا بنا کر دلشاد کے سامنے پیش کرنا ہے تاکہ اس کی اپنی گردن بچ سکے۔

سوچتے سوچتے اچانک نصیر کو ایک بات یاد آئی تو وہ دلشاد خان کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ کمرے کے دروازے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ تھوڑا سا کھلے ہوئے دروازے سے دلشاد کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی، وہ کسی سے فون پر بات کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''شادی سے واپسی پر میں اس معاملے کو حل کرلوں گا۔ ابھی میں نے نصیر کے سامنے یہ بات نہیں کھولی ہے کہ مجھے اس پر شک ہی نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ سارا غبن اسی نے کیا ہے کیونکہ جن لوگوں سے ہم خام مال لیتے ہیں، ان کے ریٹس نصیر احمد ہی طے کرتا ہے۔ ہمارا پرچیزر تو محض ہماری اور دوسری کمپنی میں شٹل کاک کا کام کرتا ہے...... ہاں ابھی میں خاموش ہوں...... ٹھیک ہے پھر بات ہوگی۔'' دلشاد خان نے بات مکمل کرنے کے بعد فون بند کر دیا اور نصیر دروازے سے ہی واپس لوٹ آیا۔ اس کی بےچینی بڑھ گئی تھی۔

وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ اس کا مطلب ہے دلشاد خان یہ سمجھ چکا ہے کہ یہ سب کیا دھرا اسی کا ہے۔ نصیر احمد کے پاس اپنے آپ کو بچانے کے لیے اب ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے سوچا اور پھر ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

☆☆☆

ٹھیک چھ بجے نصیر احمد گاڑی لے کر دلشاد خان کے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر نصیر احمد کو دیکھ کر دلشاد خان نے پوچھا۔

''ڈرائیور کہاں ہے؟''

''اس کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی تھی اس لیے گاڑی میں لے آیا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''ڈرائیونگ تم کرو گے؟'' دلشاد نے پوچھا۔

''کیا میری ڈرائیونگ پر اعتماد نہیں ہے۔'' نصیر احمد مسکرایا۔

''اعتماد ہے، کیوں نہیں ہے۔'' دلشاد بھی ہنسا۔ ''ایک منٹ میں ابھی آیا۔'' دلشاد خان کو جیسے کوئی کام یاد آ گیا تھا وہ واپس اندر چلا گیا اور تقریباً پندرہ منٹ کے بعد واپس آیا اور اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''میرے ساتھ آپ کو بھی ڈرائیونگ کرنی پڑے گی۔'' نصیر نے مسکرا کر کہا۔

''کرلوں گا مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' اس نے کہا۔

دونوں کے سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔ راستے میں کاروبار سے ہٹ کر خوشگوار انداز میں باتیں ہوتی رہیں۔ دلشاد کے دل میں جو کچھ تھا، وہ نصیر احمد پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس بات سے بےخبر تھا کہ نصیر کو اس کے خیالات کی بھنک پڑ چکی ہے۔

پہاڑی علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ بڑی بڑی کھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ نصیر نے اچانک کار کو ایک طرف روک دیا۔

''اب ڈرائیونگ آپ کو کرنی پڑے گی۔''

دونوں نے اپنی اپنی سیٹیں بدل لیں۔ اب دلشاد ڈرائیونگ کرنے لگا۔ کچھ آگے جا کر نصیر نے کہا کہ وہ کار کا رخ دائیں جانب موڑ لے۔

''وہاں کیا ہے؟'' دلشاد نے کار اس جانب موڑ لی تھی۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

کار سڑک سے ہٹ کر اندر کی جانب کھائی کے پاس ہی رک گئی۔ کار کا رخ کھائی کی طرف تھا اور کھائی اتنی گہری نہیں تھی لیکن خطرناک تھی اس کی سنگلاخ چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ کھائی میں نیچے دور آبادی دکھائی دے رہی تھی۔ دور سے ایسا لگتا تھا جیسے چھوٹے گھر آباد ہوں۔

''یہاں کیا ہے؟'' دلشاد نے پوچھا۔ وہ حیران تھا اور وہ سوچ بھی رہا تھا کہ اس نے کیوں نصیر کی بات اتنی جلدی مان لی کہ فوراً ہی کار اس طرف لاکر کھڑی کردی۔

''مجھے لگتا ہے کہ کار کا پچھلا ٹائر کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' نصیر کہہ کر کار سے باہر نکلنے لگا۔

''میں کار کا رخ بدل لوں، نیچے ڈھلان ہے اور مجھے خوف آرہا ہے۔'' دلشاد بولا۔

''فکر نہ کرو بس ایک منٹ۔'' نصیر کہہ کر باہر نکلا۔ دلشاد کو پریشانی ہونے لگی وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کیا کرے، اچانک نصیر احمد نے کار کو پیچھے سے دھکا دے دیا اور دلشاد خان کے سنبھلنے سے پہلے ہی کار ڈھلان کی طرف گئی اور نیچے لڑھک گئی۔ کار تیزی سے نیچے جارہی تھی، اس کے ٹائر ابھی ہوا میں معلق نہیں ہوئے تھے، کار کو شدید جھٹکے لگ رہے تھے اچانک کار کا اگلا حصہ ایک بڑے اور بھاری بھرکم پتھر کے ساتھ ٹکرایا۔ ایک دھماکا ہوا اور کار اسی جگہ رک گئی، جبکہ کار کا اسٹیئرنگ دلشاد خان کے سینے میں اس قوت سے لگا کہ اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کا دل رک گیا ہو۔

کار کا اس پتھر سے ٹکرا کر رک جانا نصیر کی منصوبہ بندی میں رکاوٹ کا باعث تھا۔ کار کھائی میں نیچے نہیں گری تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کار نیچے گرے گی اور تباہ ہوجائے گی۔ دلشاد خان کا خاتمہ ہوجائے گا اور وہ حادثے کا ڈراما رچا دے گا۔

وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ کھائی میں نیچے جانے کے لیے اس نے خود جو سوچا تھا، اس کے مطابق وہ نیچے لڑھک گیا اور قلابازیاں کھاتا ہوا، مٹی میں لت پت، چھوٹی چھوٹی سرنکالے پہاڑیوں سے ٹکراتا، زخمی ہوتا جونہی وہ کار کے پاس پہنچا اس نے ہاتھ بڑھا کر کار کا دروازہ پکڑلیا۔

نصیر اب خود بھی زخمی ہوگیا تھا، اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بھی اسی کار میں نیچے گرا ہو۔ اب وہ یہ بیان دے سکے گا کہ جونہی کار نیچے کی طرف گئی اس کی سائڈ والا دروازہ کھل گیا اور وہ باہر نکل کر قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے جانے لگا۔ بمشکل اس نے گرتے ہوئے کار کے دروازے کو پکڑ کر اپنے آپ کو مزید نیچے گرنے سے بچالیا۔

کار اس انداز میں اس بڑے پتھر کے ساتھ لگی ہوئی تھی کہ جب تک وہ پتھر راستے سے نہ ہٹتا، کار کا نیچے گرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ نصیر نے اپنے آپ کو کھڑا کیا اور اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور کار کے اندر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اندر دلشاد خان بری طرح سے زخمی تھا۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور خون بہہ رہا تھا جبکہ اس کے سینے پر بھی شدید چوٹ آئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ زندہ تھا۔

''تم ابھی تک مرے نہیں ہو۔'' نصیر نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر سیدھا کیا۔

''تم نے یہ کیا کیا......؟'' دلشاد خان نے تکلیف بھری آواز میں بمشکل پوچھا۔

''مجھے یہ کرنا ہی تھا کیونکہ تم مجھ تک پہنچ گئے تھے۔'' نصیر کے لہجے میں سفاکی تھی۔

''ہاں......تم نے کاروبار کو بہت نقصان پہنچایا ہے......لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اپنے آپ کو بچانے کے لیے برسوں کی دوستی کو بھول جاؤ گے اور میرا یہ حال کردو گے۔ تم تو میری سوچ سے بھی کہیں زیادہ خطرناک نکلے۔'' دلشاد خان کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ سینے میں شدید چوٹ لگنے کی وجہ سے اس کے لیے بولنا مشکل ہورہا تھا۔

وہ ہنسا اور بولا۔ ''بس مجھے تم یہ بتادو کہ تم اپنے موبائل فون پر کس سے بات کرتے ہوئے میرے بارے میں بتارہے تھے۔''

اس کی بات سن کر دلشاد خان نے بمشکل سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ لیاں کی اور بولا۔

''تو تم نے سن لیا تھا۔''

''ہاں میں نے سن لیا تھا۔''

''نہیں بتاؤں گا۔''

''تمہیں بتانا پڑے گا۔''

''بتادیا تو تم انجام تک کیسے پہنچو گے......شکر ہے کہ میں نے وہ فیصلہ ٹھیک کیا تھا......حالانکہ مجھے تمہارے اس خطرناک ارادے کا اندازہ نہیں تھا۔'' دلشاد نے کرب سے جملہ مکمل کیا۔

''مجھے بتاؤ تم نے کس کو میرے بارے میں بتایا تھا؟'' نصیر کا لہجہ درشت ہوگیا۔

''نہیں بتاؤں گا......تم......تم خود اپنے جرم کا اعتراف کرو گے......مجھے یقین ہے۔'' دلشاد کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں اور تکلیف بھی بڑھ گئی تھی پھر اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی اور اس کا جسم بے جان ہوگیا۔

نصیر نے اس کا سر پکڑ کر سیدھا کیا۔ اس کے گال تھپتھپائے لیکن دلشاد خان مرچکا تھا۔

نصیر نے اس کی جیب میں سے اس کا موبائل فون نکالا اسی اثنا میں امدادی ٹیم کی گاڑی کا آلارم سنائی دینے لگا۔ نصیر احمد نے گردن گھما کر دیکھا کہ اوپر گاڑی بھی کھڑی ہوئی ہے اور کچھ لوگ بھی تیزی سے بھاگ دوڑ کررہے ہیں۔ نصیر احمد نے دلشاد خان کا موبائل فون اس کی جھولی میں رکھ دیا اور بے ہوش ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کار کے کھلے دروازے سے جھکے ہوئے باہر نکل کر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

☆☆☆

اس سارے معاملے کی تفتیش اچانک پیش آنے والے حادثے سے آگے نہیں بڑھی۔ نصیر نے جو کچھ کیا تھا، وہ بالکل مخفی رہا تھا۔ پولیس اور دلشاد کے خاندان والوں کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا کہ گویا دلشاد کی موت کا سب سے زیادہ صدمہ اسے ہی ہوا ہے۔ نصیر نے وہی بیان دیا تھا جو اس نے سوچا تھا کہ جونہی کار نیچے ڈھلان کی طرف گئی اس کی طرف کا دروازہ کھلا اور وہ باہر گرتے ہی قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے جانے لگا کہ بمشکل اس نے گرتے ہوئے گاڑی کو پکڑ کر اپنے آپ کو مزید نیچے جانے سے روکا اور یوں اس کی جان بچ گئی۔ پولیس نے بیان لیا اور جانے سب کچھ کہاں دفن کردیا۔

نصیر چند دن ڈاکٹر کے پاس زیر علاج رہا اور رفتہ رفتہ سب کچھ معمول پر آگیا۔ نصیر احمد کو جو ڈر تھا، وہ ختم ہوگیا تھا بس ایک دھڑکا لگا ہوا تھا کہ دلشاد خان نے فون پر اس کے بارے میں کس کو بتایا تھا۔ کہیں وہ یکدم سامنے نہ آجائے مگر اس نے اس کا بھی حل سوچ لیا۔

اس واقعے کو ایک ماہ ہوگیا۔ نصیر احمد نے دلشاد خان کے بڑے بیٹے کو بلا کر اس کے سامنے فائلوں کا انبار رکھتے ہوئے کہا۔

''پچھلے ایک سال سے ہم کاروباری نقصان میں جارہے تھے۔ نقصان کا حساب کتاب خود دلشاد بھائی نے کیا تھا جو ان فائلوں میں لکھا ہوا ہے۔ ہم سوچ چکے تھے کہ اس کاروبار کو بند کردیں۔ اس کی موت کے بعد میں نے پھر سے کوشش کی لیکن بے سود۔ تم ان فائلوں کو دیکھ لو۔ نقصان اتنا ہے کہ قرض کا ڈھیر ہے اور پیسہ ختم ہوچکا ہے۔ اب تم چاہو تو ابھی اور اسی وقت یہ کاروبار سنبھال لو اور جیسے تیسے لوگوں کا پیسہ واپس کردو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تم میرے عزیز دوست کے بیٹے ہو، ابھی تمہاری تعلیم مکمل ہوئی ہے، میں تمہیں کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا مجھے کچھ بھی کرنا پڑا میں لوگوں کا پیسہ واپس کرنے کی کوشش کروں گا۔ کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

دلشاد کے بیٹے نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولا۔ ''مجھے سوچنے کے لیے کم از کم ایک ہفتہ چاہیے۔''

''ہاں کیوں نہیں تم تسلی سے سوچ لو۔'' نصیر نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔

دس دن اور گزر گئے تھے۔ نصیر اس بات کو بھی بھول گیا تھا جو اس کے دماغ میں تھی کہ اس دن دلشاد نے کس کو اس کے بارے میں فون پر بتایا تھا، کیونکہ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے کاروبار میں مصروف اور اس تیاری میں تھا کہ جب دلشاد خان کا بیٹا کوئی فیصلہ لے کر آئے تو وہ اس کے سامنے کاروبار کی خطرناک صورت حال رکھ کر اس کو چلتا کردے۔

اچانک......دو دن کے بعد......استقبالیہ پر موجود لڑکی نے نصیر کو انٹرکام پر اطلاع دی کہ کوئی سلیم پاشا کے نام کا آدمی ان سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ نام نصیر پہلی بار سن رہا تھا۔ اس وقت نصیر کے پاس وقت تھا اور وہ اس سے ملاقات کرسکتا تھا اس لیے اس نے آنے والے کو بلالیا۔

سلیم پاشا پچپن سال کی عمر اور پتلے اور لاغر سے جسم کا مالک تھا۔ وہ چلتے ہوئے لنگڑا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا ہینڈ بیگ تھا۔ نصیر نے اس سے پہلے اس شخص کو نہ تو کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی اس سے کہیں ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور نصیر احمد کے کہنے پر وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''معذرت چاہتا ہوں کہ مجھے آنے میں دیر ہوگئی۔'' سلیم پاشا نے کہا تو نصیر احمد کے چہرے پر حیرت کی لکیریں ابھر آئیں۔ کیونکہ یہ بات تو سلیم پاشا تب کہتا اگر اس نے اسے بلایا ہوا اور وہ مقررہ وقت سے دیر کے ساتھ پہنچا ہو۔

''معذرت کیسی......؟ میں نے تو آپ کو نہیں بلایا تھا۔'' نصیر احمد نے کہا۔

وہ مسکرایا۔ ''لیکن مجھے اس وقت پہنچنا تھا جب آپ کے

دوست اور بزنس پارٹنر دلشاد خان کا قتل ہوا تھا۔“

جونہی نصیر احمد نے اس کے منہ سے یہ بات سنی، وہ بری طرح چونکا۔ ”قتل......؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ میں آپ کو کچھ دکھاتا ہوں۔“ سلیم پاشا نے اپنے چھوٹے سے بیگ کی زپ کھولی اور اس کے اندر سے ایک خاکی لفافہ نکال کر نصیر کی طرف بڑھا دیا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے وہ لفافہ پکڑ لیا اور اس کے اندر سے ایک درجن سے زیادہ تصاویر نکال لیں۔

پھر جیسے جیسے نصیر ایک ایک تصویر دیکھتا گیا، اس کا چہرہ حیرت کے سمندر میں ڈوبتا گیا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو چکی تھی۔

تصاویر بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ پہلی تصویر میں دلشاد خان کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھا حیرت اور خوف سے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ نصیر احمد کار کو دھکا لگا رہا تھا۔ تصویر میں نصیر، کار میں بیٹھا دلشاد خان اور سامنے کھائی کا بھی کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس سے واضح ہوتا تھا کہ کار کو کھائی میں دھکیلا جا رہا تھا۔ اسی طرح باقی تصویریں بھی تھیں اور جب قلابازیاں کھاتا ہوا نصیر احمد نیچے گر رہا تھا، اس کی بھی چند تصویریں موجود تھیں۔ وہ تصویر بھی ان تصویروں کا حصہ تھی جب نصیر احمد قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے تک آیا تھا تو اس نے کھڑے ہو کر تسلی سے دائیں بائیں بھی دیکھا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ نصیر بری طرح سے گھبرا گیا تھا۔

”یہ وہ تصویریں ہیں جو میں نے اپنے کیمرے سے محفوظ کی تھیں کیونکہ میں ایک پیشہ ور فوٹوگرافر ہوں۔ میری دلشاد سے ملاقات ایک سال پہلے ایک تقریب میں ہوئی تھی... پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ گاہے بگاہے بھی جاری رہا۔ مجھے اپنا اسٹوڈیو بنانے کے لیے کچھ رقم کی ضرورت پڑی تو وہ دلشاد خان نے مجھے دے دی اور میں ذاتی اسٹوڈیو کا مالک بن گیا اور دلشاد صاحب نے مجھ سے رقم واپس بھی نہیں لی۔ وہ بہت اچھے انسان تھے اور میں ان کی عزت کرتا تھا۔“

”مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟“ اندر سے ڈرے ہوئے نصیر نے بظاہر خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”تاکہ آپ کو پتا چل سکے کہ میرا اور دلشاد صاحب کا تعلق کیا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ ان کا پارٹنر یعنی کہ آپ ایک بڑے غبن میں ملوث ہیں۔ وہ ثبوت جمع کر بھی چکے ہیں اور مزید ثبوت کی تلاش میں ہیں۔ جانتے ہیں انہوں نے یہ بات مجھ سے کیوں کی تھی؟“ سلیم نے کہا۔

”کیوں کی تھی؟“ نصیر جو ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، یکدم اس کے منہ سے نکلا۔

”کیونکہ میں نے خفیہ پولیس میں نوکری کی تھی۔ فوٹوگرافی میرا شوق تھا جو ریٹائرمنٹ کے بعد میرا پیشہ بن گیا۔ پولیس سے میں نے خود ریٹائرمنٹ لی تھی۔ تب میں نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ ابھی آپ خاموشی سے ثبوت جمع کرتے رہیں پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔“ سلیم نے بتا کر نصیر پر یہ عیاں کر دیا کہ اس دن دلشاد خان اسے فون پر بتا رہا تھا۔

”تو وہ تم تھے؟“ نصیر کے منہ سے زیرِ لب نکلا۔

”پھر ان کا فون آیا کہ وہ ایک اہم شادی پر جا رہے ہیں۔ جب آپ ڈرائیور کے بغیر ان کے گھر پہنچے تو انہوں نے مجھے فون کیا۔ میں نے کہا کہ آپ کم از کم بیس منٹ تک اپنے گھر سے نکلیں۔ میں کسی جاسوس کی طرح آپ دونوں کے پیچھے اپنی کار میں چل پڑا۔ جب کار ایک کھائی کے پاس رکی اور اسے دھکیل کر کھائی میں گرانے لگے تو میں سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ دلشاد خان کو بچاؤں یا سب کچھ اپنے کیمرے میں محفوظ کر لوں۔ ویسے بھی میں شوگر کا مریض ہوں جسم میں اتنی طاقت نہیں رہی کہ آپ جیسے شخص کا مقابلہ کر سکتا۔ میرے سامنے جو کچھ بھی ہو رہا تھا، سب غیر متوقع تھا، چنانچہ میں تصویریں بناتا رہا اور ایمرجنسی پولیس کو بھی فون کر دیا۔ پولیس کے آنے پر میں جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھا رہا۔ وہ آپ سب کو لے گئے اور مجھے اچانک ایک سانپ نے ڈس لیا۔“ سلیم نے تفصیل بتائی۔

سلیم پاشا چپ ہو گیا اور نصیر اس کی طرف دیکھتا رہا جیسے وہ آگے بھی جاننے کے لیے بے چین ہو۔

”میں وہاں اکیلا تڑپ رہا تھا۔ میں نے اپنی کار بہت پیچھے کھڑی کی ہوئی تھی۔ اچانک جانے کہاں سے ایک فرشتہ نما انسان نمودار ہوا اور وہ مجھے اٹھا کر میرے کہنے پر میری کار تک لے کر گیا۔ مجھے اس نے قریبی اسپتال میں کیسے پہنچایا مجھے ہوش نہیں۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

سلیم نے چپ ہو کر نصیر احمد کے سامنے رکھا پانی کا گلاس اٹھایا اور دو گھونٹ پینے کے بعد گلاس نیچے رکھ کر کہا۔

”معذرت چاہتا ہوں شوگر کا مریض ہوں اس لیے گلا بار بار خشک ہو جاتا ہے۔ بہرحال میری جان بچ گئی۔ پانچ دن تک اس اسپتال میں رہا۔ ہوش میں آنے پر میں نے



بے فکر ہو کر مال سمیٹو، کتا بوڑھا ہے اور اس کے دانت بھی گر چکے ہیں۔

اپنے بیٹے کو اطلاع کر دی، وہ بھی آ گیا۔ پانچ دن کے بعد جب اسپتال سے فارغ ہو کر ہم کار میں واپس جا رہے تھے تو ایک اور حادثہ ہمارا منتظر تھا۔ ہماری کار کا ایکسیڈینٹ ہو گیا۔ میرے بیٹے کو کم لیکن مجھے شدید چوٹیں آئیں۔ میں ایک بار پھر اسپتال میں پہنچ گیا۔ اپنی شوگر کی وجہ سے میرے زخم دیر سے بھرے اور جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ایک ماہ گزر چکا تھا۔ تب میں نے یہ تصاویر نکالیں اور آپ کے پاس حاضر ہو گیا ہوں۔“

”تم جھوٹے فراڈیے ہو۔ میری جعلی تصویریں بنا کر لے آئے ہو۔ میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔“

”ضرور بلائیے۔ ثابت ہو جائے گا کہ یہ تصویریں جعلی نہیں ہیں اور جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ جعلی نہیں ہیں تو پھر آپ کا بچنا مشکل ہو جائے گا جبکہ سانپ کے ڈسنے اور حادثے کی وجہ سے مجھے مالی طور پر بہت دھچکا لگ چکا ہے۔ میری کار بیکار ہو چکی ہے۔ میں سارے احسانات ایک طرف رکھ کر آپ کے پاس آ گیا ہوں کہ دلشاد خان کے بیٹے کو یہ سب ثبوت دینے کے بجائے یہ سب آپ کے حوالے کر کے جو پیسہ میرے علاج پر لگا اور میری کار تباہ ہوئی، اس کی قیمت لے کر میں چلتا بنوں۔ مرنے والا تو مر چکا ہے۔ اب مجھے اپنے فائدے کا سودا کرنا چاہیے، مجھ سے یہ سارے ثبوت آپ لے لیں۔“ سلیم پاشا اپنے اصل مقصد کی طرف آتا ہوا بولا اور اس نے مسکراتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

نصیر نے اس کی یہ بات سن کر اپنے گلے میں اٹکی ہوئی سانس خارج کی اور اپنے تنے ہوئے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ لین دین کی بات کر کے سلیم پاشا نے جیسے اس کی مشکل حل کر دی ہو۔ نصیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی اور بولا۔

”تو تم یہ ثبوت مجھے دے کر اس کے بدلے میں رقم لو گے لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تمہارے پاس کوئی اور ثبوت نہیں ہے۔“ نصیر احمد یکدم ہی لین دین پر آ گیا تھا۔

”میں کوئی پیشہ ور بلیک میلر نہیں ہوں۔ جیسا کہ آپ پیشہ ور قاتل نہیں ہیں۔ حادثے کی وجہ سے مجھے جو نقصان ہوا، مجھے وہ چاہیے۔ اگر میں یہ سارے ثبوت دلشاد کے بیٹے

کے حوالے کردوں تو مجھے کیا ملے گا؟ میرا نقصان تو اپنی جگہ رہے گا اور میں تو گھاٹے کا سودا کرلوں گا البتہ آپ کا بچنا مشکل ہوجائے گا۔''

''سمجھ دار ہو۔'' وہ مسکرایا۔

''آپ نے اپنا جرم چھپانے کے لیے دلشاد کو مار دیا اتنا فائدہ لے لیا کہ دس لاکھ روپے مجھے دینا آپ کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔'' سلیم نے اپنی مانگ ظاہر کردی۔

''مشکل تو نہیں ہے لیکن دلشاد نے یہ اچھا نہیں کیا تھا کہ وہ تمہیں رازدار بناتا۔ تم سے اس معاملے کا مشورہ کرنا مجھے بڑا عجیب سا لگا ہے۔ ویسے اگر تم اس کی جان بچانے کے لیے میرے سامنے آجاتے تو یقین کرو کہ میں تمہیں بھی مار دیتا۔ جہاں ایک کو مارا وہاں دوسرے کو مارنا کونسا مشکل ہوتا۔'' نصیر عجیب سے انداز میں مسکرایا اور پھر بولا۔ ''بہرحال میں تمہیں صرف پانچ لاکھ روپے دوں گا۔ سارے ثبوت میرے حوالے کردو۔''

''دس لاکھ روپے سے کم بات نہیں ہوگی۔ کیونکہ میرا اتنا ہی نقصان ہوا ہے۔ ورنہ مجبوراً مجھے دکھی دل کے ساتھ یہ سب تصویریں دلشاد کے بیٹے کو دینی پڑیں گی۔ تاکہ مجھے دس لاکھ روپے نہ دینے کی سزا، میں آپ کو دوں۔'' سلیم پاشا اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

نصیر نے سوچا کہ بحث کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ وہ دس لاکھ روپے دے کر اس کا منہ بند کردے۔ اس نے دلشاد خان کو دھوکا دے کر کئی لاکھ کا فائدہ حاصل کیا ہے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' نصیر نے کہا۔ سلیم پاشا پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''مجھے ساری تصویریں اور ویڈیو دو۔''

سلیم پاشا نے بیگ سے ایک دوسرا لفافہ نکالا اور بولا۔ ''سب کچھ اس میں بند ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں لیکن ایک ہاتھ رقم دیں اور دوسرے ہاتھ یہ سارے ثبوت۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' نصیر احمد نے کہا اور وہ اسے لے کر پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کمرا بڑا تھا اور وہاں جاتے ہی نصیر احمد نے انٹرکام پر کسی کو اندر آنے کو کہا۔ کچھ دیر کے بعد ایک صحت مند آدمی اندر آگیا۔ نصیر احمد نے اسے حکم دیا۔

''اس سے بیگ چھین لو۔''

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ......'' سلیم پاشا نے گھبرا کر کہا۔ اس کے گمان میں نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔ صحت مند آدمی نے بیگ چھین کر نصیر احمد کے حوالے کردیا۔ نصیر نے بیگ کو میز پر الٹ دیا۔ اس کے اندر بس ایک ہی خاکی لفافہ تھا۔ خاکی لفافے کے اندر تصاویر اوران کے ویڈیو موجود تھے۔ اس نے مسکرا کر اس لفافے کو دراز میں رکھ دیا اور صحت مند آدمی کو جانے کا کہہ دیا۔ اس کے جاتے ہی سلیم پاشا بولا۔

''میرا اناڑی پن تھا یہ کہ میں سارے ثبوت لے کر یہاں آگیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں یہاں ڈیل کرتا اور پھر آپ کو کسی جگہ بلا کر رقم لیتا۔''

نصیر قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ''اب تم نکلو یہاں سے ورنہ جس طرح میں نے اپنے جگری دوست اور بزنس پارٹنر کو دھوکا دے کر اپنے ہاتھوں سے مارا اور حادثے کا ڈراما رچا کر محفوظ ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں بھی ماردوں۔''

اس کی بات سن کر سلیم پاشا نے متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بے بسی کے عالم میں بولا۔ ''یہ ٹھیک نہیں کیا آپ نے......''

''تم جاتے ہو کہ پھر اسی کو بلاؤں اور وہ تجھے اُٹھا کر باہر پھینک دے۔'' نصیر نے درشت لہجے میں کہا تو ناچار سلیم کو کمرے سے تہی دست جانا ہی پڑا۔ اس کے جاتے ہی وہ بڑبڑایا۔ ''مجھے بلیک میل کرنے آیا تھا۔'' اس نے غصے سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں کمرے کا دروازہ کھلا اور سلیم پاشا پھر نمودار ہوا اور اس نے آتے ہی کہا۔

''ایک بات بتانا چاہتا ہوں کہ میری شرٹ کے ساتھ ایک خفیہ کیمرا لگا ہوا ہے جس میں ہماری گفتگو اور آپ کا اعتراف ریکارڈ ہے۔ اور وہ کیمرا یہ لگا ہوا ہے۔'' سلیم پاشا نے آگے بڑھ کر اپنے کوٹ کے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ نصیر یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور گھبراہٹ چہرے سے برسنے لگی۔

''اب تجھے بھی مارنا ہی پڑے گا۔'' نصیر میز کی دراز کی طرف بڑھا شاید وہ اپنا پستول نکالنا چاہتا تھا لیکن اسی اثنا میں دلشاد خان کا بیٹا پولیس کے ساتھ اندر داخل ہوا اور نصیر احمد اسی جگہ ساکت رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے حیرت ٹپک رہی تھی۔ وہ ان سب کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''میں احسان فراموش نہیں ہوں۔'' پہلے میں نے دلشاد صاحب کے بیٹے کو آگاہ کیا پھر ہم پولیس کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ اب آپ اپنے اعتراف سے بھاگ نہیں سکتے۔'' سلیم نے کہا اور پولیس نے آگے بڑھ کر نصیر احمد کو ہتھکڑیاں لگادیں۔

▲▲

بندوبست

عکسِ فاطمہ

ہر آدمی کی زندگی کا انت ایک جیسا ہوتا ہے صرف ایک چیز اسے دوسروں سے منفرد بناتی ہے... اور وہ یہ کہ اس نے زندگی کیسے گزاری اور اسے موت کیسے آئی... ایک چھوٹے سے قصبے میں زندگی کی صعوبتوں کو برداشت اور انصاف کے منتظر غریب کسانوں کی کسمپرسی... ان کے طاقتور مالکان چاہتے تھے کہ انہیں اس قدر تنگ کرو کہ وہ اپنی زمین چھوڑ کر چلے جائیں...

اس شخص کا دردناک انجام جس نے جیتے جی اپنوں کی زندگی کو گہن لگا دیا تھا......



سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور زمین کی سطح پر جمی ہوئی کیچڑ نے پگھلنا شروع کردیا تھا جس کی وجہ سے میرے جوتوں کی ایڑی پر کیچڑ لگ گئی تھی۔ لوئی پروٹ کی لاش کے گرد پہلے ہی مجمع اکٹھا ہوچکا تھا۔ پروٹ زمین پر چت پڑا ہوا تھا اور اس کے سر کے پچھلے حصے میں ایک سوراخ نظر آرہا تھا۔ زمینوں کے مالکان بڑبڑاہٹ کے

اندازمیں ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے جبکہ ان کی زمینوں پر کام کرنے والے مزارع خاموش کھڑے ہوئے منتظر تھے کہ ان کے طاقت ور مالکان کیا کہتے ہیں۔ وہاں سے گزرنے والے ہر ایک سے لاش کے بارے میں سوالات کررہے تھے جن کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا پھر میں نے کسی کی زبان سے یونین کا لفظ سنا تو مجھے پریشانی ہو گئی۔

گزشتہ موسم گرما میں کچھ مزارع اکٹھے ہوئے اور انہوں نے ساؤدرن ٹیننٹ فارمرز یونین کے نام سے ایک تنظیم بنائی جس نے ان زمینداروں کو پریشان کردیا جن کی زمینوں پر وہ کاشت کیا کرتے تھے۔ مزارعوں کی اکثریت چاہتی تھی کہ انہیں بھی اس زرتلافی میں حصہ ملے جو زمین داروں کو کپاس کی فصل کاشت نہ کرنے کے بدلے دی جاتی تھی۔ اس قانون میں کہا گیا تھا کہ کسی بھی مزارع کو زمین سے بے دخل نہیں کیا جائے گا اور زمیندار انہیں ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے پابند ہوں گے لیکن زیادہ زمینداروں نے پوری رقم اپنی جیب میں رکھنا شروع کردی اور وہ اس انتظار میں رہتے کہ بھوک اور فاقہ کشی سے تنگ آکر مزارع خود ہی زمین چھوڑ کر چلے جائیں گے چنانچہ یونین نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کیں اور زمینداروں پر مقدمہ کردیا۔ اب ایسی باتیں سننے میں آرہی تھیں کہ یہ زمین دار کچھ ایسے نائٹ رائڈرز کی حوصلہ افزائی کررہے ہیں جو ان گستاخ مزارعین کو سبق سکھا سکیں۔

میں نے شگری شیفرڈ کو مجمع کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ مزارع پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے ان کے پاس سے گزر گیا۔ وہ خود بھی ایک کاشتکار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ میرے دادا نے اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے اس کے تعلیمی اخراجات برداشت کیے اور اب وہ ایک وکیل تھا اور بلاشبہ یونین کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کمیونسٹ ہے۔

ایک طرف میرے چند مزارع کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ قانونی طور پر یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ میری آنٹیوں کے مزارع تھے لیکن انہوں نے مجھے زمین کی ذمے داری سونپ رکھی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہ رہے ہیں چنانچہ میں ان کے پاس چلا گیا۔ دوسرے زمیندار بھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ میری طرف سے مشکوک تھے کیونکہ ہم اپنے مزارعین کو زرتلافی میں سے حصہ دیا کرتے تھے۔ میں نے ایک مزارع سے پوچھا۔

''لاش کس نے دریافت کی؟''

اس مزارع کا نام بینز تھا۔ اس نے میرے ایک اور مزارع ہارڈوک کی طرف سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کلیر نے۔ وہ صبح یہاں آیا۔''

''شکریہ بینز۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ وہی بات دہرائے جو ہارڈوک نے اسے بتائی تھی۔ میں براہِ راست اس کی زبان سے سننا چاہ رہا تھا۔

یہ تینوں مزارع بھی پروٹ کی طرح سفید فام تھے۔ وہ میرا مزارع نہیں تھا لیکن یہ تینوں میری زمین پر کام کرتے تھے۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے سب سے پہلے لاش دیکھی۔'' میں نے ہارڈوک سے کہا۔

''جی جناب۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے میں ہی یہاں آیا۔ یہ بالکل اسی طرح پڑا ہوا تھا جیسا تم دیکھ رہے ہو۔ میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ مرچکا ہے پھر کوئی بے وقوف ہی اسے ہاتھ لگاتا۔''

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کتنی دیر سے وہاں پڑا ہوا تھا؟''

''شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی کیونکہ اس کا خون ابھی تک جما نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یعنی تم اس وقت سے یہاں ہو جب قاتل اسے مار کر چلا گیا؟''

''جب میری نظر لاش پر گئی تو میں جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ اسے ہاتھ نہیں لگایا لیکن فوراً سمجھ گیا کہ یہ کس کی لاش ہے کیونکہ میں اس کی گردن پر ایک پھوڑا پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔''

''پھوڑا؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ہاں، وہ پھوڑا میں نے پہلی بار کل دیکھا جب میں اس سے ملنے گیا تھا۔''

''یعنی تم فوراً سمجھ گئے کہ یہ پروٹ کی لاش ہے؟''

''جی جناب۔ ایک بات اور بتانا چاہتا ہوں۔ شدید سردی کی وجہ سے زمین پر سفیدی کی تہ جم گئی تھی اور اس پر پروٹ کے قدموں کے نشانات نظر آرہے تھے پھر میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے اپنے قدموں کے نشان بھی نظر آئے، اس کے علاوہ کسی اور کے نشانات نظر نہیں آئے جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔''

مجھے اس کی پریشانی کی وجہ فوراً ہی سمجھ میں آگئی۔ اگر

وہاں پروٹ کے علاوہ صرف اس کے قدموں کے ہی نشانات تھے تو سب سے پہلے ہارڈوک پر ہی شبہ ہوتا کہ اس نے ہی یہ قتل کیا ہے۔ میں نے لاش کی طرف دیکھا۔ وہاں لوگ ابھی تک موجود تھے۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کیا لاش کے قریب کسی کے قدموں کے نشان تھے لیکن کچھ یاد نہیں آیا کیونکہ میں نے پہلے اس پر توجہ نہیں دی اور اب وہ جگہ لوگوں کے پیروں تلے روندی جاچکی تھی۔

میرے دماغ میں اچانک ایک خیال آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم پروٹ کے گھر کیوں جارہے تھے؟''

ہارڈوک نے کھڑے کھڑے پہلو بدلا پھر بولا۔ ''میں ان کے لیے کچھ مٹر کے دانے اور تھوڑا سا گوشت لے کر جارہا تھا۔''

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ ہارڈوک کو میری آنٹیوں کی طرف سے زرتلافی میں اس کا حصہ نقدی اور اجناس کی صورت میں مل رہا تھا لیکن پروٹ ہمارا مزارع نہیں تھا۔ اسی لیے ہارڈوک کو ڈر محسوس ہوا کہ پروٹ کو تھوڑا سا سامان دینے پر ہم ناراض نہ ہوجائیں۔

''کوئی بات نہیں اگر تم اپنے حصے میں سے کچھ ضرورت مندوں کو دیتے ہو تو اس پر کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔''

پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور وہ بولا۔ ''تمہاری آنٹیاں بہت اچھی ہیں اور تم بھی۔''

شگری شیفرڈ ہمارے پاس آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''آؤ، میں تمہیں ایک نئے مؤکل سے ملواؤں۔ یہ کلیر ہارڈوک ہے جس نے سب سے پہلے لاش دیکھی۔''

''اچھا۔'' وہ ہارڈوک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

''نہیں، میں یہاں ہتھیار کے بغیر آیا تھا۔''

''تم کیوں سمجھتے ہو کہ تمہیں کسی وکیل کی ضرورت ہے؟''

ہارڈوک نے اسے قدموں کے نشانات کے بارے میں بتایا۔ شیفرڈ اسے ایک دو منٹ دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے۔ کیا قاتل اڑتا ہوا آیا تھا یا کسی نے ہوائی جہاز سے گولی چلائی؟''

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اسے کیسے گولی لگی تھی۔''

شیفرڈ بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ کوئی اس سے یہاں ملنے آیا اور اسے گولی ماردی۔''

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آلۂ قتل مل گیا ہے؟''

شیفرڈ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''یہ میں نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ اس مجمع میں سے کسی نے وہ ہتھیار اٹھالیا ہو یا قاتل یہاں سے جاتے وقت اسے اپنے ساتھ لے گیا ہو۔''

''ہارڈوک اسی لیے پریشان ہے کیونکہ اسی نے......''

''ٹیٹ، میری بات سنو۔ یہ جگہ قدموں کے نشانات سے بھری ہوئی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ جب صبح ہارڈوک یہاں آیا تو وہ تمام نشانات نہیں دیکھ سکا ہوگا، کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ قاتل کوئی مافوق الفطرت مخلوق تھا۔''

اس نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہارڈوک سے کہا۔ ''تم نے جو قدموں کے نشان دیکھے، ان سے کہیں زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔''

''نہیں مسٹر شیفرڈ۔ میں نے اس جگہ کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہاں صرف میرے اور پروٹ کے نشانات ہی تھے۔''

میں نے شیفرڈ کو بتایا۔ ''یہ شخص اس علاقے بلکہ قرب و جوار میں بہترین شکاری سمجھا جاتا ہے... اس لیے اسے قدموں کے نشانات کی خوب پہچان ہے۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''اگر پولیس کو یہ بات معلوم ہوگئی تو ہارڈوک سزا سے نہیں بچ سکتا۔''

''میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' ہارڈوک نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ مجھے بائبل پر حلف اٹھانا ہوگا اور خداوند کے روبرو جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

شیفرڈ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''ٹھیک ہے لیکن تم میری غیر موجودگی میں پولیس سے کوئی بات نہیں کرو گے۔''

''بالکل مسٹر شیفرڈ۔'' اس نے اپنی بات پوری ہی کی تھی کہ شیرف آگیا۔

شیرف مارک سے میرا پہلے بھی واسطہ پڑ چکا تھا اور میں اس کے ڈپٹی بلی تھامسن کو اسکول کے زمانے سے جانتا تھا۔ شیرف کافی ہوشیار شخص تھا جبکہ بلی اس کے مقابلے میں سادہ لوح واقع ہوا تھا۔ مجھے شیرف سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

وہ دونوں لاش پر جھکے ہوئے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کچھ اور پولیس والے بھی آگئے اور تھامسن انہیں ہدایات دینے لگا۔ اس کے کہنے

پر انہوں نے وہاں موجود تمام لوگوں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ پھر شیرف ہمارے پاس آکر بولا۔ ’’کیا تم لوگوں میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار ہے؟‘‘

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن کوئی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے کہ شیفرڈ کوئی اعتراض کرتا، میں نے کہا۔ ’’تم ہماری تلاشی لے سکتے ہو۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ شیفرڈ نے بھی میری تقلید کی۔

جب بلی تلاشی لے چکا تو میں نے کہا۔ ’’تمہارے خیال میں اسے کس طرح گولی ماری گئی؟‘‘

’’لگتا ہے کہ کسی نے اس کے چہرے کو تیس بور کے ہتھیار سے نشانہ بنایا۔ گولی اس کے دانتوں سے ذرا اوپر لگی اور سر کے پچھلے حصے سے باہر نکل گئی۔ ممکن ہے کہ اس واردات میں پستول استعمال کیا گیا ہو لیکن مجھے لگتا ہے کہ اسے رائفل سے نشانہ بنایا گیا۔‘‘ پھر وہ ہارڈوک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ’’تمہارے پاس تیس بور کا ہتھیار ہے؟‘‘

’’نہیں، میرے پاس اعشاریہ بائیس کا پستول ہے۔‘‘

مارک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’جب تم صبح یہاں آئے تو کیا دیکھا؟‘‘

شیفرڈ کچھ کہنے کے لیے آگے بڑھا لیکن میں نے اسے روک لیا۔ ہارڈوک نے شیرف کو وہی کچھ بتایا جو وہ ہم سے کہہ چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنا بیان تبدیل نہیں کرے گا اور اگر اس کے وکیل نے اسے خاموش کروانے کی کوشش کی تو یہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

’’یہ بڑی عجیب بات ہے کہ قدموں کے نشانات نہیں ملے۔‘‘ پھر وہ ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ’’مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں آلۂ قتل بھی نہیں ملا اور نہ ہی کسی کو یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی شخص یہاں سے گیا اور واپس آگیا۔‘‘ اس نے براہ راست ہارڈوک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

’’میں یہاں سے کہیں نہیں گیا۔‘‘ ہارڈوک بولا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ شیرف بولا۔ ’’تم فی الحال یہ علاقہ نہیں چھوڑو گے اور اگر کہیں جانا ہو تو پہلے مجھے بتاؤ گے کیونکہ تم مرکزی گواہ ہو۔‘‘

مائیک اور تھامسن کے جانے کے بعد شیفرڈ نے کہا۔ ’’آئندہ تم میرے معاملے میں دخل نہ دینا۔‘‘

’’میں نے صرف اس وجہ سے تمہیں روکا کہ یہ ہارڈوک کے لیے اچھا نہ ہوتا۔‘‘

’’میں اپنے مؤکلوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔‘‘

شیرف اور تھامسن کچھ فاصلے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان کے پاس گیا اور بولا۔ ’’ہارڈوک یہاں پروٹ کی بیوی کے لیے کچھ مٹر اور گوشت لے کر آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی ان چیزوں کو استعمال کر سکتی ہے۔‘‘

مائیک نے اپنے ڈپٹی کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ’’ہاں، ہمیں ایک تھیلا ملا ہے جس میں یہ دونوں چیزیں ہیں۔‘‘

شیرف نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ’’ہمیں آدھے گھنٹے کی مہلت دو تاکہ ہم یہ افسوسناک خبر اس کی بیوی تک پہنچا سکیں۔ اس کے بعد ہارڈوک یہ چیزیں وہاں لے جا سکتا ہے۔‘‘

’’ہاں، بھوکا رہنے سے یہ بہتر ہے۔‘‘ میں نے جل کر کہا۔

میں گھر گیا تاکہ یہ خبر آنٹی مارگریٹ اور آنٹی پامیلا کو سنا دوں۔ یہ دونوں عورتیں میری زندگی کا اہم حصہ تھیں اور میں ان سے بہت محبت کرتا تھا کیونکہ انہوں نے ہی ماں کے مرنے کے بعد میری پرورش کی تھی اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی ایک ٹوکری میں چیزیں رکھنا شروع کر دیں جن میں دلیا، آٹا، گھی، بیکنگ پوڈر اور تھوڑا سا نمکین گوشت شامل تھا۔ ہمارے گھر کام کرنے والی امیلیا اس کام میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔

آنٹی مارگریٹ اور امیلیا کے جانے کے بعد شیفرڈ میرے گھر آیا۔ وہ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ میں اسے بیٹھک میں لے گیا اور مشروب سے اس کی تواضع کی۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ ’’معاف کرنا، میں وہاں تم سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا لیکن......‘‘

’’اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔‘‘

’’تمہارے خیال میں پروٹ کو گولی کون مار سکتا ہے اور وہ گن کہاں ہے؟‘‘

’’یہی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کسی نے بلندی سے اس پر گولی چلائی ہو۔‘‘

’’نہیں کیونکہ گولی نیچے جانے کے بجائے سر میں سے پار ہو گئی۔‘‘

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ آنٹی مارگریٹ واپس آگئی۔ اس نے ایک نظر شیفرڈ پر ڈالی۔ اسے ہیلو کہا اور چلی

گئی۔ وہ کچھ اکھڑی اکھڑی لگ رہی تھی۔ شیفرڈ نے اسے محسوس کیا اور بولا۔ ’’بہتر ہے کہ میں مزید ڈرنک نہ کروں۔‘‘

اس کے بعد ہم دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ شیفرڈ نے کہا۔ ’’اگر ہم عدالتی چارہ جوئی کریں تو یہ بے چارے کاشت کار بھوکے مرنے سے بچ جائیں گے۔‘‘

اس کے منہ سے ’ہم‘ کا لفظ سن کر میں چونک گیا۔ ویسے تو میں کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ وہ یونین کی سرگرمیوں میں شامل ہو گیا ہے لیکن اب مجھے یقین ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ’’میں اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔‘‘

’’جیک، ہماری لڑائی تم سب زمینداروں سے ہے۔‘‘

’’مجھے عدالت کے فیصلے کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم پہلے ہی اپنے مزارعوں کو زرِ تلافی میں حصہ دینے کے علاوہ بھی بہت کچھ دے رہے ہیں۔‘‘ حقیقت بھی یہی تھی کہ ہمیں ان زمینوں سے کوئی آمدنی نہیں ہو رہی تھی اور ہمارا گزارا اس جمع پونجی سے ہو رہا تھا جو ہمارے باپ دادا نے اکٹھی کی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ رقم کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی جس کا منافع آتا تھا۔

’’مسئلہ یہ نہیں ہے۔‘‘ شیفرڈ بولا۔ ’’یقیناً تم بہت اچھے اور فیاض لوگ ہو لیکن اس سے یونین یا مزارعوں کو کیا فائدہ ہوگا۔ وہ اجتماعی طور پر اپنا حق مانگ رہے ہیں۔‘‘

’’مجھے امید ہے کہ تم انقلاب کی بات نہیں کر رہے۔‘‘

’’کچھ لوگ ایسا سوچ رہے ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’اب مجھے چلنا چاہیے۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ کھانا کھا کر چلے جاتے۔‘‘

’’نہیں، مجھے ہارڈوک کو دیکھنا ہے۔ کہیں وہ گرفتار تو نہیں ہو گیا۔‘‘

’’کیا پروٹ بھی یونین کا ممبر تھا؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ شیفرڈ نے کہا۔ ’’بلکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مالکوں کے لیے مخبری کرتا تھا۔‘‘

’’مجھے نہیں لگتا کہ ہارڈوک بھی ایسا سوچتا ہو اور مالکان بھی اسے مخبری کرنے کا معقول معاوضہ نہیں دے سکتے۔ ورنہ اس کے گھر میں فاقے نہ ہو رہے ہوتے۔‘‘

’’میں نے صرف یہ کہا کہ کچھ لوگ ایسا سوچ رہے تھے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم چاہو تو اپنے طور پر معلوم کر لو۔‘‘

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ’’مالکان مجھ پر بھروسا نہیں کرتے لیکن اگر مجھے کچھ معلوم ہوا تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔‘‘

میں شیفرڈ کو رخصت کر کے واپس آیا تو سٹنگ روم میں آنٹی مارگریٹ اور پامیلا سر جوڑے بیٹھی ہوئی تھیں جیسے ان کے درمیان کوئی سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہو۔ میں نے پوچھا۔

’’آنٹی کیا بات ہے؟‘‘

پامیلا بولی۔ ’’وہ بے چاری عورت۔ اس کی زندگی بہت بری گزر رہی ہے۔‘‘

آنٹی مارگریٹ نے بھی تائید میں سر ہلایا جو مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ کیونکہ ان کے لیے یہ ایک عام بات تھی۔ یہاں

کہتے ہیں کہ لڑکیاں بہترین لباس پہن کر اس وقت تک خوش نہیں ہوتیں، جب تک کوئی دوسرا شخص ان کی تعریف نہ کرے۔

آنسہ جہاں آرا بیگم بازار سے نئے فیشن کا، مہین کپڑے کا لباس لے کر آئیں، اسے پہن کر قدِ آدم آئینے کے پاس گئیں۔ سراپا کا جائزہ لیا مگر حسبِ عادت مطمئن نہ ہوئیں، ان کی نظریں ادھر ادھر کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنے لگیں جو تعریفی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھے۔

اتفاق سے سامنے والی بلڈنگ کے چھجے پر بیٹھا ہوا ایک پلمبر پائپ درست کر رہا تھا۔ آنسہ جہاں آرا بیگم نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے فرش پر زور زور سے پاؤں مارے، وہ متوجہ نہیں ہوا تو ایک انگڑائیوں بھرا گانا گایا۔ پھر بھی وہ متوجہ نہیں ہوا تو غصے میں بھر کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئیں اور ایک کنکر اٹھا کر پلمبر کی طرف پھینکا۔

پلمبر نے گھوم کر ان کی طرف دیکھا اور بولا۔ ’’محترمہ! کیا آپ کو زندگی میں پہلی بار کسی پلمبر کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؟‘‘

کے پی کے سے اویس بخاری کا جواب

ایک تھانیدار صاحب کا مرغ گم ہو گیا۔ کسی میراثی نے مرغ کو پکڑا اور ذبح کر کے کھا لیا اور مرغ کی کھال دیوار پر لٹکا دی۔ جب تھانے دار کو مرغ نہ ملا تو وہ وردی ڈال کر بڑے رعب کے ساتھ میراثی کے گھر آگئے۔ بڑے رعب سے پوچھا کہ ہمارا مرغ تو ادھر نہیں آیا۔ میراثی کہنے لگا کہ جناب آپ کا مرغ یہاں آیا ضرور تھا مگر یہ وردی اُتار کر پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔

سریش پانڈے کا شگفتہ پارہ ہڑپہ سے

کی عورتیں عموماً ایسے ہی پھٹے پرانے کپڑوں میں نظر آتی تھیں لیکن شاید پروٹ کی بیوی کے حالات اس سے بھی بُرے ہوں۔ ممکن ہے کہ اسے ٹی بی یا کوئی مہلک بیماری ہو۔

اگلے روز صبح میں کھیتوں کی طرف گیا۔ بے اختیار میرے قدم اس جانب اٹھ گئے جہاں گزشتہ روز پروٹ کی لاش ملی تھی۔ درختوں کی قطار کی دوسری جانب کری کے کھیت تھے وہاں موس کری اور رین جونز کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں ہیلو کہا تو انہوں نے بھی جواب میں ہیلو کہہ دیا۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

موس کری نے میری طرف دیکھا اور ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''اسے قتل کیا گیا ہے۔''

''یقیناً یہ خودکشی نہیں لگتی۔''

جونز بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور ہم جانتے ہیں کہ یہ قتل کس نے کیا ہے۔''

''وہ کون ہے ریڈی؟''

''یہ وہی کمیونسٹ ہیں۔'' کری نے اسے خاموش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بولتا رہا اور اس نے کمیونسٹوں پر الزام لگایا کہ وہ سیاہ فام لوگوں کو منظم کر رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یونین کی میٹنگوں میں سفید اور سیاہ فام دونوں ہی موجود ہوتے ہیں۔''

''تمہیں یونین کے بارے میں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

جونز اتنے غصے میں تھا کہ اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بجائے کری نے جواب دیا۔ ''جیک! ہمارے پاس کچھ ایسی معلومات اور حقائق ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

''مجھے بھی تو معلوم ہو کہ وہ کون سے حقائق ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہمیں ناقابلِ مواخذہ ذرائع سے معلوم ہو گیا ہے کہ مجرم کون ہے؟'' موس کری نے کہا۔

''ناقابلِ مواخذہ۔'' میں نے دہراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایسے کسی ذریعے کا علم نہیں۔''

جونز بولا۔ ''تم خود ان کمیونسٹوں سے ملتے ہو۔''

اب میری سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ میرے دادا نے اپنے سیاسی کیریئر کی قربانی دے کر ایک ایسے بل کی حمایت کی تھی جس میں نجی عدالتیں قائم کرنے اور تشدد کر کے مارنے کی ممانعت کی گئی تھی۔ میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ''میرے دادا قانون پسند تھے۔ وہ ایسے پُرتشدد گروہوں کے خلاف تھے جو کسی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر مار ڈالیں کیونکہ انہیں اپنے طور پر اس کے مجرم ہونے کا یقین ہوتا ہے۔''

جونز کی آنکھوں میں چمک دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص بھی کسی ایسے گروہ کا حصہ رہ چکا ہے یا کم از کم اس نے ایسی کوشش ضرور کی ہوگی۔

موس کری نے کہا۔ ''تمہیں اس کی مخالفت کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارے دادا نے ایک کوشش ضرور کی تھی لیکن جب لوگوں کو انصاف نہ ملے تو وہ خود فیصلے کرتے ہیں۔''

''اور شاید کوئی سفید فام بھی اس کی زد میں آ جائے۔'' جونز نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ تمہارا دوست وکیل بھی ان میں شامل ہو۔''

میں نے واپس اپنے کھیتوں کی طرف چلنا شروع کر دیا اور اس جگہ پہنچا جہاں میری کار کھڑی ہوئی تھی۔ سام گاڑی کی صفائی کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''میں ہارڈوک کے پاس جانا چاہتا ہوں۔''

''اونہہ۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ضرور اس میں کوئی حقیقت ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لاش کے پاس قدموں کے نشانات نہ ملیں۔''

گویا یہ بات پہلے ہی سب کو معلوم ہو گئی تھی۔ ہر کوئی جان گیا تھا کہ پروٹ کو ایک ایسے شخص نے قتل کیا ہے جس نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا۔ وہ ہارڈوک بھی ہو سکتا ہے۔ میں اس موضوع پر سام سے گفتگو کرنے کے لیے وہاں نہیں رکا بلکہ جلد از جلد شیفرڈ سے مل کر اسے خبردار کرنا چاہ رہا تھا کہ اس کا نام پُرتشدد گروہ کی فہرست میں ہے۔

میں ہارڈوک کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ اور شیفرڈ باہر چبوترے پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے بچے ننگے پاؤں صحن میں کھیل رہے تھے۔ انہیں اس وقت جوتے نصیب ہوتے جب وہ کھیتوں میں کام کرنے کے قابل ہو جاتے تھے۔ ہارڈوک نے بتایا کہ اس کی بیوی اندر کچھ عورتوں کے ساتھ مصروف ہے۔ یہ نرسیں محکمۂ صحت کی طرف سے آئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''موس کری اور جونز لوگوں کو جمع کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے پیچھے آنا چاہتے ہیں۔''

''جونز شیخی خور ہے۔'' شیفرڈ نے کہا۔ ''اور بے وقوف بھی۔''

''کیا ایسے لوگ عموماً پُرتشدد گروہ میں شامل نہیں ہو جاتے۔''

شیفرڈ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا۔ ''تم دونوں میرے گھر کیوں نہیں آ جاتے۔ ہارڈوک تم اپنے گھر والوں کو بھی لے آؤ۔''

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی ہارڈوک نے نفی میں سر ہلا دیا اور بولا۔ ''نہیں، اگر کوئی مشکل آئی ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہوگی۔ میں یہ جگہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔''

یہ لوگ اپنی قسمت پر شاکر تھے اور بڑے سے بڑا نقصان ہونے پر بھی اف نہیں کرتے تھے چاہے ان کی فصلیں تباہ ہو جائیں یا انہیں کیڑا لگ جائے۔ ان کے بچے بھوک اور بیماری سے مر جائیں۔ میرا خیال ہے کہ ہارڈوک کے بھی دو یا تین بچے مر چکے تھے۔ ان میں سے ایک ویگن کے نیچے آ کر کچلا گیا۔ دوسرا بیماری سے مر گیا اور تیسرا ماں کے پیٹ میں ہی مر گیا۔

میں نے اس کے تین بچوں کو میدان میں کھیلتے ہوئے دیکھا اور یہ دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی کہ ان کے پیروں میں جوتے نہیں تھے اور وہ یخ بستہ زمین پر ننگے پاؤں رقص کر رہے تھے۔

محکمۂ صحت کی نرس باہر آئی تو سارے مرد کھڑے ہو گئے۔ شیفرڈ نے مارجوری کا تعارف مجھ سے کرایا۔ اس نے ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا تب مجھے احساس ہوا کہ میں اسے گھور رہا تھا، ہارڈوک کی بیوی دروازے پر آئی اور بچوں کو آواز دے کر بلانے لگی۔

میں نے شیفرڈ سے کہا۔ ''تم میرے ساتھ چل رہے ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ دیر یہاں رکوں گا۔''

شاید وہ سوچ رہا تھا کہ جو لوگ اسے مارنے آئیں گے، وہ انہیں سمجھا سکے گا لیکن میرا اندازہ تھا کہ ان کی آمد رات سے پہلے متوقع نہیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس وقت تک میں یہاں واپس آ جاؤں اور اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو بھی لا سکوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر شیرف سے کہا تو وہ آنے پر تیار ہوگا یا نہیں۔

شیفرڈ نے نرس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ مس مارجوری تمہارے ساتھ چلی جائے گی۔''

.... میں نرس کی جانب مڑا تو وہ بولی۔ ''میں بینز کے گھر جا رہی ہوں۔'' اس پر میں نے کہا کہ اسے وہاں اتار دوں گا تو وہ میری کار میں بیٹھ گئی۔ میں خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا اور میرے ذہن میں بہت سی باتیں آ رہی تھیں۔ نرس نے میری خاموشی کو محسوس کیا اور بولی۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں، معاف کرنا۔ میں کچھ سوچ رہا تھا۔''

''مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''میں پروٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا......''

میں نے دیکھا کہ وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ پروٹ کو کس نے قتل کیا ہے اور مجھے صرف ایک چیز چیک کرنا تھی۔ اس سے پہلے میں کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

''اگر تم خیال نہ کرو تو میں تمہارے گھر جانا چاہتی ہوں تاکہ تمہاری آنٹیوں کا شکریہ ادا کر سکوں کہ انہوں نے پروٹ کی بیوی اور دوسرے لوگوں کے لیے کھانے پینے کی اشیا بھیجیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کا رخ اپنے گھر کی جانب موڑ دیا۔ جیسے ہی کار گھر کے سامنے رکی تو آنٹی مارگریٹ اور آنٹی پامیلا دروازے پر آ گئیں۔ میں نے مارجوری کا تعارف کروانا چاہا لیکن وہ اسے جانتی تھیں۔ وہ اسے اپنے ساتھ بیٹھک میں لے گئیں اور میں کچن میں آ گیا جہاں امیلیا مہمانوں کے لیے چائے بنا رہی تھی۔

''تم نے پروٹ کے گھر کوئی خاص چیز دیکھی تھی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کیونکہ کچھ لوگ تشدد کر کے اپنے طور پر سزا دینا چاہتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کوئی بے گناہ مارا جائے۔ اس لیے اپنے طور پر حقائق جاننے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ اس تشدد کو روک سکوں۔''

امیلیا کچھ دیر سوچتی رہی جیسے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو پھر آہستہ سے بولی۔ ''ہم نے وہاں ایک گن دیکھی مسٹر جیک۔''

''گن؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ہاں ایک پرانی آرمی رائفل۔ وہ ایک کونے میں رکھی ہوئی تھی۔''

''کیا تم نے یا آنٹی مارگریٹ نے اس کے بارے میں پوچھا؟''

''ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''ٹھیک ہے امیلیا، میں سمجھ گیا۔''

اس نے چائے کی ٹرے تیار کی اور جاتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر جیک! کیا تم اسے روک سکتے ہو؟''

''مجھے یقین ہے کہ ایسا کر سکتا ہوں۔''

چائے کا دور ختم ہونے پر میں بھی پارلر میں چلا گیا۔ آنٹی مارگریٹ میرے پاس آکر بولی۔ ''جیک، میں نہیں جانتی کہ تم کیا سوچ کے، تم جانتے ہو......''

''آنٹی مارگریٹ۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ پروٹ کو کس نے قتل کیا اور میں یہ بات شیرف کو بتا رہا ہوں۔''

آنٹی پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''جیک! وہ ایک عفریت تھا۔ جب اس کا بیٹا زخمی ہوا تو اس نے اس کی بھی پروا نہیں کی، اس نے حادثے کے بعد ڈاکٹر کو علاج نہیں کرنے دیا۔ اس کے بیٹے کا ہاتھ مشین میں آگیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس کا ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔ لیکن پروٹ نے کہا کہ ایک بازو والا لڑکا اس کے کسی کام کا نہیں۔ چاہے اس کا زخم بھرے یا نہیں اور وہی ہوا۔ اس کا زخم نہیں بھر سکا اور وہ دس سالہ لڑکا خون میں زہر پھیل جانے کی وجہ سے مر گیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ ایک اور لڑکا پیدا کرے جو اس کے ساتھ کھیتوں میں کام کر سکے۔'' یہ کہتے ہوئے آنٹی مارگریٹ غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں نے آنٹی مارگریٹ سے کہا۔ ''وہ لوگوں کو اکٹھا کر رہے ہیں تاکہ ہارڈوک کو خود سزا دے سکیں اور اگر شیفرڈ نے اسے بچانے کی کوشش کی تو وہ بھی مارا جائے گا۔ تم نہیں چاہو گی کہ ہارڈوک کی بیوی اور بچے بے سہارا ہو جائیں اور نہ ہی شیفرڈ کو قتل ہوتا دیکھ سکو گی۔''

ایک منٹ تک سب خاموش رہے پھر آنٹی پاسیلا بولی۔ ''جیک کیا تم اس تشدد کو روک سکتے ہو؟''

''ہاں، وہ لوگ اندھیرا ہونے سے پہلے حرکت نہیں کریں گے اور میں اس سے پہلے شیرف کو لے کر آ جاؤں گا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہی بہتر رہے گا۔'' آنٹی پاسیلا نے کہا۔

''میں پہلے شیفرڈ کو لے کر پروٹ کے گھر چھوڑوں گا پھر شیرف کو لے کر آؤں گا۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔'' مس مارجوری نے کہا۔ ''وہاں ایک عورت کا ہونا ضروری ہے۔''

شیفرڈ ابھی تک ہارڈوک کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے میرے ساتھ چلنے میں پس و پیش کی لیکن مس مارجوری کے کہنے پر رضامند ہو گیا۔

''جیک بہتر ہوگا کہ کوئی حماقت نہ ہو۔'' اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے۔'' میں نے اسے بتانا شروع کیا کہ اس قتل کے بارے میں کیا جانتا ہوں۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے میری نظر کچھ لوگوں پر گئی۔ وہ بیس کے قریب تھے۔ ''ہمیں انہیں روکنا ہوگا۔'' میں نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ شیفرڈ بھی میرے ساتھ آنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔

میں نے ہجوم میں جاکر موس کری کو تلاش کیا اور وہ جیسے ہی سامنے آیا، میں نے اس سے کہا۔ ''موس، ان لوگوں کو واپس بھیج دو۔ ہارڈوک نے پروٹ کو قتل نہیں کیا۔''

جونز بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم کیا ڈراما کر رہے ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ قتل کس نے کیا ہے اور کیوں؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، اس کا یونین سے کوئی تعلق نہیں۔'' پھر میں نے موس کری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ پروٹ کو کس نے قتل کیا۔ جب میں اس کا نام شیرف کو بتاؤں گا تو تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا نام ایک ایسے شخص کے طور پر لیا جائے جو بے قصور لوگوں کو مارتا ہے۔''

موس کے کچھ کہنے سے پہلے جونز چلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم میں سے کسی کو بھی اپنی ساکھ کی فکر نہیں۔ یہاں کوئی ایسا شخص نہیں جس کے کمیونسٹوں اور تم جیسے شرپسندوں سے تعلقات ہوں۔ صرف تم ہی بُری ساکھ والے ہو۔''

''تھوڑا صبر کرو ریڈی۔'' موس کری ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''جیک تم کہہ رہے ہو کہ قاتل کو جانتے ہو پھر ہمیں اس کا نام کیوں نہیں بتا دیتے۔''

''میں خون خرابا نہیں چاہتا۔ اس لیے شیرف کو اس کا نام بتاؤں گا۔ کل تک تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ لوگ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں اور تمہاری موجودگی کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ تم مجرم کو بچانا چاہ رہے ہو۔''

''میں قسم کھاتا ہوں موس......''

جونز چلاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بھی تمہاری قسم پر یقین نہیں کرے گا۔ تم غدار ہو اور غالباً ماسکو سے پیسے لیتے ہو۔''

''موس۔'' میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''ہارڈوک یہاں سے کہیں نہیں جا رہا۔ اگر چاہو تو رات بھر اس کی نگرانی کر سکتے ہو لیکن اس کے بیوی بچوں کو خوف زدہ مت کرنا۔''

جونز نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن کری نے اسے روک دیا اور مجھ سے بولا۔ ''میں تمہارے خاندان کو برسوں سے جانتا ہوں اور میں نے ہمیشہ ان کی عزت کی گو کہ تمہارے دادا سے میرے سیاسی اختلافات تھے لیکن وہ بات پرانی ہو چکی۔ میں نہیں جانتا کہ تم صحیح ہو یا غلط لیکن پھر بھی تمہیں اپنی سچائی ثابت کرنے کا ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ آج کی رات ہارڈوک کو کوئی پریشان نہیں کرے گا۔''

جونز بولا۔ ''چوبیس گھنٹے۔ جیک تمہارے پاس اپنے آدمی کو بچانے کے لیے چوبیس گھنٹے ہیں۔''

میں واپس گاڑی پر آیا تو شیفرڈ نے پوچھا۔ ''یہ لوگ کیا کہہ رہے تھے؟''

''کچھ نہیں، البتہ جونز کا رویہ جارحانہ تھا۔ بہرحال وہ آج رات کچھ نہیں کریں گے۔ اس لیے ہمیں کچھ وقت مل گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے جیک، مجھے بتاؤ کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''پہلی بات تو یہ کہ کری نے پروٹ کو جاسوسی پر نہیں لگایا تھا اور یہ بات ہارڈوک بھی جانتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس خاندان کو خوراک کی ضرورت ہے۔ شاید اسے اُمید ہو کہ پروٹ یونین میں آجائے گا لیکن یونین ممبر کو رازداری کا حلف اٹھانا ہوتا ہے اور جب تک دوسرے لوگ بھروسا نہ کریں، وہ رکن نہیں بن سکتا۔''

میں نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔ ''جب ہارڈوک کی بیوی، بچوں کو بلانے باہر آئی تو وہ سب ننگے پاؤں تھے اور اسی وجہ سے زمین پر ان کے قدموں کے نشانات نہیں تھے۔ مس مارجوری تمہارے خیال میں پروٹ کی بیوی کا وزن کتنا ہوگا؟''

''چند روز قبل جب میں نے اس کا وزن کیا تو وہ چوراسی پونڈ کے لگ بھگ تھا۔''

ہم پروٹ کے مکان پر پہنچے تو اس کی بیوی ہمارا استقبال کرنے باہر آگئی۔ میرا خیال تھا کہ نرس نے اس کا وزن زیادہ بتایا، وہ اتنی کمزور اور مختصر تھی کہ آندھی اسے اڑا کر دوسری کاؤنٹی میں لے جاتی۔

وہ ہمیں اندر لے گئی اور بولی۔ ''اوون میں کچھ بسکٹ رکھے ہیں۔ یہ میں نے اس آٹے سے بنائے ہیں جو تمہاری آنٹیوں نے بھیجا تھا۔ مجھے بسکٹ بہت پسند ہیں لیکن میں نے ایک عرصے سے بسکٹ نہیں کھائے۔ ہمارا گزارا ڈبل روٹی پر ہوتا ہے۔''

میں نے کونے پر نگاہ ڈالی وہاں اسپرنگ فیلڈ رائفل رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور بولٹ ہٹا کر دیکھا۔ وہ بھری ہوئی تھی۔ میں نے اس کی نال سونگھی اور سمجھ گیا کہ اس سے فائر ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔

پروٹ کی بیوی مجھے دیکھ رہی تھی، وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم لوگ پروٹ کے بارے میں بات کرنے آئے ہو۔'' اس نے اپنا بوسیدہ لباس ٹھیک کیا۔ ''تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟''

''مسز پروٹ۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم نے اپنے شوہر کو گولی ماری تھی؟''

''ہاں۔'' وہ بے خوف لہجے میں بولی۔ ''میں نے یہ بات تمہاری آنٹی کو بھی بتا دی تھی۔ میں اس کے لیے مزید بچے پیدا کر کے انہیں مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔''

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر شیفرڈ تمہاری قانونی مدد کریں گے۔''

اس نے شیفرڈ کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''یہ تمہاری مہربانی ہے۔ میں تو یہی امید کر رہی تھی کہ عدالت میں پیش ہونا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ مجھے جیل بھیج دیا جائے یا بجلی کی کرسی پر بیٹھنا پڑے۔''

شیفرڈ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''نہیں مادام! تمہیں سزا نہیں ہوگی لیکن جج کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔''

''نہیں مسز پروٹ۔ اس کے سامنے پیش ہونے کے لیے ہم تمہیں ایک نیا لباس لے کر دیں گے۔''

''اور جوتے بھی۔'' میں نے کہا۔

''نیا لباس اور جوتے۔'' اس نے قہقہہ لگایا اور اپنے سیاہ دانت اور ان کے درمیان خلا کو چھپانے کے لیے جھریوں بھرا ہاتھ منہ پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو اس کتیا کے بچے کو بہت پہلے مار دیتی۔''

وہ قہقہے لگاتی رہی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا جیل میں کوئی اچھا دندان ساز ہوگا جو اس کے دانتوں کا علاج کر سکے تاہم مجھے یہ اطمینان تھا کہ وہاں اسے پیٹ بھرنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہاں اسے مناسب خوراک ملتی رہے گی۔

زخمی دل

محمد یاسر اعوان

محبت ایک ایسا شجر ہے... جس کی دو شاخیں ہیں... ایک سوکھی اور دوسری پتوں میں ڈوبی، کبھی کبھی یہ دونوں شاخیں زوال کا شکار ہو جاتی ہیں... اسی طرح انسان کے پاس ذہن ہے اور روح بھی... ہر براعظم میں انسان کو یہ چیزیں ملی ہیں تاکہ وہ محبت اور نفرت کر سکے... بہادر یا بزدل... نیک یا بدطن، بے لوث یا مفاد پرست بن سکے... انسانوں کے ذہن شکستوں کا محاذ ہیں اور کارناموں کے آئینہ دار بھی... ایسے ہی انسانوں کے گرد گھومتی زخمی کہانی... جس کے کردار زخمی تھے... دکھوں اور زخموں سے چور تھے... کسی کے زخمی دل کے لیے رفوگر تھے اور کسی دل کی پیوند کاری کے لیے مسیحا ہاتھ تھے... لہولہو رستے زخم جو مندمل ہونا چاہتے تھے...

سرورق کے لیے ایک انوکھی کہانی...... درد و خون میں ڈوبی زخمی دل کہانی

سال کے آخری دن کا سورج سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے تپتے ہوئے چہرے کی سرخی نے پاتال جیسی گہرائیوں والے سمندر کے پانی کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ سرخی...... لہریں لیتی ہوئی سرخی...... جیسے پانی میں آگ لگ گئی ہو۔ نہیں وہ خون کی لہریں تھیں۔ آگ اور خون...... سمندر میں لہریں لیتا ہوا خون...... سڑکوں اور گلی کوچوں میں بہتا ہوا خون...... آسمان کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے شعلے......

پورے شہر میں بڑے جوش و خروش سے نئے سال کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں اور کلبوں میں رات بھر جاری رہنے والے پروگراموں کو آخری شکل دی جا رہی تھی۔

پورا شہر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کہیں کہیں سے پٹاخوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، نوجوانوں کا جوش و خروش بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ شہر کے وسط میں واقع بڑے گراؤنڈ میں آتش بازی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دو مہینے پہلے ہی ماہر آتش بازوں کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں اور وہ اس گراؤنڈ کے ایک حصے پر قبضہ جمائے آتش بازی کے ساز و سامان کی تیاری میں مصروف تھے۔ دو دن سے شہر میں اعلان ہو رہا تھا کہ آخری شب ٹھیک بارہ بجے بڑے گراؤنڈ میں شاندار آتش بازی کا مظاہرہ کیا جائے گا۔

لوگ بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ بار بار اپنی کلائیوں پر بندھی گھڑیوں کو دیکھ رہے تھے کہ کب بارہ بجیں اور آتش بازی کا مظاہرہ شروع ہو۔ مختلف اطراف سے پٹاخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں پر کلاشنکوف لیے کھڑے تھے کہ گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر پہنچیں۔ تو وہ فائرنگ کر کے نئے سال کا استقبال کریں۔ گراؤنڈ کا ایک حصہ خواتین کے لیے بھی مخصوص تھا۔ اس حصے میں کچھ



نوجوان لڑکے بھی گھس آئے تھے جہاں موقع ملتا وہ کوئی شرارت کر گزرتے، جو پکڑا جاتا اس کی دھنائی ہو جاتی۔ یہاں بوڑھی خواتین بھی تھیں اور ادھیڑ عمر بھی لیکن زیادہ تعداد نوجوان لڑکیوں کی تھی۔ ان میں ثانیہ نام کی وہ لڑکی بھی تھی جو اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ آتش بازی کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اس ٹولی میں شامل لڑکیوں کا تعلق ایک ہی گلی کے مختلف گھروں سے تھا اور وہ گلی اس گراؤنڈ سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ اس لیے ان لڑکیوں کو گھر سے نکلنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ آس پاس کے علاقوں سے پٹاخوں اور گولیوں کے چلنے کی آوازوں میں شدت آگئی تھی حالانکہ، بارہ بجنے میں ابھی تین منٹ باقی تھے۔

ثانیہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ دوسری عورتوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتی ہوئی آگے آگئی، تاکہ وہ آتش بازی کا منظر اچھی طرح دیکھ سکیں۔ سب لوگوں کی نظریں گراؤنڈ کے وسط میں لگی ہوئی تھیں جہاں تیز روشنی کے حلقے میں آتش بازی کے کرتب باز اپنی تیار کردہ چیزوں کا آخری جائزہ لے رہے تھے۔

اور پھر ٹھیک بارہ بجے روشنی بجھ گئی۔ اچانک بتیاں بجھ جانے سے گہری تاریکی چھا گئی۔ اس اندھیرے سے مانوس ہونے کے لیے آنکھوں کو چند سیکنڈ لگے تھے۔ آس پاس کے علاقے دھماکوں اور فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھے۔ یہ آوازیں اس قدر شدید تھیں کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ گراؤنڈ کے وسط میں بھی پہلی پھلجھڑی چھوڑی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس آتش بازی کا مظاہرہ شروع ہو گیا۔ جسے دیکھنے کے لیے لوگ یہاں جمع تھے۔ پھلجھڑیاں، ہوائیاں اور نجانے کیا کیا تھا۔ آتش بازی کے اس مظاہرے کے لیے ہنرمندوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دی تھیں۔ ہوائیاں بلندی پر جا کر دھماکوں سے پھٹیں تو آسمان روشن ہو گیا۔ فضا میں ہر طرف پھلجھڑیاں سی پھوٹنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے رنگ و نور کی بارش ہو رہی ہو۔ لوگ محظوظ ہو رہے تھے۔ شور مچا کر اور تالیاں بجا کر ان ہنرمندوں کے فن کی داد دے رہے تھے۔

میدان میں اچانک ہی دھماکے ہونے لگے۔ بارود کے اس ڈھیر میں آگ لگ گئی تھی جہاں آتش بازی تیار کرنے والوں نے اپنے خیمے لگا رکھے تھے۔ ان دونوں خیموں میں بارود رکھا ہوا تھا اور کوئی چنگاری ایک خیمے پر گری جس نے بارود کے اس ڈھیر میں آگ لگا دی۔ بارود پھٹا تو چاروں طرف میزائل سے چلنے لگے۔ بھگدڑ مچ گئی، لوگ بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ اس وقت واقعی جنگ کا سماں تھا۔ لگتا تھا جیسے ہنستے بستے شہر پر اچانک ہی دشمن نے حملہ کر دیا ہو اور لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہوں۔ ثانیہ اور اس کی سہیلیاں بھی بدحواس ہو کر دوسروں کو دھکے دیتی اور خود دھکے کھاتی ہوئی ایک طرف دوڑ رہی تھیں۔ وہ آگ ان سب کی دشمن بن گئی

تھی جو چند لمحے پہلے انہیں دلچسپی اور تفریح فراہم کر رہی تھی۔ ثانیہ دو مرتبہ گری تھی۔ شگفتہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اپنے ساتھ کھینچتی چلی گئی۔

گراؤنڈ میں بعض لوگوں کے پاس بھی رائفلیں تھیں اور جب آتش بازی کا مظاہرہ شروع ہوا تھا تو انہوں نے بھی جوش میں آکر ہوائی فائرنگ شروع کردی تھی اور اب یہ لوگ شاید بدحواسی میں فائرنگ کر رہے تھے۔ ثانیہ اور شگفتہ دھکے کھاتی ہوئی ایک طرف دوڑتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ نسبتاً کھلی جگہ پر نکل آئیں اور پھر دفعتاً ثانیہ کے منہ سے ایک کربناک چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گری۔ شگفتہ یہی سمجھی کہ ثانیہ کسی پتھر وغیرہ سے ٹھوکر کھا کر گری ہے۔ ثانیہ کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ثانیہ کے ہاتھ کو کھینچ کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''ثانیہ اٹھو۔'' وہ اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔ ''دوسری لڑکیاں پتا نہیں کس طرف چلی گئی ہیں۔ ہم اس سامنے والی گلی سے نکل چلتے ہیں۔'' مگر ثانیہ نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ شگفتہ نے جھک کر اسے دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی تو چونک گئی۔ اسے ثانیہ کے سینے پر چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی۔ پہلے اس نے اپنے ہاتھ کو گھورا پھر ثانیہ کے سینے کو ٹٹولنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ثانیہ کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ شگفتہ اٹھ کر مدد کے لیے چیخنے لگی۔

تین چار آدمی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ایک نے جھک کر ثانیہ کو دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ''اسے شاید گولی لگی ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔''

''گولی۔'' شگفتہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

''کک...... کیا یہ...... مرگئی؟''

''ابھی زندہ ہے۔'' وہی آدمی ثانیہ کی نبض ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ''اگر فوری طور پر اسے اسپتال پہنچا دیا جائے تو شاید یہ بچ جائے۔ پلیز، اسے اٹھانے میں میری مدد کرو۔'' اس نے قریب کھڑے ہوئے دوسرے آدمیوں سے کہا۔

گراؤنڈ میں تو دھماکے ہو رہے تھے، شگفتہ کے دماغ میں بھی دھماکے ہونے لگے۔ تین آدمیوں نے مل کر ثانیہ کو اٹھا لیا اور تیزی سے ایک طرف چلنے لگے۔ شگفتہ بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

گراؤنڈ سے بھاگ کر آنے والے بہت سے لوگ سڑک پر پہنچ گئے تھے مگر یہاں بھگدڑ نہیں تھی۔ قریب ہی ایک شخص ہائی روف دین کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہا تھا۔

تین آدمیوں نے ثانیہ کو اٹھا رکھا تھا اور چوتھا ان کے ساتھ تھا۔ وہ دوڑ کر وین کے قریب پہنچ گیا۔

''اس لڑکی کو گولی لگی ہے۔'' وہ وین والے کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''اسے فوراً اسپتال لے جانا ہے۔ شاید بروقت طبی امداد ملنے سے بچ جائے۔ ہماری مدد کرو پلیز۔''

اس شخص نے فوراً ہی وین کا دروازہ کھول دیا۔ ثانیہ کو پچھلی ایک سیٹ پر ڈال دیا گیا۔ دو آدمی سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شگفتہ بھی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے ثانیہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ وہ ہچکیاں ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے رو رہی تھی۔

ثانیہ کے سینے کا ہلکا سا زیروبم بتا رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ ثانیہ کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ شگفتہ بھی اس کی ہم عمر تھی۔ دونوں گورنمنٹ کالج میں سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹس تھیں اور دونوں کے گھر بھی ساتھ ساتھ تھے۔ ثانیہ کی حالت دیکھ کر شگفتہ کے لیے اپنی حالت پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

قریب ترین اسپتال ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ بہت بڑا اسپتال تھا۔ وین تیز رفتاری سے فاصلہ سمیٹتی ہوئی عمارت کے وسیع و عریض پورچ میں رک گئی۔ ایمرجنسی شعبے کا اسٹاف فوراً حرکت میں آگیا اور ثانیہ کو وین سے نکال کر اسٹریچر پر منتقل کر دیا گیا۔ شگفتہ اسٹریچر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وین پر آنے والے دونوں آدمی وہیں رک گئے تھے۔ پھر دراز قد آدمی کچھ سوچ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے ساتھ ہولیا۔

ثانیہ کو ایمرجنسی میں پہنچا دیا گیا۔ دو ڈاکٹر بھی فوراً ہی وہاں پہنچ گئے۔ ان میں ایک نوجوان تھا اور دوسرا ادھیڑ عمر جس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے۔

''کیا ہوا...... ایکسیڈنٹ؟'' ادھیڑ عمر ڈاکٹر نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب، میری دوست کو گولی لگی ہے۔ خدا کے لیے اسے بچا لیجیے۔'' شگفتہ ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے گڑگڑائی۔

''گولی!'' ڈاکٹر ٹھٹک گیا۔ ''سوری، یہ پولیس کیس ہے...... اسے سرکاری اسپتال میں لے جایئے۔''

''ڈاکٹر صاحب پلیز۔'' شگفتہ گڑگڑائی۔ ''سرکاری اسپتال یہاں سے بہت دور ہے۔ وہاں جاتے ہوئے یہ ختم ہو جائے گی۔ اسے بچا لیجیے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

''ہمیں ایسا کوئی کیس لینے کی اجازت نہیں ہے۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ پرائیویٹ اسپتال ہے۔ ہم کسی ایسے مریض کو ٹریٹ منٹ نہیں......''

''ڈاکٹر!'' شگفتہ کے ساتھ آنے والے دراز قد شخص نے اس کی بات کاٹ دی اور جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور قواعد و ضوابط سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ پرائیویٹ اسپتالوں کو اس قسم کے کیس لینے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن لڑکی کی حالت تشویشناک ہے۔ سرکاری اسپتال جانے کی کوشش میں اس کی جان بھی جاسکتی ہے۔ بعض اوقات صورتِ حال سنگین ہو تو...... قواعد و ضوابط کو نظرانداز بھی کیا جاسکتا ہے۔ میں اس کیس کی ذمّے داری لینے کو تیار ہوں، جلدی کیجیے۔ وقت بہت کم ہے۔''

ڈاکٹر نے کچھ کہنا چاہا مگر اس شخص نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ ''میں انسانیت کے ناتے آپ سے درخواست کر رہا ہوں ڈاکٹر۔ آپ بھی صاحبِ اولاد ہیں۔ خدانخواستہ اگر آپ کے کسی بچے کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہوتا تو آپ وہ سب کچھ کرتے، جو آپ کے بس میں ہوتا۔ اسے بھی اپنی بیٹی سمجھ کر اس کی جان بچانے کی کوشش کریں ڈاکٹر، پلیز۔'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ ''یہ کوئی واردات نہیں ہے۔ اتفاقی حادثہ ہے اور پھر میں یہاں موجود ہوں۔ ساری ذمّے داری لینے کو تیار ہوں۔ پلیز جلدی کریں۔''

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی ثانیہ کی طرف دیکھا اور اس کا دل پسیج گیا۔ اس نے اپنے ساتھی نوجوان ڈاکٹر سے کچھ کہا اور پھر ثانیہ کو آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔

شگفتہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی رو رہی تھی۔ دراز قامت پولیس آفیسر نے اسے بانہوں سے پکڑ کر بینچ پر بٹھا دیا اور اسے تسلی دینے لگا۔ ''گھبراؤ نہیں بیٹی!'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہم نے اسے بروقت یہاں پہنچا دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو وہ بچ جائے گی۔ دعا کرو...... انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''انکل پلیز۔'' شگفتہ ہچکی لیتے ہوئے بولی۔ ''ثانیہ کے ابو کو اطلاع دے دیں۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو انکل جمال یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔''

''میں انہیں اطلاع دیتا ہوں، تم مجھے فون نمبر بتاؤ۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔

''ان کے ہاں فون نہیں ہے۔ میں اپنے گھر کا نمبر بتاتی ہوں، وہ ہمارے ساتھ والے گھر میں رہتے ہیں۔''

شگفتہ نے کہا۔ ''ہمارے گھر والوں کو گراؤنڈ میں اس حادثے کی اطلاع مل گئی ہوگی۔ وہ سب پریشان ہوں گے، آپ انہیں بتا دیجیے۔''

شگفتہ نے ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے گھر کا فون نمبر بتا دیا۔ دراز قد شخص اسے تسلی دیتا ہوا اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔

''تمہارے گھر والوں کو گراؤنڈ میں ہونے والی گڑبڑ کا پتا چل گیا ہے۔'' وہ شگفتہ کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری دوسری سہیلیاں اپنے گھروں کو پہنچ گئی ہیں۔ وہ لوگ تم دونوں کے لیے پریشان ہیں۔ تمہارے والد شفیق صاحب سے میری بات ہوئی تھی۔ میں نے انہیں تو ثانیہ کے بارے میں بتا دیا ہے لیکن ان سے درخواست کی ہے کہ ثانیہ کے والد کو...... فی الحال ثانیہ کی حالت کے بارے میں نہ بتایا جائے۔''

''وہ بچ جائے گی نا؟'' شگفتہ نے آنسو بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم جیسی پُرخلوص اور محبت کرنے والی دوست دعائیں مانگ رہی ہو تو اسے کیا ہوسکتا ہے۔ دل سے نکلی ہوئی دعا کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس پولیس آفیسر نے کہا۔ اس کا نام افضل ملک تھا۔ اور عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ دراز قد، صحت مند اور خوبرو......

وہ ایک ہفتہ پہلے چھٹی لے کر اپنے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور آج صبح ہی واپس آیا تھا۔ اس کا آج کا دن چھٹیوں میں شامل تھا اور کل یعنی نئے سال کے پہلے دن اسے رپورٹ کرنی تھی۔ وہ ایک دوست کے ہمراہ گراؤنڈ میں آتش بازی کا مظاہرہ دیکھنے آیا تھا کہ یہ خوفناک حادثہ پیش آگیا۔

افضل ملک ایک پولیس آفیسر تھا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جرائم پیشہ لوگوں سے نبردآزما ہوتے ہوئے گزرا تھا۔ کئی مجرم اس کے ہاتھوں...... اپنے انجام کو پہنچے تھے۔ اس نے زندگی میں بہت سے لوگوں کو تڑپتے دیکھا تھا لیکن اس کے دل میں کبھی ایسی ہوک نہیں اٹھی تھی۔ نجانے کیا بات تھی کہ شگفتہ کو چیختے دیکھ کر اور خون میں لت پت ثانیہ کو زمین پر پڑے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا تھا اور وقت ضائع کیے بغیر اسے اسپتال پہنچایا تھا۔

شگفتہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس نے دو اور سینئر ڈاکٹرز کو آپریشن تھیٹر میں جاتے دیکھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس

کے والد شفیق علی، دونوں بھائی، ثانیہ کے والد جمال اور دو تین آدمی راہداری میں داخل ہوئے۔ ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جمال کا چہرہ تو دھواں ہو رہا تھا۔ اسے شاید ثانیہ کے بارے میں کچھ بتا دیا گیا تھا۔ شگفتہ دوڑ کر اپنے والد شفیق علی سے لپٹ گئی اور پھر چند سیکنڈ بعد وہ جمال سے لپٹی رو رہی تھی۔

''میری بیٹی ثانیہ کہاں ہے، کیا ہوا ہے اُسے؟'' جمال نے کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی دہاڑیں مار کر رونا شروع کر دے گا۔

انسپکٹر افضل نے اسے بانہوں سے پکڑ کر شگفتہ سے الگ کیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''بڑے گراؤنڈ میں ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ ثانیہ کو گولی لگی ہے۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ دو تین سینئر سرجن ڈاکٹر اسے دیکھ رہے ہیں۔ دعا کیجیے اللہ بہتر کرے گا۔'' جمال دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ شفیق علی بھی اسے تسلی دے رہا تھا لیکن جمال کے لیے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ جمال کی عمر پچپن سال کے قریب تھی۔ وہ درمیانے قد کا کسی قدر بھاری بھرکم شخص تھا۔ ثانیہ اس کی اکلوتی اولاد تھی، وہ دو سال کی تھی جب اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ دوستوں اور عزیزوں نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی عورت دوسری عورت کی اولاد کو وہ پیار نہیں دے سکتی جو اسے ملنا چاہیے تھا۔ اس نے ثانیہ کو باپ ہی نہیں، ماں بن کر بھی پالا تھا۔ وسائل کم ہونے کے باوجود اس نے ثانیہ کو کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ بڑے ناز و نعم میں پالا تھا اس نے اپنی بیٹی کو...... اور...... آج وہی بیٹی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔

شفیق علی نے شگفتہ کو اپنے ایک بیٹے کے ساتھ گھر روانہ کر دیا تھا جبکہ دوسرا بیٹا وہیں موجود تھا۔ وہ سب جمال کو تسلی دے رہے تھے اور جمال کے آنسو کسی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

انسپکٹر افضل بھی وہیں موجود تھا۔ وہ اس وقت تک وہاں رہنا چاہتا تھا جب تک ثانیہ کے بارے میں کوئی..... تسلی نہ ہو جاتی۔ دو گھنٹے اور گزر گئے پھر جب ایک ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر آیا تو جمال دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

''میری بیٹی کیسی ہے ڈاکٹر صاحب؟ وہ بچ گئی ہے نا؟ خدا کے لیے اسے بچا لو۔'' وہ ڈاکٹر کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ وہ وہی ڈاکٹر تھا جسے افضل نے سفید بالوں والے ڈاکٹر کے ساتھ سب سے پہلے دیکھا تھا۔ ''کیا صورتِ حال ہے ڈاکٹر؟'' انسپکٹر افضل نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''کچھ پیچیدگیاں ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ڈاکٹر شمس اور دو دوسرے سینئر سرجن ڈاکٹروں پر مشتمل ٹیم یہ کیس دیکھ رہی ہے۔ تفصیل آپ کو ڈاکٹر شمس ہی بتا سکیں گے۔''

''وہ بچ تو جائے گی نا ڈاکٹر۔'' جمال بولا۔

''مایوس نہ ہوں، خدا سے دعا کیجیے۔'' ڈاکٹر کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور تقریباً پندرہ منٹ بعد وہی ڈاکٹر دوبارہ آپریشن تھیٹر میں چلا گیا۔

صبح کے چھ بجنے والے تھے۔ ثانیہ کو آپریشن تھیٹر میں تقریباً سوا پانچ گھنٹے ہو چکے تھے۔ انسپکٹر افضل ..... کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ہو سکتا ہے گولی ثانیہ کے دل کے آس پاس لگی ہو جس کی وجہ سے یقیناً کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہو۔ ثانیہ کو اسپتال لاتے ہوئے تو اس نے بھی دیکھا تھا کہ گولی ثانیہ کے سینے پر بائیں طرف لگی تھی۔

کیس خاصا پیچیدہ تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ سوا چھ بجے کے قریب ڈاکٹر شمس آپریشن تھیٹر سے باہر آیا تو جمال ایک دفعہ پھر دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ جمال نے ڈاکٹر شمس سے بھی وہی سوال کیا جو اس سے پہلے جونیئر ڈاکٹر سے کر چکا تھا۔

''اڑتالیس گھنٹے۔'' ڈاکٹر نے افضل ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اڑتالیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔ اگر اڑتالیس گھنٹوں تک سانس کی ڈوری قائم رہی تو اس کے زندہ بچ جانے کی امید کی جا سکتی ہے، لیکن فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہم تو دوا کر رہے ہیں، آپ دعا کیجیے۔''

''کیا میں اپنی بیٹی کو دیکھ سکتا ہوں ڈاکٹر صاحب۔'' جمال نے کہا۔

''نہیں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''اڑتالیس گھنٹوں تک اسے آپریشن تھیٹر میں آبزرویشن میں رکھا جائے گا۔ اس کے بعد ہی صحیح صورتِ حال سامنے آئے گی۔ آپ لوگوں کا یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن آپ مریضہ کے والد ہیں۔ آپ میرے ساتھ آیئے اور آفیسر آپ بھی۔'' آخری الفاظ اس نے افضل ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہے۔

وہ سب ڈاکٹر شمس کے ساتھ دفتر استقبالیہ میں آ گئے، جہاں کچھ کاغذات پر جمال کے دستخط کروائے گئے۔ دو کاغذات پر انسپکٹر افضل ملک نے بھی دستخط کیے تھے۔ فون نمبر شفیق علی کا لکھوا دیا گیا تھا..... انسپکٹر افضل ملک نے بھی

اپنا نمبر لکھوا دیا تھا۔ آخر میں ڈاکٹر شمس نے پندرہ ہزار روپے جمع کرانے کو کہا تو جمال نے فوراً ہی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر میز پر رکھ دی۔ ''فون پر اطلاع ملنے کے بعد میں نے احتیاطاً یہ رقم جیب میں رکھ لی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''یہ پورے دس ہزار ہیں، باقی پانچ ہزار بھی تھوڑی دیر میں جمع کرا دوں گا۔ اخراجات کی پروا مت کیجیے ڈاکٹر صاحب، ثانیہ کی زندگی بچانے کے لیے میں بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار ہوں۔''

''زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔'' ڈاکٹر شمس نے جواب دیا۔ ''ہم اس بچی کو بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔'' اس کے آدھے گھنٹے بعد وہ لوگ اسپتال کی عمارت سے نکل رہے تھے۔ اسپتال کے برآمدے میں دو آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک شفیق علی کا شناسا نکلا۔ اس سے علیک سلیک کے بعد باتوں سے پتا چلا کہ گزشتہ رات کے ہنگامے میں تین افراد جاں بحق ہوئے تھے۔

دن کا ملگجا سا اجالا پھیل رہا تھا۔ نئے سال کا پہلا دن طلوع ہو رہا تھا اور اس نئے سال نے اپنے ابتدائی لمحوں میں ہی اپنی بھینٹ لے لی تھی۔

شفیق علی کے پاس گاڑی تھی۔ انسپکٹر افضل کو بھی گاڑی میں بٹھا لیا گیا تھا۔ اس کا مکان اس گراؤنڈ کے دوسری طرف تھا، جہاں رات کو یہ ہنگامہ ہوا تھا۔ شفیق علی نے گاڑی کا رخ اس طرف موڑ لیا۔ افضل ملک انہیں بتا رہا تھا کہ یہ سارا ہنگامہ کس طرح ہوا تھا۔

''خوشی کے ایسے موقعوں پر آتش بازی والی بات تو کسی حد تک سمجھ میں آتی ہے لیکن فائرنگ کی تک سمجھ میں نہیں آتی، انسپکٹر صاحب...... ایسے موقعوں پر قانون کیوں بے بس ہو جاتا ہے؟'' شفیق علی نے کہا۔

''قانون بے بس نہیں ہے۔'' افضل ملک نے جواب دیا۔ ''بعض مصلحتیں ہوتی ہیں جو قانون کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اس معاملے کی انکوائری ہو گی اور اس کے ذمے دار افراد کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ اگرچہ ثانیہ والے کیس کی ابھی تک پولیس میں رپورٹ نہیں ہوئی لیکن میں صبح سب سے پہلا کام یہی کروں گا کہ متعلقہ تھانے میں اس کی باقاعدہ رپورٹ درج ہو اور اس کی تحقیقات کی جائے۔''

باقی راستہ اسی واقعے پر بات چیت کرتے ہوئے گزرا تھا۔ انسپکٹر افضل کو اس کے مکان کے سامنے چھوڑ کر شفیق علی نے گاڑی دوسری سڑک پر موڑ لی۔

انسپکٹر افضل ملک اپنے عزیز کی شادی پر گیا تھا تو اپنی فیملی کو وہیں چھوڑ آیا تھا۔ وہ چند روز بعد آنے والے تھے۔

اس وقت دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ افضل مکان میں داخل ہوتے ہی سیدھا کچن میں آیا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور جانتا تھا کہ اگر اس وقت سو گیا تو دوپہر تک سوتا ہی رہے گا۔ اس لیے اس نے جاگتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے چائے بنائی اور برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر چسکیاں لینے لگا۔

انسپکٹر افضل ملک کا شمار پولیس کے اُن چند گنتی کے افسروں میں ہوتا تھا، جنہیں ذمے دار، فرض شناس اور دیانت دار سمجھا جاتا تھا۔ ایسے آفیسر نہ تو رشوت قبول کرتے تھے اور نہ ہی کسی سفارش کو مانتے تھے۔ انسپکٹر افضل ملک کے تین بچے تھے، سب سے بڑی بیٹی پندرہ سال کی تھی اور جب اس نے ثانیہ کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا تھا تو اس کی نظروں میں اپنی بیٹی کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے قواعد و ضوابط کو نظرانداز کرتے ہوئے ڈاکٹر کو زخمی ثانیہ کو ٹریٹمنٹ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

انسپکٹر افضل ملک نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ اس نے شام کے وقت ڈاکٹر شمس کو فون کر کے ثانیہ کے بارے میں معلوم کیا۔ اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس رات وہ جمال کے گھر جا کر بھی اس سے ملا تھا۔ اس کی حالت واقعی بہت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ثانیہ زندہ نہ بچ سکی تو جمال کا بھی ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اس سے اگلے روز شام کو افضل ملک نے پھر ڈاکٹر شمس کو فون کیا۔

''کیا آپ اسپتال آ سکتے ہیں آفیسر؟'' ڈاکٹر شمس نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے مسٹر شفیق کا فون بھی آیا تھا۔ میں نے انہیں بھی سات بجے بلایا ہے۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر، میں سات بجے پہنچ جاؤں گا۔'' افضل ملک نے کہا اور پھر ٹھیک سات بجے ڈاکٹر شمس کے کمرے میں وہ موجود تھا۔ ''یس ڈاکٹر! کیسی ہے ہماری بچی۔''

انسپکٹر افضل ملک نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس طرح کہا جیسے ثانیہ اس کی اپنی بیٹی ہو۔ شفیق علی بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

''صورتِ حال خاصی پیچیدہ ہے آفیسر۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے آپ دونوں حضرات کو بلایا ہے، تاکہ وضاحت کر سکوں۔''

''وہ زندہ تو ہے نا؟'' افضل ملک کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

''ہاں، وہ زندہ ہے لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ جسم و جان میں قائم یہ مبہم سا رابطہ کب منقطع ہوجائے۔'' ڈاکٹر شمس نے جواب دیا۔

''کیا وہ خطرے سے باہر نہیں ہوئی؟'' افضل ملک نے پوچھا۔

''بات یہ ہے آفیسر۔'' ڈاکٹر شمس اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''وہ لڑکی اب تک کس طرح زندگی کی سانس لے رہی ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔''

''میں سمجھا نہیں ڈاکٹر۔'' انسپکٹر افضل نے اسے گھورا۔

''گولی دل کے قریب پیوست ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اسے تو اسی وقت ختم ہوجانا چاہیے تھا جب اسے گولی لگی تھی لیکن یہ آپ جیسے نیک لوگوں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ اس کا سانس ابھی تک چل رہا ہے۔''

انسپکٹر افضل اور شفیق علی ڈاکٹر کے اس انکشاف پر سناٹے میں آگئے۔

''گولی ایسی جگہ پیوست ہے جس نے دل کو ابھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔'' ڈاکٹر شمس کہہ رہا تھا۔ ''یہ تاریخ کا کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ میڈیکل سائنس میں تین چار مثالیں ایسی اور بھی موجود ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ایک امریکی فوجی کو گولی دل کے قریب پیوست ہوگئی۔ اس کے بعد بھی وہ سترہ سال تک زندہ رہا۔ وہ موت کو سینے میں چھپائے زندگی کے دن گزارتا رہا اور پھر ایک روز...... وہ ڈاکٹرز کی اس ہدایت کو بھول گیا کہ کوئی غیر معمولی جسمانی حرکت اس کی موت کا باعث بن سکتی ہے...... ایک دن وہ اپنے گھر میں بانس کی سیڑھی پر کھڑا دیوار پر رنگ کر رہا تھا کہ سیڑھی پھسل گئی۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لیے چھلانگ لگا دی اور یہ چھلانگ ہی اس کی موت کا سبب بن گئی۔ دل میں پیوست گولی جسم کی غیر معمولی حرکت سے اپنی جگہ سے ہل گئی اور اس کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ ایک دو ایسی مثالیں اور بھی ہیں۔ وہ لوگ بھی اسی طرح موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔''

''ایسا ایک واقعہ میں نے بھی پڑھا تھا۔'' شفیق علی نے کہا۔ ''لیکن کیا آپریشن کرکے گولی کو نکالا نہیں جاسکتا؟''

''نہیں۔'' ڈاکٹر شمس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم نے کچھ اور سینئر ڈاکٹرز کو بھی بلایا تھا جو ایسے کیسز میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی رائے بھی یہی ہے کہ اگر گولی کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو لڑکی ختم ہوجائے گی۔''

''تو کیا وہ ساری عمر ایسے ہی...... ایسے ہی رہے گی؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''ساری زندگی؟'' ڈاکٹر نے یہ دو الفاظ دہرائے۔ ''اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی، چند لمحے، چند گھنٹے...... اور سالہا سال بھی گزر سکتے ہیں۔ غیر یقینی کیفیت رہے گی۔ آج دوپہر اس شعبے سے تعلق رکھنے والے ماہرین کی ایک میٹنگ ہوئی تھی، جس میں اس کیس کے ہر پہلو کی باریکیوں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا تھا۔ ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپریشن کرکے گولی نکالنے کی کوشش کرنا خطرناک ہوسکتا ہے...... البتہ، متبادل دل کا بندوبست ہوجائے تو اس لڑکی کی زندگی بچائی جاسکتی ہے۔''

''متبادل دل۔'' وہ دونوں ہی اچھل پڑے۔ ''کیا آپ کے خیال میں دل ایسی چیز ہے کہ اسے بازار سے خریدا جاسکے۔'' انسپکٹر افضل ملک نے کہا۔

''آپ بھول رہے ہیں کہ ہم اکیسویں صدی میں رہ رہے ہیں۔'' ڈاکٹر شمس نے کہا۔

''میرا خیال ہے، کچھ عرصہ پہلے میں نے ایسی کوئی بات سنی تھی۔'' انسپکٹر افضل نے کہا۔ وہ چند لمحے خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''آپ لوگوں کی رائے ہے کہ متبادل دل سے اس لڑکی کی جان بچائی جاسکتی ہے لیکن کیا کوئی متبادل۔ دل اس قدر آسانی سے مل سکتا ہے؟''

''ہاں۔'' ڈاکٹر شمس نے کہا۔ ''اس دور میں میڈیکل سائنس بہت آگے جاچکی ہے۔ پہلے جس طرح بلڈ بینک ہوا کرتے تھے۔ اس طرح اب مختلف انسانی اعضا کے بینک بھی معرضِ وجود میں آچکے ہیں۔ پچھلی صدی میں تو صورتِ حال یہ تھی کہ اگر کسی مریض کی جان بچانے کے لیے گردے کی ضرورت پڑتی تھی تو اس کے لیے اخبارات میں اشتہار دیے جاتے تھے لیکن اب صورتِ حال مختلف ہے۔ کسی بھی کڈنی بینک سے فوری طور پر مطلوبہ بلڈ گروپ کا گردہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں کم از کم تین ہارٹ بینک موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بیشتر بڑے اسپتال ایسے ہیں جہاں ہارٹ ٹرانس پلانٹ کا بندوبست ہے۔ اس سلسلے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں...... لیکن......''

''لیکن کیا؟'' شفیق علی نے سوالیہ نظروں سے اس کی

طرف دیکھا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں اخراجات بہت زیادہ ہوں گے اور اس کے علاوہ اس بات کی ضمانت بھی نہیں دی جاسکتی کہ آپریشن کامیاب ہوگا یا نہیں؟ مریض کی جان بھی جاسکتی ہے۔'' ڈاکٹر شمس نے کہا تو شفیق نے کہا۔ ''اس سلسلے میں جمال سے بات کرنی ہوگی۔ ویسے آپ کے خیال میں اگر گولی رہنے دی جائے تو......''

''ایسی صورت میں بھی زندگی کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔'' ڈاکٹر شمس نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''موت تو اس لڑکی کے دل میں چھپی بیٹھی ہے اور وہ کسی بھی وقت حرکت میں آسکتی ہے۔ لڑکی ابھی کوما میں ہے۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر۔'' شفیق علی گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ سارا معاملہ جمال کے سامنے رکھتا ہوں۔ وہ اپنی بیٹی کو بہت چاہتا ہے۔ جو بھی فیصلہ کرنا ہے، اسے ہی کرنا ہے۔'' انسپکٹر افضل ملک بھی اٹھ گیا اور وہ دونوں ڈاکٹر شمس سے ہاتھ ملا کر اس کے دفتر سے باہر آگئے، وہ دونوں تھوڑی دیر تک اسپتال کے برآمدے میں کھڑے ہوکر صورتِ حال پر تبادلہ خیال کرتے رہے، پھر شفیق اس سے ہاتھ ملا کر اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا اور انسپکٹر افضل ملک اپنی سرکاری جیپ میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ ایک پرائیویٹ کلب تھا۔ اس کی ممبر شپ کی کم سے کم سالانہ فیس پانچ لاکھ روپے تھی اور زیادہ سے زیادہ فیس کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ اس فیس کو...... ڈونیشن کا نام بھی دیا جاتا تھا۔ لائف ٹائم ممبر شپ کی فیس پچاس لاکھ روپے تھی۔ کلب کی انتظامیہ اس کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً اپنے ممبرز سے فنڈز رجوع کرتی رہتی تھی اور یہ بڑی بڑی رقمیں ادا کرتے وقت کبھی کسی ممبر کے ماتھے پر شکن نہیں آئی تھی۔ اس کلب کے ممبر وہی لوگ تھے جنہیں خود بھی اپنی دولت کا اندازہ نہیں تھا۔ اُن کی آمدنی کے ذرائع لامحدود تھے۔ بڑے بڑے صنعت کار، ملٹی نیشنل تجارتی کمپنیوں کے مقامی سربراہ وغیرہ اس کلب کی ممبر شپ کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔

شہری آبادی سے میلوں دور ویرانے میں یہ کلب اپنے ممبرز کو تفریح اور عیش و نشاط کا ہر وہ سامان فراہم کرتا تھا جس کی زندگی میں، کوئی بھی شخص خواہش کرسکتا تھا۔ کلب کا رقبہ کئی ایکڑ اراضی پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف اونچی دیوار اور اس کے اوپر خاردار تاروں کی باڑھ تھی۔ شہر سے کلب تک پختہ سڑک تعمیر کی گئی تھی اور اس سڑک کے دونوں جانب درختوں کی قطاریں تھیں۔ کلب کی تین منزلہ عمارت بھی وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ گراؤنڈ فلور پر کلب کے دفاتر کے علاوہ، ڈائننگ ہال، ریکریشن روم، بلیئرڈ روم اور اس قسم کی تفریحات کے ہالز تھے۔ گراؤنڈ فلور پر ہی شاندار بار روم تھا جہاں دنیا کی مہنگی ترین اور ہر برانڈ کی شراب دستیاب تھی۔ اس کلب کی تیسری منزل پر رہائشی کمرے تھے۔ ان کمروں میں ممبرز کو ان کی خواہش کے مطابق بہت سی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ کلب کی عمارت کے سامنے وسیع سبزہ زار تھا، جہاں شام کے بعد ایک دوسرے سے فاصلے پر میزیں بچھا دی جاتیں۔ اس کے بائیں جانب باربی کیو اسٹینڈ تھا۔ عمارت کے بائیں پہلو میں بہت بڑا سوئمنگ پول تھا اور اس سے آگے کا علاقہ امریکا کی کسی قبائلی بستی کا منظر پیش کرتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھاس پھوس کے جھونپڑے تھے۔ گنجان درختوں میں ایک دوسرے سے فاصلے پر بظاہر گھاس پھوس کے جھونپڑے تھے، مگر ان میں بھی ایک حُسن تھا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ یہاں آنے والوں کو وہی تاثر دیا جائے جو امریکا کی کسی تاریک قبائلی بستی کا ہوسکتا ہے۔ دن کے وقت کلب میں اِکّا دُکّا لوگ ہی نظر آتے تھے لیکن شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد یہاں کی رونق بڑھنے لگتی اور رات دس گیارہ بجے تو یہاں...... زندگی گویا بھرپور شباب پر ہوتی تھی۔

اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور کلب میں سب سے زیادہ رونق ڈانس فلور اور اس ہال میں تھی جہاں جُوا ہو رہا تھا۔ اس ہال کی ایک میز کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ سب کروڑ پتی تھے اور بڑی دلچسپی سے تاش کی اس بازی کو دیکھ رہے تھے جو اس میز پر چل رہی تھی۔ یوں تو اس بازی میں حصہ لینے والے چار افراد تھے مگر اصل گیم دو میں ہو رہی تھی۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر سیٹھ اسلم تھا۔ یہ شخص شہر کے نواح میں کئی فیکٹریوں کا مالک تھا۔ شہر کے اندر بھی کئی بڑی بڑی بلڈنگز اس کی ملکیت تھیں۔ اس کے کارندے دولت کماتے تھے اور یہ خرچ کرتا تھا۔

اس کے سامنے والی کرسی پر ایک نہایت حسین عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ مسز صدیقی کی عمر یوں تو اٹھائیس، تیس کے لگ بھگ تھی، لیکن وہ کسی طرح بھی چوبیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس کے قیمتی لباس، اندازِ گفتگو اور حرکات کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ دولت کی اس کے پاس بھی کمی نہیں ہے۔

بازی میں شریک دوسرے دو آدمی اپنے کارڈ پھینک چکے تھے۔ سیٹھ اسلم اور مسز صدیقی کے پتے ان کے سامنے اوندھے پڑے تھے۔ ان دونوں نے اب تک صرف ایک ایک مرتبہ اپنے کارڈز دیکھے تھے اور دوبارہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ شاید دونوں کو اپنے اپنے کارڈز پر بھروسا تھا اور اسی لیے وہ داؤ لگائے جا رہے تھے۔

دونوں کے سامنے پلاسٹک کے رنگ برنگے چپس رکھے ہوئے تھے اور میز کے وسط میں چپس کے ڈھیر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سیٹھ اسلم نے سرخ رنگ کے پانچ چپس اپنے سامنے سے اٹھا کر ڈھیر میں شامل کر دیے اور مسز صدیقی کی جانب دیکھنے لگا۔ چپس کی مالیت ان کے رنگوں کے حساب سے تھی۔ سرخ رنگ کا ہر ٹکڑا پانچ ہزار کی قیمت رکھتا تھا۔

مسز صدیقی نے نظریں جھکا کر چپس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ آگئی تھی۔ ہونٹ ذرا سے کھل گئے تھے اور اس کے موتیوں جیسے سفید دانت چمک اٹھے تھے۔ اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے چپس میں سے سبز رنگ کے تین چپس اٹھا کر ڈھیر میں شامل کر دیے۔ یہ ہر ٹکڑا دس ہزار مالیت کا تھا۔ میز کے وسط میں رنگ برنگے ٹکڑوں سے ان کی مالیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس وقت کم از کم چار لاکھ روپے کی رقم داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

داؤ پر لگی ہوئی رقم بڑھتی گئی۔ میز پر چپس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ مسز صدیقی نے ایک بار پھر مسکرا کر سیٹھ اسلم کی طرف دیکھا۔ اسی وقت ایک آدمی میز کے گرد کھڑے ہوئے لوگوں کو ہٹاتا ہوا آگے آگیا۔ اس نے جھک کر مسز صدیقی کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور واپس چلا گیا۔

مسز صدیقی کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا مگر اس نے بڑی خوب صورتی سے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور اپنے سامنے رکھے ہوئے چپس اٹھا کر ڈھیر میں شامل کر دیے اور اسلم سیٹھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شو کیجیے مسٹر اسلم۔''

''کیا خیال ہے۔'' سیٹھ اسلم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے اپنے کارڈز اٹھا کر دیکھے بغیر میز پر پلٹ دیے۔ وہ مسز صدیقی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ چپس اٹھا لوں؟''

''ابھی نہیں مسٹر اسلم۔'' مسز صدیقی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور پھر اس نے بھی اپنے پتے اٹھا کر بغیر دیکھے پلٹ دیے۔ میز کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے منہ سے بے اختیار 'اوہ' کی آوازیں نکل گئیں۔ حکم کا اکا، حکم کی بیگم اور حکم کا نہلا تھا۔

''تم جیت گئیں مسز صدیقی۔'' سیٹھ اسلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اتنی بڑی بازی ہار جانے کے بعد بھی اس کے ماتھے پر ایک شکن بھی نہیں آئی تھی۔ ''یہ کیا بات ہوئی مسز صدیقی۔'' سیٹھ اسلم اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تو بازی گرم ہوئی ہے اور آپ اٹھ کر جا رہی ہیں۔''

''فون کال ہے۔'' ناہید صدیقی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں واپس آؤں گی۔''

وہ گراؤنڈ فلور پر لفٹ سے باہر نکلی اور راہداری سے نکل کر سائڈ والے دروازے سے باہر نکل گئی اور دروازے کے قریب ہی رک کر متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ تقریباً پچیس گز کے فاصلے پر درخت کے نیچے وہ آدمی کھڑا تھا جس نے اس کے کان میں کچھ دیر پہلے سرگوشی کی تھی۔

''کیا بات ہے......؟'' وہ اس کے قریب پہنچ کر بولی۔

''تھوڑی دیر پہلے میں نے اس لڑکی کو یہاں دیکھا تھا، اس لیے میں نے آپ کو بتا دینا ضروری سمجھا۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''تمہارا مطلب ہے فرحانہ مگر وہ یہاں کیسے آسکتی ہے؟'' ناہید صدیقی کے لہجے میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔

''وہ کسی اور شخص کے ساتھ آئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے ان دونوں کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا تھا پھر تھوڑی دیر بعد جب میں ہال میں داخل ہوا تو وہ شخص اکیلا بیٹھا تھا مگر فرحانہ......کہیں دکھائی نہیں دی۔''

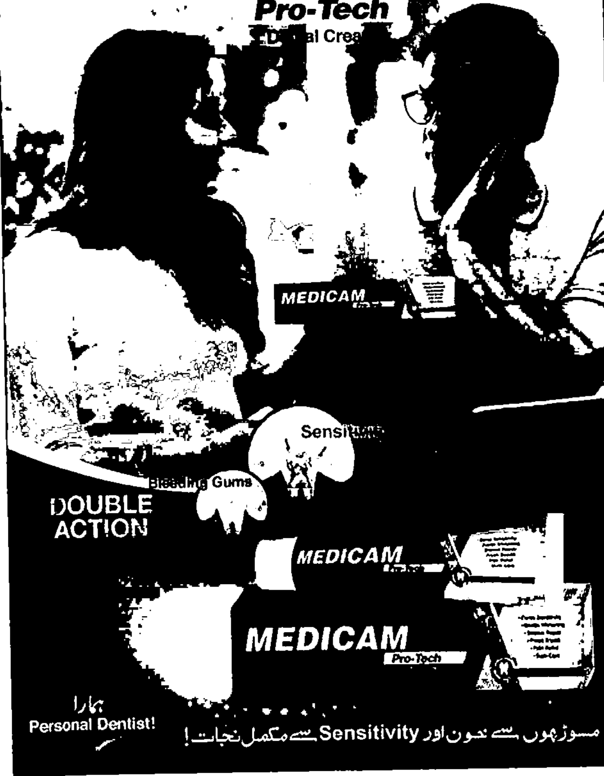
''اور صدیقی کہاں ہے؟'' ناہید نے پوچھا۔

''وہ سوئمنگ پول کی طرف بیٹھے ہوئے ہیں، مسٹر داؤد کے ساتھ۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں دیکھتی ہوں۔ تم فرحانہ پر نظر رکھنا۔ اس کتیا سے اب مجھے خوف آنے لگا ہے۔'' ناہید نے کہا۔

وہ وہاں سے چلا گیا۔ ناہید چند منٹ وہاں کھڑی رہی پھر اوپر سے چکر لگاتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف آگئی۔

اس وقت اگرچہ ساڑھے بارہ بج چکے تھے مگر سوئمنگ پول پر بھی بڑی رونق تھی۔ حسین و جوان لڑکیاں مختصر ترین لباس پہنے پیراکی کر رہی تھیں۔ مرد بھی تھے، جو ان کے آس پاس پانی میں منڈلا رہے تھے۔ پول کے اطراف میں وہ لوگ بیٹھے تھے جنہیں پیراکی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر



آنکھوں کو تراوٹ پہنچانے کے لیے یہاں آگئے تھے۔

ناہید صدیقی ایک طرف کھڑی ہو کر سوئمنگ پول کے اطراف میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ اسے سیٹھ داؤد تو ایک جگہ نظر آ گیا مگر صدیقی دکھائی نہیں دیا۔

''ہیلو مسٹر داؤد۔'' ناہید قریب پہنچ کر بولی۔ ''تھوڑی دیر پہلے صدیقی صاحب آپ کے پاس بیٹھے تھے، کہاں چلے گئے؟''

''ارے بھئی، کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔'' داؤد اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''ویسے تمہارا شوہر ہے کمال کی چیز۔ اس عمر میں بھی تتلیوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہے۔ ویسے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم میں کیا کمی ہے۔''

ناہید چند لمحے خشمگیں نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کا شوہر صدیقی فرحانہ کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ وہ اوپر سے گھومتی ہوئی دوبارہ عمارت میں داخل ہو گئی۔ وہ مختلف ہالز کا چکر لگاتی ہوئی باہر آ کر لان میں ایک کرسی پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ صدیقی اور فرحانہ کہاں ہوں گے؟

ناہید کی عمر اٹھائیس تیس سال تھی۔ پانچ سال پہلے جب اس کی شادی ہوئی تھی تو وہ آج سے زیادہ خوب صورت تھی۔ وہ اس وقت یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ صرف ایک ہفتہ پہلے اسے بتایا گیا تھا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ ماں باپ کے اس فیصلے پر بھونچکا سی رہ گئی تھی اور جب اسے پتا چلا کہ اس کے ہونے والے شوہر کی عمر پچپن چھپن سال ہے تو وہ سر پیٹ کر رہ گئی تھی۔ کریم صدیقی اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ اکثر ان کے گھر بھی آیا کرتا تھا۔ وہ نہ صرف عمر میں اس کے باپ کے برابر تھا بلکہ شکل و صورت بھی ایسی ہی تھی۔ اس کی نوجوانی میں کوئی لڑکی اس کے قریب نہیں آئی ہوگی مگر سچی بات تو یہ ہے کہ عمر اور شکل و صورت کو کون دیکھتا ہے۔ لوگ تو دولت کی پوجا کرتے ہیں اور سیٹھ کریم صدیقی کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ وہ ایک بہت بڑا بزنس مین تھا۔ اس کے نام کا سکہ چلتا تھا وہ جس تجارتی کمپنی میں سرمایہ کاری کرتا، اس کے شیئرز کے بھاؤ آسمان پر پہنچ جاتے اور جس کمپنی سے سرمایہ نکال لیتا، اس کا دیوالیا ہو جاتا۔

بوڑھا اور بدصورت ہونے کے باوجود وہ اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین میں بہت ہر دل عزیز تھا۔ خواتین کو قیمتی تحائف سے نوازنا اس کی عادت تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بہت سی خواتین تو محض اس سے کچھ اینٹھنے کے لیے اسے بے وقوف بناتی ہیں۔ اس کا مذاق بھی اُڑایا جاتا۔ کئی عورتوں نے پیار سے اسے بندر کے خطاب سے بھی نوازا تھا مگر اس نے کبھی کسی بات کا برا نہیں مانا تھا۔ کریم صدیقی دل کا بُرا نہیں تھا۔ وہ عام لوگوں کی مدد بھی دل کھول کر کرتا تھا۔ کئی رفاہی ادارے اس کے فنڈز پر چل رہے تھے۔ ٹرسٹ کے تحت چلنے والا ایک بہت بڑا اسپتال اسی کے نام پر تھا۔ وہ اس اسپتال کو دس لاکھ روپے ماہانہ ڈونیشن دیتا تھا۔ ملک کے چند قابل ترین ڈاکٹر اس اسپتال سے وابستہ تھے۔

ناہید کا باپ کبیر علی، کریم صدیقی کی ایک دوائیوں والی کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ بعد میں اسے کارپوریٹ آفس میں ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ یہاں چارج لینے کے دوران انکشاف ہوا کہ حساب میں گڑبڑ تھی۔ سابق اکاؤنٹنٹ نے تقریباً پچاس لاکھ کا گھپلا کر رکھا تھا۔ بڑی کمپنیوں میں ایسے گھپلوں کا عرصے تک پتا نہیں چلتا اور جب انکشاف ہوتا ہے تو معاملے کو اندر ہی اندر دبانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ بات پولیس تک پہنچ جائے تو بدنامی کمپنی کی ہوتی ہے۔

کبیر علی نے وہ چوری پکڑ لی تھی۔ وہ کریم صدیقی کو اس کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ سابق اکاؤنٹنٹ نے اسے دس لاکھ روپے کی پیشکش کی تو اس کی رال ٹپک پڑی۔ اتنی بڑی رقم تو اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ دس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ کرائے کا مکان، چار بچے۔ ان کی تعلیم اور دیگر اخراجات...... گزارہ تنگدستی میں ہو رہا تھا۔

ناہید سب سے بڑی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں بی اے آنرز کی طالبہ تھی۔ اس کے لیے خاندان میں اور باہر سے بھی کئی رشتے آئے تھے، مگر ہر مرتبہ انکار کر دیا گیا۔ پاس پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ بیٹی کی شادی کیسے کر دیتے۔ کبیر کے ملازمت سے ریٹائر ہونے میں بھی صرف ایک سال رہ گیا تھا۔ ریٹائرمنٹ پر کیا مل جائے گا، لاکھ، ڈیڑھ لاکھ روپے۔ اس رقم سے کیا ہوگا۔ بیٹی کی شادی کریں گے یا مستقبل کا کوئی پروگرام بنائیں گے۔

کبیر علی نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔ حساب کتاب میں کبھی ایک روپے کی گڑبڑ نہیں کی تھی لیکن اب معاملہ دس لاکھ کا تھا تو اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ اس نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ دس لاکھ روپے بڑی رقم تھی۔ بیٹی کی شادی ہو سکتی تھی اور بہت سے مسائل حل ہو سکتے تھے۔ وہ کچھ عرصہ تو خوف زدہ رہا لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کا یہ خوف دور ہو گیا۔

پانچ چھ مہینے گزر گئے۔ ایک روز...... وہ دفتر سے نکلا

تو گیٹ کے قریب سیٹھ کریم صدیقی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ وہ اس وقت اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا۔ کبیر علی کو دیکھ کر رک گیا۔

''ارے کبیر علی صاحب! اس وقت آٹھ بج رہے ہیں۔ آپ اتنی دیر تک آفس میں بیٹھے ہوئے تھے؟''

''کچھ کام آج ہی مکمل کرنا ضروری تھا سر، اس لیے دیر تک بیٹھا رہا۔'' کبیر علی نے جواب دیا۔

''آپ تو، میرا خیال ہے سلا ٹاؤن میں رہتے ہیں نا؟ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔ چلیے، آپ کو بھی ڈراپ کر دوں گا۔'' کریم صدیقی نے کہا۔

کبیر علی اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سیٹھ کریم راستے میں اس کے گھریلو حالات اور بچوں کے بارے میں پوچھتا رہا اور جب اس کے گھر کے سامنے گاڑی رکی تو کبیر علی نے اخلاقاً چائے کے لیے پوچھ لیا۔

''چلو بھئی، مجھے تمہاری دعوت قبول ہے۔ ویسے بھی اس وقت چائے کی طلب ہو رہی ہے۔'' کریم صدیقی بھی دروازہ کھول کر کار سے نیچے اتر آیا۔

کبیر علی کا گھر اکیسویں صدی تو کیا اٹھارویں صدی کے ہم آہنگ بھی نہ تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک پرانا سا صوفہ رکھا ہوا تھا جس کا کشن پھٹ چکا تھا۔ اس پر اجلی چادر ڈال دی گئی تھی۔

چائے ناہید لے کر آئی تھی۔ کریم صدیقی نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ چائے پینے کے دوران کبیر علی اپنے سیٹھ کے سامنے اپنی غربت کا رونا روتا رہا، جس کی وجہ سے وہ ابھی تک اپنی بیٹی کے ہاتھ بھی پیلے نہیں کر سکا تھا، اس روز سیٹھ کریم صدیقی دیر تک بیٹھا گپ شپ کرتا رہا، لیکن ناہید دوبارہ سامنے نہیں آئی تھی اور پھر کریم صدیقی اکثر ان کے ہاں چائے پینے کے لیے آنے لگا۔

چائے ہمیشہ ناہید ہی لے کر آتی مگر اس کے بعد دوبارہ سامنے نہ آتی۔ یہ سلسلہ تقریباً دو ماہ تک چلتا رہا اور پھر ایک روز دفتر کے منیجر نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس وقت وہ دونوں اکیلے ہی تھے۔ کبیر علی سمجھ گیا تھا کہ ضرور، کوئی خاص بات تھی اور پھر وہ بات بھی کھل گئی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے منیجر صاحب۔'' کبیر علی نے جواب دیا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ میری ایسی حیثیت ہی نہیں اور پھر میری بیٹی اور صدیقی صاحب کی عمروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میری بیٹی کی عمر چوبیس سال ہے اور صدیقی صاحب پچپن چھپن سال کے ہیں۔ میری بیٹی یہ رشتہ کبھی قبول نہیں کرے گی۔''

''عمروں کے فرق کو مت دیکھو کبیر علی!'' منیجر نے کہا۔ ''صدیقی اس وقت ملک کا نہیں تو اس شہر کا سب سے بڑا صنعت کار ہے۔ تم تو اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں ہو۔ تمہیں اس کی دولت کا اندازہ ہونا چاہیے۔ یہ تو تمہاری خوش قسمتی ہے کہ صدیقی نے تمہاری بیٹی کو پسند کیا ہے۔ سیکڑوں حسین و جمیل لڑکیاں اس کے ایک اشارے کی منتظر ہیں۔ شکل و صورت اور عمر کے فرق کو کون دیکھتا ہے۔ آج کل تو صرف اور صرف دولت کی اہمیت ہے جس کے پاس دولت ہے، وہ بادشاہ ہے۔ وہی طاقتور ہے۔ یہ سمجھو کہ تمہاری بیٹی کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔'' وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم یہ بات بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ سیٹھ صدیقی کی یکے بعد دیگرے دو بیویاں انتقال کر چکی ہیں۔ کسی بیوی سے کوئی اولاد نہیں۔ نہ کوئی بھائی نہ بہن۔ کوئی ایسا قریبی رشتے دار نہیں جو صدیقی کے بعد اس کا وارث بن سکے۔ اگر تم ہاں کر دیتے ہو تو تمہاری بیٹی دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوگی۔ یہ سب کچھ اسی کا ہوگا اور تمہیں شاید معلوم نہیں کہ صدیقی نے لندن اور امریکا میں بھی لمبی چوڑی پراپرٹی بنا رکھی ہے۔ وہ سب کچھ بھی تمہاری بیٹی کو ہی ملے گا۔ تمہاری زندگی کے باقی دن بھی آرام سے گزریں گے۔ تمہارے دوسرے بچوں کا مستقبل بھی سنور جائے گا۔ تم اپنی بیوی اور بیٹی سے مشورہ کر لو۔ چار پانچ دن سوچ لو لیکن میرا مشورہ ہے کہ اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے کی حماقت مت کرنا۔ ایک بات اور...... صدیقی چاہتا ہے کہ یہ شادی جلد از جلد ہو جائے اس لیے سوچنے میں زیادہ دن مت لگا دینا۔''

''آپ نے مجھے عجیب اُلجھن میں ڈال دیا ہے منیجر صاحب۔'' کبیر علی نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''ابھی تو ایسی کوئی بات نہیں لیکن تمہارے انکار سے کچھ الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔'' منیجر شہزاد نے کہا اور پھر باتوں ہی باتوں میں یہ بات بھی اس کے کانوں میں ڈال دی کہ سیٹھ کریم صدیقی دس لاکھ والی بات سے واقف ہے۔''

...... کبیر کانپ اٹھا۔

کبیر علی نے اسی روز اپنی بیوی کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ دونوں میں دو تین دن تک کھسر پھسر ہوتی رہی۔

''ناہید سے بات کر لو...... اس کی مرضی معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔'' بیگم کبیر نے کہا۔

''وہ صدیقی کا نام سنتے ہی انکار کر دے گی۔'' کبیر

علی نے کہا۔ ''اگر وہ دس لاکھ والی بات بیچ میں نہ ہوتی، تو میں وہیں پر انکار کر دیتا لیکن اب اگر انکار کیا تو مجھے تین چار سال کے لیے جیل بھجوا دیا جائے گا۔ ساری عزت خاک میں مل جائے گی، گھر کی بربادی جو ہوگی وہ الگ..... میں تو کہتا ہوں ہمیں ہاں کر دینی چاہیے۔ خاندان سے اب تک جو رشتے آئے ہیں، ان میں کوئی بھی لڑکا دس بارہ ہزار سے زیادہ نہیں کماتا۔ اتنی رقم میں تو گھر کا خرچ نہیں چلتا۔ شہزاد صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ناہید کی لاٹری نکل آئی ہے۔ ایسے رشتے کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ساری زندگی عیش کرے گی۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تم ہاں کر دو۔ میں ناہید کو سنبھال لوں گی۔'' بیگم نے کہا۔

اس کے دو دن بعد کبیر علی نے منیجر شہزاد کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا اور سیٹھ کریم صدیقی کو بھی اس کی اطلاع دے دی گئی۔ اس نے خود کبیر علی سے ملاقات کی، وہ اب زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ناہید کو پتا چلا تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ باپ نے ہاتھ جوڑے۔ ماں اس کے قدموں میں گر گئی۔ رو رو کر اسے حالات کی نزاکت اور سنگینی کا احساس دلایا اور ناہید نے اپنے آپ کو قربان کر دیا اور اس طرح ٹھیک دس دن بعد ناہید کبیر، ناہید صدیقی بن گئی۔

صدیقی عمر میں اس کے باپ کے برابر تھا۔ شکل و صورت بھی بس گزارہ تھی۔ لیکن صدیقی کے دل میں ناہید کے لیے بہت محبت تھی اور پھر یہ راز بھی ناہید پر جلد ہی کھل گیا کہ اس کی پہلی دو بیویوں سے اولاد کیوں نہیں تھی۔

ناہید کی شادی کو چھ سال ہو چکے تھے۔ وہ خود تیس کی اور کریم صدیقی باسٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ ان چھ برسوں میں ناہید پر بڑے دلچسپ انکشافات ہوئے تھے۔ جسمانی طور پر بظاہر صحت مند ہونے کے باوجود صدیقی اندر سے کھوکھلا تھا۔ نوجوانی میں وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا لیکن مزاج میں رنگینی تھی، وہ حسن پرست تھا، جہاں بھی کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھتا، دیوانہ ہو جاتا۔ ناہید مختصر سے عرصے میں اس کی اس رنگین مزاجی اور حسن پرستی سے واقف ہو گئی تھی۔ ان کی عالیشان کوٹھی خوب صورت عورتوں کا گڑھ بن گئی تھی۔ ناہید نے کچھ عرصے تو یہ سب کچھ برداشت کیا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ ہاتھ پیر پھیلانے لگی۔ صدیقی کے گرد بہت سی ایسی عورتیں جمع تھیں جن کا مقصد اس کی جیبوں کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔ ناہید آہستہ آہستہ چھانٹی کرتی چلی گئی اور بالآخر اس نے میدان صاف کر دیا لیکن...... پھر ناہید کی شامت ہی آ گئی تھی کہ ایک دن اس نے اپنے کچھ پرانے دوستوں کو مدعو کر لیا۔ ان میں یونیورسٹی کے زمانے کے لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ دعوت کا اہتمام کوٹھی کے وسیع و عریض ہال میں کیا گیا تھا۔ اس کے سارے دوست اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔

''تمہارے ممی ڈیڈی اور بہن بھائی نظر نہیں آ رہے؟'' فرحانہ نے پوچھا۔

ناہید اسے گھوم پھر کر کوٹھی دکھا رہی تھی۔ ''وہ تین سال پہلے لندن چلے گئے تھے، وہیں سیٹل ہو گئے ہیں۔'' ناہید نے جواب دیا۔

کریم صدیقی کو بھی اس پارٹی کا علم تھا مگر وہ ذرا تاخیر سے پہنچا تھا۔ ناہید کی بعض سہیلیاں اسے دیکھ کر ہنسی ضبط کیے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔ صدیقی بہت جلد تمام لڑکیوں سے گھل مل گیا۔ خصوصاً فرحانہ اس کی توجہ کا مرکز تھی۔ وہ جو بھی بات کرتا، اس سے مخاطب ہو کر کرتا۔ ناہید نے بھی یہ بات نوٹ کر لی تھی لیکن یہ سوچ کر توجہ نہیں دی کہ ان کی یہ پہلی ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوگی۔ اس کے بعد تو ان کی ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا۔

کریم صدیقی دن بھر دفتر اور فیکٹریوں کے چکر میں رہتا اور ناہید نے اپنے لیے سماجی شعبے میں مصروفیات پیدا کر لی تھیں۔ وہ خواتین کی کئی فلاحی انجمنوں کی سرپرست تھی۔ اس کا تعلق چونکہ غریب طبقے سے تھا اس لیے وہ درمیانے اور نچلے طبقے کی خواتین کے مسائل کو بخوبی سمجھتی تھی اور ایسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی جن میں ان خواتین کی بھلائی کا پہلو نکلتا ہو۔

یہ اس پارٹی کے ایک مہینے بعد کی بات ہے۔ شام سات بجے کے قریب ناہید ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تیار ہو رہی تھی۔ اسے آٹھ بجے خواتین کے ایک جلسے کی صدارت کرنا تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ اس وقت آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی۔ وہ ڈریسنگ روم سے باہر نکلی تو ملازمہ نے کارڈلیس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''یس، ناہید صدیقی اسپیکنگ۔'' وہ ماؤتھ پیس میں بولی۔

''میں تمہارا ایک پرانا دوست بول رہا ہوں ناہید۔'' ریسیور پر ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ ''میں نے تمہیں ایک اہم اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے۔ اس قسم

کی باتیں تمہارے علم میں آنا ضروری ہیں جو تمہارے مستقبل پر اثر انداز ہوں۔''

''تم کون ہو؟ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی؟'' ناہید نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہارے باپ نے کریم صدیقی جیسے شخص سے تمہاری شادی کیوں کی تھی۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''میں تمہارے باپ کی مجبوریوں کو سمجھتا ہوں لیکن اس شادی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تمہیں صدیقی کی دولت کا وارث بنا دیا جائے لیکن اگر تم اسی طرح غفلت برتتی رہیں تو یہ سب کچھ بہت جلد تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا جس کے لیے تم نے اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر جوانی جیسی قیمتی شے قربان کر دی۔''

''میں جاننا چاہتی ہوں، تم کون ہو؟'' ناہید نے کہا۔ اجنبی کی بات سن کر اس کے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔

''نام جاننا فی الحال ضروری نہیں۔ تمہارا دوست ہوں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''اور وہ بھی تمہاری دوست ہے جو یہ سب کچھ تم سے چھین لینا چاہتی ہے۔''

''کون؟'' ناہید کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

''فرحانہ۔'' دوسری طرف سے بتایا گیا۔ ''پچھلے ایک مہینے کے دوران میں، میں نے فرحانہ کو تیسری دفعہ تمہارے بوڑھے شوہر کے ساتھ دیکھا ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو گرین ویلی ریسٹورنٹ میں چلی جاؤ، وہ دونوں اس وقت تمہیں وہاں ملیں گے۔''

لائن بے جان ہو گئی۔ ناہید نے بھی فون بند کر دیا۔ گرین ویلی ریسٹورنٹ صرف بڑے لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ عام آدمی تو اس طرف جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ناہید خود بھی صدیقی کے ساتھ کئی مرتبہ وہاں جا چکی تھی۔

فون کرنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا تھا لیکن ناہید کو اس کی باتوں میں سچائی کی جھلک نظر آئی تھی۔ اس نے خواتین کے جلسے کے منتظمین کو فون کر کے آنے سے معذرت کر لی۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر باہر نکل آئی اور پھر اسے گرین ویلی ہوٹل پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

فرحانہ تو ناہید کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں لیکن صدیقی کے چہرے سے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہیں ہوا تھا۔

''ہیلو، فرحانہ!'' ناہید مسکرائی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا تھا۔ ''تم تو بڑی مصروف رہتی ہو۔ یہاں کیسے نظر آ رہی ہو؟''

''تمہیں تو معلوم ہے کہ میں ایک این جی او چلا رہی ہوں۔'' فرحانہ نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنے کام کے سلسلے میں ایک صاحب سے ملنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ وہ صاحب تو ملے نہیں، صدیقی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔''

''تم تو ایک جلسے میں جانے والی تھیں؟'' صدیقی نے ناہید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''عین وقت پر جلسہ کینسل کر دیا گیا۔ اس طرف سے گزر رہی تھی، سوچا ایک کپ چائے ہو جائے۔ اچھا ہوا تم بھی مل گئے۔'' ناہید نے جواب دیا اور پھر باتوں باتوں میں ڈھکے چھپے الفاظ میں ناہید نے فرحانہ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اپنی اوقات میں رہے اور اس کے شوہر کو ہائی جیک کرنے کی کوشش نہ کرے۔

ناہید اب محتاط ہو گئی تھی۔ اس نے نہ صرف خود اپنے شوہر کی نگرانی شروع کر دی بلکہ ایک ایسے آدمی کی خدمات بھی حاصل کر لی تھیں جس پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا ناہید کو اس آدمی کے ذریعے وقتاً فوقتاً فرحانہ اور صدیقی کی ملاقاتوں کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں۔

ناہید کا وہ پُراسرار ہمدرد عام طور پر موبائل فون پر رابطہ کیا کرتا تھا اس روز بھی اس کا فون آیا تھا۔

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' ناہید نے کہا۔ ''آج شام گرین ویلی ہی میں آ جاؤ، چائے پر باتیں ہوں گی۔''

ناہید دیر تک اس اجنبی کے بارے میں سوچتی رہی۔

اس شام ان دونوں کی ملاقات خاصی طویل ثابت ہوئی تھی۔ ناہید سے ہمدرد بن کر ملنے والا شخص اجنبی نہیں بلکہ اس کا سابقہ کلاس فیلو شیراز تھا۔ اسے دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ ناہید نے یہ بات واضح طور پر محسوس کی تھی کہ شیراز بہت بدل گیا تھا۔ یونیورسٹی کے زمانے میں وہ بہت سیدھا، سادہ نوجوان ہوا کرتا تھا لیکن اب اس میں ایسی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ وہ انجینئرنگ نہیں کر سکا تھا لیکن اس نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ آج کل کیا کر رہا ہے، لیکن بہر حال یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی مالی حالت کافی بہتر تھی۔ گرین ویلی میں اس پہلی ملاقات کے بعد ان کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ صدیقی کو ان ملاقاتوں کا علم نہیں ہو سکا۔ اگر اسے پتا چل بھی گیا تھا تو اس نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

فرحانہ سے صدیقی کے تعلقات ناہید کے لیے خطرے کی گھنٹی بن گئے تھے اور شیراز اس موقع پر اس کا ہمدرد بن کر سامنے آیا تھا۔ وہ اسے فرحانہ اور صدیقی کی سرگرمیوں سے باخبر رکھے ہوئے تھا۔

اس روز ناہید، صدیقی کے ساتھ کلب میں داخل ہوئی تو استقبالیہ لاؤنج میں شیراز کو دیکھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کلب کی ممبر شپ فیس ہی لاکھوں روپے تھی۔ وہ یہاں کیسے پہنچا؟ وہ اس کلب کا ممبر تھا یا کسی اور کے ساتھ مہمان کی حیثیت سے آیا تھا۔ ناہید باقاعدگی سے یہاں آتی تھی۔ جوا کھیلنا اس نے یہیں سے سیکھا تھا۔ ان سب لوگوں کے لیے یہ جوا نہیں ایک شغل تھا۔ وقت گزارنے کے لیے ایک تفریح۔ ایک رات میں لاکھوں روپے جیت لینا یا ہار جانا ان لوگوں کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

وہ بازی بڑی دلچسپ تھی۔ اگر ناہید کو شیراز کا پیغام نہ ملتا تو یہ بازی ابھی جاری رہتی لیکن ناہید نے شو کروالیا تھا اور بازی ختم کر کے باہر آگئی تھی۔ شیراز ایک دفعہ پہلے بھی اسے مشورہ دے چکا تھا کہ اسے اپنا مستقبل محفوظ رکھنا ہے تو اسے فرحانہ کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔ اگر فرحانہ صدیقی پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہوگئی تو یہ سب کچھ اس سے چھن جائے گا لیکن ناہید اس کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتی تھی۔ آج پھر شیراز نے ایسی ہی بات کہی تھی۔ اس وقت ناہید لان میں بیٹھی شیراز کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ ناہید تقریباً آدھا گھنٹا وہاں بیٹھی رہی۔ اس دوران میں نہ تو شیراز نظر آیا تھا اور نہ ہی فرحانہ یا صدیقی...... وہ اٹھ کر اس طرف چل پڑی، جہاں درختوں میں ہٹس بنے ہوئے تھے۔ ناہید کا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا مگر وہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ آخری دفعہ فرحانہ کو سمجھانے کی کوشش کرے گی اور اگر وہ پھر بھی نہ مانی تو کچھ اور سوچے گی۔

درختوں میں تاریکی تھی لیکن کئی جھونپڑیوں کے دروازوں کے نیچے سے روشنی جھلک رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ جھونپڑے آباد تھے لیکن ان میں امریکا کے تہذیب ناآشنا، وحشی قبائل نہیں، بلکہ مہذب دنیا کے مہذب لوگ تھے۔ وہ ایک جھونپڑے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر روشنی ہو رہی تھی۔

ناہید نے پہلے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی پھر اندر داخل ہوگئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ دروازے کے پیچھے فرحانہ فرش پر پشت کے بل پڑی تھی۔ اس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر خنجر پیوست تھا۔ آس پاس خون پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ پہلی نظر میں ہی کہا جاسکتا تھا کہ وہ ختم ہو چکی تھی۔

ناہید نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ چند ثانیے فرحانہ کی لاش کو دیکھتی رہی پھر گھٹنوں کے بل جھک کر خنجر کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ خنجر کو باہر کھینچنا ہی چاہتی تھی کہ روشنی کا کوندا سا لپکا اور پھر کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

ناہید نے خنجر سے ہاتھ اٹھا لیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ وہ دروازے کی طرف لپکی اور باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز اب معدوم ہو چکی تھی۔ یہ سوچ کر ہی ناہید کا دل اچھل کر حلق میں آگیا کہ اگر کسی نے اسے یہاں دیکھ لیا تو فرحانہ کے قتل کا الزام اسی پر آئے گا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی درختوں سے نکل کر کلب کی عمارت کی طرف آگئی۔ جیسے ہی دروازے میں داخل ہوئی، ایک عورت اس کی جانب لپکی۔ ''ارے کہاں تھیں آپ مسز صدیقی؟ آپ کو تو چاروں طرف ڈھونڈا جا رہا ہے۔ آپ کے شوہر کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور سب لوگ آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔''

ناہید کا چہرہ ایک بار پھر دھواں ہوگیا۔ وہ دوڑ کر اس جگہ پہنچ گئی جہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔

کریم صدیقی کو فوراً گاڑی میں ڈال دیا گیا تھا۔ ناہید بھی اندر بیٹھ گئی۔ دو آدمی اور بھی ساتھ تھے۔ گاڑی کلب کی پارکنگ سے نکل کر تیز رفتاری سے سنسان سڑک پر دوڑنے لگی۔ پھر تین بجے کے لگ بھگ وہ اسی پرائیویٹ اسپتال پہنچ گئے جہاں ثانیہ بھی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ یہ ٹرسٹ کا اسپتال تھا اور سیٹھ کریم صدیقی سے اس اسپتال کو ہر ماہ دس لاکھ روپے کا ڈونیشن ملتا تھا۔

اسپتال کا پورا عملہ حرکت میں آگیا۔ ڈاکٹر شمس ہی ڈیوٹی پر تھا۔ کریم صدیقی کو فوراً ہی ایمرجنسی میں پہنچا دیا گیا اور ناہید باہر کھڑی اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

☆☆☆

وہ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اس میں وہ تمام چیزیں اور سہولتیں موجود تھیں جو ایک انتہائی نگہداشت میں رکھے

جانے والے مریض کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

بیڈ پر لیٹی ہوئی مریضہ ثانیہ تھی۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ منہ پر ماسک لگا ہوا تھا۔ مشین پر وہ متحرک آڑی ترچھی سبز لکیریں اس میں زندگی کا پتا دے رہی تھیں۔ آج پندرھواں دن تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان کچی کے تار سے بھی نازک رابطہ تھا جو معمولی سی حرکت سے ٹوٹ سکتا تھا لیکن پندرہ دن سے اس کے جسم میں کوئی معمولی سی حرکت بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مستقل بے ہوشی میں تھی۔ ڈاکٹر باقاعدگی سے اسے چیک کر رہے تھے۔ دل کا معاملہ ابھی تک حل نہیں ہوا تھا۔ ملک بھر میں موجود ایسے تمام اسپتالوں سے معلومات حاصل کرلی گئی تھیں جہاں سے متبادل دل دستیاب ہوسکتا تھا لیکن کسی بھی ہارٹ بینک میں اس بلڈ گروپ کا دل دستیاب نہیں تھا۔ اسپتال کی انتظامیہ نے لندن اور امریکا کے بعض اسپتالوں کو بھی ثانیہ کی رپورٹس بھیج کر دل کے بارے میں استفسار کیا تھا لیکن مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ، ان کی درخواست کو ویٹنگ لسٹ پر رکھ لیا گیا تھا۔

ثانیہ کا باپ جمال مستقل طور پر اسپتال میں ڈیرے ڈالے ہوا تھا۔ اس کا اسٹیٹ ایجنسی کا دفتر تھا۔ بزنس زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اپنی مدد کے لیے ایک لڑکا رکھا ہوا تھا لیکن جس روز سے ثانیہ کو یہ حادثہ پیش آیا تھا، اس دن سے اس کا کام ٹھپ ہوگیا تھا۔ لڑکا زیادہ تجربے کار نہیں تھا۔ اس کا صرف یہ فائدہ تھا کہ دفتر کھلا رہتا تھا۔ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا جو جمع پونجی تھی، خرچ ہو رہی تھی۔ اس کی مالی حالت کا اندازہ لگا کر اس ٹرسٹ اسپتال کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا تھا کہ ثانیہ کے علاج کے تمام اخراجات اسپتال اٹھائے گا۔ تاہم متبادل دل کی قیمت جمال کو ادا کرنا پڑے گی۔ اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ قیمت کیا ہوگی۔

شگفتہ اور اس کے گھر والے بھی ثانیہ کو دیکھنے کے لیے باقاعدگی سے آتے رہتے تھے۔ شفیق ہی نے تو کئی مرتبہ جمال سے کہا تھا کہ اس کی بیٹی یا بیوی یہاں رہ لے گی مگر جمال وہاں سے ہلنے کو تیار نہ تھا۔ انسپکٹر افضل بھی روزانہ ایک مرتبہ یہاں کا چکر ضرور لگا لیتا تھا۔ تین دن پہلے اس کا تبادلہ اسی علاقے میں ہوگیا تھا۔ اس تھانے کا ایک سب انسپکٹر اس رات گراؤنڈ میں پیش آنے والے حادثے کی تحقیقات کر رہا تھا۔ انسپکٹر افضل ملک نے آتے ہی یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تب اسے پتا چلا کہ تحقیقات ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی۔

انسپکٹر افضل اس رات چونکہ خود وہاں موجود تھا اور یہ حادثہ اس کی موجودگی میں پیش آیا تھا اس لیے اس نے ازسرِ نو تحقیقات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

سب سے پہلے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ بارود کے ڈھیر میں آگ لگنا محض اتفاق تھا یا کسی کی شرارت تھی۔

افضل ملک نے سب سے پہلے ان کاریگروں سے رابطہ کیا جنھوں نے آتش بازی تیار کی تھی۔

''بارود تو بارود ہی ہوتا ہے صاحب۔'' اس پارٹی کے سربراہ نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''ایک چنگاری بھی تباہی مچا سکتی ہے جیسا کہ اس رات ہوا تھا۔''

''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ چنگاری اتفاق سے گری تھی یا کسی نے شرارتاً ایسا کیا تھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''وہ خیمے ہم نے گراؤنڈ کے ایک کونے میں لگا رکھے تھے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''اور ہم نے آتش بازی چھوڑنے کا بندوبست اس طرح کیا تھا کہ ہوائیاں یا گولے اوپر جا کر پھٹیں تو ان کی چنگاریاں قرب و جوار کے مکانوں پر گرنے کے بجائے میدان ہی میں گریں۔ ویسے میری زندگی کا تجربہ ہے کہ فضا سے زمین پر آتے آتے چنگاریاں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسی چنگاری رہ جاتی ہے جو زمین پر گرنے کے بعد ٹھنڈی ہوتی ہے۔ مجھے خود بھی حیرت ہے کہ بارود کے ڈھیر میں آگ کیسے لگ گئی۔ کوئی چنگاری اگر خیمے پر گری بھی ہوگی تو خیمے کا کپڑا اتنا موٹا اور کھردرا ہوتا ہے کہ ایک دم توڑتی ہوئی چنگاری اسے جلا نہیں سکتی، لیکن میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اگر کوئی ایسی چنگاری گری تھی جس نے خیمے میں سوراخ کر دیا تھا تو پھر نیچے گرنے والی کوئی معمولی سی چنگاری بھی نیچے پڑے ہوئے بارود میں آگ لگا سکتی تھی۔''

''تمہاری باتوں سے میں نے یہ تاثر لیا ہے کہ وہ حادثہ کسی شرارت یا تخریب کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔'' انسپکٹر افضل نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''ہو بھی سکتا ہے صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔

انسپکٹر افضل ملک نے کچھ ایسے لوگوں سے بھی رابطہ کیا جو اس رات آتش بازی کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے بڑے گراؤنڈ میں موجود تھے۔ بعض خواتین سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی اور پھر یہ انکشاف اس کے لیے خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ اس رات...... دو لڑکے گراؤنڈ کے خواتین والے حصے میں گھسے شرارتیں کرتے پھر رہے تھے۔

افضل ملک کے ذہن میں اچانک ہی شگفتہ کا خیال آ گیا اور جب شگفتہ سے بات ہوئی تو اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔

''میں ان میں سے ایک لڑکے کو پہچانتی ہوں انکل۔'' شگفتہ نے جواب دیا۔ ''اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں لیکن وہ گراؤنڈ کے دوسری جانب کسی مکان میں رہتا ہے۔ میں اور ثانیہ روزانہ کالج جانے کے لیے گھر سے اکٹھے ہی نکلا کرتے تھے۔ اور وہ لڑکا بس اسٹاپ پر کھڑا رہتا تھا۔ اس نے ہمیں کبھی چھیڑا تو نہیں، البتہ ہم جتنی دیر بس اسٹاپ پر کھڑے رہتے، وہ ثانیہ کو دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی وہ اکیلا ہوتا اور کبھی اس کے ساتھ کوئی اور لڑکا بھی ہوتا تھا۔ اس رات وہ ایک اور لڑکے کے ساتھ اس حصے میں گھس آیا تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کسی شرارت یا چھیڑ چھاڑ کی نیت سے ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔ میں نے ثانیہ کو بتا دیا اور ہم ان سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن اس سے پہلے ہی چند عورتوں نے انہیں اٹھا کر گراؤنڈ سے باہر پھینک دیا اور وہ لڑکے قہقہے لگاتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئے۔''

انسپکٹر افضل کے خیال میں ان لڑکوں سے کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی سادہ لباس میں بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد شگفتہ بھی کالج جانے کے لیے اسٹاپ پر آ گئی۔ اس نے انسپکٹر کی طرف دیکھا اور پھر اس لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا جو ایک طرف اکیلا کھڑا شگفتہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شگفتہ اپنے روٹ کی بس پر سوار ہو گئی۔ وہ لڑکا وہیں کھڑا رہا۔ افضل ملک اس لڑکے کے قریب گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی گرفت دوستانہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ لڑکا گھبرا گیا تھا۔

''میں پولیس انسپکٹر افضل ملک ہوں۔'' وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں تمہیں پولیس اسٹیشن بھی لے جا سکتا ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم دوسروں کی نظروں میں آؤ۔ اس لیے میں یونیفارم پہن کر بھی نہیں آیا۔ آؤ...... اس ریسٹورنٹ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

لڑکے کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے اور اتفاق سے اسی وقت ایک باوردی کانسٹیبل اس طرف آ گیا۔ اس نے انسپکٹر کو سلیوٹ کیا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ انسپکٹر افضل نے اسے ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے ہٹا دیا اور اس لڑکے کو لے کر ریسٹورنٹ میں آ گیا۔ اس نے چائے منگوائی اور پھر چسکیاں لیتے ہوئے لڑکے کو بتانے لگا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

لڑکے کا نام عرفان تھا۔ یہ انکشاف اس کے لیے بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ جس لڑکی کو دیکھنے کے لیے وہ روزانہ صبح بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا کرتا تھا، وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔'' عرفان نے جواب دیا۔ ''میرا یا میرے دوست کا شرارت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے دور سے اسے عورتوں کے درمیان بیٹھے دیکھا تو قریب سے دیکھنے کے لیے اپنے دوست کے ساتھ اس طرف چلا آیا تھا۔''

''تم روزانہ بس اسٹاپ پر اس کا انتظار کرتے تھے، کیوں؟'' انسپکٹر افضل نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''وہ...... وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔'' عرفان نے رک رک کر جواب دیا۔ ''میں نے کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی، آپ اس کی دوست سے پوچھ سکتے ہیں؟''

''ہوں...... سمجھ گیا۔'' انسپکٹر افضل بولا۔ ''وہ اس وقت موت سے لڑ رہی ہے۔ اگر تمہیں اس سے ہمدردی ہے اور تم چاہتے ہو کہ اس واقعے کے ذمے دار فرد یا افراد کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے تو...... یاد کر کے بتاؤ کہ اس رات اسلحہ کن کن لوگوں کے پاس تھا۔ کوئی ایسا شخص جسے تم نے دیکھا ہو اور پہچانتے ہو؟''

''میں ایک لڑکے کو جانتا ہوں۔ اس رات اس کے پاس ایل ایم جی رائفل تھی۔'' عرفان نے جواب دیا۔ ''طارق کالیا، ایک ٹرانسپورٹر کا بیٹا ہے۔ ٹرانسپورٹر کیا، ایک منی بس ہے اس کے باپ کی۔ طارق عرف کالیا، اگرچہ کالج کا اسٹوڈنٹ ہے لیکن اسے تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے صرف داداگیری اور غنڈاگردی کے لیے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ ایک سیاسی پارٹی کے لیے کام کرتا ہے۔ کالج میں بھی اس کی جیب میں پستول موجود رہتا ہے۔ بہرحال، میں نے اس رات خود اس کے پاس رائفل دیکھی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جب آتش بازی شروع ہو گی تو وہ اس سے ہوائی فائر کرے گا۔ یہ...... آتش بازی شروع ہونے سے تقریباً آدھا گھنٹا پہلے کی بات ہے۔ وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ اس وقت گراؤنڈ کے اس طرف کھڑا تھا جہاں ایک

کونے میں چبوترا سا بنا ہوا ہے۔''

انسپکٹر افضل چونک سا گیا۔ ثانیہ کو بھی اسی چبوترے سے تقریباً ساٹھ گز کے فاصلے پر گولی لگی تھی۔

انسپکٹر افضل، عرفان سے اور بھی باتیں پوچھتا رہا اور پھر اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ پھر اسی رات انسپکٹر افضل نے طارق کالیا کو چھاپ لیا۔ اس کے قبضے سے ایک پسٹل اور ایل ایم جی رائفل بھی برآمد کر لی۔ ثانیہ کے دل سے گولی برآمد نہیں ہوئی تھی اس لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ گولی اسی رائفل سے نکلی تھی یا کسی اور رائفل یا پستول کی تھی۔ لیکن بہرحال طارق کالیے کو بغیر لائسنس کا اسلحہ رکھنے کے جرم میں بند کر دیا گیا۔

افضل ملک نے اپنی تحقیقات ختم نہیں کی تھی بلکہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ اس سے اگلے روز ثانیہ کی خیریت دریافت کرنے اسپتال پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اس نے ڈاکٹر عکس سے ملاقات کی۔ متبادل دل کے بارے میں ابھی کوئی بھی پیشرفت نہیں ہوئی تھی۔ کوشش بہرکیف جاری تھی۔

ڈاکٹر کے کمرے سے نکل کر وہ ثانیہ کے کمرے کی جانب آیا تو راہداری میں بینچ پر شفیق اور اس کے گھر والے بیٹھے تھے۔

''آپ کی تحقیقات کہاں تک پہنچی انسپکٹر صاحب؟'' شفیق علی نے پوچھا۔

''کچھ پیشرفت ہوئی ہے۔'' افضل ملک نے جواب دیا۔ ''ثانیہ کو میدان کے جس حصے میں دوڑتے ہوئے گولی لگی تھی وہاں میری اطلاع کے مطابق دو آدمی ایسے تھے جنہوں نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ ان میں سے ایک کا سراغ لگا کر اسے حراست میں لے لیا گیا ہے اور وہ رائفل بھی برآمد کر لی گئی ہے۔ جس سے وہاں فائرنگ کی گئی تھی لیکن ابھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ثانیہ کے لگی .... گولی اسی رائفل سے چلی ہوئی ہے یا......''

''اور اس کا فیصلہ اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ گولی وہاں سے نکال لی جائے۔'' شفیق علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔'' افضل ملک نے جواب دیا۔ ''میں ابھی ڈاکٹر عکس سے مل کر آ رہا ہوں۔ متبادل دل کے حصول کے سلسلے میں ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی ہے۔''

''اس بچی کے لیے دل روتا ہے۔'' شفیق نے.... کہا.... ''خدا کرے جلد ہی کوئی بندوبست ہو جائے۔''

''اللہ سب ٹھیک کرے گا۔'' انسپکٹر افضل ملک نے کہا۔ وہ کچھ دیر اور وہاں بیٹھا رہا۔ شفیق اور جمال سے باتیں کرتا رہا۔ پھر ان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

بیٹی کے دکھ میں جمال اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے کھانا شفیق علی کے گھر سے آتا تھا۔ کبھی تو وہ دو نوالے کھا لیتا اور کبھی کھانا یونہی پڑا رہتا۔ اگر اسے شفیق اور افضل ملک جیسے مخلص دوستوں اور ہمدردوں کا سہارا نہ ہوتا تو وہ بیٹی کی تقدیر کا فیصلہ ہونے سے پہلے ہی مر جاتا۔ وہ کرسی پر نیم دراز کبھی میز پر رکھی ہوئی مشین کی طرف دیکھتا اور کبھی بیڈ پر پڑی ہوئی ثانیہ کی طرف پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ نیند سے بوجھل پلکیں بند ہوتی چلی گئیں۔

کولمبس کا امریکا

توسکانینی ایک مشہور ترین اطالوی موسیقار گزرا ہے۔ اس کے بارے میں دو باتیں مشہور ہیں۔ ایک تو اس کی بدصورتی دوسرے خواتین کے باب میں اس کا احترام آمیز اور مؤدب رویہ۔ ایک بار ایک اوپیرا کے لیے وہ ریہرسل کروا رہا تھا۔ جس میں اطالوی جوان، ساز بجا رہے تھے اور ایک امریکی لڑکی گا رہی تھی۔ وہ لڑکی بار بار بےسری ہو جاتی تھی۔ توسکانینی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ صنفِ نازک کو کوئی سخت بات کہہ نہیں سکتا تھا۔ زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''کرسٹوفر کولمبس پر لعنت ہو۔''

اسلام آباد سے شکیل کاظمی کا تعاون

مِس

ڈرل ماسٹر، لڑکوں کو سمجھا رہے تھے کہ جب میں ڈس، مس کہوں تو تمام لڑکے بھاگ کر کلاسوں میں چلے جائیں۔

لڑکوں نے کہا بہت اچھا۔ ابھی ماسٹر صاحب نے صرف ڈس ہی کہا تھا کہ تمام لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن ایک لڑکا کھڑا رہا۔ ماسٹر صاحب لڑکے کے پاس آئے اور اس سے پوچھا۔ ''تم کیوں کھڑے ہو؟'' تو لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''جی! میں آپ کی مس کا انتظار کر رہا تھا۔''

خیبر ایجنسی، لنڈی بازار سے دلیر سنگھ

اپنے آس پاس مختلف آوازیں سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر شمس اور اس کے ساتھ دو ڈاکٹرز اور تھے۔ ایک نرس بھی تھی۔ وہ سب بیڈ کے گرد کھڑے ثانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شمس نے وہ فائل اٹھالی، جس میں ثانیہ کی اب تک کی ساری رپورٹس لگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ آنے والے ڈاکٹرز کو انگریزی میں کچھ بتا رہا تھا۔

''یہ مریضہ کے والد ہیں۔'' ڈاکٹر شمس نے اجنبی سے اس کا بھی تعارف کرایا پھر جمال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ ڈاکٹر سجاد رضوی ہیں۔ دو دن پہلے امریکا سے آئے ہیں۔ انہیں ہارٹ ٹرانسپلانٹیشن کا سب سے تجربے کار اور ماہر ڈاکٹر سمجھا جاتا ہے۔ ٹرانسپلانٹ کے ایک درجن سے زائد کامیاب کیسز کر چکے ہیں۔ مجھے جب ان کے آنے کا پتا چلا تو میں نے فوراً ہی ان سے رابطہ کیا اور یہ ان کی نوازش ہے کہ یہاں تشریف لے آئے۔ یہ اس کیس کو اسٹڈی کریں گے اور عین ممکن ہے کہ کامیاب آپریشن کر کے دل کے پاس پیوست گولی نکال دی جائے۔ بہرحال ہمیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔''

جمال انہیں دعاؤں سے نوازنے لگا اور جب وہ لوگ کمرے سے رخصت ہوئے تو ثانیہ کی تمام ایکسرے رپورٹس، الٹراساؤنڈ رپورٹس اور دیگر رپورٹس بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ جمال نے گھڑی دیکھی تو بارہ بج رہے تھے اور پھر وہ گہری نیند میں چلا گیا۔ جب دوبارہ آنکھ کھلی تو تین بج رہے تھے۔ کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آوازیں کمرے کے باہر سے آ رہی تھیں۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری کے آخر میں کچھ لوگ جمع تھے۔ ایک عورت بھی تھی جس نے سبز ساڑی پہن رکھی تھی۔ جمال کمرے سے نکل کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔ اس عورت کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ وہ خوب صورت چہرہ، اسے کچھ جانا پہچانا سا لگا لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے یہ چہرہ کب اور کہاں دیکھا تھا؟

''کیا بات ہے جناب! خیریت تو ہے؟'' اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا۔

''کریم صدیقی کو دل کا دورہ پڑا ہے اور یہ خاتون ان کی بیگم ہیں۔'' اس شخص نے سبز ساڑی والی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جمال نے ایک بار پھر اس عورت کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اس نے اس عورت کو پہچان لیا تھا۔ وہ ناہید صدیقی تھی۔ اس کی تصویریں تو اکثر اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔ ابھی چند روز پہلے ہی ایک نرس نے بتایا تھا کہ ''یہ اسپتال ایک ٹرسٹ کے تحت چل رہا ہے۔ شہر کے کچھ مخیر حضرات اس کے لیے فنڈز فراہم کرتے ہیں۔ شہر کا سب سے بڑا صنعت کار سیٹھ کریم صدیقی دس لاکھ روپے مہینے کا عطیہ دیتا ہے۔'' اور وہی سیٹھ کریم صدیقی اس وقت ایمرجنسی روم میں پڑا زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔

ابتدائی ٹریٹ منٹ دینے کے بعد سیٹھ کریم صدیقی کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں انتہائی نگہداشت کے بھی تمام انتظامات موجود تھے۔

تین، چار دن گزرنے کے بعد ایک روز ڈاکٹر شمس نے جمال کو بتایا۔ ''ڈاکٹر سجاد رضوی کی رائے میں ثانیہ کے دل کے پاس لگی گولی نکالنے کے لیے آپریشن کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ البتہ، ایک خوش خبری یہ ہے کہ لندن کے جس اسپتال کو ثانیہ کے متبادل، دل کے لیے کہا گیا تھا انہوں نے دوبارہ تفصیلی رپورٹس مانگی ہیں۔ امید ہے کہ چند دنوں میں دل کا بندوبست ہو جائے گا۔ یہ جمال کے لیے بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔

سیٹھ کریم صدیقی پر پڑنے والا دورہ زیادہ شدید نہیں تھا۔ اتنی عمر ہونے کے باوجود وہ اس جھٹکے کو سہہ گیا تھا۔ اس سے اگلے روز اسے اسپتال سے رخصت کر دیا گیا۔ جمال دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ اس کی بیٹی کو بھی اسی طرح چلتے قدموں سے رخصت کیا جائے۔

☆☆☆

ڈاکٹرز نے صدیقی کو مکمل بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیا تھا اور اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ اگر دواؤں کے استعمال میں غفلت اور بے پروائی برتی گئی یا اپنے آپ پر کام کا بوجھ ڈالا گیا تو ایک دوبارہ بھی ہو سکتا ہے۔

گھر پہنچتے ہی ناہید نے اپنے شوہر کا چارج سنبھال لیا تھا۔ کئی ملازم ہونے کے باوجود وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال خود رکھتی، اپنے ہاتھ سے دوائیں دیتی اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی۔ صدیقی کی عیادت اور مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگوں کو پتا چل گیا تھا کہ صدیقی اسپتال سے گھر منتقل ہو چکا ہے۔ ہر شخص چلا آ رہا تھا۔

رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ ناہید بُری طرح تھک چکی تھی۔ وہ بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھی صدیقی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''میں یہ ٹیوب لائٹ بجھا کر نائٹ بلب جلا رہی ہوں۔ گیارہ بج رہے ہیں، تمہیں اب سو جانا چاہیے۔''

''تم تو میری دیکھ بھال اس طرح کر رہی ہو، جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ حالانکہ میری اور تمہاری عمر میں آدھے آدھے کا فرق ہے۔'' صدیقی نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہی تو افسوس ہے کہ ہماری عمروں میں اتنا فرق ہے۔'' ناہید کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا تھا۔ ''اگر دو چار سال کا فرق ہوتا تو مجھے یہ دکھ تو نہ اٹھانا پڑتا۔''

''کیا مطلب؟...... کیا کہنا چاہتی ہو؟'' صدیقی نے اسے گھورا۔

''میں تو اس وقت بھی کچھ نہیں کہہ پائی تھی جب میرے باپ نے......'' وہ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ ''میں اس وقت ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی جو کسی بدمزگی کا باعث بنے...... اب تم سو جاؤ...... میں اس کاؤچ پر لیٹ جاؤں گی۔ اگر کسی وقت کوئی معمولی سی بھی تکلیف محسوس کرو تو مجھے آواز دے دینا۔'' اس نے کرسی سے اٹھ کر ٹیوب لائٹ بجھائی اور نائٹ بلب جلا دیا۔ نیلے رنگ کی مدھم سی روشنی آنکھوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ناہید دیوار کے قریب فوم نما کوچ پر لیٹ گئی۔ اس نے ایک کشن سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ پورا دن بھاگ دوڑ میں وہ بری طرح تھک گئی تھی۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

چیخ کی آواز سے ناہید کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی اور متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ صدیقی گہری نیند سو رہا تھا۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ حالانکہ نسوانی چیخ کی آواز اس نے اپنے بالکل قریب سنی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کشادہ راہداری سنسان پڑی تھی۔ پورے گھر میں گہرا سناٹا تھا۔ سامنے اس کا اپنا بیڈ روم تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ کمرا خالی تھا۔ وہ راہداری میں چلتی ہوئی لاؤنج کی طرف آ گئی۔ وسیع و عریض لاؤنج میں ایک طرف دیوار پر چھوٹی ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔ جس کے نیچے...... کلاک لگا ہوا تھا۔ اس کی سوئیاں رات کے دو بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ ناہید اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ لاؤنج کے ایک صوفے پر وہ نرس سو رہی تھی جو صبح اسپتال سے ان کے ساتھ آئی تھی۔ اسے صدیقی کی دیکھ بھال کے لیے بھیجا گیا تھا مگر ناہید نے اس جوان اور خوب صورت نرس کو صدیقی کی نظروں سے دور ہی رکھا تھا۔ اسے کمرے میں بھی نہیں جانے دیا تھا۔

ناہید پورے گھر کا چکر لگانے کے بعد دوبارہ آ کر کمرے میں لیٹ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ نسوانی چیخ کی وہ آواز کیسی تھی؟ جو اس نے نیند میں سنی تھی اور پھر اچانک...... اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شاید وہ اس کی اپنی گھٹی گھٹی سی چیخ تھی، جو اس وقت اس کے منہ سے نکلی تھی جب اس نے کلب کے جھونپڑے میں فرحانہ کی لاش دیکھی تھی۔ وہ اتنے دن فرحانہ اور اس واقعے کو بھولی ہوئی تھی۔ اس رات اگر کلب میں صدیقی کو دل کا دورہ نہ پڑتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ صدیقی کی وجہ سے وہ اپنی ہی الجھنوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ لاؤنج کے ایک طرف رکھے ہوئے ریک سے اس نے پچھلے ایک ہفتے کے اخبار نکال لیے۔ وہ ترتیب وار اخبارات دیکھنے لگی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس رات دو بجے کے قریب اس نے فرحانہ کی لاش دیکھی تھی اور پھر وہ صدیقی کو لے کر اسپتال آ گئی تھی۔ بعد میں اس لاش کے بارے میں انکشاف ہوا تھا۔ پولیس اگرچہ رات کے آخری پہر کلب میں پہنچ گئی تھی، لیکن اگلے روز کے اخبارات میں اس حوالے سے کوئی خبر نہیں تھی۔ البتہ، اس سے اگلے روز یہ خبر بڑی تفصیل سے موجود تھی اور اس کے ساتھ تصاویر بھی تھیں۔ اس اخبار میں سیٹھ کریم صدیقی پر دل کا دورہ پڑنے کی بھی خبر موجود تھی۔

فرحانہ کے قتل کی خبر بڑی تفصیل سے تھی۔ پولیس کے مطابق اسے چاقو یا خنجر کے وار سے ہلاک کیا گیا تھا، لیکن آلۂ قتل برآمد نہیں ہو سکا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ قاتل آلۂ قتل اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔

یہ اطلاع ناہید کے لیے سنسنی خیز تھی۔ جب وہ اس جھونپڑے میں داخل ہوئی تھی تو خنجر دستے تک لاش کے سینے میں پیوست تھا اور اس نے وہ خنجر نکالنے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن روشنی کا جھماکا ہوتے ہی وہ گڑبڑا کر لاش کے قریب سے اٹھ گئی تھی۔ اسے اب تک یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ روشنی کا وہ جھماکا کیسا تھا؟ اور وہاں سے بھاگنے والا آدمی کون تھا؟

کلب کے کچھ ممبران اور انتظامی عہدیداروں کے بیانات کے مطابق فرحانہ اس کلب کی ممبر نہیں تھی۔ منیجر کے بیان سے بھی تصدیق ہو گئی کہ وہ کلب کی ممبر نہیں تھی بلکہ وہ سیٹھ سلطان کے ساتھ آئی تھی۔ کلب کے ممبروں کو ہفتے میں

ایک دن ایک مہمان ساتھ لانے کی اجازت تھی جس کے اضافی اخراجات چارج نہیں کیے جاتے تھے۔ سیٹھ سلطان نے پولیس کو بتایا تھا کہ فرحانہ چونکہ ایک این جی او سے وابستہ ہے، اس حوالے سے بھی کبھار ان کی ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ اس رات وہ کلب آنے کی تیاری کر رہا تھا کہ فرحانہ اپنے ایک کام کے سلسلے میں اس کے بنگلے پر پہنچ گئی۔ اس نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ انکار نہ کر سکا۔ کیونکہ اس کے لیے کوئی اضافی رقم خرچ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کلب آنے کے بعد وہ تھوڑی دیر اس کے ساتھ رہی پھر کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی۔

ناہید اخبارات دیکھتی رہی۔ آج کے اخبار میں فرحانہ ہی کے قتل کے حوالے سے ایک چھوٹی سی خبر تھی کہ پولیس کی تفتیش جاری ہے۔ پولیس ان تمام لوگوں سے رابطہ کر رہی ہے جن سے فرحانہ کا ملنا جلنا تھا اور ان میں سیٹھ کریم صدیقی کا نام بھی تھا۔ ناہید کی نیند کافور ہو چکی تھی اور آنکھوں میں شدید جلن محسوس ہو رہی تھی۔

وہ آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اخبارات کے مطالعے کے بعد جو صورتِ حال سامنے آئی تھی، اس نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔ اس نے خنجر فرحانہ کے سینے میں پیوست دیکھا تھا اور دستے پر ہاتھ رکھ کر اسے نکالنا بھی چاہتی تھی لیکن اچانک روشنی کے جھماکے نے اسے بدحواس کر دیا تھا اور وہ خوف زدہ ہو کر خنجر فرحانہ کے سینے میں ہی چھوڑ کر جھونپڑے سے باہر آ گئی تھی۔

لیکن لاش کے سینے میں پیوست خنجر کہاں گیا؟ پولیس کے مطابق آلۂ قتل برآمد نہیں ہو سکا تھا...... ناہید سوچ رہی تھی کہ وہ خنجر کہاں گیا؟ اسے دوڑتے ہوئے قدموں کا خیال آیا۔ وہ آدمی کون تھا؟ اور کہاں چھپا ہوا تھا؟ کیا وہ قاتل تھا؟ جو ناہید کو دیکھ کر کہیں چھپ گیا تھا اور موقع پا کر وہاں سے بھاگ گیا۔ کیا ناہید کے وہاں سے آجانے کے بعد وہ دوبارہ وہاں آیا تھا اور خنجر غائب کر دیا؟ طرح طرح کی باتیں ناہید کے ذہن کو الجھائے دے رہی تھیں۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ شیراز اس کا ہمدرد بن کر سامنے آیا تھا۔ فرحانہ کے بارے میں وہی اسے اطلاعات فراہم کرتا رہا تھا۔ اس نے ناہید کو خبردار کیا تھا کہ اگر فرحانہ کا بندوبست نہ کیا گیا تو وہ اس کے بوڑھے حُسن پرست شوہر پر قبضہ کر لے گی اور ناہید سے وہ سب کچھ چھن جائے گا جس کے لیے اس نے اپنی جوانی غارت کر دی تھی۔

شیراز ایک دفعہ پہلے بھی اسے مشورہ دے چکا تھا کہ اگر اسے اپنا مستقبل محفوظ کرنا ہے تو اسے فرحانہ کو راستے سے ہٹانا ہو گا۔ ناہید اس کا مطلب سمجھ گئی تھی لیکن وہ کوئی ایسا خطرناک قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی اور پھر اس رات کلب میں بھی شیراز نے ایسی ہی بات دہرائی تھی مگر ناہید نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائے گا اور پھر اسی رات فرحانہ قتل ہو گئی۔

کیا فرحانہ کو شیراز نے قتل کیا تھا؟ مگر وہ ایسا کیوں کرنے لگا۔ وہ ناہید کا ہمدرد ضرور تھا اور اس نے فرحانہ سے پیچھا چھڑانے کا مشورہ بھی دیا تھا مگر اس کی ہمدردی میں وہ کسی کے خون سے اپنے ہاتھ کیوں رنگنے لگا؟ ناہید نے کئی مرتبہ شیراز کے بارے میں سوچا۔ ناہید کے خیال میں وہ محض پرانی دوستی کی بِنا پر اس کا ہمدرد بن گیا تھا۔ وہ اس کی شادی کا پس منظر بھی جانتا تھا اور اسی لیے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسے ناہید سے کوئی لالچ نہیں تھا۔ اس نے آج تک کوئی ایسی بات بھی نہیں کی تھی جس سے اس قسم کا عندیہ ملتا ہو بلکہ ایک موقع پر تو ناہید نے اسے ایک قیمتی تحفہ بھی دینا چاہا تھا، مگر اس نے وہ تحفہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

ناہید کو شیراز پر فرحانہ کے قاتل ہونے کا شبہ نہیں تھا، تو پھر قاتل کون ہو سکتا ہے؟ وہ جیسے جیسے سوچتی رہی، اس کا ذہن الجھتا رہا۔

اس رات وہ اپنے شوہر کے ساتھ کلب گئی تھی۔ وہاں پہنچنے کے بعد وہ صدیقی کو اس کے دوستوں کے ساتھ چھوڑ کر جوئے خانے میں آ گئی تھی اور شیراز سے ملاقات کے بعد وہ اسے تلاش کرتی رہی تھی لیکن وہ نہیں ملا تھا اور جب وہ فرحانہ کی لاش دیکھنے کے بعد خوف کی چادر میں لپٹی واپس آئی تو صدیقی کو دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا فرحانہ کو اس جھونپڑے میں صدیقی نے قتل کیا تھا؟ مگر صدیقی اسے قتل نہیں کر سکتا تھا، وہ تو شاید اسے اپنے بہت قریب لانا چاہتا تھا۔ فرحانہ حسین تھی، اس کے بیسیوں چاہنے والے تھے۔ فرحانہ کو صدیقی سے تعلقات بڑھاتے دیکھ کر اس کا کوئی چاہنے والا اس سے ناراض ہو گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے فرحانہ کو اس نے قتل کیا ہو اور یہ واردات صدیقی کی موجودگی میں ہوئی ہو...... جس کے نتیجے میں اس پر دل کا دورہ پڑ گیا۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے صبح چار ساڑھے چار بجے کے لگ بھگ ناہید کی آنکھ لگ گئی لیکن سات بجے وہ آوازیں سن کر جاگ گئی۔ ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا اور ملازمہ اس کے لیے چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔ وہ عام طور پر اسی

وقت جاگ جایا کرتی تھی اور ملازمہ کو یہ حکم تھا کہ وہ اسی وقت اس کے کمرے میں چائے پہنچا دیا کرے۔

ناہید نے باتھ روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ چائے پیتے ہوئے وہ صدیقی کی طرف دیکھ رہی تھی، جو ابھی تک سو رہا تھا۔

ناہید نے اس دن سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس خوب صورت نرس کو واپس بھیج دیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اب کسی خوب صورت لڑکی کا سایہ بھی صدیقی پر نہیں پڑنے دے گی۔ نرس کے رخصت ہوتے ہی اس نے اسپتال کے ڈائریکٹر کو فون کر دیا تھا کہ وہ فوری طور پر کسی ادھیڑ عمر نرس کو بھیج دے جو زیادہ حسین نہ ہو۔ گھنٹے بھر بعد جو نرس آئی، اسے دیکھ کر ناہید نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے نرس کو اس کی ڈیوٹی سمجھائی اور اپنے کمرے میں آکر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

ناہید کی توقع کے عین مطابق گیارہ بجے پولیس پارٹی پہنچ گئی۔ ان میں ایک انسپکٹر تھا اور دو اس کے ماتحت...... انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے تقریباً پانچ منٹ بعد ناہید اندر آئی تھی۔

’’آپ کس سلسلے میں صدیقی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟‘‘ ناہید نے انسپکٹر کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’کلب میں فرحانہ نامی لڑکی کے قتل کے سلسلے میں تفتیش ہو رہی ہے۔‘‘ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ’’ان لوگوں سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے جن کا مقتولہ سے کسی نہ کسی طرح کوئی تعلق رہا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق مقتولہ کو پچھلے دو ماہ کے دوران میں متعدد بار آپ کے شوہر کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔‘‘

’’صدیقی صاحب صنعت کار ہیں، دولت مند ہیں، شہر کی کئی سماجی اور فلاحی کام کرنے والی تنظیموں کے سرپرست ہیں۔ لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں ان سے ملتے رہتے ہیں۔ مقتولہ فرحانہ کا تعلق بھی ایک ایسی ہی این جی او سے تھا، وہ اکثر صدیقی صاحب سے ملتی رہی تھی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ......‘‘

’’آپ غلط سمجھ رہی ہیں میڈم۔‘‘ انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ’’میں صدیقی صاحب پر کوئی الزام نہیں لگا رہا۔ صرف یہ معلوم کرنا مقصود ہے کہ ان کی ملاقاتیں کس سلسلے میں ہوا کرتی تھیں۔ کیا ان ملاقاتوں میں ذاتی دلچسپی کا بھی کوئی عنصر شامل تھا؟‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ ناہید نے گہرا سانس لیا۔ ’’آپ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، انہی سے پوچھ لیجیے۔‘‘

وہ انسپکٹر کو صدیقی کے بیڈ روم میں لے آئی۔ صدیقی اس وقت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔

انسپکٹر آدھے گھنٹے تک صدیقی سے سوالات کرتا رہا۔ ناہید گہری نظروں سے صدیقی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔ بعض سوالوں پر صدیقی کے تاثرات یک دم بدل جاتے۔

’’ایک بات اور صدیقی صاحب۔‘‘ انسپکٹر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ’’فرحانہ کے قتل والی رات...... آپ بھی کلب میں موجود تھے اور ہماری اطلاع کے مطابق مقتولہ کو آخری بار آپ کے ساتھ دیکھا گیا، اس کے بعد رات کے پچھلے پہر اس کی لاش ملی تھی۔‘‘

’’یہ درست ہے کہ وہ کچھ دیر میرے پاس آکر بیٹھی تھی۔‘‘ صدیقی نے جواب دیا۔ بات کرتے ہوئے اس کے چہرے کی پیلاہٹ انسپکٹر سے چھپ نہیں سکی تھی۔ ’’اسے کلب میں دیکھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ فرحانہ کلب کی ممبر نہیں تھی۔ وہ تو بعد میں اس نے بتایا تھا کہ وہ سیٹھ سلطان کے ساتھ آئی تھی۔‘‘

’’یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے جناب۔‘‘ انسپکٹر نے کہا۔ ’’آپ دونوں پول سائڈ پر بیٹھے باتیں کرتے کرتے اٹھ کر کہیں چلے گئے تھے۔ مقتولہ آپ سے شاید کچھ بے تکلف بھی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے آپ کو اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہو؟ یعنی، کوئی ایسی بات جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ اسے کسی سے کوئی خطرہ ہے؟‘‘

’’نہیں، اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی۔‘‘ صدیقی نے جواب دیا۔

’’ایک بات اور صدیقی صاحب......‘‘ انسپکٹر بولا۔ ’’کلب کے جس ہٹ یا جھونپڑے سے فرحانہ کی لاش ملی تھی، وہ جھونپڑا اس رات آپ کے نام سے بُک تھا۔ کلرک نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس جھونپڑے کی چابی آپ لے کر گئے تھے۔ کیا آپ فرحانہ کو اپنے ساتھ ہٹ میں لے گئے تھے؟‘‘

اس سوال پر صدیقی کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے ناہید کی طرف دیکھا اور بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

’’انسپکٹر!‘‘ ناہید نے اسے گھورا۔ ’’کیا آپ کے خیال میں فرحانہ کو صدیقی صاحب نے قتل کیا ہو گا؟‘‘ وہ ایک لمحہ خاموش رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ’’یہ

شاید آپ کے علم میں نہیں ہے کہ فرحانہ میری یونیورسٹی کی دوست تھی...... تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ایک این جی او سے وابستہ ہوگئی۔ اس کا کردار کبھی بھی قابلِ تعریف نہیں رہا۔ یونیورسٹی میں بھی وہ مختلف لڑکوں سے فلرٹ کرتی رہتی تھی۔ عملی زندگی میں بھی اس نے ایسا شعبہ منتخب کیا جہاں لوگوں سے اس کا ملنا جلنا ہوتا رہے۔ وہ بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتی تھی۔ بڑے بڑے لوگوں سے اپنی تنظیم کے نام پر پیسے اینٹھنے کو اس نے اپنا وتیرہ بنا لیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس نے کسی کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت بھی کی ہو، اس کے کئی دشمن ہوسکتے ہیں۔ کسی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے قتل کر دیا ہوگا۔“

”میڈم! آپ جذباتی ہورہی ہیں۔“ انسپکٹر نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”میں آپ سے نہیں، صدیقی صاحب سے سوال کر رہا ہوں اور جواب بھی انہی سے چاہتا ہوں...... ویسے......“ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا، پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”ویسے قتل کے اس کیس میں عورت کا فطری رقابت کا جذبہ بھی کارفرما ہوسکتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“ ناہید نے کہا۔ وہ اس کا مطلب بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی اور ایک لمحے کے لیے اس کا دل کانپ کر رہ گیا تھا۔

”مقتولہ فرحانہ کو پہلے دو مہینے کے دوران، کئی بار آپ کے شوہر کے ساتھ دیکھا گیا۔ اس کی خبریں آپ کو بھی ملتی ہوں گی۔ کوئی عورت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ اس کا شوہر غیر عورتوں سے ملے۔ آپ نے کوئی احتجاج کیا ہوگا، کوئی ری ایکشن......؟“

”مجھے اس کی کبھی پروا نہیں رہی کہ میرا شوہر کس سے ملتا ہے اور کس سے نہیں۔“ ناہید نے جواب دیا۔

”بہرحال، فی الوقت تو میں صدیقی صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں اور اگر...... ضرورت محسوس ہوئی تو کسی وقت آپ کو بھی زحمت دوں گا۔“ انسپکٹر نے کہا اور صدیقی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

”ہاں۔“ صدیقی نے کہا۔ ”میں اُسے جھونپڑے میں لے گیا تھا اور پھر میں...... ویٹرس کو کچھ کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر نوٹ کرانے کے لیے استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف آیا تھا...... ہال میں داخل ہوتے ہی میرے سینے میں درد شروع ہوگیا۔ میں فرش پر گر گیا اور اس کے بعد مجھے کچھ پتا نہیں کہ کلب میں کیا ہوا تھا۔ فرحانہ کے قتل کی خبر بھی مجھ سے چھپائی گئی تھی۔ تین دن بعد اسپتال میں ہی کسی نے مجھے اس واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔“

”شکریہ صدیقی صاحب۔“ انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے صدیقی سے ہاتھ ملایا، پھر ناہید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ضرورت پڑی تو کسی وقت آپ کو بھی زحمت دوں گا۔“ انسپکٹر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھ کر ناہید کانپ اٹھی تھی۔

پولیس کو رخصت کرنے کے بعد ناہید، صدیقی کے کمرے میں آگئی اور بولی۔ ”بہت سی باتیں ایسی ہیں جو تم نے پولیس سے چھپائی ہوں گی۔“ اس کی نظریں صدیقی پر جمی ہوئی تھیں۔ ”لیکن مجھے امید ہے کہ مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کرو گے۔“

”تم اپنی حد سے بڑھ رہی ہو ناہید! مجھ سے ایسی باتیں پوچھنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ تم مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتیں۔“ صدیقی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، میں تم پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتی لیکن اگر میں بھی ایسی ہی حرکتیں شروع کر دوں، تو تمہاری کیا حالت ہوگی۔ تم جانتے ہو تمہارے ہی دوستوں کے حلقے میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو میرے قریب آنے کے خواہش مند ہیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں نے غیر مردوں اور اپنے بیچ ہمیشہ فاصلہ رکھا ہے۔ کیا خیال ہے میں یہ فاصلہ ختم کر دوں؟ آزاد کر دوں ان جذبوں کو جنہیں میں نے اپنے سینے میں قید کر رکھا ہے، وہ زنجیریں توڑ دوں جن سے میں نے خود کو جکڑ رکھا ہے؟“

ناہید جذباتی ہورہی تھی اور صدیقی سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا۔ وہ بے چینی سی محسوس کرنے لگا اور بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ ناہید کمرے سے باہر نکل گئی۔

ناہید کا وہ دن بڑی بے چینی اور اضطراب میں گزرا تھا۔ پورا دن دونوں کے درمیان تناؤ کی کیفیت طاری رہی تھی۔

اسی شام ناہید، صدیقی کے کمرے میں بیٹھی چائے پی رہی تھی اور صدیقی اپنے کیے پر شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کا یہ اندازِ گفتگو، ناہید کے لیے بالکل خلافِ توقع تھا۔ اس نے تو ہمیشہ اپنے آپ کو راستی پر سمجھا تھا۔ غلطی ہونے کے باوجود بھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کی تھی۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا، وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”فرحانہ جیسی لڑکیاں بہت عیار ہوتی ہیں۔ ان کا مقصد صرف اور صرف پیسا ہوتا ہے۔ وہ تم جیسے

لوگوں کو پھانس کر اپنا اُلّو سیدھا کرتی ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے، تو لات مار دیتی ہیں۔ اس میں قصور تمہارا ہے کہ تم اس کے حُسن و جمال کے جال میں پھنس گئے۔ ویسے، ایک بات تو بتاؤ؟“

”کیا؟“ صدیقی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ کسی معاملے میں تمہیں بلیک میل تو نہیں کر رہی تھی؟“ ناہید نے پوچھا۔ ”یہ بات میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ تم کسی بھی عورت کے ساتھ ہفتے دو ہفتوں سے زیادہ نہیں رہے مگر فرحانہ، دو ڈھائی مہینوں سے تمہارے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔“

”نہیں۔“ صدیقی نے جواب دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

”تو پھر کیا بات ہے؟ وہ تم پر اتنا حاوی کیوں ہوتی جا رہی تھی کہ میرے بار بار کہنے کے باوجود تم اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے؟“ ناہید نے کہا۔

”میرا خیال ہے، اب چونکہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے اس لیے تمہیں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ صدیقی نے کہا اور تھوڑی سی خاموشی کے بعد بولا۔ ”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔“

”تم سے یا تمہاری دولت سے؟“ ناہید نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

”تم نے بھی تو دولت کی خاطر مجھ سے شادی کی تھی۔ ورنہ مجھ جیسے بوڑھے میں کیا رکھا تھا۔“ صدیقی کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

”میں آئی نہیں، لائی گئی تھی۔“ ناہید نے جواب دیا۔ ”تم ہی ہمارے دروازے پر آئے تھے اور تم نے ہی میرے باپ کو دھمکی دی تھی۔ اگر میرے باپ سے وہ غلطی نہ ہوئی ہوتی، تو میں تمہاری دولت پر تھوکتی بھی نہیں۔“ اس نے پہلی دفعہ اس طرح نفرت کا اظہار کیا تھا اور صدیقی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ ”اور اب ایک بات اچھی طرح سن لو۔“ ناہید نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنے ماں، باپ کی عزت کی خاطر میں نے اپنے ارمانوں اور اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اپنی جوانی تمہارے بڑھاپے کی بھینٹ چڑھا دی۔ اگر تمہارے پاس دولت نہ ہوتی اور تم مفلس اور قلاش ہوتے تو بھی میں تم سے اتنی ہی وفادار ہوتی، جتنی اب ہوں۔ میں نے کبھی تمہاری اس دولت کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ لیکن اب بات آہی گئی ہے تو یہ سن لو، کہ اس دولت پر میرا حق ہے اور میں اس میں کسی کو حصے دار نہیں بننے دوں گی۔“

”اوہ۔“ صدیقی مسکرایا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ فرحانہ کے قتل میں تمہارا ہاتھ ہے۔ تمہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ اس دولت میں حصے دار بننا چاہتی ہے اسی لیے تم نے اسے راستے سے ہٹا دیا۔“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی لیکن آئندہ کوئی بات ہوئی تو میں انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کروں گی۔“ ناہید نے جواب دیا اور پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔

ان دونوں میں طویل عرصے سے سرد جنگ چل رہی تھی اور اب وہ کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آگئے تھے۔ اس صورتِ حال نے ناہید کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ پلہ صدیقی کا بھاری تھا۔ اس کا کوئی فیصلہ ناہید کی زندگی میں اندھیرا پھیلا دے گا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کوئی ایسا فیصلہ کرنے سے پہلے صدیقی کو بھی دس مرتبہ سوچنا پڑے گا۔

ناہید اپنے کمرے میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا لفافہ تھا جو اس نے ناہید کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ ناہید نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”چوکیدار نے دیا ہے، تھوڑی دیر پہلے کوئی آدمی دے گیا تھا۔“ ملازمہ نے جواب دیا۔ اور کمرے سے نکل گئی۔ مختلف سماجی اور فلاحی تنظیموں کی طرف سے دعوت نامے گھر پر آتے رہتے تھے۔ وہ اس لفافے کو ایک طرف ڈال دینا چاہتی تھی پھر کچھ سوچ کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ لفافے پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر لفافہ کھول لیا اور پھر اس میں سے جو کچھ برآمد ہوا، اسے دیکھ کر اسے اپنا سانس سینے میں رکتا ہوا محسوس ہوا، وہ اس کی اپنی تصویر تھی۔

ناہید پھٹی پھٹی نظروں سے اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ فرحانہ کی لاش کے پاس گھٹنوں کے بل جھکی بیٹھی تھی۔ لاش کے سینے میں خنجر پیوست تھا اور ناہید کا ہاتھ خنجر کے دستے پر تھا۔ تصویر میں اس کا چہرہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔

ناہید کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ اس کے لیے کھڑا رہنا مشکل ہوگیا۔ وہ دھم سے کرسی پر گر گئی۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ اب یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ جب وہ کلب کے جھونپڑے میں فرحانہ کی لاش کے پاس

بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سینے میں پیوست خنجر نکالنا چاہتی تھی تو روشنی کا وہ جھماکا کیسا تھا۔ کوئی شخص یا تو پہلے سے وہاں موجود تھا یا اس کے جھونپڑے میں داخل ہونے کے بعد وہاں پہنچا تھا اور تصویر کھینچ کر بھاگ گیا تھا۔

تصویر ایک سفید کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی جس پر کمپیوٹر سے انگریزی میں صرف ایک جملہ لکھا گیا تھا۔ ''رات ساڑھے گیارہ بجے میرے فون کا انتظار کرنا۔'' اس کے نیچے کسی کا نام نہیں تھا۔

وہ اپنی تصویر کو دیکھتی اور کانپتی رہی۔ یہ تصویر اُسے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتی تھی۔ اگر پھانسی سے بچ بھی جاتی تو باقی زندگی جیل ہی میں گزرے گی۔ دفعتاً...... اس کے ذہن میں ایک خیال اورا بھرا۔ پولیس کو جائے واردات سے آلۂ قتل نہیں ملا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ناہید کے اس جھونپڑے سے نکلنے کے بعد تصویر کھینچنے والا شخص دوبارہ وہاں آیا ہوگا اور لاش کے سینے سے خنجر نکال کر لے گیا ہوگا۔ یہ تصویر اور خنجر پر اس کی انگلیوں کے نشان اسے قاتل ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس نے کھانا نہیں کھایا اور نہ ہی اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ پہلے اس نے سوچا کہ صدیقی کو صورتِ حال سے آگاہ کر دے لیکن ان میں جو جھڑپ ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اس سے کسی ہمدردی کی امید رکھنا بیکار تھا بلکہ ہوسکتا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی بار بار گھڑی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس دوران وہ سوچتی رہی تھی کہ تصویر کھینچنے والا کون ہوسکتا ہے؟ اس کے ذہن میں شیراز کا خیال بھی آیا تھا مگر...... اس خیال کو اس نے جھٹک دیا۔ شیراز تو اس کا ہمدرد تھا، وہ اسے کسی مصیبت میں نہیں پھنسا سکتا...... یہ بات بھی خارج از امکان نہیں تھی کہ صدیقی نے ہی اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے منصوبہ بنایا ہو۔ شادی کے وقت کچھ شرائط طے ہوئی تھیں۔ ان میں اہم ترین شرط یہ تھی کہ صدیقی، ناہید کو طلاق نہیں دے گا اور اگر وہ طلاق دے گا تو اسے اپنی ساری جائداد، جس میں کوٹھیاں، بنگلے، فیکٹریاں اور نقد سرمایہ بھی شامل تھا، کا نصف حصہ (پچاس فیصد) ناہید کو دینا ہوگا اور اگر ناہید طلاق کا مطالبہ کرے تو اسے ہر چیز سے محروم ہونا پڑے گا۔

ناہید کا دماغ خراب نہیں تھا کہ وہ طلاق کا مطالبہ کرتی۔ وہ تو ہر حال میں اس بڈھے کو برداشت کر رہی تھی۔ البتہ طلاق دینے میں نقصان صدیقی کا تھا اور وہ ناہید سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس قسم کے حربے استعمال کر سکتا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے۔ ناہید نے ملازمہ سے کہہ کر لاؤنج والا ٹیلی فون منگوا لیا اور اس کا پلگ بیڈ کے پیچھے دیوار کے ساکٹ میں لگا دیا۔ اس سے پہلے وہ ایک چکر صدیقی کے کمرے کا بھی لگا آئی تھی۔ وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ بوڑھی نرس اسے کمبل اوڑھا رہی تھی۔ صدیقی نے بڑی ناگوار سی نظروں سے ناہید کو دیکھا، مگر بولا کچھ نہیں۔ ناہید دوبارہ اپنے کمرے میں آگئی۔

ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجی تو...... اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم بے قراری سے میرے فون کا انتظار کر رہی ہوگی۔'' دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

''کون ہو تم؟ اور کیا چاہتے ہو؟'' ناہید کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

''تمہاری آواز سے لگ رہا ہے کہ تم بہت خوف زدہ ہو، لیکن اگر تم چاہو تو اس خوف سے نجات حاصل کر سکتی ہو۔ اس کے لیے تمہیں تھوڑی سی قربانی دینا پڑے گی۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''تم جو کوئی بھی ہو، اس حرکت کے لیے تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔'' ناہید نے کہا لیکن اس کے لہجے میں کپکپاہٹ موجود تھی۔

''تم ایسا نہیں کر سکو گی۔'' دوسری طرف سے وہی آواز ابھری۔ ''اس تصویر کے علاوہ میرے پاس وہ خنجر بھی محفوظ ہے جس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ثبت ہیں۔ اگر یہ دونوں چیزیں پولیس تک پہنچ گئیں، تو تمہاری ساری زندگی یا تو جیل میں گزرے گی یا اس کا اختتام پھانسی کے تختے پر ہوگا۔''

''تم جانتے ہو، میں نے وہ قتل نہیں کیا؟'' ناہید نے کہا۔

''جانتا ہوں، لیکن یہ دونوں ثبوت جھٹلائے نہیں جا سکتے۔ اس لیے تو میں نے کہا تھا کہ تم اس خوف سے نجات حاصل کر سکتی ہو۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' ناہید نے پوچھا۔

''صرف دو کروڑ روپے۔'' دوسری طرف سے سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔ ''یہ معمولی سی رقم تمہاری زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ تمہیں تین دن کے اندر اندر اس رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔ میں پرسوں شام فون کروں گا۔ اگر تم

نے پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش کی تو نتائج کی تمام تر ذمے داری تم پر ہوگی۔''

ناہید ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی مگر دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ اس نے ریسیور پٹخ دیا اور ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ دو کروڑ روپے...... اس کی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ تین دن کے اندر اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیسے کیا جائے؟ ناہید نے وہ رات جاگ کر گزاری۔ اس سے اگلے دو دن بھی کانٹوں پر لوٹتے ہوئے کٹے۔ تیسرے دن شام سے پہلے ہی اس نے ٹیلی فون اپنے کمرے میں لگا لیا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی تو اس نے فوراً ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''ان دو دنوں میں تم نے بھاگ دوڑ تو بہت کی۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے مطلوبہ رقم کا بندوبست بھی کر لیا ہوگا۔'' دوسری طرف سے ہیلو کے جواب میں کہا گیا۔

ناہید چونک گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، اس کی نگرانی کرتا رہا تھا۔

''میں پوری رقم کا بندوبست نہیں کر سکی۔'' ناہید نے کہا۔ ''بڑی مشکل سے ایک کروڑ ستّر لاکھ کا بندوبست کر سکی ہوں۔''

''حیرت ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''تم ایک ارب پتی کی بیوی ہو۔ تمہارے ایک اشارے پر تو تمہارے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگایا جا سکتا ہے اور تم...... دو کروڑ کا بندوبست نہیں کر سکیں؟''

''تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے، یہ رقم بھی میں نے بڑی مشکل سے جمع کی ہے۔'' ناہید نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... چلے گا...... اب میری بات غور سے سنو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔'' وہ ہدایات دینے لگا، اسے رقم کہاں اور کیسے پہنچانی ہے۔

اس سے آدھے گھنٹے بعد اس نے ایک سوٹ کیس گاڑی میں رکھا اور اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ عالی شان کوٹھی سے نکلتے ہی اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

شہر کے نواحی علاقے میں وہ الگ تھلگ مکان تلاش کرنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ بوسیدہ سے مکان کا دروازہ ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ کے ساتھ کھل گیا۔ بھاری سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکائے اندر داخل ہوتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ دروازے کے دوسری جانب ایک مختصر سا آنگن تھا، جس کے ایک طرف دو کمرے تھے۔ دائیں طرف کچن، اسٹور اور اس کے ساتھ باتھ روم تھا۔ کمروں کے سامنے برآمدے میں مدھم روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ وہ آنگن میں کھڑی خوف زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ چند منٹ گزرے اور پھر برآمدے میں دائیں طرف والے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اندر روشنی ہوگئی اور ایک آواز سنائی دی۔

''اس کمرے میں چلی آؤ، ناہید صدیقی۔''

وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی ٹانگوں میں ہلکی سے کپکپاہٹ تھی۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی، دروازہ دھڑ سے بند ہوگیا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

''ایک دراز قامت آدمی دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ماسک تھا اور ہاتھ میں پستول جس کا رخ ناہید کی جانب تھا۔

''یہ سوٹ کیس فرش پر رکھ کر کھولو، میں تسلی کر لینا چاہتا ہوں کہ اس میں رقم ہی ہے یا کچھ اور......'' اس شخص کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ آواز وہی تھی جو وہ فون پر سن چکی تھی۔ ناہید نے سوٹ کیس گرد آلود فرش پر رکھ دیا۔ اس کا کور... کھولتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ سوٹ کیس میں ہزار کے نوٹوں کے بنڈل بھرے ہوئے تھے۔

''وہاں کھڑی ہو جاؤ۔ اس کونے میں۔'' نقاب پوش نے پستول سے اشارہ کیا۔

ناہید اٹھ کر کمرے کے کونے میں کھڑی ہوگئی۔ نقاب پوش نے نیچے سے اوپر تک بنڈل چیک کیے اور ڈھکنا بند کر کے سوٹ کیس دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔

''میرے جانے کے بعد تم دس منٹ تک اس کمرے سے نہیں نکلو گی۔'' نقاب پوش نے کہا۔

''وہ خنجر اور تصویر کا نیگیٹو؟'' ناہید کی آواز کانپ رہی تھی۔

''دونوں چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔ یہاں سے سیدھی گھر چلے جانا۔'' نقاب پوش نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

اس سے پہلے کہ ناہید کچھ کہتی نقاب پوش باہر نکل گیا اور دھڑ سے دروازہ بند ہوگیا۔ ناہید چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں وہاں کھڑی رہی اور پھر دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

دوسرے دن صبح دس بجے کے قریب بنگلے کے چوکیدار نے ایک پیکٹ اس کے حوالے کر دیا جو ایک بچہ دے گیا تھا اور اس پر ناہید کا نام لکھا ہوا تھا۔

ناہید نے کمرے میں آکر بڑی بے صبری سے ڈبا کھولا۔ ایک کاغذ میں تصویر لپٹی ہوئی تھی جس پر مختصر سی تحریر تھی۔ ''تمہاری تصویر اور ٹیکیو میرے لیے بیکار ہے۔ خنجر کو حفظِ ماتقدم کے طور پر چند دن اپنے پاس رکھوں گا۔ بہتر ہوگا کہ اس دوران میں باقی تیس لاکھ روپوں کا بھی بندوبست کر لو۔ اس کاغذ میں لپٹی ہوئی دوسری تصویر بھی تمہیں رقم کا بندوبست کرنے پر مجبور کر دے گی۔''

ناہید نے وہ کاغذ کھول لیا۔ اس کی تصویر اور ٹیکیو تھا اور دوسری تصویر دیکھ کر وہ تھرتھرا اٹھی۔

وہ دراصل ایک کارڈ تھا جس پر خون جیسے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ خون جیسے سرخ رنگ کی ایک لکیر نیچے کی طرف پھیلی ہوئی تھی اور اس دھبے میں بڑی فنکاری سے ایک انسانی چہرہ اجاگر کیا گیا تھا اور وہ چہرہ دیکھ کر ناہید کو اپنا سانس سینے میں رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ اس کے چھوٹے بھائی جاوید کا چہرہ تھا۔ لگتا تھا جیسے اسے اذیت کا نشانہ بنایا جا رہا ہو...... وہ چیخ رہا تھا...... کھلا ہوا منہ اور خوف سے پھیلی ہوئی آنکھیں۔

ناہید کا دماغ گھوم گیا۔ اردگرد کی ہر چیز گردش کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر...... کامیاب نہ ہو سکی اور لہراتی ہوئی قالین پر گر گئی۔

☆☆☆

تین ہفتے ہو چکے تھے۔ ثانیہ کوما میں تھی۔ وہ نہ تو زندہ تھی اور نہ مردہ وہ ایسی لاش تھی جس سے زندگی کا رابطہ ابھی منقطع نہیں ہوا تھا۔

بیڈ کے قریب کھڑا ہوا انسپکٹر افضل اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ جب یہ ہوش میں آئے گی تو کیا اسے احساس ہوگا کہ اس کی زندگی کے بیس بائیس دن گزر چکے تھے؟ انسپکٹر افضل ایک گھنٹا پہلے آیا تھا۔ زیادہ وقت تو اس نے ڈاکٹر شمس کے کمرے میں گزارہ تھا۔

ڈاکٹر کی باتوں سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ اب ڈاکٹر بھی ثانیہ کے بارے میں فکرمند تھا۔ نجانے کس طرح دل کے قریب پیوست گولی اپنی جگہ سے سوئی کی نوک کے برابر حرکت کر چکی تھی۔ گولی کی حرکت ثانیہ کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر شمس نے تو واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر ہفتہ دس دن تک متبادل دل کا بندوبست نہ ہوا تو ثانیہ کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکے گی۔ دل کے حصول کے لیے کوششیں جاری تھیں مگر ابھی کوئی امید نہیں پیدا ہوئی تھی۔

انسپکٹر افضل ملک ڈاکٹر کے کمرے سے نکل کر ثانیہ والے کمرے میں آ گیا تھا۔ اس وقت جمال کمرے میں اکیلا ہی تھا۔ اس کی حالت مُردوں سے بدتر تھی۔ ثانیہ تو تکلیف میں تھی ہی...... وہ اس سے زیادہ کرب میں مبتلا تھا۔

افضل ملک حسبِ معمول جمال کو تسلی دے کر رخصت ہونا چاہتا تھا کہ دروازے پر ڈاکٹر شمس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا اور چہرے پر انبساط کی لہر تھی۔

''مبارک ہو مسٹر جمال۔'' وہ جمال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری بیٹی کے لیے دل کا انتظام ہو گیا ہے۔ یہ فیکس لندن سے آیا ہے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ دکھایا۔ ''پرسوں شام کو لندن سے دل یہاں پہنچ جائے گا اور اسی رات ٹرانسپلانٹ ہو جائے گا۔''

''خدایا تیرا شکر ہے۔'' جمال کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

انسپکٹر افضل کے چہرے پر بھی رونق آ گئی۔ ڈاکٹر شمس بھی خوش تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ ثانیہ سے ہر شخص کو ہمدردی تھی۔ ہر کوئی اس کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

جمال بہت خوش تھا۔ اس کی بیٹی کے زندہ رہنے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ بس دو دن کی بات اور تھی۔ ماہر ڈاکٹر دل تبدیل کر دیں گے اور...... زندگی اور موت کی سرحد پر لڑی جانے والی یہ جنگ ثانیہ جیت جائے گی اور وہ زندگی کی سرحد میں آ جائے گی۔

دوسرے دن جمال شام کے وقت تھوڑی دیر کے لیے اسپتال سے باہر گیا تھا۔ واپس آیا تو پورے اسپتال میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اور عملے کے دوسرے افراد اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ جمال پہلے تو اس افراتفری پر حیران ہوا پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ کوئی بڑا آدمی بیمار ہو کر اسپتال آیا ہوگا۔ ایسے موقعوں پر اسپتال میں ہلچل مچا کرتی تھی۔ بڑے لوگ اس اسپتال کو عطیات دیتے تھے اور جب وہ بیمار ہو کر یہاں آتے تھے تو اسپتال کے ہر ملازم کی توجہ ان پر مرکوز ہوتی تھی۔

ایمرجنسی روم کے قریب سے گزرتے ہوئے جمال، ناہید صدیقی کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس وقت وہ جامنی رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں میں کرب تھا اور چہرہ

بھی ستا ہوا تھا۔ جمال نے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے دریافت کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ سیٹھ کریم صدیقی کو پھر ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور اس مرتبہ اس کی حالت زیادہ تشویشناک تھی۔ جمال ایک طرف کھڑا اس کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ایمرجنسی روم کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر شکیل باہر نکلا۔ ناہید دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئی۔ ''کیا صورتِ حال ہے ڈاکٹر؟'' اس نے پوچھا۔

''صورتِ حال خطرناک ہے مگر فی الحال کنٹرول میں ہے۔'' ڈاکٹر شکیل نے جواب دیا۔ ''اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد صدیقی کو انتہائی نگہداشت کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ایک ڈاکٹر، دو نرسیں کمرے میں موجود تھیں۔ ناہید بھی کرسی پر بیٹھی ویران سی نظروں سے بیڈ پر پڑے ہوئے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ مزید ایک گھنٹے بعد صدیقی کے کیے جانے والے تمام ٹیسٹوں کی رپورٹس تیار ہو گئیں۔ اسپتال کے سینئرز ڈاکٹرز کا پینل، ڈاکٹر شکیل کے کمرے میں میٹنگ میں مصروف تھا۔ اس میٹنگ میں اسپتال کا ڈائریکٹر بھی موجود تھا۔

دلچسپی کی بات یہ تھی کہ کریم صدیقی کا بلڈ گروپ وہی تھا جو ثانیہ کا تھا۔ دونوں کی رپورٹس میں اور بھی کئی باتیں مشترک تھیں۔

''اب صورتِ حال یہ ہے۔'' ڈاکٹر شکیل کہہ رہا تھا۔ ''کل شام لندن سے ایک ایسا دل ہمارے پاس آنے والا ہے جو سیٹھ صدیقی کی میڈیکل رپورٹس کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ ہمیں اپنی طرف سے تمام تیاری مکمل کر لینی چاہیے اور کل شام جیسے ہی وہ دل ہمیں موصول ہو اُسے صدیقی سیٹھ کے سینے میں منتقل کر دینا چاہیے۔''

''لیکن ڈاکٹر شکیل۔'' ڈاکٹر شمس نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ وہ دل ثانیہ کے لیے منگوایا گیا ہے۔ وہ تین ہفتوں سے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔''

''آپ بھی جانتے ہیں ڈاکٹر شمس صاحب!'' ڈاکٹر شکیل بولا۔ ''سیٹھ کریم صدیقی کی زندگی بھی خطرے میں ہے اور ان کا دل تبدیل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس لڑکی کے مقابلے میں سیٹھ صدیقی ہمارے لیے زیادہ اہم ہیں۔ وہ اس اسپتال کو ہر مہینے دس لاکھ روپے ڈونیشن دیتے ہیں۔ اس اسپتال پر سب سے زیادہ حق انہی کا ہے۔''

''حق تو اس لڑکی کا بنتا ہے جو پہلے سے یہاں داخل ہے اور یہ دل منگوایا بھی اسی کے لیے گیا تھا۔'' ڈاکٹر شمس نے کہا۔ ''ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ جینے کا حق کسی غریب کو ملنا چاہیے یا دولت مند کو...... اگر ہم اونچ نیچ کی اس تفریق میں پڑ گئے تو کوئی بھی ہم پر بھروسا نہیں کرے گا۔ طب جیسے مقدس پیشے پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ اس لیے میری یہی رائے ہے کہ یہ دل اس لڑکی کے سینے میں لگایا جائے جس کے لیے منگوایا گیا ہے۔''

''ہماری نظروں میں سیٹھ کریم صدیقی کی زندگی کی زیادہ اہمیت ہے۔ اس لیے یہ دل انہی کو لگایا جائے گا۔'' ڈاکٹر شکیل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ وہ اسپتال کے ڈائریکٹر کا خاص آدمی تھا۔ صدیقی جیسے دولت مندوں کی چمچہ گیری بھی کرتا رہتا تھا۔ ڈائریکٹر نے بھی ڈاکٹر شکیل کے اس فیصلے کی تائید کر دی تھی۔

اگلے دن اسپتال کا ایک سینئر ڈاکٹر، دو جونیئر ڈاکٹروں کے ساتھ لندن...... سے آنے والا دل وصول کرنے کے لیے ائرپورٹ روانہ ہو گیا۔

ثانیہ کے والد جمال کے کان میں بھی یہ بھنک پڑ گئی تھی کہ لندن سے آنے والا دل اس کی بیٹی کے بجائے سیٹھ کریم صدیقی کے سینے میں لگانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ ڈاکٹر شمس کو تلاش کر رہا تھا جس نے دو روز پہلے اسے خوش خبری سنائی تھی کہ اس کی بیٹی زندگی کی جنگ جیت جائے گی مگر ڈاکٹر شمس اس کے سامنے نہیں آیا۔ وہ اپنے اندر اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

نہ ٹوٹنے والے شیشے کا وہ بکس ڈھائی فٹ لمبا دو فٹ اونچا اور ڈیڑھ فٹ چوڑا تھا۔ اس بکس کے اندر نصف کے قریب کسی قسم کا محلول بھرا ہوا تھا اور اس میں پڑے ہوئے مخصوص ساخت کے ایک نرم سے طشت نما پلیٹ فارم پر دھڑکتا ہوا دل رکھا ہوا تھا۔ اس کے والو، سے منسلک ٹرانسپیرنٹ ربر کی ٹیوبس تھیں جو ایک طرف سے شروع ہو کر پورے بکس میں بل کھاتی ہوئی دل کے دوسری طرف والے والو سے جا ملتی تھیں۔ ان ٹیوبس میں خون گردش کر رہا تھا۔ دل کی دھڑکنوں کے ساتھ اس خون کو بھی حرکت کرتے ہوئے واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔

بکس کے باہر ایک بیٹری لگی ہوئی تھی جو سگریٹ کی ڈبیا سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔ یہی بیٹری بکس کے اندر رکھے ہوئے دل کی دھڑکنوں کو کنٹرول کر رہی تھی اور اس بیٹری ہی کے ذریعے بکس کے اندر وہ درجۂ حرارت برقرار رکھا گیا تھا

جو ایک صحت مند اور نارمل انسان کے جسم کا ہوسکتا ہے۔

یہ بکس اسپتال کے سینئر ڈاکٹر کمال نے وصول کیا تھا اور اب اسے ائرپورٹ کی ٹرمنل بلڈنگ کے عین سامنے کھڑی ہوئی ایمبولینس میں پہنچایا جارہا تھا۔ ایمبولینس کے پچھلے حصے میں ہموار اور نرم سطح والے کشن پر بکس رکھ دیا گیا۔ دونوں جونیئر ڈاکٹرز ایمبولینس کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئے اور انہوں نے ایک ایک ہاتھ بکس پر رکھ دیا تاکہ ایمبولینس کو لگنے والے کسی جھٹکے سے اس بکس کو اپنی جگہ سے ہلنے یا گرنے سے بچایا جاسکے۔ ڈاکٹر کمال آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ ڈرائیور نے بیٹھتے ہی سائرن آن کردیا تھا اور انجن اسٹارٹ کرکے ایمبولینس آگے بڑھا دی۔

ائرپورٹ سے اسپتال چودہ پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ازدحام تھا۔ کیونکہ لوگوں کی واپسی کا وقت تھا۔ جگہ جگہ ٹریفک سگنلز کی وجہ سے ایمبولینس کو رکنا پڑ رہا تھا۔

دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایمبولینس ایک ذیلی سڑک پر مڑ گئی۔ دو کلومیٹر کا مزید فاصلہ طے کرکے ڈرائیور نے ایمبولینس کو ایک ایسی سڑک پر موڑ دیا جہاں کسی قسم کا ٹریفک نہیں تھا، بلکہ دور دور تک کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ یہ راستہ اسپتال پہنچنے کے لیے قریب پڑتا تھا اس لیے ڈرائیور نے ایمبولینس اس طرف موڑ لی تھی۔

ایمبولینس اس طرف موڑنے کے چند سیکنڈ بعد ہی پیچھے سے آنے والی ایک موٹر بائیک ایمبولینس کو اوورٹیک کرتی ہوئی برق رفتاری سے آگے نکل گئی تھی۔ ایمبولینس تھوڑی آگے بڑھی تو ڈاکٹر کمال چونک گیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ایک موٹر بائیک سڑک پر پڑی تھی اور اس کے قریب ہی ایک آدمی بھی آڑھا ترچھا پڑا تھا۔

"اوہ! میرا خیال ہے یہ وہی موٹر سائیکل سوار ہے جو تیز رفتاری سے ہمیں اوورٹیک کرکے آیا تھا۔ اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہے، گاڑی پہلو سے نکالنے کی کوشش کرو...... ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اسے دیکھ سکیں۔" ڈاکٹر کمال نے کہا۔

"راستہ بالکل نہیں ہے سر۔" ڈرائیور نے کہا۔ "ایمبولینس روک کر اس آدمی یا موٹر بائیک کو ہٹانا پڑے گا۔"

ڈرائیور نے ایمبولینس روک لی اور نیچے اتر کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے پہلے موٹر سائیکل سوار کی طرف دیکھا جو سڑک پر اوندھا...... بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے کے نیچے دبا ہوا تھا اور دوسرا بازو سائڈ میں پھیلا ہوا تھا۔ ڈرائیور سمجھ گیا کہ وہ بے ہوش ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی مدد کرے یا موٹر سائیکل ایک طرف کھینچ کر اپنی ایمبولینس کے لیے راستہ بنائے۔

"تم وقت ضائع کررہے ہو ڈرائیور۔ موٹر بائیک اٹھا کر ایک طرف کردو جلدی کرو۔" ایمبولیس میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کمال نے آواز لگائی۔ ڈرائیور موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔ وہ موٹر سائیکل اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ سڑک پر پڑا ہوا نوجوان بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ڈرائیور کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نوجوان نے ڈرائیور کو دھکا دے کر ایک طرف گرادیا اور ایمبولینس کے قریب پہنچ گیا۔

"نیچے اتر آؤ ڈاکٹر...... جلدی کرو۔" وہ ڈاکٹر کمال کو پستول کی زد پر لیتے ہوئے غرایا۔

ڈاکٹر کمال دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ نوجوان نے پچھلا دروازہ کھول کر دونوں جونیئرز ڈاکٹروں کو بھی نیچے اتار لیا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے ان چاروں کو پستول کی زد میں لیے ہوئے تھا۔

"ان ٹیلوں کی طرف دوڑ لگا دو، پیچھے مڑ کر دیکھا تو بھون کر رکھ دوں گا۔" پستول بردار نوجوان نے پستول کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

"تم غلط کررہے ہو مسٹر......" ڈاکٹر کمال کہنے لگا۔ "اس ایمبولینس میں دل ہے۔ مریض اسپتال میں پڑا ہے اگر جلد سے جلد یہ دل اس کے سینے میں منتقل نہ کیا گیا تو وہ ختم ہوجائے گا۔"

"اگر زیادہ بکواس کی تو میں تم چاروں کو ختم کردوں گا۔" نوجوان غرایا۔ "دوڑ لگا دو، جلدی کرو۔" اس نے پستول ڈاکٹر کمال کے سینے کی طرف اٹھا دیا تھا۔ ڈاکٹر کمال اور اس کے تینوں ساتھی ٹیلوں کی طرف دوڑ پڑے۔

اس کے چند سیکنڈ بعد ہی پیچھے سے آنے والی ایک تیز رفتار کار وہاں آکر رکی۔ دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت آدمی نیچے اترا۔ اس نے پستول والے کے ساتھ مل کر ایمبولینس میں سے شیشے کا بکس اتار کر کار کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ پستول والا نوجوان بھی اس سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ دراز قد والے نے سیٹ سنبھال لی اور کار برق رفتاری سے آگے روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

اسپتال میں ایک بار پھر کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ سیٹھ کریم صدیقی کو لگایا جانے والا دل ہائی جیک ہوگیا تھا۔ پولیس کو اس کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اسپتال کے تمام ڈاکٹرز بھاگے پھر رہے تھے۔

تمام سینئر ڈاکٹرز اسپتال کے ڈائریکٹر کے آفس میں جمع تھے۔ ناہید بھی وہاں موجود تھی اور انسپکٹر افضل ملک بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کمال، دونوں ماتحت ڈاکٹروں اور ایمبولینس ڈرائیور سے سوالات کررہا تھا۔

"یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس دل کو باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہائی جیک کیا گیا ہے۔" انسپکٹر افضل کہہ رہا تھا۔ "وہ جو کوئی بھی تھے، ائرپورٹ ہی سے ایمبولینس کے پیچھے لگے تھے اور اس سنسان سڑک پر انہیں موقع مل گیا۔ وہ اگرچہ موٹر سائیکل جائے واردات پر چھوڑ گئے ہیں مگر میں دعوے سے کہتا ہوں کہ موٹر سائیکل چوری کی ہوگی۔ ایسی وارداتوں میں مجرم کوئی ایسی چیز استعمال نہیں کرتے جس سے ان کا کوئی سراغ مل سکے۔"

"اب کیا ہوگا ڈاکٹر؟" ناہید، ڈاکٹر شکیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

"ان کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے آفیسر۔" ڈاکٹر شکیل نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس دل کے بارے میں ہمیں جو رپورٹ ملی ہے، اس کے مطابق وہ مزید بیس گھنٹے تک کارآمد ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، وہ دل کمزور ہوتا جائے گا۔ مزید برآں...... اگر چودہ گھنٹوں کے اندر اندر سیٹھ صدیقی کے سینے میں دل کی پیوندکاری نہ کی گئی تو اسے زندہ رکھنا بھی مشکل ہوجائے گا۔"

انسپکٹر افضل کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ڈائریکٹر نے ریسیور اٹھالیا۔ چند لمحے وہ بات کرتا رہا پھر ناہید کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کے لیے کال ہے۔"

ناہید نے جلدی سے آگے بڑھ کر ریسیور لے لیا۔

"ہیلو...... میں ناہید صدیقی بول رہی ہوں۔" اس نے کہا۔

"ناہید صدیقی۔" دوسری طرف سے مردانہ آواز سنائی دی۔ "میں تمہاری حالت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ اپنے ٹیلی فون سیٹ کا ساؤنڈ سسٹم آن کردو، تاکہ کمرے میں موجود دوسرے لوگ بھی میری آواز سن سکیں۔" ناہید نے ایک بٹن دبا دیا۔

"تم کون ہو، کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"وہ دل جو تمہارے بوڑھے شوہر کو زندگی بخش سکتا ہے، میرے قبضے میں ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں جانتا ہوں کہ اگر تیرہ، چودہ گھنٹوں میں دل کی پیوندکاری نہ کی گئی تو وہ بوڑھا اس دنیا سے رخصت ہوجائے گا۔ اگر تم اس کی زندگی بچانا چاہتی ہو تو یہ دل واپس مل سکتا ہے۔"

"خدا کے لیے وہ دل واپس کردو۔" ناہید گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ میں منہ مانگی قیمت دوں گی۔ لاکھ...... دو لاکھ...... دس لاکھ......"

"اس دل کی قیمت پانچ کروڑ ہے، سیٹھانی صاحبہ......" دوسری طرف سے سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔ "پانچ کروڑ روپے زیادہ بڑی رقم نہیں ہے۔ اس وقت آٹھ بجے ہیں۔ میں تمہیں زیادہ سے زیادہ سات گھنٹوں کی مہلت دے سکتا ہوں۔ رات تین بجے تک۔"

"میں چند گھنٹوں میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کرسکتی۔" ناہید نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"تم بہت بڑے سیٹھ کی بیوی ہو، بڑے بڑے سیٹھوں سے تعلقات ہیں۔ ان سیٹھوں کی تجوریاں تو نوٹوں سے بھری رہتی ہیں۔ اس معمولی رقم کا بندوبست کرنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ اب اپنے فون کا ساؤنڈ سسٹم بند کردو تو تمہیں ایک اور بات بتاؤں۔" ناہید نے ساؤنڈ سسٹم بند کردیا۔ وہ شخص کہہ رہا تھا۔ "پانچ کروڑ کی اس رقم سے تمہاری اور تمہارے بھائی کی زندگی بھی وابستہ ہے۔ جو چند روز پہلے لندن سے آیا تھا اور ائرپورٹ پر ہی میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ رات تین بجے تک رقم فراہم کردو، تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاؤں گا...... رقم تمہیں اسی مکان میں پہنچانی ہے جہاں تم پہلے بھی آچکی ہو، لیکن یاد رکھو! اگر تمہارے ساتھ کوئی اور ہوا یا کسی نے تمہارا تعاقب کرکے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کی تو تمہیں وہاں کچھ نہیں ملے گا۔ وقت یاد رکھنا۔ رات تین بجے......"

ناہید ہیلو ہیلو کہتی رہ گئی مگر دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہوچکا تھا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور بھیگی آنکھوں سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ناہید کی گاڑی ٹھیک تین بجے رات اس ویران مکان کے سامنے رکی تھی۔ اس نے گاڑی میں سے دو بڑے سوٹ کیس نکالے۔ وہ بڑی مشکل سے ان سوٹ کیسوں کو گھسیٹتی

ہوئی مکان کے اس کمرے میں آگئی جہاں پہلے بھی آچکی تھی۔

دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر کمرے کے وسط میں فرش پر رکھے ہوئے شیشے کے اس بکس پر پڑی، جس میں رکھا ہوا دل ایک تندرست انسان کے دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔ کمرے میں وہ نقاب پوش بھی موجود تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر دونوں سوٹ کیس اٹھا کر باہر چلا گیا۔ جبکہ ناہید نے بڑی احتیاط سے شیشے کا وہ بکس اٹھایا اور مکان سے باہر آکر اسے پوری احتیاط سے پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ اسی وقت مکان کے پچھلی طرف سے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔

ناہید صدیقی جب اسپتال واپس پہنچی تو چار بج چکے تھے۔ اس کی آمد کی اطلاع پاتے ہی کئی سینئر ڈاکٹرز پورچ میں پہنچ چکے تھے۔ ناہید کی گاڑی سے شیشے کا بکس اتار کر ایک اسٹریچر ٹرالی پر رکھ دیا گیا۔ اس دل نے شام ہی سے اسپتال میں کھلبلی سی مچا رکھی تھی۔ ہر شخص اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ مریضوں کے اٹینڈنٹس ابھی تک جاگ رہے تھے۔ رات کا آخری پہر ہونے کے باوجود دل کی آمد کی اطلاع پورے اسپتال میں پھیل گئی اور لوگ راہداری میں جمع ہونے لگے۔ ثانیہ کا والد جمال بھی کمرے سے نکل آیا۔ اسے صورت حال کا علم ہوا تو وہ دوڑتا ہوا آپریشن تھیٹر والی راہداری میں پہنچ گیا اور ٹرالی کا راستہ روک لیا۔

''میں یہ دل سیٹھ صدیقی کے سینے میں نہیں لگانے دوں گا۔'' وہ چیخا۔ ''کتنے ظالم ہو تم لوگ...... اس شخص کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہے ہو، جو اپنی عمر سے زیادہ جی چکا ہے۔ تم لوگوں کو اس بچی کی کوئی پروا نہیں جس نے ابھی اس دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ میں یہ دل اس بڈھے کے سینے میں نہیں لگانے دوں گا۔ خاموش کر دوں گا اس کی دھڑکنوں کو......''

''سیٹھ صدیقی اس اسپتال کو دس لاکھ روپے ماہانہ عطیہ دیتا ہے۔ اس کی زندگی تمہاری بیٹی کی زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ راستے سے ہٹ جاؤ۔'' ڈاکٹر شکیل نے کہا مگر جمال راستے سے نہیں ہٹا بلکہ اس نے آگے بڑھ کر ٹرالی پر رکھے ہوئے بکس کو گرانے کی کوشش کی۔ دو تین آدمی اسے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے گئے۔

ناہید نے اس غیر آباد مکان سے روانہ ہوتے ہی موبائل فون...... پر دل کے مل جانے کی اطلاع دے دی تھی۔ اس کی اطلاع ملتے ہی سیٹھ کریم صدیقی کو آپریشن تھیٹر میں پہنچایا جا چکا تھا۔ ڈاکٹر شکیل کی نگرانی میں چند منٹ بعد ہی صدیقی کے بوڑھے دل کی جگہ نئے دل کی پیوندکاری کا عمل شروع ہو گیا۔ سارا کام بڑی خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا۔ صدیقی کا بوڑھا دل نکال کر اس کی جگہ نیا دل رکھ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شکیل اور اس کے ساتھی بڑی مہارت کا ثبوت دے رہے تھے۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ دفعتاً ڈاکٹر شکیل کا ہاتھ کانپ اٹھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے آپریشن ٹیبل پر پڑے ہوئے جسم نے حرکت کی ہو اور اس سے پہلے کہ وہ یا دوسرے ساتھی کچھ سمجھ سکتے، کریم صدیقی کا جسم زور زور سے حرکت کرنے لگا۔ اس کا سینہ چاک تھا۔ ایک ڈاکٹر خون کی گردش جاری رکھنے کے لیے پمپ کر رہا تھا لیکن چند سیکنڈ میں ہی صدیقی کا جسم مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ انستھیسیا کا اثر زائل ہو رہا تھا۔ تمام ڈاکٹر اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جس شخص کا سینہ چاک ہو، اسے تو صرف موت کا فرشتہ ہی سنبھال سکتا ہے۔ اس کے سینے میں رکھا ہوا نیا دل اچھل کر میز پر گرا اور لڑھکتا ہوا فرش پر گر گیا اور پھر چند لمحوں میں سیٹھ کریم صدیقی کی زندگی کی کہانی ختم ہو گئی۔

وہ دل ڈاکٹر شکیل کے قدموں میں فرش پر پڑا تھا جو ایک نو عمر غریب لڑکی کی زندگی بچانے کے لیے لندن سے منگوایا گیا تھا۔ وہ ایک کروڑ پتی شخص کی زندگی بھی نہ بچا سکا۔

☆☆☆

کریم صدیقی کے انتقال کو بارہ دن گزر چکے تھے۔ ناہید، شیراز کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ ان میں ابھی ابھی جھڑپ ہوئی ہے۔ وہ دونوں اس وقت شیراز کے بنگلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شیراز کے بلاوے پر ہی وہ یہاں آئی تھی۔

''میں رنگ میں ابھرا ہوا، اپنے بھائی کا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ فرحانہ کو تم نے قتل کیا ہے۔ میری تصویر بھی تم ہی نے کھینچی تھی۔ تم شاید اس بات کو بھول گئے تھے کہ یونیورسٹی میں تم نے مجھے اپنی بنائی ہوئی ایسی تصویریں دکھائی تھیں جو رنگوں میں ابھاری گئی تھیں۔ میں تمہیں پہچان گئی تھی لیکن خاموش اس لیے رہی کہ وہ خنجر اور میرا بھائی تمہارے قبضے میں تھے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ مزید تیس لاکھ روپے دے کر تم سے قطع تعلق کر لوں گی۔''

ناہید کی باتیں سن کر وہ طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ ''لیکن میں تم کو اتنی آسانی سے قطع تعلق کبھی نہ کرنے دیتا۔ تم جیسی سونے کی چڑیا کو آسانی سے کون ہاتھ سے جانے دیتا ہے؟ یہ تو میری اضافی آمدنی تھی...... اصل آمدنی تو اس

وقت ہوتی جب تمہارے دوسرے منصوبے پر عمل ہو جاتا۔''

''میں نے تمہیں منع کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود تم نے دل ہائی جیک کر لیا اور پھر واپس بھی کر دیا۔ اگر اس بڈھے کو نئی زندگی مل جاتی تو......'' ناہید نے کہا۔

''اگر اسے نئی زندگی مل جاتی تو تمہیں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی۔'' شیراز بولا۔ ''جس وکیل نے سیٹھ صدیقی کا نیا وصیت نامہ تیار کیا تھا۔ اس نے اسی وقت مجھے فون پر بتا دیا تھا۔ اس وصیت نامے کے تحت صدیقی کی تمام جائداد کو ایک ٹرسٹ کے سپرد کر دیا جاتا۔ وہ جب چاہتا اس ٹرسٹ سے رقم لے سکتا تھا۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ اس روز، اسے دوبارہ دل کا دورہ پڑ گیا اور پھر اسے ہوش نہیں آسکا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ وہ اپنی موت آپ مر جائے گا لیکن پھر انکشاف ہوا کہ لندن سے آنے والا دل اسے لگایا جائے گا۔ دل کی پیوندکاری کے بعد ہوش میں آتے ہی وہ سب سے پہلے اس نئے وصیت نامے پر دستخط کرتا اور تم ہر چیز، حتیٰ کہ اپنے جائز حق سے بھی محروم ہو جاتیں لیکن میں نے تمہیں بچانے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اسپتال کے بے ہوش کرنے والے ڈاکٹر کو ساٹھ لاکھ روپے دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ سیٹھ صدیقی کو بے ہوشی کی دوا اس طرح سے دے کہ اس کا اثر آپریشن کے دوران میں ہی زائل ہو جائے اور وہ بڈھا سیٹھ ختم ہو جائے۔'' شیراز چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس دوران میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ڈاکٹر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور اس بڈھے کے سینے میں دل کی پیوندکاری کا آپریشن کامیاب ہو جائے...... اس طرح تم تو ہر چیز سے محروم ہو جاتیں، مجھے بھی کچھ نہ ملتا اس لیے میں نے راستے میں ہی دل کو ہائی جیک کر کے فون پر تمہیں دوسروں کی موجودگی میں وہ دھمکی دی...... اس طرح مجھے بھی پانچ کروڑ مل گئے اور کسی کو شک بھی نہیں ہو سکا کہ تم بھی اس منصوبے میں شامل تھیں۔ یہ منصوبہ تمہارا ہی تو بنایا ہوا تھا۔''

''اس طرح تم مجھ سے چھ کروڑ ستر لاکھ روپے وصول کر چکے ہو، اب کیا چاہتے ہو؟'' ناہید نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''اپنا حصہ......'' شیراز نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''چند دنوں بعد تم سیٹھ کریم صدیقی کے تمام بزنس اور جائداد کی وارث بننے والی ہو، میرا مطالبہ زیادہ نہیں ہے، صرف پندرہ کروڑ روپے اور...... اس کے بعد میں یہ ملک چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

ناہید چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ہینڈ بیگ کھول کر اس نے اچانک ہی پستول نکال لیا۔ ''اب تو میں صرف ایک گولی ہی تمہیں دے سکتی ہوں۔'' وہ غرائی۔ ''وہ خنجر تم نے کہاں چھپا رکھا ہے اور میرا بھائی کہاں ہے، میں تمہیں صرف ایک منٹ دوں گی، اس کے بعد گولی چلا دوں گی۔'' پستول کا رخ اس کے دل کی طرف تھا۔

شیراز کا چہرہ فق ہو گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا، اس نے غیر محسوس انداز میں اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن ٹھیک اسی لمحے دروازے کی طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''تم دونوں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے...... پستول پھینک دو میڈم اور تم بھی اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو مسٹر شیراز...... وہ انسپکٹر افضل تھا جو اپنے کئی ماتحتوں کے ساتھ کمرے میں گھس آیا تھا۔ ناہید نے پستول پھینک دیا۔ اس کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ شیراز نے بھی ہاتھ سر سے بلند کر لیے تھے۔

''تم دونوں کو حیرت ہو گی کہ میں یہاں کیسے پہنچ گیا؟'' انسپکٹر افضل نے کہا۔ ''فرحانہ کے قتل کی تفتیش بعد میں مجھے سونپ دی گئی تھی میرا ایک اپنا طریقہ کار ہے۔ تفتیش کے دوران میں ہی انکشاف ہوا کہ تم دونوں میں گہرے تعلقات ہیں۔ یہ انکشاف بھی دلچسپ تھا کہ ناہید نے بینک سے ڈیڑھ لاکھ روپے نکلوائے تھے۔ میں خفیہ طور پر کچھ بینکوں اور منی چینجرز کی نگرانی کروا رہا تھا۔

''مسٹر شیراز! مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ تم نے ایک منی چینجر سے ایک بھاری رقم ڈالرز میں منتقل کروائی ہے۔ بہت سی باتوں کے انکشافات ہو رہے تھے، میں نے تم دونوں کی نگرانی جاری رکھی اور آج جب مجھے اطلاع ملی کہ ناہید یہاں آئی ہے تو میں سمجھ گیا کہ آج کوئی آخری ڈیل ہو گی اور میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ میں تم دونوں کو فرحانہ اور سیٹھ کریم صدیقی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔''

ناہید پھٹی پھٹی سی نظروں سے انسپکٹر افضل کی طرف دیکھ رہی تھی پھر وہ کھڑے کھڑے لڑکھڑائی اور تیورا کر زمین پر گر گئی۔

☆☆☆

ثانیہ کو زندگی اور موت کی جنگ لڑتے ہوئے ایک مہینہ ہو چکا تھا اور پھر ایک دن یہ خوش خبری ملی کہ اسپتال کو ایک دل ملنے والا ہے اور پھر دو دن بعد وہ دل پہنچ گیا۔ ثانیہ

کے دل کی پیوندکاری کا عمل ڈاکٹر شمس کے ہاتھوں کامیابی سے اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔ اس کے دو روز بعد ثانیہ نے آنکھیں کھول دیں اور وہ زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ ثانیہ کے آپریشن سے نکلنے والی گولی انسپکٹر افضل نے اپنے قبضے میں لے لی اور ٹیسٹ کے بعد...... اسلحہ کے ماہر کی رپورٹ کے مطابق یہ گولی ایل ایم جی رائفل سے چلائی گئی تھی جو طارق کالیا کے قبضے سے برآمد ہوئی تھی۔ غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے کیس میں طارق کالیا ضمانت پر رہا ہو گیا تھا۔ لیکن اسے غیر ارادی اقدام قتل کے جرم میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔

ثانیہ تندرست ہوتے ہی اسپتال سے گھر منتقل ہو گئی۔ جمال بہت خوش تھا۔ اس کے گھر کی رونقیں لوٹ آئی تھیں۔ یوں زندگی پھر سے ایک ڈگر پر رواں ہو گئی۔ شگفتہ اور ثانیہ باقاعدگی سے کالج جانے لگیں۔ کیونکہ ایگزام قریب تھے اور انہیں دن رات محنت کرنا تھی۔

بس اسٹاپ پر کھڑے اچانک ہی ثانیہ کی نگاہیں اس کونے کی طرف اٹھ گئیں۔ جہاں کبھی ایک لڑکا روزانہ اسے دیکھنے آیا کرتا تھا۔ جب سے وہ اسپتال سے لوٹی تھی وہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

''وہ میرا عاشق، اب کبھی اسٹاپ پر نظر نہیں آیا؟'' ثانیہ نے شگفتہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ، تو آپ کو اس مجنوں کی یاد ستا رہی ہے۔'' شگفتہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

''آپ جب زندگی اور موت کے درمیان لٹکی ہوئی تھیں تو انسپکٹر انکل نے اس عاشق نامراد کو کیچ کر لیا تھا پھر نجانے اس .... کے ساتھ کیا ہوا؟''

اس روز افضل ملک اور ڈاکٹر شمس بھی اس تقریب میں موجود تھے، جو جمال نے اپنی بیٹی کے روبصحت ہونے اور ایف ایس سی میں اعزازی نمبروں سے پاس ہونے کی خوشی میں منعقد کی تھی۔ اس تقریب میں شفیق علی کے اہل خانہ بھی شریک تھے۔ چائے کے دوران شگفتہ نے انسپکٹر افضل ملک سے اچانک ہی پوچھ لیا۔ ''انکل! اس لڑکے کا کیا بنا جو بس اسٹاپ پر آپ کے ہاتھ لگا تھا؟''

افضل ملک نے ڈاکٹر شمس کی طرف دیکھا اور جیب سے ایک چھوٹا سا سرخ رنگ کا لفافہ نکال لیا۔ سب لوگ حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے جن میں ثانیہ جمال بھی شامل تھی۔

''میں یہ انکشاف کبھی نہ کرتا مگر بچی نے پوچھا ہے تو جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ عرفان نامی، وہ لڑکا جو بس اسٹاپ پر روزانہ ثانیہ کو دیکھنے جاتا تھا وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ہاں...... مگر ایک صورت میں وہ زندہ ہے۔'' افضل ملک تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا۔ وہاں موجود ہر فرد اس کو مبہوت سا ہو کر دیکھ رہا تھا۔

جمال بولا۔ ''ملک صاحب! جب وہ اس دنیا میں نہیں رہا تو پھر زندہ کیسے ہے؟''

''ثانیہ کے سینے میں دل کی دھڑکنوں کی صورت میں۔'' افضل ملک نے نم آنکھوں سے کہا۔ ''جب میں نے اسے ثانیہ کو گولی لگنے اور اسپتال والی بات بتائی تو اس وقت اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ طارق کالیا کی فائرنگ کا انکشاف بھی اسی نے کیا تھا اور جب اسے پتا چلا کہ لندن سے آنے والا دل ثانیہ کو نہیں دیا جا رہا بلکہ سینہ صدیقی کے سینے میں رکھا جائے گا تو اس سے دوسرے دن ہی وہ اپنے ملک کے ایک ہارٹ بینک میں پہنچ گیا اور...... اور...... اپنا دل ثانیہ کے نام کر کے ہمیشہ کی نیند سو گیا۔''

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس دل کے ساتھ یہ سرخ رنگ کا لفافہ بھی تھا، جو ڈاکٹر شمس نے مجھے تھما دیا تھا۔'' لفافے کے اندر سے ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ برآمد ہوا جس پر صرف ایک جملہ درج تھا۔ ''دل کا یہ حقیر سا تحفہ ثانیہ جمال کے لیے۔ عرفان۔'' افضل ملک نے وہ.... کاغذ سب کے سامنے کر دیا تھا۔

اس انکشاف نے اس تقریب کے تمام شرکا کو سوگوار کر دیا۔ ثانیہ دوڑتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات ہونے لگی تھی۔ وہ سوچتے سوچتے عجیب انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔

''واہ عرفان! تم واقعی عظیم انسان تھے۔ پاکیزہ جذبوں اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مجھے پیار کرتے رہے۔ میں ہی پگلی اس خاموش محبت کو نہ سمجھ سکی۔

''تم نے زندگی اور موت کی جنگ میں مجھے جیت سے ہمکنار کرنے کے لیے دل کی بازی لگا دی۔ یہ جیت میری نہیں...... تمہاری ہوئی ہے۔ تم نے قربانی کی ایسی مثال پیش کی، جو آنے والی نسلوں تک نہیں ملے گی۔ تمہارا تحفۂ دل، جب تک میرے سینے میں دھڑکتا رہے گا، ان دھڑکنوں میں ہمیشہ تمہاری ہی خوشبو بسی رہے گی۔ پیار و محبت کی خوشبو، سچے جذبوں کی خوشبو۔''

اس طرح نئے سال کی خوشیوں کی تقریب سے شروع ہونے والی کہانی کا اختتام دو دلوں پر ہوا...... ایک دل مردہ اور ایک زندہ۔



مدادا

اسما قادری

دنیا میں ہر شے ایک قاعدے اور قانون کی تابع ہے... چاند اور تارے سب ایک زبردست قاعدے میں بندھے ہوئے ہیں... جس کے خلاف وہ بال برابر جنبش نہیں کر سکتے... انسان بھی اسی قانونِ قدرت کا تابع ہے... یہ زبردست قانون جس کی بندش میں بڑے بڑے سیاروں سے لے کر زمین کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ تک جکڑا ہوا ہے... مگر انسان جب اپنی عقل و دانش کو اطاعت و فرماں برداری کی ڈگر سے ہٹاتا ہے اور قانونِ قدرت کی بندشوں کو توڑتا ہے تو پھر ہر شے کا توازن بگڑ جاتا ہے... اپنے خیالات کو جہالت کی سیاہی سے منور کرنے والے ایسے ہی چند کوتاہ اندیش کا ماجرا... جو اپنی دانست میں سرفروش تھے اور زندگی کے اصولوں کو زیادہ بہتر جانتے تھے...

سنسنی خیز واقعات میں لپٹی ایک تیز رفتار تحریر کی حقیقی جھلکیاں......

کولتار کی بل کھاتی اور سیاہ سڑک کے دونوں اطراف درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور موسم گرما ہونے کے باوجود وہاں گرمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ سڑک پر دو گاڑیاں آگے پیچھے بھاگتی چلی جا رہی تھیں۔ آگے والی گاڑی مخصوص ساخت اور مونوگرام کی وجہ سے صاف پہچانی جا رہی تھی کہ وہ ایک پولیس وین ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر

دو ڈتی ہلور گرے مرسیڈیز مکمل ائرکنڈیشنڈ تھی۔ گاڑی کو باوردی ڈرائیور چلا رہا تھا جبکہ پچھلی سیٹ پر ایس پی خاور حیات اور اس کا انیس سالہ بیٹا یاور حیات براجمان تھے۔ دونوں کے چہروں سے خوش حالی، اطمینان اور ایک خاص قسم کی بے نیازی جھلک رہی تھی۔ اس طرح کی بے نیازی عموماً ان ہی چہروں سے جھلکتی ہے جنہیں دنیا میں بہت کچھ من چاہا حاصل ہوتا ہے اور جو غم دنیا میں کھلنا تو دور کی بات، دنیا اور دنیا والوں کی رتی برابر بھی پروا نہیں کرتے۔ وہ صرف اپنے لیے جی کر خوش رہتے ہیں۔ اس وقت بھی باپ بیٹا بہت خوش تھے کیونکہ وہ ایک بھرپور تفریحی دورہ کرکے اب واپسی کے سفر پر گامزن تھے۔ انہوں نے پچھلا پورا ہفتہ خاور حیات کے گہرے دوست ملک ارباز کی میزبانی کا لطف اٹھاتے ہوئے اس کے گاؤں میں گزارا تھا۔ کہنے کو ملک ارباز کا گاؤں بہت پسماندہ اور غریب تھا لیکن ملک ارباز کی حویلی کا اس پسماندگی اور غربت سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ اس کی حویلی تمام جدید سہولیات سے مزین تھی اور وہ مکمل کر مہمانوں کی خاطر..... کرنے والا بندہ تھا۔ حقیقتاً اس کی حویلی آنے والے مہمان عیاشی کرتے تھے، یہ اور بات کہ اس عیاشی کا بوجھ ان غریب کسانوں کے شانوں کو اٹھانا پڑتا تھا جو ملک ارباز کی زمینوں سے سونے جیسی فصل اگاتے اگاتے خود خاک میں ملتے رہتے تھے۔ خاور حیات اور اس کا بیٹا یاور حیات ان کیڑے مکوڑوں جیسے انسانوں کی طرف نظر ڈالنے کے عادی نہیں تھے اس لیے انہوں نے ملک ارباز کی میزبانی سے بھرپور لطف اٹھایا تھا۔ خاور حیات کی ملک ارباز سے پرانی دوستی تھی اور وہ ملک ارباز کی دعوت پر فرصت ملنے پر اس کی میزبانی کا لطف اٹھانے جاتا رہتا تھا۔ اس تفریحی دورے کا سب سے اہم جزو ملک ارباز کے گاؤں سے متصل جنگل میں شکار کا پروگرام ہوتا تھا۔ اس شکاری مہم کی تصویریں اور یادیں جب وہ بیوی بچوں سے شیئر کرتا تو اس کا سب سے بڑا بیٹا یاور مچل جاتا کہ پاپا مجھے بھی آپ کے ساتھ وہاں جانا ہے لیکن ہر بار یاور کسی نہ کسی وجہ سے باپ کے ساتھ نہیں جا پاتا تھا۔ اس بار اسے مشکل سے یہ موقع ملا تھا کہ وہ خاور کے ساتھ جانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور حقیقتاً بھرپور لطف اٹھا کر واپس آ رہا تھا۔ یہ وہ دور نہیں تھا کہ انٹرنیٹ کی حکمرانی کی وجہ سے پل پل کی خبریں ادھر سے ادھر ہوتی رہیں۔ موبائل فونز بھی اپنے ابتدائی دور میں تھے اور نہ تو ہر ایک کی دسترس میں تھے اور نہ ہی ہر جگہ کام کرتے تھے۔ اس لیے نوجوان یاور بہت پُرجوش تھا کہ

اپنے اس دورے کی یادیں اپنے گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ بانٹ سکے۔ خصوصاً دوستوں کو کچھ سنسنی خیز تجربات سے آگاہ کرنے کی اسے بہت جلدی تھی۔ ملک ارباز نے اسے خاور حیات سے چوری چھپے کچھ تفریحات فراہم کی تھیں جن میں سرفہرست وہ طرح دار ملازمہ تھی جو عمر میں تو یاور حیات سے چند سال بڑی تھی لیکن حسن اور اداؤں کے بل بوتے پر اس نے یاور کو دیوانہ بنا کر رکھ دیا تھا اور اسے یقین تھا کہ اگلی بار وہ باپ کے ساتھ ملک ارباز کی حویلی کا رخ کرے گا تو اس کی سب سے بڑی وجہ ملازمہ رومانہ ہوگی۔ اس وقت بھی وہ باپ کے ساتھ بیٹھا رومانہ کے ساتھ بیتے رنگین و سنگین لمحات کو یاد کر رہا تھا۔ اگر خاور حیات کی ملازمت اور خود اس کی یونیورسٹی میں کلاسز کے آغاز کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ کسی طرح وہاں اپنے قیام کو طول دینے کی کوشش کرتا۔ اس کی طرح خاور حیات بھی اپنے دل میں بڑی آسودگی محسوس کر رہا تھا لیکن بہرحال وہ ایک کھایا کھیلا تجربہ کار آدمی تھا جو اپنے شہر میں رہ کر بھی ''من چاہی'' تفریح کے مواقع تلاش کر لیتا تھا اس لیے وہ نوجوان یاور کی طرح پُرجوش نہیں تھا۔ دونوں باپ بیٹے اپنی اپنی کیفیت میں مگن آرام دہ ٹھنڈی گاڑی میں سوار واپسی کی راہ پر گامزن تھے کہ ایک کان پھاڑ دینے والے دھماکے کے ساتھ ان کی گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا۔ بے دھیانی میں بیٹھے ہونے کے باعث ان کے سر اگلی نشستوں کی پشت گاہوں سے ٹکرائے لیکن ان کی گدیلی تہوں کی وجہ سے زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ البتہ سامنے کے... منظر نے ان کو آنکھیں پھاڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پولیس وین جو ان کی حفاظت پر مامور تھی اس وقت آگ کا گولا بنی دھڑا دھڑ جل رہی تھی اور کسی ایک سپاہی کو بھی اس وین سے باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اصل میں پولیس وین پر دستی بموں سے حملہ کیا گیا تھا اور وین کو نشانہ بنانے والے سڑک کے دائیں بائیں سے نکل کر اب مرسیڈیز کی طرف دوڑے آ رہے تھے۔ جلتی وین سے چند فٹ کے فاصلے پر مرسیڈیز کو بریک لگانے میں کامیاب ہو جانے والا ماہر ڈرائیور ایک تربیت یافتہ باڈی گارڈ بھی تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے خود کو سنبھالا اور پھرتی سے گن تھام لی لیکن اسے اپنی گن استعمال کرنے کی حسرت ہی رہ گئی اور کہیں سے ایک اندھی گولی آ کر سیدھی اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر گئی۔ خاور حیات تو ہتھیار نکالنے کا بس سوچ کر ہی رہ گیا۔ سڑک کی دونوں جانب سے آنے والے نقاب پوشوں نے بیک وقت پچھلی جانب کے دونوں

دروازے کھولے اور باپ بیٹے کو باہر گھسیٹ لیا۔

''کک..... کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟'' جلتی ہوئی پولیس وین پر ایک اور دہشت زدہ نظر ڈال کر خاور حیات نے یہ سوال کرنے کی جرأت کی، جواب میں اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ پڑا اور تھپڑ مارنے والا غرایا۔

''غور سے دیکھ، میں تیرے اعمال کا نتیجہ ہوں۔'' جملہ مکمل ہوتے ہی اس نے اپنے چہرے پر موجود ڈھاٹا ہٹا دیا۔ چہرہ دیکھتے ہی خاور حیات کو چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگا۔

''تت..... تم.....'' وہ بمشکل اپنی زبان سے یہی واحد لفظ ادا کر سکا۔

''شکر ہے ابھی تمہاری اتنی یادداشت باقی ہے ورنہ تم جیسا طوطا چشم اور خودغرض آدمی تو اپنی سگی ماں کو بھی بھلا سکتا ہے۔'' اس کے مخاطب کے لہجے میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔

''دیکھو عمران..... تم۔'' خاور حیات نے تھوک نگلتے ہوئے اس سے کچھ کہنا چاہا۔

''عمران کو تم اپنے ہاتھوں سے پھانسی کے پھندے تک پہنچا چکے ہو اس لیے مجھے عمران کہہ کر مت پکارو بلکہ کچھ بھی نہ بولو، آج تمہارے بولنے کا نہیں بلکہ میرے کچھ کرنے کا دن ہے۔'' اس کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں اڑ رہی تھیں اور یہ چنگاریاں اڑاتی آنکھیں نوجوان یاور حیات کے چہرے پر مرکوز ہوئیں تو خاور حیات کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

''تم اپنے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہو عمران! تم پر پہلے ہی سنگین کیسز ہیں اور اب تمہارے جرائم کی فہرست مزید طویل ہو گئی ہے۔'' خاور حیات نے جلتی ہوئی پولیس وین پر نظر ڈال کر اسے جیسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب میں بے گناہ تھا تو تم نے مجھے دہشت گردی کا جھوٹا الزام لگا کر پھنسا دیا تھا اب میں سچ مچ دہشت گرد ہوں لیکن تم اس الزام میں مجھے گرفتار نہیں کروا سکتے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ اس کی سفاک نظریں ابھی تک یاور حیات پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ یک دم ہی اس نے یاور حیات کے بالوں کو مٹھی میں جکڑا اور اپنے پسٹل کی نال اس کی گردن پر جما دی۔ نوجوان یاور حیات جس کا چہرہ پہلے ہی خوف سے سفید پڑ رہا تھا یک دم چلّانے لگا۔

''ڈیڈ..... مجھے بچائیں، ڈیڈ یہ مجھے مار دے گا۔''

''اسے چھوڑ دو عمران! یہ بچہ ہے۔ اس کا اس سب میں کوئی قصور نہیں۔'' خاور حیات بیٹے کو اس کے نشانے پر دیکھ کر تڑپ گیا اور اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

''میں بھی کسی کا بچہ تھا اور میرا بھی کوئی قصور نہیں تھا پھر بھی تم نے..... تم نے اپنے یونیفارم پر صرف ایک اسٹار کے اضافے کے لیے مجھے سولی پر چڑھا دیا اور میری ماں.....'' شدتِ جذبات کے باعث وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ اسی وقت اس کے ایک ساتھی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے نظروں ہی نظروں میں جلد کام نمٹانے کا اشارہ دیا۔

''آج یومِ حساب ہے خاور حیات اور میں تمہیں تمہارے جرم کی پوری سزا دوں گا۔'' جملہ مکمل ہوتے ہی اس نے ایک ساتھ دو گولیاں چلائیں، گردن میں پیوست ہونے والی ان دونوں گولیوں نے یاور حیات کے جسم کو زوردار جھٹکا لگایا اور اس کی گردن سے خون کا فوارہ سا اچھلا جس کے بہت سے چھینٹے عمران کے چہرے پر بھی پڑے لیکن اس نے پروا نہیں کی اور اپنی مٹھی میں جکڑے یاور کے بالوں کو چھوڑ دیا۔ اس کا پھڑکتا ہوا جسم فوراً ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا اور جوان جسم سے تیزی سے بہتا خون سڑک پر تالاب سا بنانے لگا لیکن عمران نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں خاور حیات پر جمی تھیں جو بیٹے کو گولیاں لگتے دیکھ کر اتنے شدید صدمے میں چلا گیا تھا کہ کوئی ردِعمل بھی ظاہر نہیں کر سکا تھا۔ عمران نے اپنے پسٹل کا رخ خاور حیات کی طرف کیا۔ پسٹل سے یکے بعد دیگرے نکلنے والی گولیوں نے پہلے خاور حیات کے دونوں گھٹنوں اور پھر دونوں کہنیوں میں چھید کر ڈالے۔ سڑک پر باپ کا خون بیٹے کے خون کے ساتھ ملنے لگا۔ بیٹے کا جسم ساکت ہو چکا تھا اور باپ کا جسم بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ عمران کو معلوم تھا کہ وہ فوراً نہیں مرے گا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے پیچھے ہٹنے لگا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ خاور حیات یہاں سڑک پر پڑا تڑپ تڑپ کے مرتا ہے یا کہیں سے امداد مل جانے کی صورت بچ جانے پر ساری زندگی تڑپ تڑپ کر جیتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کا انتقام پورا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''صنوبر! کیا کر رہی ہو بیٹا!'' دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ امیمہ نے اندر جھانکا تو محویت سے موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے کھڑی صنوبر کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ وہ بیس سال سے کچھ اوپر کی نازک سی قبول صورت لڑکی تھی جس نے دوپٹہ نماز کے انداز میں لپیٹ رکھا

تھا۔

”بس آہی رہی تھی امی! ابھی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی ہوں اور دیکھ رہی تھی کہ کوئی میسج وغیرہ تو نہیں آیا ہوا۔“ اس نے نرمی سے ماں کو جواب دیا۔

”جلدی سے آجاؤ۔ میں دسترخوان لگا چکی ہوں اور تمہارے انتظار میں کسی نے کھانا شروع نہیں کیا ہے۔“ وہ اسے ہدایت دیتے ہوئے پلٹ گئیں تو اس نے بھی موبائل ہاتھ سے رکھ دینا ہی مناسب سمجھا۔ وہ ایک نرس تھی اور کراچی کے ایک بڑے سرکاری اسپتال میں ملازمت کرتی تھی۔ آج کل وہ چھٹیوں پر اپنے گھر آئی ہوئی تھی۔ اس کا گھر میرپورخاص کے ایک قریبی گاؤں میں تھا، جہاں لڑکیوں کے لیے صرف ایک ہائی اسکول تھا اور مزید تعلیم کی خواہش مند لڑکیوں کو میرپورخاص شہر کے گورنمنٹ کالج جانا پڑتا تھا جو ظاہر ہے اتنا آسان نہیں تھا اس لیے بہت کم لڑکیاں اسکول سے آگے تعلیم حاصل کر پاتی تھیں۔ صنوبر کو ڈاکٹر بننے کا جنون تھا اس لیے اس نے گھر والوں سے ضد کر کے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ قسمت کی خوبی یا خرابی سے میرپورخاص میں اس کی ایک خالہ رہائش پذیر تھیں جن کے گھر قیام کی سہولت مل جانے پر اسے روزانہ طویل سفر کرنے اور بس کے اچھے خاصے کرائے سے نجات مل گئی تھی۔ خالہ کے گھر قیام کا پہلا سال کافی بہتر گزرا۔ وہ کالج جاتی اور واپس آنے کے بعد خالہ کے ساتھ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹا کر باقی وقت اپنی پڑھائی میں گزارتی۔ خرابی سال کے آخر میں خالہ کی طبیعت کی خرابی سے پیدا ہونا شروع ہوئی۔ خالہ پانچ سال بعد دوبارہ ماں بننے جارہی تھیں اور ان کی طبیعت بے حد خراب رہتی تھی۔ اخلاقاً اسے خالہ کا گھر سنبھالنا پڑا۔ پہلے وہ صرف ان کی مدد کرتی تھی اب ساری ذمے داریاں اس کے سر پر آپڑیں۔ وہ کام سے گھبرانے والی لڑکی نہیں تھی لیکن ان کاموں کی وجہ سے اس کی پڑھائی کا حرج ہورہا تھا۔ مزید یہ کہ خالہ کا بیٹا جو کہ پانچ سال تک اکلوتی اولاد رہنے کی وجہ سے نہایت نازک مزاج تھا۔ ہر وقت اس کی ناک میں دم کیے رکھتا تھا۔ گھر میں پکنے والا کھانا وہ مشکل ہی سے کھاتا تھا اور سارا وقت اس کی چپس، برگر، اسپیگیٹی جیسی چیزوں کے لیے فرمائش جاری رہتی تھی۔ بچے کی صحت کے لیے فکرمند خالہ ہر چیز اسے گھر پر ہی بنا کر دیتی تھیں اور اب مجبوراً صنوبر کو یہ سب کرنا پڑتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس نے سارا سال بہت جانفشانی سے پڑھائی کی تھی اس لیے سال کے آخر میں ان مسائل سے نبردآزما ہونے کے باوجود اس کے پرچے اچھے ہوئے لیکن اثر بہرحال پڑا تھا اور وہ اتنے نمبر حاصل نہیں کرسکی تھی جتنے کی اسے توقع تھی۔ اس نے سیکنڈ ایئر میں اس کمی کو کور کرنے کا عزم کرلیا لیکن خالہ کے ہاں بیٹی کی پیدائش کے بعد اس کے لیے وہاں صورت حال ہنوز خراب تھی۔ خالہ بچی میں مصروف ہوچکی تھیں۔ کچھ کمزوری کا بہانہ تھا اور شاید انہیں صنوبر سے خدمت لینے کی عادت ہوگئی تھی اس لیے انہوں نے اس کے شانوں پر گھریلو کاموں کا بار برقرار رکھا اور اس بار میں ایک اضافہ اپنے بیٹے کو ٹیوشن دینے کی ذمے داری سونپ کر کر دیا۔ صنوبر اس صورتِ حال پر گھبرا گئی۔ وہ پڑھنے کے لیے وہاں رکی ہوئی تھی اور اسے پڑھنے کا ہی وقت نہیں ملتا تھا۔ گھبرا کر اس نے امی سے رجوع کیا کہ اس طرح خالہ کے گھر رہنے سے بہتر ہے کہ وہ ہاسٹل میں کمرا لے لے یا روزانہ بس سے کالج آنے جانے کی زحمت اٹھالیا کرے لیکن امی الٹا اسے سمجھانے بیٹھ گئیں کہ خالہ کا اس پر احسان ہے کہ انہوں نے اسے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے اس لیے اگر وہ اب خالہ کی ضرورت کے وقت ان کے کام آجائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ مالی طور پر اس کے گھر والے اس وقت مشکلات کا شکار تھے۔ اس کے بڑے بھائی یاسر ٹھیکے پر آم کے باغات لیتے تھے اور ہر سال بھاری منافع کماتے تھے لیکن اس سال ایسی طوفانی بارشیں ہوئی تھیں کہ سارے کچے پکے آم درختوں سے جھڑ گئے تھے اور مارکیٹ تک پہنچانے سے پہلے ہی خراب ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اس اتنے بڑے نقصان کے ساتھ ہی دو بڑے خرچے ان کے سر پر کھڑے تھے۔ یاسر بھائی اور صنوبر سے بڑی تاجور کی شادیوں کی تاریخ مقرر ہوچکی تھی۔ سارا جمع جتھا ان شادیوں پر خرچ ہونے کے علاوہ قرض کی نوبت بھی آسکتی تھی۔ ایسے میں امی اضافی اخراجات کے لیے کیسے ہامی بھر سکتی تھیں۔ اسے مجبوراً خالہ کے گھر ہی رہنا پڑا اور پوری کوشش کے باوجود اس کے میرٹ سے کچھ نمبر کم رہ گئے۔ یہ ایسا غم تھا جس نے اسے نڈھال کردیا۔ اس نے کھانا پینا ترک کردیا اور بستر سے لگ گئی۔ یہ صورتِ حال سب کے لیے پریشان کن تھی۔ وہ گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے لاڈلی تھی اور والد کی وفات کے بعد تو اس کا زیادہ ہی خیال رکھا گیا تھا اس لیے اس کی اس حالت پر سب تڑپ گئے۔ تاجور سسرال سے اسے سمجھانے آئی۔ اس کے شوہر نے بھی اسے سمجھایا اور یہ راہ دکھائی کہ اگر وہ ڈاکٹر نہیں بن سکی تو میڈیکل کے کسی اور شعبے سے وابستہ ہو

جائے۔ وہ اسے ڈی فارم یا مائیکرو بیالوجی وغیرہ کا مشورہ دے رہے تھے۔ لیکن اس نے اپنے لیے نرسنگ کے شعبے کا انتخاب کیا اور یوں وہ کراچی پہنچ گئی۔ ہاسٹل میں رہ کر نرسنگ کورس مکمل کرنے کے بعد اب وہ سرکاری ملازمت کر رہی تھی اور ہنوز ہاسٹل میں مقیم تھی۔ کبھی کبھار چھٹیوں پر ہی اس کا اپنے گاؤں آنا ہوتا تھا اور اس کی حیثیت اپنے ہی گھر میں مہمانِ خصوصی والی ہوجاتی تھی۔ گاؤں میں اب بھی سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ لوگوں کی خواہش کے باوجود اب بھی وہاں لڑکیوں کا کالج قائم نہیں ہوا تھا اور بہت سی تعلیم سے محروم لڑکیاں انٹرنیٹ کی سہولت سے ”مستفید“ ہورہی تھیں۔ موبائل کمپنیوں کی مہربانی سے اب یہ ’سہولت‘ ہر کسی کی دسترس میں تھی۔ صنوبر کے گھر والے دیکھ رہے تھے کہ اس بار گھر آمد پر صنوبر اس سہولت سے زیادہ ہی فائدہ اٹھا رہی تھی لیکن وہ اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کرسکتے تھے۔ وہ بڑے شہر میں رہ کر بھی بگڑی نہیں تھی۔ پہلے وہ صرف چادر اوڑھتی تھی اور اب اس نے باقاعدہ حجاب لینا شروع کردیا تھا۔ عبادات میں بھی پہلے سے زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔ ایسے میں انٹرنیٹ کے استعمال میں اضافے پر اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ تو فیس بک پر بھی ہمیشہ ”اسلامی پوسٹ“ ہی لگایا کرتی پھر اعتراض کس بات پر کیا جاتا۔ گھر کی سب سے ”لاڈلی بچی“ جو گھر والوں کی وجہ سے پہلے ہی اپنی قابلیت کے باوجود ایک بڑا نقصان اٹھا چکی تھی، اب مزید ”ہرٹ“ نہیں کی جاسکتی تھی۔ یوں بھی وہ گھر میں مہمانوں کی طرح آتی تھی اور مہمانوں کو ناراض نہیں کیا جاتا۔ اس لیے اسے کوئی بھی کچھ نہیں کہتا تھا۔

☆☆☆

آجا صنم! مدھر چاندنی میں ہم تم ملیں گے تو ویرانے میں بھی آجائے گی بہار
جھومنے لگے گا آسمان
جھومنے لگے گا آسمان......

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ تیز دھوپ میں حدِ نظر تک پھیلا سمندر بھی چمک رہا تھا اور وہ دو دیوانے جو ذرا ہٹ کر ایک آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے، دھیمے سروں میں بڑا دل لگا کر گا رہے تھے۔

گاتے گاتے لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی تو لڑکے کو بھی خاموش ہونا پڑا اور وہ سوالیہ نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔

”بس ایسے ہی ہنسی آگئی یہ سوچ کر کہ اس چلچلاتی دھوپ میں بیٹھ کر ہم مدھر چاندنی کے گیت گا رہے ہیں۔“ لڑکے کی سوالیہ نظروں کے جواب میں لڑکی نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔

”تم ساتھ ہو تو چلچلاتی دھوپ بھی مدھر چاندنی محسوس ہوتی ہے زارا! تمہارے ساتھ میں کوئی جادو ہے۔ تم ہمراہ ہوتی ہو تو مجھے جنت کی بھی تمنا نہیں رہتی اور یہ دنیا ہی جنت لگنے لگتی ہے۔“ نوعمر لڑکا جو عمران تھا بہت جذباتی سا ہو کر بولنے لگا۔ اس کے ان الفاظ پر زارا کے رخسار، آنکھیں، ہونٹ سب مسکرانے لگے۔ چاہے جانے کا نشہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ انسان خود کو زمین کے بجائے ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتا ہے۔ وہ دونوں بھی اس وقت زمین پر ہونے کے باوجود زمین پر نہیں تھے اور ہواؤں میں اڑتے پھر رہے تھے۔

”میرا بھی کچھ تم جیسا ہی حال ہے عمران: مجھے بھی تمہارا ساتھ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اچھا لگتا ہے تب ہی تو میں تمہارے ساتھ کالج سے یہاں آنے پر راضی ہوگئی ہوں۔ لیکن خیال رکھنا کہ آئندہ مجھ سے ایسی فرمائش نہ کرو۔ آج تو امی کے اسکول میں پارٹی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ دیر سے گھر واپس آئیں گی اس لیے مجھے موقع مل گیا۔ باجی سے گھر جا کر کہوں گی کہ پریکٹیکل کی وجہ سے کالج میں دیر ہوگئی اور واپس جس بس میں آرہی تھی اس کا ٹائر پنکچر ہوگیا اس لیے آنے میں دیر ہوگئی تو باجی مان لیں گی۔ امی اتنی آسانی سے کوئی بات نہیں مانتیں اور اتنے سوالات کرتی ہیں کہ بندے کا جھوٹ لازماً پکڑا جاتا ہے۔“ وہ اس کے ساتھ یہاں تک آتو گئی تھی لیکن تھوڑی خوف زدہ بھی تھی۔ کالج کے سفید یونیفارم پر اس نے بیگ میں چھپا کر لایا گیا ٹائی اینڈ ڈائی کا دوپٹا اوڑھ کر اس تاثر کو کم کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ کالج سے بھاگ کر عاشق سے ملاقات کرنے والی لڑکیوں میں سے ہے لیکن کوئی دیکھتا تو بہرحال اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان دونوں کی کم عمری اور گھبراہٹ ہی ان کے خلاف سب سے بڑی گواہ تھی۔

”تم بہت بزدل ہو زارا! محبت میں تو لوگ جان بھی دے دیتے ہیں اور تم اپنی امی سے ذرا سا جھوٹ نہیں بول سکتیں۔“ عمران نے خفگی دکھائی۔

”وقت پڑنے پر میں بھی تمہارے لیے جان دے سکتی ہوں عمران لیکن ابھی تو ہم پڑھ رہے ہیں۔ اگر امی کو مجھ پر شک ہوگیا تو وہ مجھے کالج چھڑوا کر گھر بٹھالیں گی اور ہم کالج میں بھی ایک دوسرے سے ملنے سے محروم ہوجائیں گے۔“ زارا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کالج میں ہم یوں کھل کر ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں کسی کی نظروں میں نہیں لانا چاہتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں خود پارٹی کے لڑکوں کی نظروں میں رہتا ہوں اور وہ لوگ ایسے خبیث ہیں کہ ہر وقت بندے کی کمزوریاں تلاش کرنے کے چکر میں لگے رہتے ہیں کہ وقت آنے پر اپنا کام نکال سکیں۔" اس کے اپنے مسئلے تھے۔

"ایک تو پتا نہیں تم نے یہ پارٹی کا چکر کیوں پالا ہوا ہے۔ اسٹوڈنٹس کو پالیٹکس سے دور رہنا چاہیے۔" زارا نے اپنی چھوٹی سی ناک سکیڑ کر اعتراض کیا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے ایڈمیشن کا مسئلہ تھا۔ میری میٹرک میں پرسنٹیج کم تھی اگر یہ لوگ ساتھ نہ دیتے تو میرا اس کالج میں ایڈمیشن نہیں ہوتا۔ انہوں نے میرا ایک کام کیا ہے تو ظاہر ہے مجھے بھی ان کی بات ماننی پڑتی ہے۔ ویسے بھی وہ مجھ سے کوئی زیادہ کام نہیں لیتے۔ کبھی کبھی پوسٹرز وغیرہ بنوا لیتے ہیں یا پھر میری اچھی آواز کا فائدہ اٹھا کر مجھے کسی فنکشن میں اپنے پارٹی سانگز گانے کا کہہ دیتے ہیں۔" عمران نے اس کی بات کا جواب دیا۔ (اب سے پندرہ بیس سال پہلے تعلیمی اداروں میں داخلہ پالیسی مختلف تھی اور طلبہ سیاسی جماعتیں اپنے اثر و رسوخ سے میرٹ سے کم پر بھی اپنی مرضی کے طلبہ کا داخلہ کروانے میں کامیاب ہو جاتی تھیں)

"مجھے ڈر لگتا ہے عمران! بظاہر وہ لوگ تم سے چھوٹے موٹے کام لیتے ہیں لیکن تم ان کے کارکن نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے کارکن کی حیثیت سے نظروں میں آ رہے ہو۔ اسپیشلی اپنی سنگنگ (گانا گانا) کی وجہ سے تم خاصے مشہور ہو گئے ہو۔" زارا نے تشویش ظاہر کی۔

"تو اس میں کیا برا ہے یار، ہو سکتا ہے اس شہرت کی وجہ سے میرے لیے آگے بھی راستہ کھل جائے اور مجھے ٹیلی ویژن وغیرہ پر گانے کا چانس مل جائے۔ کتنا مزہ آئے گا نا جب میں ایک پروفیشنل سنگر بن جاؤں گا۔ لوگ مجھ سے آٹوگراف لیا کریں گے۔ تم میری فین لڑکیوں سے جیلس تو نہیں ہو گی نا؟" وہ چھوٹی عمر میں بڑے بڑے خواب دیکھتا ہوا مسکرا کر اسے چھیڑ رہا تھا۔

"جاگ جائیے شیخ چلی صاحب ورنہ آپ کے سارے انڈے ٹوٹ جائیں گے۔" زارا چڑنے کے بجائے خود بھی اسے چھیڑنے لگی پھر ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "اب ہمیں واپس چلنا چاہیے عمران۔ میں بہت زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتی۔"

"ابھی سے کیسے؟ ابھی تو مجھے تمہیں لنچ کروانا ہے اور لنچ پر ہی میں تمہیں وہ سرپرائز دوں گا جس کے لیے میں نے یہ ملاقات ارینج کی ہے۔ پلیز انکار مت کرنا۔ تمہارا انکار میری خوشی چھین لے گا۔ میں تمہیں زیادہ لیٹ نہیں ہونے دوں گا اور یہاں سے سیدھے تمہیں تمہارے گھر کے قریب کسی جگہ چھوڑ دوں گا۔" اس کا اصرار اور سرپرائز کا تجسس..... زارا اسے انکار نہیں کر سکی اور وہ لوگ ساحل سے اٹھ کر قریب واقع ریسٹورنٹس میں سے ایک میں چلے گئے۔

وہ ایک میگا ریسٹورنٹ تھا، کم از کم عمران کی حیثیت کے مقابلے میں تو بہت ہی مہنگا۔ اس کی بیوہ ماں ایک فیکٹری میں ملازمت کر کے بس اتنا کماتی تھی کہ گھریلو اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ عمران کو محدود جیب خرچ دے سکے لیکن آج اس کی جیب میں خاصے نوٹ تھے سو وہ دل کھول کر زارا پر خرچ کر رہا تھا۔ اچھے سے لنچ کے بعد جب وہ آئسکریم کا آرڈر دے کر آئسکریم آنے کے منتظر تھے عمران نے اپنی جیب سے ایک مخملی ڈبیا نکالی اور اس کا ڈھکن کھول کر زارا کے سامنے کیا۔ اندر نگینوں والی ایک خوب صورت سی سونے کی انگوٹھی جھلملا رہی تھی۔

"یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں، زارا! میں اسے تمہاری انگلی میں پہنانا چاہتا ہوں تاکہ تم ہمیشہ یاد رکھو کہ تم میری امانت ہو۔ یہ انگوٹھی میری تم سے محبت کی نشانی ہے۔"

وہ اسی جذباتیت کا اظہار کر رہا تھا جو نوجوان فلموں اور ڈراموں سے سیکھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ باتیں ان کی چھوٹی عمر کے مقابلے میں بہت بڑی ہیں۔ زارا کا ردِعمل بھی کسی فلمی ہیروئن کا ہی تھا اور وہ عمران کے انگوٹھی پہنانے پر شرمائی شرمائی سی مسکرا رہی تھی۔ اس وقت اسے اپنی سخت گیر امی کی بھی فکر نہیں تھی کہ اس انگوٹھی کی بابت انہیں کیا بتائے گی۔ (انگوٹھی کو رولڈ گولڈ قرار دے کر دوست کا تحفہ بتا دینا مسئلے کا عمدہ حل تھا)

"کچھ بولو نا زارا۔" وہ مخمور نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے فرمائش کر رہا تھا۔

"میں تمہارے اس تحفے کو کبھی اپنی انگلی سے جدا نہیں کروں گی عمران! میں ہمیشہ تمہاری رہوں گی اور حالات کتنے ہی کٹھن کیوں نا ہوں اپنی آخری سانس تک تمہیں چاہوں گی۔" جذباتی سی کیفیت میں وہ بڑے بڑے وعدے کر رہی تھی اور وقت کا پنچھی کہیں قریب ہی ان کے سروں پر منڈلاتا ان پر ہنس رہا تھا..... دو انجان لوبرڈز اپنی خوشیوں میں مگن تھے۔ آج کا دن ان کے لیے یادگار تھا،

انہیں یقین تھا کہ آج کی تاریخ کو وہ کبھی نہیں بھول سکتے اور اس روز اپریل کی چودہ تاریخ تھی۔

☆☆☆

"تم گائنی وارڈ میں ہوتی ہو نا صنوبر! تم جس اسپتال میں ہو میری نند نے اپنی ڈلیوری کیس کے لیے اسی اسپتال میں نام لکھوایا ہے۔ تم اسے پہچانتی تو ہو جب وہ کیس کے لیے اسپتال میں داخل ہو تو اس کا خاص خیال رکھنا۔" شام کی چائے پی جا رہی تھی جب صنوبر کی بڑی بہن تاجور نے اس سے فرمائش کی۔ اس کی چھوٹی نند شادی ہو کر کراچی گئی تھی۔

"سوری باجی! اب میری ڈیوٹی بدل ہو گئی ہے اور میں گائنی سے ایمرجنسی میں آ گئی ہوں۔ بہرحال جب آپ کی نند ایڈمٹ ہو تو مجھے انفارم کر دیجیے گا میں گائنی میں کام کرنے والی اپنی کولیگز سے اس کا خیال رکھنے کو کہہ دوں گی۔" بڑی بہن کو جواب دیتے ہوئے اس کی انگلیاں مسلسل موبائل کی اسکرین پر اسکرالنگ میں معروف تھیں۔

"ہائے ایمرجنسی میں..... تم تو اتنے نازک دل کی ہو صنوبر، تم کیسے ایمرجنسی میں ڈیوٹی کرتی ہو، وہاں تو بڑے بڑے خطرناک کیس آتے ہیں نا؟ اتنے تو بم دھماکے ہوتے ہیں کراچی میں..... تم دیکھ لیتی ہو لوگوں کے کٹے پھٹے جسم اور ٹوٹے پھوٹے اعضا؟" تاجور نے حیرت کا اظہار کیا۔

"نوکری میں بندے کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے اور آہستہ آہستہ دل بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔" نظریں اسکرین پر ہی جمائے وہ سپاٹ سے لہجے میں بہن کو جواب دے رہی تھی۔ وہ اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے خود کوشش کر کے ایمرجنسی میں اپنی ڈیوٹی لگوائی ہے کیونکہ کسی نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا اور سمجھایا تھا کہ ایمرجنسی میں کام کر کے اسے زیادہ سیکھنے کے مواقع ملیں گے۔ وہ چھ مہینے سے ایمرجنسی میں ڈیوٹی دے رہی تھی اور واقعی ان چھ مہینوں میں اسے بہت کچھ سیکھنے کو ملا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کا دل مضبوط ہو گیا تھا اور دلخراش مناظر دیکھ کر بھی وہ خود کو سنبھالے رکھنے کے قابل ہو گئی تھی۔

"امی تمہاری شادی کے لیے فکرمند ہیں۔ تمہیں معلوم ہے ہمارے ہاں کم عمری میں شادیاں کر دی جاتی ہیں۔ میری بھی انیس سال کی عمر میں شادی ہو گئی تھی لیکن تمہاری پڑھائی کے شوق کی وجہ سے تمہیں کسی نے نہیں چھیڑا۔ اتفاق سے اس عرصے میں تمہارا ہم پلہ کوئی رشتہ آیا بھی نہیں اس لیے کسی نے زور نہیں دیا لیکن اب ایک اچھا رشتہ آیا ہوا ہے۔ خالہ کی دیورانی کا بھائی ہے۔ وہیں کراچی میں ایچ ایس ٹی ٹیچر ہے۔ شکل صورت کا بھی اچھا ہے۔ امی اور بھائی دونوں اس رشتے کے لیے راضی ہیں لیکن تمہاری مرضی بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ تم بتاؤ، تمہاری اس رشتے کے لیے کیا رائے ہے؟" تاجور بہت شوق سے اسے رشتے کے بارے میں بتاتے ہوئے اس سے اس کی رائے مانگ رہی تھی۔

"بور مت کرو یار! میرا فی الحال شادی کا بالکل موڈ نہیں ہے۔" نظریں ہنوز موبائل کی اسکرین پر جمائے اس نے بے نیازی سے بہن کو جواب دیا۔

"ہائیں..... شادی میں موڈ کی بات کہاں سے آ گئی۔ شادی ایک اہم فریضہ ہے جو مناسب وقت پر انجام پا جائے تو ہی بہتر ہوتا ہے۔" تاجور اس کے جواب پر حیران رہ گئی پھر اپنے طور پر کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ذرا رازداری سے پوچھنے لگی۔

"اگر وہاں کراچی میں کوئی پسند ہے تو بتا دو۔ میں امی اور بھائی سے بات کر لوں گی۔" تاجور کے ان الفاظ پر اس کی موبائل پر حرکت کرتی ہوئی انگلیاں ساکت ہوئیں لیکن وہ تاجور کی طرف متوجہ نہیں تھی اور موبائل پر آیا پیغام پڑھ رہی تھی۔ وہاں لکھا تھا۔

"اپنی جاب پر واپس پہنچو۔ وہاں تمہاری ضرورت پڑنے والی ہے۔" اس نے پیغام پڑھا اور جواب میں صرف "اوکے" ٹائپ کر کے بھیج دیا۔

"بھائی کہاں ہیں باجی! ان سے کہیں میری کل صبح ہی واپسی کے لیے بکنگ کروا دیں۔ مجھے اپنی جاب پر پہنچنا ہے۔" وہ یک دم ہی بہت عجلت میں نظر آنے لگی تھی۔

"کیوں کیا ہوا، کوئی مسئلہ ہے کیا؟ میری بات کا جواب بھی نہیں دیا اور جانے کی بات کرنے لگیں۔ میں امی اور بھائی کو کیا جواب دوں گی؟" تاجور نے پریشانی اور خفگی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

"آپ میری طرف سے انکار کر دیں۔ میں نے اس بندے کو دیکھا ہوا ہے، اس کی داڑھی بھی نہیں ہے اور شاید وہ قالو بھی اس فرقے کو کرتا ہے جو میرے حساب سے غیر مسلم ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں کسی غیر مسلم کے ساتھ شادی کیسے کر سکتی ہوں؟ اس رشتے پر تو بات کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔" اس نے کھڑے کھڑے بڑی بہن کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ تاجور اپنی جگہ ہکا بکا تھی۔ یہ بات تو اتنے دنوں سے سب ہی محسوس کر رہے تھے کہ وہ روز بروز زیادہ مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ شدت پسندی کی طرف بھی مائل ہے لیکن اس

بات کا کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے شدت پسندانہ خیالات میں اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ دوسروں پر شرک اور کفر کے فتوے دائر کرنے لگے۔ اس کے انداز کو دیکھ کر تو اسے شک ہو رہا تھا کہ پتا نہیں وہ اپنے گھر والوں کو بھی مسلمان سمجھتی ہے یا نہیں؟

☆☆☆

''یار عمران! حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میری بات مان تو اِدھر اُدھر سرک جا۔ میں بھی آج اپنی خالہ کے گاؤں جانے والا ہوں۔ دو تین مہینے تو وہیں رہوں گا۔ جب تک ہو سکتا ہے حالات سنبھل جائیں۔'' وہ جاوید سے ملنے اس کے گھر آیا تھا اور جاوید اسے دیکھتے ہی مشورے سے نوازنے لگا تھا۔

''کیوں؟ کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔'' عمران ہونق بنا جاوید کی شکل دیکھنے لگا۔

''ابے گھامڑ! تجھے نظر نہیں آ رہا کہ کیسے دھڑا دھڑ ہماری پارٹی کے کارکنوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے اور ان پر بڑے بڑے الزامات لگ رہے ہیں۔ ابھی جو گورنمنٹ ہے اس کی ہماری پارٹی سے ٹھنی ہے اور ہمارے خلاف انتقامی کارروائیاں کی جا رہی ہیں۔ بڑے لیڈروں کے مقابلے میں ہم چھوٹے کارکنوں کی شامت زیادہ آئی ہے جس کو جدھر نکلنے کا موقع مل رہا ہے وہ کھسکتا جا رہا ہے۔ میں بھی بس ایک گھنٹے میں نکلنے والا ہوں اور تمہاری بھلائی کے لیے مشورہ دے رہا ہوں۔'' جاوید نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''لیکن یار! میں تو تمہاری پارٹی کا کارکن نہیں ہوں۔ مجھے تو تم لوگوں نے پارٹی رکنیت ہی نہیں دی ہے پھر کوئی کیوں مجھ سے دشمنی کرے گا؟'' وہ اب بھی حیران تھا۔

''پارٹی ریکارڈ کا کسے معلوم ہے۔ نظر تو بہرحال یہی آتا ہے کہ تم ہمارے کارکن ہو بلکہ اپنی گلوکاری کی وجہ سے تم اصل کارکنوں کے مقابلے میں ذرا زیادہ ہی نمایاں ہو اس لیے میری مانو تو فوراً کہیں روپوش ہو جاؤ۔'' جاوید نے اسے مشورے سے نواز کر اپنے گھر سے رخصت کیا اور وہ الجھا الجھا سا بہت دیر تک سوچتا رہا کہ کہاں روپوش ہو۔ امی کا کوئی سگا بہن بھائی نہیں تھا اور قریبی ددھیالی رشتے دار سب اسی شہر میں رہتے تھے۔ صرف ایک رشتے کے چچا حیدرآباد میں مقیم تھے جن کے گھر وہ ایک بار ان کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے امی کے ساتھ گیا تھا۔ ایسے کسی رشتے دار کے گھر روپوشی کی نیت سے غیر معینہ مدت کے لیے کیسے جا کر رکا جا سکتا تھا۔ وہ سوچتا رہا اور سوچ سوچ کر خوف زدہ ہوتا رہا۔ اس دن کے بعد سے اس کے لیے اپنے ہی گھر میں رہنا دوبھر ہو گیا۔ کبھی چچا کے گھر تو کبھی پھوپو کے گھر راتیں گزارنے لگا۔ اس کا ان لوگوں سے اتنا میل جول نہیں تھا اس لیے ایک طرف وہ اس کی اس روش پر حیران تھے تو دوسری طرف ماں بھی ہکا بکا تھی کہ اچانک اس کے دل میں اپنے رشتے داروں کے لیے اتنی محبت کیسے جاگ گئی ہے۔ سیدھی سادی ماں کو تو اپنی ملازمت اور گھریلو کاموں کی مصروفیت میں کچھ پتا نہیں چلا لیکن تایا کے بیٹے نے حقیقت کھوج نکالی اور اس دن کے بعد سے اس پر اپنے ہر ددھیالی رشتے دار کے گھر کا دروازہ بند ہو گیا۔ ان میں سے ہر ایک نے صاف لفظوں میں اسے بتا دیا تھا کہ وہ اس کی وجہ سے اپنے بچوں کو مصیبت میں نہیں ڈال سکتے اس لیے وہ ان کے گھر نہ آیا کرے۔ ان لوگوں کے نظریں پھیر لینے پر اس کی زندگی اور بھی مشکل ہو گئی۔ وہ بن باپ کا غریب لڑکا تھا اور جانتا تھا کہ اگر پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گیا تو کوئی اسے ان کے چنگل سے نکالنے والا نہیں ہوگا۔ ہر روز پتا چلنے والی خبریں الگ اسے ہولانے کا باعث بن رہی تھیں۔ جاوید کی پارٹی کے کارکن سچ مچ بڑی تعداد میں گرفتار ہو رہے تھے اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ بھی اچانک گرفتار کر لیا جائے گا۔ وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ گھر سے باہر نکلنا ترک کر چکا تھا اور صبح جب امی فیکٹری جا رہی ہوتی تھیں تو ان سے کہتا تھا کہ وہ باہر سے تالا لگا کر جائیں۔ اس طرح وہ گھر میں کسی کے موجود نہ ہونے کا تاثر دینا چاہتا تھا۔ راتوں کو اسے ڈر کے مارے نیند نہیں آتی تھی کہ جانے کب پولیس چھاپا مار دے۔ اس کی امی نے دو تین دن اس کی یہ حالت دیکھی پھر ایک دن اسے فرصت سے گھیر کر بیٹھ گئیں۔ اسے بھی کسی ہمدرد کی تلاش تھی اس لیے امی کے سامنے مسئلہ بیان کر دیا۔ ایک بیوہ عورت اپنے اکلوتے بیٹے کی سلامتی کے لیے جتنی پریشان ہو سکتی تھی وہ بھی پریشان ہوئیں اور پوری رات اس مسئلے کا حل سوچتے ہوئے گزارنے کے بعد انہوں نے جو فیصلہ کیا اس پر عمل کرنے کے لیے اگلے دن فیکٹری سے چھٹی لے کر اپنی ایک کزن کے گھر پہنچ گئیں۔ نوجوانی میں ان کی اپنی اس کزن سے بہت دوستی تھی لیکن شادی کے بعد تعلقات محدود ہو گئے تھے اور بس خاندانی تقریبات میں ہی ملنا جلنا ہوتا تھا پھر بھی انہیں یقین تھا کہ پرانی دوستی کے ناتے ان کی کزن ان کے کام ضرور آئے گی۔ ان کی اس کزن کا شوہر ڈی ایس پی تھا اور وہ اس بات کا انتظام کر سکتا تھا کہ اگر اس کا محکمہ عمران کی

گرفتاری کا فیصلہ کرے تو وہ اس فیصلے کو ملتوی کروا سکے۔ ایک بے گناہ لیکن قدرے بے وقوف لڑکے کو اتنی سی لیور دینے میں بھلا کسی کا کیا جاتا۔ کزن نے ان کی ساری بات سنی اور بڑی محبت سے یقین دلایا کہ وہ ان کا مسئلہ حل کر دے گی۔ کزن کے گھر سے بے حد مطمئن سی واپس آنے والی عمران کی امی کو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کے لیے گڑھا کھود کر آ رہی ہیں۔

☆☆☆

کٹے پھٹے اعضا، ادھڑے جسم، خون، آہیں، چیخیں، کراہیں، ایمبولینس کے سائرن...... اسپتال کے شعبۂ حادثات کا منظر نہایت دلخراش تھا۔ ڈاکٹرز، نرسیں، وارڈ بوائز، رضاکار سب کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں۔ عملہ ابھی آٹھ زخمیوں کو طبی امداد دے کر فارغ نہ ہوتا تھا کہ پیچھے سے مزید دس زخمی آ جاتے تھے۔ بہت بڑا بم بلاسٹ ہوا تھا جس میں دس افراد کی فوری ہلاکت کے ساتھ درجنوں افراد زخمی ہوئے تھے اور خدشہ تھا کہ زخمیوں میں سے بھی کئی افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

دھماکے کی اطلاع آتے ہی شہر کے سارے سرکاری اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی۔ صنوبر جس اسپتال میں ملازمت کرتی تھی وہاں بڑی تعداد میں لاشیں اور زخمی لائے جا رہے تھے۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ ان روتے سسکتے زخمیوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق کام کر رہی تھی۔ اسے ان مریضوں سے کوئی دلی ہمدردی نہیں تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ ان کافروں کو بالکل درست جہنم رسید کیا گیا ہے لیکن اپنے اس خیال کے برعکس وہ پوری تندہی سے ان کے زخموں کی رفوگری کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ یہ وہ فریضہ نہیں تھا جو اپنے پیشے کے تقاضے یا انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ادا کیا جاتا ہے۔ وہ کہیں اور سے ملنے والی ہدایات کے مطابق اپنا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ اسے زخموں کی رفوگری کے ہنر میں مہارت حاصل کرنی تھی اور حقیقت یہ تھی کہ شعبۂ حادثات میں ڈیوٹی انجام دینے کے چھ ماہ میں اس نے اتنا زیادہ اور اتنی تیزی سے سیکھا تھا کہ اپنے سے سینئر نرسوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بارے میں رائے دی جاتی تھی کہ وہ اپنے پیشے سے بے حد مخلص ہے۔ انسان کا اخلاص اس کے دل میں ہوتا ہے اور دل کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس کے دل کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کسی کو یہ خبر تھی کہ اس نے اپنے سفید حجاب کے نیچے گلے میں اپنا سیل فون

موزوں جگہ

بیوی: ''اس جگہ کی مسحور کن فضا نے زبان کو گنگ کر دیا ہے۔''
شوہر: میرا خیال ہے ہم یہیں مکان بنا لیں۔''

مرسلہ: برجیس قدر علی، رحیم یار خان

لٹکایا ہوا ہے۔ فون سائلنٹ پر تھا لیکن کوئی کال آتی تو تیسری گھنٹی پر خودبخود ریسیو ہو جاتی اور وہ اپنے کان میں ہدایت دینے والی سرگوشی سن لیتی۔ بھاگ بھاگ کر اپنا کام انجام دیتے ہوئے وہ اس کی ہر سرگوشی پر بھی دھیان رکھے ہوئے تھی۔ اس روز زخموں کی رفوگری کرتے ہوئے اس نے بہت خاموشی سے کئی افراد میں موت بانٹی تھی۔ ایسے نازک حالت والے مریضوں کو مارنے کے لیے زہر کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی غلط انجکشن، کسی دوا کا زیادہ ڈوز، کوئی ایکسپائرڈ دوا بہت آسانی سے وہاں موت تقسیم کر رہی تھی اور کسی کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اتنے بڑے حادثے میں جہاں ہلاکتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو بس رسمی سا ہی پوسٹ مارٹم ہوتا ہے اس لیے کسی کو علم نہیں ہوگا کہ مرتے ہوؤں کو مارنے کے لیے کیا کارروائی انجام دی گئی تھی۔ یہ کارروائی انجام دیتے ہوئے اس کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ اپنے تئیں وہ مشرکوں اور کافروں کو جہنم واصل کر رہی تھی۔ اپنے قرار دیے ان کافروں کے علاوہ اس نے حکم ملنے پر ایک ''مجاہد'' کو بھی زندگی کی قید سے آزاد کر کے ''جنت کے محلات'' تک پہنچایا۔ وہ خودکش حملہ آور کا سہولت کار تھا جو بروقت جائے حادثہ سے نکلنے میں کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے خود بھی زد میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

فرض شناسی کی روشن مثال۔ ڈی ایس پی خاور حیات۔ فرض پر قریبی رشتوں کی قربانی دینے والا عالی ہمت انسان...... ڈی ایس پی خاور حیات۔

محکمۂ پولیس کی آن بچا لینے والا سورما...... ڈی ایس پی خاور حیات۔ اخبارات کی شہ سرخیاں اور ٹیلی وژن کے گنتی کے چینلز مختلف الفاظ میں ایک ہی راگ الاپ رہے تھے۔ ہر طرف ڈی ایس پی خاور حیات کی واہ واہ تھی اور اس واہ واہ کو سن کر خاور حیات کا چوڑا سینہ فخر سے مزید پھول گیا

تھا۔ توقع کے مطابق اس کیس نے اسے بے حد شہرت اور عزت بخشی تھی اور ہر طرف اسی کے نام کا چرچا تھا کہ اس نے کیسے فرض کی خاطر قریبی رشتے داری کو پس پشت ڈال کر ایک خطرناک دہشت گرد کی گرفتاری میں اہم کردار ادا کیا اور اپنے عہدے کا حق ادا کر دیا۔ وہ اپنی اس کامیابی پر بے حد خوش تھا اور اس خوشی نے اسے بیوی کی بھیگی پلکوں اور شکایتی نظروں سے بالکل بے نیاز کر رکھا تھا۔ یہ ٹی وی چینلز کی بھرمار اور سوشل میڈیا کے بخار کا دور نہیں تھا اور حکومتی ٹی وی چینل کے علاوہ گنتی کے ایک دو ہی چینلز ہی تھے لیکن خاور حیات کو خاطر خواہ شہرت اور نیک نامی مل گئی تھی اور ساتھ ہی محکمے میں بھی ساکھ بہتر ہو گئی تھی۔ اس لیے اسے پوری امید تھی کہ جلد اس کی ترقی ہو جائے گی اور وہ ڈی ایس پی سے ایس پی کے عہدے پر پہنچ جائے گا۔ اس کے حساب سے یہ کام دو سال پہلے ہو جانا چاہیے تھا لیکن مسلسل اس کی فائل اٹکی ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کیس کے بعد فائل کو پہیے لگ جائیں گے اور وہ ایس پی بن کر ہی رہے گا۔ اسے بالکل بھی پروا نہیں تھی کہ ترقی کی اس منزل کے لیے وہ ایک اٹھارہ سالہ لڑکے کی گردن پر پیر رکھ کر چڑھا ہے اور اپنی اس خودغرضی کی وجہ سے اس نے لڑکے کی جان ہی نہیں اس کی بیوہ ماں کی روح کو بھی سولی پر لٹکانے کا انتظام کر دیا ہے۔ اس کیس کی سماعت کے لیے عدالت میں حاضری دیتے ہوئے وہ لڑکے کے حیران و پریشان چہرے اور اس کی ماں کی بھیگی پلکوں پر نظر ڈالنے کی زحمت ہی نہیں کرتا تھا۔ اس کی ساری توجہ پریس فوٹوگرافرز کے کیمروں پر مبذول ہوتی تھی۔ وہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ تصویروں میں وہ زیادہ سے زیادہ پُروقار اور ڈیسنٹ نظر آئے۔ پوری توجہ کیمروں پر رکھنے کے باوجود وہ بے نیاز نظر آنے کی اداکاری بھی اچھی کرتا تھا۔

عمران پر نہایت سنگین نوعیت کے الزامات تھے۔ ان الزامات کے مطابق وہ جس سیاسی جماعت کے اسٹوڈنٹ ونگ کے لیے کام کرتا تھا اس کے تحت اس نے بہت سی دہشت گردانہ کارروائیاں کی تھیں۔ تنظیم کی سپورٹ کی وجہ سے وہ کالج میں لڑکوں کے ساتھ دھونس اور دھاندلی کرتا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر چندے کے نام پر بھتے وصول کرتا تھا اور ذرا سی بات پر کالج میں ہنگامہ آرائی کروانے سے نہیں چوکتا تھا۔ ان الزامات کے علاوہ اس پر جو سب سے بڑا اور سنگین الزام لگایا گیا تھا وہ کالج کے پرنسپل ظہور مرزا کے قتل کا الزام تھا۔ پرنسپل ظہور مرزا کو چودہ اپریل کے دن تین بجے کے وقت کالج سے گھر جاتے ہوئے گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس واقعے کو تقریباً دو ماہ گزر چکے تھے اور پولیس مجرموں تک نہیں پہنچ سکی تھی لیکن اب ایک دم انہیں مجرم اور وجۂ قتل دونوں مل گئے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ ملزم عمران احمد نے اشتعال اور انتقامی کارروائی کے تحت پرنسپل ظہور مرزا کا قتل کیا تھا کیونکہ ہلاکت سے دو روز قبل پرنسپل صاحب نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر ٹھیک ٹھاک ڈانٹ پلائی تھی۔ وہ سیاست کے نام پر اس کی کالج میں کی جانے والی غنڈا گردی سے سخت نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ عمران فضول حرکتوں میں وقت گزارنے کے بجائے اپنی تعلیم پر توجہ دے۔ انہوں نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ ایک بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہے اور اسے غیر ضروری سرگرمیوں میں حصہ لینے کے بجائے اپنی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے۔ عمران نے پرنسپل صاحب کی اس مخلصانہ ڈانٹ ڈپٹ سے سبق سیکھنے کے بجائے اسے اپنی توہین قرار دیا تھا اور ان کے منہ پر انہیں دھمکی دے کر آیا تھا کہ انہیں اس کے ساتھ کیے اس سلوک کے سنگین نتائج بھگتنے ہوں گے اور صرف دو دن بعد پرنسپل صاحب کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ انہیں جس پسٹل سے ہلاک کیا گیا تھا وہ عمران کو اس کے گھر سے گرفتار کرتے وقت پولیس نے "برآمد" کر لیا تھا۔ آلۂ قتل کی بازیابی کے علاوہ پولیس کے پاس وجۂ قتل کا بھی گواہ موجود تھا۔ پرنسپل صاحب کے کمرے کے باہر بیٹھنے والے چپراسی نے گواہی دی تھی کہ اس نے پرنسپل صاحب اور عمران کے درمیان ہونے والی پوری گفتگو مع عمران کی دھمکیوں کے سنی تھی۔ چپراسی کے علاوہ دو تین مزید گواہ بھی پیش کیے گئے تھے جنہوں نے عدالت کے روبرو بتایا تھا کہ عمران اپنی سیاسی تنظیم کے زور پر کس طرح ساتھی طلبہ کو دھونس میں لینے کے علاوہ زدوکوب بھی کرتا تھا۔ اب عمران لاکھ کہے کہ یہ سب جھوٹ ہے اور گواہ بکے ہوئے ہیں۔ وہاں اس کی بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی ماں نے بساط نہ ہونے کے باوجود اس کے دفاع کے لیے جو وکیل کیا تھا وہ عدالت کے روبرو اس کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے گواہ اور ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہا تھا۔ عمران کی ماں کی درخواست کے باوجود اس کے کسی کالج فیلو کے والدین اپنے بچوں کو گواہی کے لیے عدالت بھیجنے کے لیے راضی نہیں ہوئے تھے کہ وہ عدالت آتے اور بتاتے کہ عمران پر غلط الزامات لگائے گئے تھے اور وہ ہرگز بھی ویسا لڑکا نہیں تھا جیسا کہ عدالت میں جھوٹے گواہوں کے

ذریعے اسے ثابت کیا جا رہا تھا۔ اصل میں والدین ڈرتے تھے کہ کہیں عمران کے حق میں گواہی دینے کے چکر میں ان کے اپنے بچے کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ یہ خدشات غلط بھی نہیں تھے۔ عمران کے حق میں بولنے والے کو اس کا ساتھی قرار دے کر اس کا مستقبل بھی تاریک کیا جا سکتا تھا۔ سیاسی تنظیم کے مختلف فنکشنز میں گائے جانے والے عمران کے گانے بھی اس کے خلاف ایک ثبوت بن گئے تھے کہ وہ واقعی ان لوگوں کا ساتھی تھا۔ سیاسی تنظیم جو پہلے ہی اپنے خلاف کی جانے والی حکومتی کارروائیوں کی وجہ سے مشکلات کا شکار تھی اس موقع پر عمران کی مدد کے لیے نہیں آئی تھی اور واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ عمران ان کا کارکن نہیں ہے اور صرف اپنا گلوکاری کا شوق پورا کرنے کے لیے بصد اصرار ان کے فنکشنز میں گانے گایا کرتا تھا۔ ان کے کارکنوں کی فہرست میں واقعی عمران کا نام درج نہیں تھا۔ وہ تو صرف اپنے داخلے کا قرض اتارنے کے لیے مجبوراً ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا تھا۔ ایسے میں کون اس کا ساتھ دیتا۔ ایک اس کی ماں ہی تھی جو اس کو بے قصور قرار دینے کے لیے دیوانہ وار کوششیں کر رہی تھی لیکن کہیں سے کوئی گواہی، کوئی ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اللہ سے اپنے بیٹے کے لیے آسانی کی دعائیں مانگنے کے ساتھ ساتھ وہ خاور حیات کو بھی جھولی پھیلا پھیلا کر بددعائیں دیتی تھی۔ وہ تو اس کے پاس مدد مانگنے گئی تھی اور ظالم نے الٹا اس کے بے گناہ بچے کو پھنسوا دیا تھا۔ سچائی کو بہت لوگ سمجھ رہے تھے لیکن اندھا قانون ان ثبوتوں اور گواہوں کی بنیاد پر اس کا کیس دیکھ رہا تھا جو اس کے خلاف عدالت میں پیش کیے گئے تھے۔ عدالتی کارروائی کے علاوہ تھانے میں کیا جانے والا غیر انسانی تشدد الگ عمران کے لیے مصیبت تھا۔ اسے مار مار کر اعتراف کرنے اور پرنسپل کے قتل میں اپنے ساتھ ملوث ساتھی کا نام بتانے پر مجبور کیا جاتا تھا لیکن وہ ان دونوں باتوں کے لیے پولیس والوں کا من پسند جواب دینے سے قاصر تھا۔ وہیں اس کے وکیل نے اس کی ماں کے ساتھ اس سے ملاقات کا انتظام کیا تھا۔ وکیل خود بھی پریشان تھا کہ عمران کے خلاف بہت مضبوط کیس بنایا گیا ہے اور وہ اسے بچانے کے لیے کوئی راہ نہیں نکال پا رہا ہے کیونکہ اس کے مقابل ڈی ایس پی خاور حیات تھا جس نے بہت چالاکی سے عمران کے گرد جال بُنا تھا اور ثبوتوں اور گواہوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں عمران کے وکیل کے پاس اس کے دفاع کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اب بھی وہ عمران کے مقابل الجھا ہوا سا بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا۔

"تمہارے پاس بچت کا صرف ایک راستہ ہے عمران کہ ہم عدالت کے روبرو ایک ایسا گواہ پیش کریں جو یہ گواہی دے کہ پرنسپل صاحب کے قتل کے وقت تم اس کے ساتھ تھے۔ جھوٹا گواہ پیش کرنے کے لیے تمہارے پاس کوئی نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں اس لڑکی زارا کو ہی اپنا گواہ بننے پر راضی کرنا پڑے گا جس کے ساتھ تم چودہ اپریل کی دوپہر موجود تھے۔" وکیل نے اس سے کہا تو اس نے چور نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ اس نے یہ بات صرف وکیل کو بتائی تھی کہ اس روز وہ زارا کے ساتھ ساحلِ سمندر پر موجود تھا لیکن وہ زارا کو اس چکر میں گھسیٹ کر بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اب تک خاموش تھا۔

"وکیل صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا! انہوں نے مجھے زارا کے بارے میں بتایا ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہمیں زارا سے بات کرنی چاہیے۔ تمہاری گرفتاری سے وہ بھی پریشان ہو گی اور ہم اس سے اصرار کریں گے تو وہ عدالت میں گواہی دینے کے لیے راضی ہو ہی جائے گی۔ رہی بدنامی کی بات تو اس کیس سے تمہاری جان چھوٹتے ہی میں تم دونوں کا رشتہ طے کر دوں گی تاکہ لوگوں کے منہ بند ہو جائیں۔" وہ ماں تھیں اور انہیں اپنے بیٹے کی نجات کا ایک راستہ نظر آ رہا تھا تو وہ ہر حال میں اسے استعمال کرنا چاہتی تھیں۔ عمران بھی اتنے دن سے اذیتیں سہہ سہہ کر ٹوٹ چکا تھا سو زارا کو اس مشکل میں ڈالنے کے لیے تیار ہو گیا اور ماں کو اجازت دے دی کہ وہ زارا سے بات کر لیں۔ اسے اپنی محبت پر پورا بھروسا تھا اور یقین تھا کہ بہت سی مشکلات کے باوجود زارا اس کے لیے یہ قدم اٹھانے پر راضی ہو جائے گی۔ دونوں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ زارا اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیتی۔

☆☆☆

صنوبر کے گھر والے بہت پریشان تھے۔ ان کا اچانک ہی اس سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی طرف سے کوئی کال یا پیغام نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی وہ اس سے رابطہ کر پا رہے تھے۔ ہر بار کوشش کرنے پر اس کا نمبر بند ملتا تھا۔ پریشان ہو کر انہوں نے اسپتال اور ہاسٹل کے نمبرز پر رابطہ کر کے وہاں سے صنوبر کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو وہاں سے بھی کوئی اچھی اطلاع نہیں ملی۔ اسپتال کے ریکارڈ کے مطابق صنوبر بغیر اطلاع کے چار دن سے غیر حاضر تھی جبکہ ہاسٹل انتظامیہ کے مطابق وہ چار دن قبل اپنے ڈیوٹی

ٹائم پر یہ کہہ کر اسپتال کے لیے روانہ ہوئی تھی کہ آج وہ دو تین دن کی چھٹی لے کر اسپتال سے ہی سیدھی اپنے گھر کے لیے روانہ ہو جائے گی۔ اس مقصد کے تحت وہ ڈیوٹی جاتے ہوئے اپنے سامان کا ایک بیگ بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی لیکن اس روز سے ہی وہ ڈیوٹی پر نہیں پہنچی تھی۔ اسپتال اور ہاسٹل سے ملنے والی ان تشویشناک اطلاعات پر اس کا بڑا بھائی یاسر فوراً کراچی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر بھی صورت حال جوں کی توں تھی اور صنوبر کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ ہاسٹل سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں بس یہی خیال ذہن میں آیا تھا کہ وہ ہاسٹل سے اسپتال جاتے ہوئے کسی حادثے کا شکار ہو گئی تھی ورنہ ایسی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اسپتال نہ پہنچتی۔ بہن کی خیریت کی طرف سے فکرمند اس نے کسی کے مشورے پر تھانے میں اس کے غیاب کی رپورٹ درج کروادی۔ اس کے شکوک وشبہات اپنی جگہ تھے اور پولیس والوں کے چبھتے ہوئے سوالات اپنی جگہ...... جوان لڑکیوں کے غیاب پر لوگوں کے ذہنوں میں سب سے پہلا خیال یہی آتا ہے کہ وہ کسی لڑکے کی خاطر بھاگ گئی ہے۔ یاسر اپنی باپردہ رہنے والی دین دار بہن کے لیے اس طرح کی باتیں نہیں سوچ سکتا تھا۔ پسندیدگی وغیرہ کا معاملہ بھی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس کی وجہ سے صنوبر کو یوں سب کچھ چھوڑ کر جانا پڑتا۔ وہ لوگ گاؤں کے رہنے والے ضرور تھے لیکن تنگ نظر نہیں تھے۔ خصوصاً صنوبر کو تو بہت زیادہ رعایت حاصل تھی۔ ابھی پچھلے دنوں ہی تو اس کے سامنے ایک معقول رشتہ رکھتے ہوئے اسے یہ آپشن بھی دیا گیا تھا کہ اگر وہ کسی کو اس حوالے سے پسند کرتی ہے تو بتا دے لیکن اس نے ایسی کسی بات کا اظہار نہیں کیا تھا، ایسے میں اس کا بھائی اس پر کیسے شک کر سکتا تھا۔ وہ تھانے کے چکر لگاتا رہا کہ اس کی بہن کی بازیابی کے سلسلے میں کچھ کیا جائے۔ کراچی میں اپنی جان پہچان کے ایک بارسوخ آدمی سے بھی اس نے سفارش کروائی تو پولیس نے اس کیس پر سرگرمی سے کام شروع کر دیا اور اس کارروائی کے نتیجے میں عجیب عجیب باتیں سامنے آنے لگیں۔ پولیس نے سب سے پہلے صنوبر کو اس کے موبائل فون کی مدد سے ٹریس کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے کوئی سراغ نہ مل سکا۔ صنوبر کے زیرِاستعمال رہنے والا نمبر مسلسل بند تھا۔ پولیس نے موبائل کمپنی سے اس کا ڈیٹا نکلوالیا۔ صنوبر کے فیس بک اور ٹوئٹر اکاؤنٹ کی تفصیلات بھی حاصل کر لی گئیں اور ایک پینڈورا باکس کھل گیا۔ وہ سال بھر سے زیادہ عرصے سے سوشل میڈیا پر ایسے لوگوں کے ساتھ منسلک تھی جو انتہا پسندانہ خیالات کے مالک تھے۔ صنوبر ایسی پوسٹس کو ہمیشہ لائک کرتی تھی اور خود بھی ایسی پوسٹس لگاتی رہتی تھی جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انتہا پسند مذہبی رجحان رکھنے والی لڑکی ہے۔ پولیس نے کچھ مشکوک پیغامات، ای میلز اور فون کالز بھی پکڑی تھیں جن سے یہ شک پیدا ہوتا تھا کہ صنوبر انتہا پسند گروپ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص سے رابطے میں تھی۔ شہر میں ہونے والے دو بڑے حادثات سے قبل اس کے نمبر پر ڈھکے چھپے الفاظ میں ایسے پیغامات بھیجے گئے تھے جن سے یہ شک ہو رہا تھا کہ صنوبر کو قبل از وقت حادثات کی اطلاع دیتے ہوئے ڈیوٹی پر موجود رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ان حادثات کے بعد ڈیوٹی ٹائمنگ میں اس کا موبائل خاصا مصروف رہا تھا اور حاصل شدہ ڈیٹا کے مطابق وہ کسی سے کوڈ ورڈز میں ہدایات لیتی رہی تھی۔ یہ سب معمولی انکشافات نہیں تھے۔ ان انکشافات کے مطابق صنوبر دہشت گردوں کی ساتھی اور سہولت کار تھی اور اس کے موبائل پر آنے والی آخری کال کے مطابق وہ ان ہی لوگوں کی ہدایت پر کہیں روانہ ہوئی تھی۔ پولیس نے ایک سی سی ٹی وی فوٹیج بھی حاصل کر لی تھی جس کے مطابق صنوبر اپنے غیاب والے روز کینٹ اسٹیشن پر دکھائی دی تھی۔ اس کے بعد سے پولیس کو اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ نہ ہی وہ اس شخص کو ٹریس کر پائے تھے جس سے وہ رابطے میں تھی۔ وہ کوئی بہت ہی چالاک اور ماہر شخص تھا جسے خود کو چھپانا آتا تھا اور اس نے خود تک پہنچنے کے سارے راستے بند کر رکھے تھے۔ اس طرف سے راستہ بند پا کر پولیس نے صنوبر سے منسلک لوگوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ گھر والے، کولیگز، روم میٹس اور سہیلیاں سب تفتیش کی زد میں آ گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ صنوبر انتہا پسند مذہبی رجحانات میں مبتلا تھی اور موبائل پر بہت مصروف رہتی تھی۔ سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ اور پوچھ گچھ پر اس نے اس بات کا اقرار بھی کیا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی شخص موجود ہے لیکن اس شخص کے بارے میں اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا اور یہی کہتی رہی تھی کہ وقت آنے پر بتا دے گی۔ گھر والوں کو اتنی معلومات بھی نہیں تھیں۔ پولیس والوں نے یاسر سے بہت سختی سے پوچھ گچھ کی تھی، گھر کی خواتین سے بھی سوال جواب ہوئے تھے لیکن کوئی بتاتا بھی تو کیا۔ تاجور کو البتہ رشتے کے سلسلے میں اس سے ہونے والی گفتگو یاد تھی کہ اس نے کتنے آرام سے اس لڑکے کو کافر اور مشرک قرار دے دیا

تھا جس کے لیے اس کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ بہرحال اس نے اس بات کا تفتیشی افسر کے سامنے ذکر نہیں کیا تھا۔ کوئی لاکھ کہتا کہ صنوبر انتہا پسند تھی اور اب باقاعدہ دہشت گردوں کی ساتھی بننے چلی گئی تھی، گھر والوں کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ جو گھر میں سب سے چھوٹی تھی اور جس کی پرورش میں ماں باپ کے ساتھ بہن بھائی نے بھی بھرپور حصہ لیا تھا جس کے بےحد لاڈ اٹھائے گئے تھے اور جو محبت کی چھاؤں میں پل کر جوان ہوئی تھی، نفرتوں کی سوداگر بن گئی تھی، کوئی اس بات پر یقین کرتا بھی تو کیسے؟ خود کو دھوکا دیتے وہ لوگ اب بھی اپنی اسی پرانی معصوم بھولی بھالی صنوبر کے واپس لوٹ آنے کے منتظر تھے۔

☆☆☆

سلاخوں کے پیچھے نیم تاریک کوٹھری کے فرش پر پڑا عمران اندر باہر سے بُری طرح ٹوٹا ہوا تھا۔ تفتیش کے نام پر آج اسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ ایک عام سا سیدھا سادہ نوعمر لڑکا تھا جس کی دوستوں کے ساتھ بھی شاذ و نادر ہی کبھی ہاتھا پائی کی نوبت آپاتی تھی۔ وہ بھلا اتنا تشدد کیسے سہہ پاتا، وہ ٹوٹ گیا تھا اور اپنے اعترافی بیان میں ناکردہ جرائم کو قبول کر لیا تھا۔ ٹوٹنے کی ایک بڑی وجہ زارا بھی تھی۔ کل اس کی ماں اس سے ملنے آئی تھی تو اس نے بھیگی آنکھوں سے اسے بتایا تھا کہ زارا کسی صورت بھی اس کی گواہ بننے کے لیے راضی نہیں ہے۔ گواہ بننا تو دور کی بات وہ یہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھی کہ اس کی کسی عمران نامی لڑکے سے شناسائی تھی۔ اس نے عمران کی ماں کو اچھا خاصا بےعزت کیا تھا کہ وہ اپنے قاتل اور دہشت گرد بیٹے کو بچانے کے لیے ایک باعزت گھرانے کی لڑکی کو اس کے ساتھ ملوث کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس نے اس بات سے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ چودہ اپریل کی دوپہر عمران کے ساتھ ساحل پر موجود تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ چودہ اپریل تو کیا وہ کبھی بھی کسی بھی تاریخ کو کالج سے کہیں نہیں گئی تھی۔ اس کے مطابق وہ ایک شریف لڑکی تھی جو کالج سے سیدھی اپنے گھر جاتی تھی۔ عمران کی ماں اگر زارا کے گھر جا کر اس سے ملی ہوتی اور اس کے گھر والوں کے سامنے اس سے بات کی ہوتی تو عمران اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلا لیتا کہ گھر والوں کے عتاب سے بچنے کے لیے زارا کو یہ سارے جھوٹ بولنے پڑے ہوں گے لیکن وہ اس کے ایک دوست زعیم کے ذریعے کالج جا کر زارا سے ملی تھیں لیکن اس نے ان سے نہایت بےسردی سے بات کی تھی۔ زعیم، عمران کا وہ واحد دوست تھا جسے اس کے اور زارا کے تعلق کے بارے میں علم تھا اور خود عمران نے ماں کو تجویز دی تھی کہ وہ زعیم کی مدد سے زارا سے ملاقات کریں لیکن زارا نے بہت مایوس کن رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ جو ہمیشہ اسے چاہنے اور ہر حال میں ساتھ نبھانے کے دعوے کرتی تھی، وہ اپنے سارے دعوے اور وعدے بھول گئی تھی۔ اسے ذرا سا بھی خیال نہیں آیا تھا کہ اس کی گواہی عمران کو موت کے منہ سے نکال لے گی۔ اگر وہ اپنے گھریلو حالات اور معاشرتی دباؤ کی وجہ سے گواہی نہیں دے سکتی تھی تو اتنا تو کر سکتی تھی کہ اس کی ماں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتی اور انہیں اپنی مجبوری بتا کر گواہی دینے سے انکار کر دیتی۔ اس نے تو الٹا ماں کی بےعزتی کی تھی۔ زارا کے لیے اس نے اپنی ماں کے صندوق میں نہایت احتیاط سے چھپا کر رکھا گیا ان کا جڑاؤ ٹیکا فروخت کر دیا تھا۔ وہ ٹیکا شادی کے موقع پر انہیں بری میں چڑھایا گیا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ وہ اسے اپنی بہو کی بری میں چڑھائیں گی۔ اپنی آنے والی اکلوتی بہو کے لیے ان کے دل میں بڑے ارمان تھے لیکن جب عمران نے زارا کو چودہ اپریل کی اس دوپہر ساحل پر ملاقات کے لیے راضی کیا تو اس ملاقات کو یادگار اور بھرپور بنانے کے لیے ماں کے خوابوں کو بھول کر ان کا وہ ٹیکا چپکے سے فروخت کر دیا۔ ٹیکا فروخت کرتے ہوئے دل میں اگر کوئی احساسِ ندامت تھا بھی تو اس نے خود کو یہ کہہ کر بہلا لیا تھا کہ ٹیکا ماں نے اپنی بہو کے لیے رکھا تھا اور زارا ان کی ہونے والی بہو ہی تھی۔ اپنے تئیں اس نے اس روز زارا کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی اور یادگار موقع کو مزید یادگار بنانے کے لیے اس کی شاندار ضیافت بھی کی تھی لیکن اسی زارا نے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی عمران کو نہیں جانتی۔ اس نے اس کی ماں کے سامنے اسے قاتل اور دہشت گرد قرار دے دیا تھا پھر عمران ٹوٹتا نہ تو اور کیا کرتا۔

نیم تاریک سیل میں فرش پر پڑا وہ اندرونی اور بیرونی زخموں سے نڈھال ہلکی آواز میں سسک رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اپنے قریب کسی کی آہٹ سنی۔ بنا دیکھے بھی وہ جانتا تھا کہ یہ چند دن قبل اس کا ساتھی بننے والا قیدی ارمان خان ہے۔ عمران نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ارمان خان کس جرم میں قید تھا۔ اس پر جو قیامت ٹوٹی تھی وہ اسے اپنے سوا کسی اور کے بارے میں سوچنے اور جاننے کی مہلت ہی کہاں دیتی تھی؟ اس کے لیے اپنا ہی غم بہت تھا، وہ دوسروں کے غم کہاں پالتا، سوائے ارمان خان کے بارے میں کچھ

علم نہیں تھا۔ البتہ یہ ضرور جانتا تھا کہ ارمان خان کوئی اس کی طرح ڈرا سہما رہنے والا قیدی نہیں تھا۔ وہ خاصا زندہ دل تھا اور دوسرے قیدیوں سے تعلقات بنانے اور ان کا حال چال جاننے میں پیش پیش رہتا تھا۔ اس نے عمران سے بھی اس کی ساری داستان سنی تھی اور اس کی ہمدردی میں اس کے رشتے کے خالو ڈی ایس پی خاور حیات کو غائبانہ بھاری بھرکم گالیوں سے نوازتے ہوئے آخرت میں جہنم کی وعید دی تھی۔ ارمان خان شکستہ حالت میں پڑے عمران کے قریب پنجوں کے بل آبیٹھا تھا۔ عمران بے سُدھ پڑا رہا۔ ارمان خان نے اس کے سر کے بالوں کو سہلاتے ہوئے دھیرے سے اسے پُکارا۔ اس کے ہمدردی سے پکارنے پر عمران کے ہونٹوں سے سسکی نکل گئی۔

''بہت بُری طرح مارا ہے سالوں نے۔'' ارمان خان کے لہجے میں مزید ہمدردی سمٹ آئی۔ جواب میں عمران کی سسکیاں اور بھی تیز ہوگئیں۔ اگلے چند منٹ تک ارمان اسے سنبھالتا اور چپ کرواتا رہا۔ سہارے سے بٹھا کر اسے پانی پلایا اور ہمدردی کے جملے بولے۔ آخرکار عمران خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہوگیا۔ ارمان نے اسے ٹٹولا تو اس نے اسے موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ زارا کے رویے نے اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگائی تھی۔ اس پر جو کچھ گزر رہی تھی، وہ اس کی عمر اور تجربے کے حساب سے بہت کڑی صورتِ حال تھی اس لیے ہمدرد ملا تو اسے سب کچھ بتاڈالا۔ اس وقت وہ دکھی بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔ زارا کی گواہی اسے اس چکر سے نکالنے کے لیے واحد امید تھی اور اس نے ہی اسے مایوس کردیا تھا۔ خاور حیات نے اسے اس چکر میں اس طرح پھنسایا تھا کہ اس کے خلاف ثبوتوں اور گواہوں کے ڈھیر لگادیے تھے۔ زارا گواہی دے دیتی تو سارے ثبوت اور گواہ جھوٹے قرار دیے جاسکتے تھے لیکن گواہی کے لیے راضی ہونا تو دور کی بات وہ اس سے تعلق سے ہی منکر ہوگئی تھی اور مایوسی کی انتہا پر پہنچا عمران خود کو تصور میں پھانسی کے پھندے پر جھولتا دیکھ رہا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ناکردہ جرم کے الزام میں اپنے اس انجام کا سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے چنانچہ اسی رات جب ارمان خان نے نہایت دھیمی سرگوشیوں میں اسے آگاہ کیا کہ اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو جیل سے چھڑانے کے لیے باہر موجود ان کے ہمدرد منصوبہ بندی کررہے ہیں اور جلد وہ لوگ یہاں سے فرار ہوجائیں گے تو اس کے کان کھڑے ہوگئے اور اس نے ارمان کے ساتھ فرار ہونے کی پیشکش کو بلا تامل قبول کرلیا۔ اس کے پاس جیل سے نجات کا یہی واحد راستہ رہ گیا تھا۔ کم از کم موجودہ صورتِ حال میں تو اسے یہی نظر آرہا تھا۔

☆☆☆

صنوبر کراچی سے روانہ ہوئی تو بے حد پریشان اور متفکر تھی۔ اسے خبر ملی تھی کہ قادر شدید زخمی ہے۔ اسے کسی مہم کے دوران گولیاں لگی تھیں۔ اس کے ساتھی اسے وہاں سے اٹھا کر لے آئے تھے اور صنوبر کی حاصل شدہ معلومات کے مطابق انہوں نے قادر کے جسم میں لگنے والی گولیاں نکال لی تھیں لیکن اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی اور زخموں میں انفیکشن ہونے لگا تھا۔ قادر کی اس حالت کا سن کر صنوبر اپنی جگہ سکون سے بیٹھی نہیں رہ سکتی تھی۔ قادر وہ شخص تھا جسے اس نے بنا دیکھے اور بنا ملے صرف اس کے خیالات اور الفاظ کی بنیاد پر بہت چاہا تھا۔ وہ اس شخص کی باتوں سے متاثر تھی۔ شروع شروع میں ان کا تعلق عام نوعیت کا تھا اور ان کے درمیان پیغامات کے ذریعے تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ بعد میں وائس کال کا سلسلہ شروع ہوا تو صنوبر اس کے سحر میں جکڑتی چلی گئی۔ اس کے الفاظ، اس کا لہجہ سب کچھ نہایت دلنشین تھا۔ صنوبر اس کی محبت میں ایسے مبتلا ہوئی کہ اس کے دل و دماغ پر قادر کا قبضہ ہوگیا اور اس کے خیالات و افکار سے متفق وہ اس کے ''کاز'' کا حصہ بنتی چلی گئی۔ اب اسے قادر کی تشویش ناک حالت کے بارے میں پتا چلا تھا تو وہ کیسے خود کو روک پاتی۔ زخمی ہونے کے بعد خود قادر نے تو صرف ایک بار ہی اس سے بات کی تھی اور اس کی آواز سے صنوبر کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ بے حد تکلیف میں ہے۔ بعد میں اس کی قادر کے ایک قریبی ساتھی سے بات ہوئی تو اس نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ وہ قادر کی دیکھ بھال کے لیے وہاں ان لوگوں کے پاس آنا چاہتی ہے، جواب میں اسے بتایا گیا کہ ایک بار آنے کے بعد اس کے پاس واپسی کا راستہ نہیں ہوگا۔ اپنے خیالات میں آنے والی تبدیلی کی وجہ سے وہ پہلے ہی خود کو اپنے لوگوں میں اَن فٹ محسوس کرنے لگی تھی اور اس وقت اس شخص کا معاملہ تھا جس کی وہ دیوانی تھی اس لیے فیصلہ کرنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ان لوگوں کی ہدایت کے مطابق وہ بذریعہ ریل پہلے کراچی سے لاہور پہنچی۔ روانگی سے قبل وہ اپنا پرانا موبائل اور اس کی سم ضائع کرچکی تھی اور اب ایک دوسرا موبائل اور سم استعمال کررہی تھی۔ لاہور پہنچنے پر اسے اگلی ہدایات دی گئیں اور وہ لاہور سے اگلی منزل کے لیے روانہ ہوگئی۔ پشاور میں ایک شخص اس

سے ملنے آیا اور یہاں سے آگے اس نے اس شخص کے ساتھ ایک شٹل کاک برقع میں سفر کیا۔ وہ سفر اتنا تھکا دینے والا اور پیچیدہ تھا کہ اسے کسی بات کا اندازہ نہ ہوسکا۔ یہاں تک کہ وہ وقت کا تعین بھی نہیں کرسکی۔ جو نیا موبائل اور سم وہ پشاور تک استعمال کرتی رہی تھی، وہ بھی ضائع کروادیا گیا اور جب ایک طویل مسافت کے بعد وہ وزیرستان کے اس خفیہ ٹھکانے تک پہنچی تو اس کا اپنی پچھلی زندگی سے رابطہ قطعی منقطع ہوچکا تھا۔ منزل پر پہنچ کر اسے پہلے آرام کرنے کی ہدایت کی گئی پھر قادر سے ملوایا گیا۔ قادر سے مل کر اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ لمبے قد کی دبلی پتلی اور صاف رنگت والی پُرکشش لڑکی تھی جسے ایک بار دیکھنے والا اس پر دوسری نظر ضرور ڈالتا تھا۔ اس کے مقابلے میں قادر پستہ قد اور سیاہ رنگت والا تھا جس کا معمولی نقش و نگار والا چہرہ کئی دن سے تکلیف سہتے ہوئے مزید بے کشش بلکہ خوفناک ہوچکا تھا۔ صنوبر کو سامنے پاکر اس نے مسکرانے کی کوشش کی تو اس کے سفید دانت نمایاں ہوگئے اور وہ کچھ اور بھی بھیانک لگنے لگا لیکن اب صنوبر خود کو سنبھال چکی تھی۔ اسے یاد آگیا تھا کہ اس نے قادر کے ظاہر نہیں بلکہ باطن سے محبت کی تھی۔ وہ اس کے خیالات و ذہانت سے متاثر تھی اور بن دیکھے اس سے محبت کرتے ہوئے جب بھی اپنے ذہن میں اس کی شبیہ بنانے کی کوشش کی تھی تو اس نکتے کو بھی ذہن میں رکھا تھا کہ وہ کوئی معمولی صورت کا بدشکل شخص بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے اندیشے کے مطابق وہ ایسا ہی نکلا تھا تو اسے اسی طرح اسے قبول کرنا تھا۔

''تم آگئیں صنوبر! مجھے معلوم تھا کہ ایک دن ضرور یہاں آجاؤ گی۔'' اسے دیکھ کر مسکرانے کے بعد قادر نے یہ الفاظ کہے تو اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ یقیناً اسے بولنے کے لیے بھی خاصی توانائی صرف کرنی پڑرہی تھی۔

''آپ کی اس حالت کا سُن کر میں کیسے نہ آتی۔ مجھے تو آنا ہی تھا۔'' صنوبر نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا اور جھک کر اس کا معائنہ کرنے لگی۔ پتا نہیں کیوں یہاں آنے کے ساتھ ہی اسے اپنے گھر والے بہت شدت سے یاد آنے لگے تھے اور وہ جو یہ سمجھنے لگی تھی کہ ذہنی فاصلوں کے ساتھ ساتھ اس کا ان لوگوں سے قلبی فاصلہ بھی ہوگیا ہے پہلے ہی مرحلے پر ان کی یاد میں تڑپنے لگی... اور یہ خیال کہ اب کبھی وہ اپنے پیاروں کے درمیان نہیں جاسکے گی اس کے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ رہا تھا۔ دل کی اس کیفیت کا اظہار کیے بغیر وہ قادر کا معائنہ کرتی رہی۔ اس کے زخموں میں بُری طرح انفیکشن ہوگیا تھا اور وہ بے حد تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ صنوبر نے اس کے سرہانے رکھی دواؤں کا جائزہ لیا۔ ان میں اینٹی بائیوٹکس بھی تھیں اور بخار اور درد کی دیگر دوائیں بھی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ایک کوالیفائڈ ڈاکٹر قادر کا علاج کررہا ہے لیکن اسے افاقہ نہیں ہورہا تھا۔ صنوبر کو بھی ان دواؤں میں کوئی کمی نظر نہیں آرہی تھی۔ بحیثیت نرس اسے تجربہ تھا کہ اس طرح کے مریضوں کو یہی دوائیں دی جاتی ہیں۔ بہرحال وہ قادر کے بستر کے قریب ہی رکھی کرسی پر جم کر بیٹھ گئی اور پورے تین دن اس نے اس کمرے میں قادر کی خدمت کرتے ہوئے گزارے لیکن صورتِ حال سنبھلنے کے بجائے بگڑتی چلی گئی۔ پہلے قادر پر غشی طاری ہوئی اور پھر اسی غشی کی کیفیت میں وہ زندگی کی بازی ہار گیا۔ زندگی ساتھ چھوڑنے پر آئے تو ایسی ہی بے وفا ثابت ہوتی ہے۔ بہترین علاج، لائق معالج، ہمدرد تیمار دار سب رائگاں چلے جاتے ہیں۔ قادر بھی سب کچھ ہوتے ہوئے موت کی آغوش میں چلا گیا تھا اور اس کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر آنے والی صنوبر بالکل تہی داماں رہ گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اب وہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ کہیں جانے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ یہاں آتے وقت ہی اسے بتادیا گیا تھا کہ واپسی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قادر کی موت کے چوتھے دن اسے اس جگہ کے سربراہ نے اپنے پاس بلایا اور کافی لمبی تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ان کے لیے فرد نہیں ''کاز'' کی اہمیت ہے۔ قادر چلا گیا لیکن ان کا مشن جاری ہے اور صنوبر کو بھی اپنا غم بھول کر مشن کے لیے کام کرنا چاہیے۔ آگے وہی ساری باتیں تھیں جو اتنے عرصے سے قادر بھی اس سے کرتا رہا تھا۔ اس ملاقات نے صنوبر کی خاصی برین واشنگ کی اور وہ معلق سی کیفیت سے نکل کر ایک بار پھر اس ڈھب پر سوچنے لگی جس پر چلتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔ پہلے وہ خیالات کے اعتبار سے ان کی ساتھی تھی اور اپنے نرسنگ کے پیشے کی آڑ میں ان کے لیے چند خدمات انجام دے دیتی تھی لیکن اب اس کی باقاعدہ تربیت کا آغاز ہونے جارہا تھا اور تصور ہی تصور میں وہ پاک سرزمین سے سارے ''کافروں'' کو نیست و نابود کردینے کے لیے پُرعزم تھی۔

☆☆☆

عمران، ارمان خان کے ساتھیوں کی مدد سے جیل سے فرار ہوا تو ایک ڈرا سہما چوزے جیسا دل رکھنے والا انسان تھا۔ ارمان خان کے ساتھیوں نے انہیں باقاعدہ جیل

توڑ کر نکالا تھا۔ ہنگامے کا آغاز جیل کے اندر سے ہی ہوا تھا۔ پہلے قیدیوں کے دو گروہ آپس میں بُری طرح لڑ پڑے۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس اہلکار اس جھگڑے سے نمٹ ہی رہے تھے کہ جیل کے ایک حصے میں بری طرح آگ بھڑکنے کی خبر سنائی دی۔ پولیس اہلکار اور قیدی اس آگ کو بجھانے کے لیے دوڑے۔ آگ واقعی شدید تھی۔ کئی لوگ اس بھڑکتی آگ کو بجھانے میں مصروف ہو گئے۔ فائر بریگیڈ کو کال کی جانے لگی اور ابھی یہ سارا ہنگامہ جاری تھا کہ آگ والی جگہ سے بالکل مخالف سمت میں جیل کی ایک دیوار زوردار دھماکوں کے ساتھ منہدم ہو گئی۔ دھماکے ہینڈ گرینیڈز کے تھے۔ ارمان خان اور اس کے ساتھی اسی لمحے کے منتظر تھے۔ انہوں نے ٹوٹی ہوئی دیوار سے راہِ فرار اختیار کی۔ عمران ان کے ساتھ تھا۔ دھماکوں کے ساتھ ہی جیل میں خطرے کا الارم گونجنے لگا تھا۔ ظاہر ہے جیل انتظامیہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس سارے ہنگامے کی آڑ میں کچھ قیدی جیل سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بے پناہ شور تھا جو ہر طرف پھیل گیا تھا۔ قیدیوں کی چیخ و پکار، اہلکاروں کی للکاریں، الارم کی گونج، گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں اور قریب آتی فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں۔ غرض وہاں شور ہی شور تھا اور اس بے پناہ شور میں بھی عمران اپنے دگنی رفتار سے دھڑکتے دل کی دھڑ دھڑ سن رہا تھا۔ اسے ہر لمحے یہی دھڑکا تھا کہ کسی بھی لمحے کوئی گولی آئے گی اور اس کے جسم کے کسی حصے میں پیوست ہو جائے گی۔ ارمان خان اور اس کے ساتھی اس خوف سے بے نیاز تھے۔ عمران دیکھ سکتا تھا کہ انہوں نے چادر کی بکل کے نیچے چھپائے اپنے ہتھیار نکال لیے ہیں اور ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے پاس یہ ہتھیار کہاں سے آئے تھے اس سوال کا جواب جاننے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں تھی۔ فرار کا کوئی بھی منصوبہ صرف باہر کی کارروائی سے مکمل نہیں ہوتا۔ باہر والے کچھ اندر والوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ یہاں بھی محکمے کی کالی بھیڑیں مفروروں کی پشت پر موجود تھیں اور مفرور اتنے پُراعتماد تھے کہ گولیوں کی بوچھاڑ بھی انہیں جیل کی دیوار پار کرنے سے نہیں روک سکی تھی۔ ادھر انہوں نے باہر قدم رکھا ادھر فائر بریگیڈ کی ایک گاڑی وہاں آ کر رکی۔ ان کے فرار کی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے جدوجہد میں مصروف پولیس اہلکار فائر بریگیڈ کی گاڑی کی موجودگی سے ذرا سا ہچکچا گئے۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں کوئی گولی ریسکیو کے لیے آئے ہوئے فائر بریگیڈ کے عملے کے کسی فرد کو نہ لگ جائے۔ ان کی اس ہچکچاہٹ نے فراریوں کا کام آسان کر دیا اور وہ گولیاں چلاتے ہوئے فائر بریگیڈ کی گاڑی پر سوار ہو گئے۔ ہر کام بالکل ٹائمنگ سے ہو رہا تھا۔ یہ طے تھا کہ فائر بریگیڈ کی گاڑی کو اس لمحے اس جگہ موجود ہونا چاہیے۔ گاڑی باہر موجود ان کے ساتھیوں نے منصوبے کے تحت حاصل کی تھی اور گاڑیوں پر موجود فائر بریگیڈ کا عملہ یرغمال بنا ہوا تھا۔ گاڑی پر اپنے مفرور ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے میگا فون پر اعلان کر دیا کہ اگر ان کا تعاقب کرنے کی کوشش کی گئی تو عملے کے افراد کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ پولیس والے بے بسی سے دیکھتے رہ گئے اور فائر بریگیڈ کی گاڑی فراریوں کو لے کر سائرن بجاتی ٹریفک کے ہجوم سے نکلتی چلی گئی۔ مختلف اداروں اور افسروں کے ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنے اور احکامات صادر ہونے تک وہ لوگ بہت دور نکل چکے تھے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی انہوں نے راستے میں چھوڑ دی تھی۔ اس کے بعد وہ مسلسل گاڑیاں اور ٹھکانے بدلتے ہوئے وزیرستان کے اس کیمپ تک کیسے پہنچے تھے یہ ایک الگ داستان تھی۔ ان کے ساتھ ساتھ موجود عمران بس اتنی بات سمجھ سکا تھا کہ وہ بے حد منظم لوگ ہیں جن کے پاس وسائل کی کمی نہیں ہے۔ یہ وہ دور تھا جب دہشت گردی کا ناسور وطنِ عزیز میں اتنی بری طرح نہیں پھیلا تھا کہ ملک کا بچہ بچہ اس لفظ سے واقف ہوتا۔ عمران کو بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچنے کے لیے وہ کن لوگوں میں جا پھنسا ہے۔ اس کے نزدیک وہ ایک جہادی گروہ تھا اور جذبۂ ایمانی کے تحت وہ اپنے دل میں ان کے لیے ہمدردی رکھتا تھا۔ اسے اس بات کی بھی سمجھ نہیں تھی کہ کیسے وہ لوگ مذہب کے نام پر تخریب کاری اور دہشت گردی کے بیج بو رہے ہیں۔ اس کے نزدیک تو وہ اس کے محسن تھے جو اسے پھانسی کے پھندے سے بچا لائے تھے اور ایک محفوظ ٹھکانا دے دیا تھا ورنہ خود اس کے پاس تو جیل سے نکل کر کہیں چھپنے کی بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ محفوظ ٹھکانے پر تمام تر سہولیات کے ساتھ رہتے ہوئے وہ بہت جلد خوف اور اندیشوں کے حصار سے باہر نکل آیا۔ اب اس کے دل میں صرف غصے اور نفرت کے جذبات تھے۔ ان دو جذبات کی کوکھ سے تیسرے جذبے ”انتقام“ کا جنم ہوا تھا۔ وہ خاور حیات سے انتقام لینا چاہتا تھا جس نے اپنی ترقی اور نیک نامی کے لیے سارے رشتے ناتے اور لحاظ بالائے طاق رکھ کر اسے بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ وہ زارا سے بھی حساب لینا چاہتا تھا جو

محبت کے بڑے بڑے دعوے کرنے کے بعد امتحان کی پہلی گھڑی میں ہی پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اس کے ان انتقامی جذبات میں ہر ملنے والی نئی اطلاع کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ جیل سے فرار ہونے کے بعد اسے اشتہاری قرار دے دیا گیا ہے۔ اب وہ سیاسی جماعت کے بجائے ان لوگوں کے ساتھ نتھی کیا جارہا تھا جن کے ساتھ وہ جیل سے فرار ہوا تھا۔ عوام کو بے شک ابھی زیادہ خبر نہیں تھی لیکن خواص اور حساس ادارے جانتے تھے کہ ملک کے کچھ حصوں میں دہشت گرد اور ان کے کیمپ پنپ رہے ہیں۔ ارمان خان اور اس کے ساتھی بھی دہشت گردی کے الزام میں ہی گرفتار ہوئے تھے اور ابھی ان سے تفتیش کا سلسلہ جاری تھا کہ وہ جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ عمران چونکہ ان کے ساتھ فرار ہوا تھا اس لیے اب وہ ان کا ساتھی تھا اور ان کا ساتھی قرار دیے جانے کا مطلب تھا کہ اب کبھی بھی وہ واپس معاشرے کا حصہ نہیں بن سکتا ہے۔ اسے قدرے تاخیر سے اس بات کی بھی اطلاع مل گئی تھی کہ اس کے فرار کی خبر سنتے ہی اس کی ماں کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ اسپتال پہنچنے سے قبل ہی دم توڑ گئی تھی۔ ماں اس کی کل کائنات تھی، وہ نہ رہی تو اس کے لیے دنیا میں کچھ نہ رہا اور اس کا دل چاہا کہ وہ اس دنیا کو آگ لگا دے۔ دل میں بھڑکنے والی آگ نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ وہ لڑکا جو بہت نازک جذبات کا مالک تھا اور اپنی خوب صورت آواز میں محبت کے گیت گانا چاہتا تھا سنگ دل اور جنونی ہوتا چلا گیا۔ اپنے اس جنون میں اس نے خاور حیات کے سامنے اس کے بیٹے یاور کو موت سے ہمکنار کیا اور خاور حیات کو ہمیشہ کے لیے معذور کر ڈالا۔ یہ معذوری جسمانی ہی نہیں ذہنی بھی تھی۔ خاور حیات لاڈلے بیٹے کے نظروں کے سامنے مارے جانے کا صدمہ برداشت نہیں کر سکا تھا اور اسے اتنا زبردست فالج کا اٹیک ہوا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی مفلوج ہو گیا تھا۔ خاور حیات کو عبرت کا نشان بنا کر اسے اپنے دل میں عجیب سی تسکین محسوس ہوئی تھی۔ اس کے انتقام کا دوسرا نشانہ زارا تھی۔ زارا کو اس نے کوئی جسمانی گزند نہیں پہنچائی تھی۔ اس کے ساتھ اس نے صرف اتنا کیا تھا کہ اس کی منگنی کے فنکشن میں زبردست فائرنگ کروادی تھی اور جب اس فائرنگ کے نتیجے میں سب کچھ تلپٹ ہو گیا تھا تو ایک بندے نے رسم کے لیے بنائے گئے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ یہ صرف ایک ٹریلر تھا اور اس ٹریلر کا مقصد یہ تنبیہ کرنا تھا کہ جس کسی نے بھی اس لڑکی زارا سے منگنی، شادی وغیرہ کرنے کی کوشش کی وہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو سکتا ہے۔ بس اسی دن طے ہو گیا تھا کہ اب زارا کی زندگی میں کوئی خوشی نہیں آنے والی اور بائیس سال گزرنے کے بعد بھی زارا کنواری تھی۔ ان بائیس سالوں میں عمران نے کیا کچھ کیا تھا، کتنی زندگیوں کے چراغ بجھائے تھے، کتنے گھر اجاڑے تھے اس کے پاس کوئی حساب نہیں تھا، پورے بائیس سال سے وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں موت کے فرشتے کا کردار ادا کر رہا تھا اور اسے احساس نہیں ہوا تھا کہ یہ کردار انسان کے لیے نہیں ہے۔ انسان جب یہ کردار ادا کرتا ہے تو وہ انسانیت کے درجے سے بہت نیچے گر جاتا ہے۔

☆☆☆

صنوبر شدید صدمے میں مبتلا تھی۔ یہ صدمہ ذہنی بھی تھا اور جسمانی بھی۔ اس سے ایک غلطی ہوئی تھی اور اس غلطی کی سزا میں اسے ذہنی اور جسمانی طور پر بری طرح توڑ دیا گیا تھا۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ ان کے کاز کا حصہ بن جانے کے باوجود اپنے گھر والوں سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکی تھی۔ وہ جب سے ان کے درمیان پہنچی تھی اسے ایک بار بھی اپنے گھر والوں سے رابطے کی اجازت نہیں ملی تھی اور وہ جس نے جذباتیت میں اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا تھا دن رات ان کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اس کو دی جانے والی ساری تربیت اور برین واشنگ دل کے اس گوشے پر اثر انداز ہونے سے قاصر تھی جس میں اپنے خونی رشتوں کے لیے پیار بھرا تھا۔ وہ ان قادر کی موت کے صدمے کو بھول گئی تھی جس کی محبت میں اس نے اپنے گھر والوں کو چھوڑا تھا لیکن اپنی ماں کی لوریاں، بہن کی ہنسی، بھائی کی شفقت اور ننھے بھتیجے کی شرارتیں دل و دماغ سے نہیں نکلتی تھیں۔ کبھی کبھی یہ یادیں اتنی شدت سے اس پر حملہ آور ہوتیں کہ اس کا دل چاہتا وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے پاس چلی جائے اور اپنا انقلابی، جہادی اور نہ جانے کیا کیا ہونا فراموش کر کے اپنوں کے درمیان ایک عام سی لڑکی کی زندگی گزارے۔ وہ جن کے نظریات و خیالات سے متاثر ہو کر اپنا سب کچھ چھوڑ آئی تھی ان کے درمیان رہ کر ان سے دور ہوتی جارہی تھی۔ قادر کی موت کے بعد ان کے لیڈر کے سمجھانے پر شروع کا کچھ عرصہ تو اس نے ان کے زیرِ اثر گزارا تھا لیکن ساتھ رہتے رہتے اس پر ان لوگوں کے بارے میں انکشافات ہونے لگے تھے۔ وہ ویسے نہیں تھے جیسا خود کو ظاہر کرتے تھے۔ اسلام کی ٹھیکیداری کرنے والوں کے کردار میں پیغمبرِ اسلام

کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ وہ بااخلاق نہیں تھے، ہمدرد نہیں تھے، رحمدل نہیں تھے۔ نرم خو نہیں تھے، سخی نہیں تھے، عاجز نہیں تھے ان میں ایسا کچھ نہیں تھا جو انہیں محمدؐ کا مقلد ظاہر کرتا۔ وہ جانے کس اسلام کی پیروی کرتے تھے جس میں قتل و غارت، بے رحمی اور سخت سزاؤں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے اپنے ساتھ وہاں موجود دیگر لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھا تھا۔ وہ سب کسی انجانے خوف کے حصار میں رہتی تھیں اور آپس میں بھی گھلتی ملتی نہیں تھیں۔ کبھی کبھی صنوبر کو ان پر گوشت پوست کے انسانوں کے بجائے مشینی مخلوق کا گمان ہوتا تھا جو بندھے ٹکے انداز میں اپنی ذمے داریاں پوری کرتی رہتی تھیں۔ شروع شروع میں اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ اپنے دل کی باتیں کرے۔ انہیں اپنے گھر والوں کے بارے میں بتائے اور ان سے ان کے خاندانوں کے بارے میں پوچھے لیکن وہ سب یوں بدک گئی تھیں جیسے کوئی گناہ سرزد ہونے لگا ہو۔ پھر ایک دن بہت چپکے سے سرگوشی میں صنوبر ہی کی ہم عمر ایک لڑکی نے اسے بتایا تھا کہ یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں اور ان کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو کہیں اور سنی جاتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ گفتگو کی ہی نہ جائے۔ اس دن کے بعد سے صنوبر کا دل اور بُرا ہو گیا تھا اور اس کا دم یہاں مزید گھٹنے لگا تھا۔ یہ شاید سانس لینے ہی کی خواہش تھی کہ اس نے ایک روز موقع ملنے پر تاجور سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کنٹرول روم کی صفائی کر رہی تھی۔ وہاں کا انچارج واش روم گیا ہوا تھا۔ صفائی کرتے کرتے اس کی نظر ایک اسمارٹ فون پر پڑی تو وہ خود کو روک نہیں سکی۔ فون پر کوئی پاس ورڈ نہیں لگا ہوا تھا۔ اس نے زبانی یاد تاجور کا نمبر ملایا۔ دوسری گھنٹی پر تاجور نے کال ریسیو کر لی اور حسبِ عادت ہیلو کے بجائے السلام علیکم کہا۔ بہن کی بھیگی سلامتی پر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور جواب میں لرزتے ہونٹوں سے وعلیکم السلام کہنے کی کوشش کی۔ ابھی اس نے صرف وعلیکم کہا تھا کہ تاجور چیخ پڑی۔

"صنوبر...... تم صنوبر ہو نا؟" وہ ہاں کہہ پاتی اس سے قبل ہی اس کے ہاتھ سے فون جھپٹ کر بند کر دیا گیا۔ اس نے صرف واش روم کے دروازے پر دھیان رکھا ہوا تھا کہ آہٹ پر فوراً فون بند کر دے گی۔ اس سے فون چھیننے والا کسی بغلی کمرے کا دروازہ کھول کر وہاں آیا تھا اور اب بھسم کر دینے والی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس کی نظروں سے خوف زدہ وہ معذرت یا وضاحت کا کوئی جملہ ترتیب دے پاتی اس سے قبل ہی ہتھوڑے جیسا بھاری ہاتھ اس کے رخسار پر پڑا اور یہ واحد تھپڑ نہیں تھا جو اسے اپنے جرم کی پاداش میں کھانا پڑا تھا۔ تھپڑوں، گھونسوں اور لاتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو اس نے اپنے اس جسم پر سہا تھا جسے کبھی پھولوں کی چھڑی کی ضرب بھی نہیں سہنی پڑی تھی۔ وہ اپنے گھر کی سب سے لاڈلی بچی تھی اور اسے اس کے گھر والوں نے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ تصور میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ کبھی اسے اس بُری طرح مارا پیٹا جائے گا۔ سسکیوں، آہوں اور چیخوں کے ساتھ سہی جانے والی اس ساری تکلیف کے ناقابلِ برداشت ہو جانے پر جب وہ بے ہوشی کی پناہ میں جا رہی تھی تو دل میں یہ خیال بھی انی کی طرح چبھتا تھا کہ وہ اپنی ماں جائی کی آواز سن کر بھی اس سے کچھ کہہ نہیں پائی تھی۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ اسے یہ تو بتا دیتی کہ وہ ان سب سے بہت محبت کرتی ہے اور ان سے جدا ہو کر دن رات انہیں یاد کرتی ہے۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکی تھی اور اس روز کے بعد سے اسے مستقل چپ لگ گئی تھی۔ اس نے اس وقت بھی کوئی احتجاج نہیں کیا تھا جب اسے بتایا گیا تھا کہ موقع پر اسے دی جانے والی سزا صرف ایک ٹریلر تھا، باقاعدہ سزا اسے ابھی بھگتنی تھی۔ اس پر جو فردِ جرم عائد کی گئی تھی اس کے مطابق وہ غدار قرار پائی تھی۔ ان کے خیال میں اس نے ان کے خلاف مخبری کی کوشش کی تھی۔ اگر اس کی نیت ایسی نہیں تھی تب بھی ان کی عائد کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی ہی بہت بڑا جرم تھی۔ ان کے مطابق اس کی ایک کال نے ان کے لیے مصیبت کھڑی کر دی تھی اور خفیہ ایجنسیاں اس کال کا سراغ لگاتی ہوئی ان تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں تو اس کا جرم بہت بڑا تھا اور اسی حساب سے اسے بڑی سزا بھی سنائی گئی تھی۔ اب وہ ان کی ساتھی نہیں رہی تھی اب وہ ان کی لونڈی تھی جس پر ان کی ہر طرح کی خدمت بجالانا فرض تھا۔ ہر طرح کی اس خدمت میں ان کی وحشت کو سہنا بھی شامل تھا اور اس اذیت کو سہتے ہوئے اس کے دل میں اگر ان کے لیے کوئی خوش گمانی تھی بھی تو اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔ عقل پر پڑے پردے دیر سے ہی سہی لیکن ہٹ گئے تھے اور پچھتاووں کے ناگ دن رات اسے ڈستے تھے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنی جذباتیت کی وجہ سے ٹریپ ہو گئی تھی اور اس نے بہت کچھ ایسا کیا تھا جو خلافِ انسانیت تھا۔ اسپتال کے بستر پر طبی امداد کے منتظر پڑے مریضوں کو موت کے منہ میں اتار دینا کتنا قبیح فعل تھا اس بات کا بھی اسے اب احساس ہو رہا تھا۔

اب وہ سوچتی تھی کہ اگر وہ کافر بھی تھے تو انہیں اس طرح مارنے کا حق کس نے دیا تھا۔ نبیٔ برحق کی تعلیمات تو یہ نہیں تھیں۔ آپؐ نے تو کبھی کسی نہتے پر تلوار اٹھانے کا حکم نہیں دیا تھا، آپ تو کبھی بے بسوں کے ساتھ ترشی سے پیش نہیں آئے تھے پھر اسے کیا ہوا تھا کہ وہ دین کی خدمت کے فریب میں اپنے پیشے کا تقدس فراموش کر بیٹھی تھی۔ اسے تو مسیحا بننے کا شوق تھا اور مسیحا کا کام موت بانٹنا تو نہیں ہوتا۔ اَن گنت سوال اور پچھتاوے تھے جو ہر روز کوڑوں کی طرح اس کی روح پر برستے تھے اور وہ ہر دکھ، ہر اذیت سہتے ہوئے سوچتی تھی کہ وہ ان دہشت گردوں کی دی ہوئی سزا نہیں بلکہ اپنے اعمال کے نتیجے میں اللہ کی نافذ کردہ سزا سہہ رہی ہے۔ اپنا کیا انسان کو بھگتنا تو ہوتا ہے۔

☆☆☆

”کیسی ہو زارا ڈارلنگ! مجھے زیادہ مس تو نہیں کر رہی تھیں؟“ فون کان سے لگائے بظاہر وہ بڑی محبت سے پوچھ رہا تھا لیکن آنکھوں میں جو حظ اٹھانے والی سرد سی کیفیت تھی وہ کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ دوسری طرف سے زارا نے اس کی آواز سنتے ہی کوسنے دینے شروع کر دیے تھے۔ وہ اس کے نزدیک ایک آسیب تھا جو پچھلے بائیس سال سے اس سے چمٹا ہوا تھا۔ گھر، محلے، علاقے یا شہر کی تبدیلی اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ اس کا ہر پتا ڈھونڈ نکالتا تھا۔ اسے اس کا ہر نیا فون نمبر معلوم ہوتا تھا اور وہ ہر بار اسے یہ احساس دلانے میں کامیاب رہتا تھا کہ اب وہ کبھی بھی نارمل زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس نے اس سے بے وفائی کی تھی تو اس کی سزا بھی ہر حال میں بھگتنی تھی۔ سزا کا یہ سلسلہ دونوں میں سے کسی ایک کی موت پر ہی ختم ہو سکتا تھا۔

”کتنی خوش اطوار ہوا کرتی تھیں تم۔ اتنی میٹھی آواز ہوا کرتی تھی تمہاری کہ میں اپنی آواز کی شہرت بھول کر بس تمہیں سنتے رہنا چاہتا تھا۔ کتنی بدل گئی ہو تم زارا۔ یہ کوسنے، یہ گالیاں...... سچ سچ، لگتا ہی نہیں کہ میں کسی پڑھی لکھی لڑکی سے بات کر رہا ہوں اور مٹھاس...... تمہاری آواز کی مٹھاس کہاں گئی زارا، انگلی سے میری دی ہوئی انگوٹھی اتار کر کیا تم اسے بھی کسی گہرے کنویں میں پھینک آئی تھیں۔“ وہ تاسف کا...... حیرت کا اظہار کر رہا تھا لیکن لہجہ صاف چڑاتا ہوا تھا۔ بائیس سال سے...... پورے بائیس سال سے اس نے زارا سے اپنا رابطہ صرف اسی لیے تو منقطع نہیں ہونے دیا تھا کہ اسے کچوکے لگاتا رہے گا۔

”تم میری جان چھوڑ کیوں نہیں دیتے عمران! چھوڑ دو میرا پیچھا اور مجھے سکون سے جینے دو۔“ اب وہ بولی تو لہجے میں تلخی کے بجائے عجیب سی شکست اور بے بسی تھی۔

”کیسے چھوڑ دوں پیچھا۔ ہم نے ہمیشہ ساتھ رہنے اور ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ تم ان قسموں کو بھول گئیں لیکن میں نہیں بھول سکتا۔“ اس کے لہجے میں ٹوٹی کانچ کی کرچیاں تھیں۔

”معاف کر دو میری اس خطا کو۔ میں مجبور تھی۔ تم ایک لڑکی کی مجبوری کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ کیسے اپنے ماں باپ کی عزت کو روند کر میں تمہارے حق میں گواہی دینے عدالت آسکتی تھی۔“ وہ سسکی۔

”نہ آتیں عدالت میں...... نہ دیتیں کوئی گواہی لیکن اس محبت سے تو منکر نہ ہوتیں جو ہمارے درمیان تھی۔ اگر محبت سے منکر ہو بھی گئی تھیں تو میری ماں کو یوں بے عزت تو نہ کرتیں۔ ان کے منہ پر ان کے بیٹے کو دہشت گرد کہتے ہوئے تمہارا دل نہیں کانپا زارا......؟“ آج وہ بڑی فرصت سے اس کا احتساب کر رہا تھا۔

”میں نے تمہارے بارے میں جو سنا تھا وہی کہا تھا۔ تمہیں اس الزام میں گرفتار کروانے والے تمہارے اپنے خالو تھے۔“ زارا نے جیسے اسے یاد دلایا۔ حالانکہ وہ نہیں بھولا تھا، خاور حیات سے انتقام لینے کے باوجود وہ نہیں بھولا تھا کہ کیسے اس شخص نے اس کی ماں کے اعتماد کا خون کیا تھا۔

”کسی جھوٹ پر اعتبار کرنے کے لیے یہ دلیل بہت کمزور ہے زارا۔ مجھ سے تمہاری سگی ماں بھی تمہارے کردار کی برائی کرتی تو نہیں مانتا۔ جو محبت کرتے ہیں وہ دوسروں کی زبانوں کا اعتبار نہیں کرتے۔ ان کے اپنے دل اپنے محبوب کے لیے گواہی دیتے ہیں۔ کیا تمہارے دل نے میرے لیے کوئی گواہی نہیں دی تھی۔ یا تمہیں مجھ سے محبت ہی نہیں تھی۔“

بائیس سال بعد بھی اس کا دل ویسا کا ویسا ہی زخمی تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس دور کی تو بات ہی دوسری تھی لیکن آج بھی اگر کوئی تم پر انگلی اٹھائے، تم پر کوئی الزام لگائے تو میں یقین نہیں کروں گا کیونکہ میرا دل مجھے گواہی دیتا ہے کہ میری زارا گزرتے وقت کے ساتھ چڑچڑی اور بدمزاج تو ہو سکتی ہے بدکردار نہیں پھر تم نے کیسے میرے مجرم ہونے پر یقین کر لیا تھا۔“ اسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ آج بھی اسے ”میری زارا“ کہہ کر پکار رہا تھا۔ زارا نے ان الفاظ کو سنا اور سن کر تلخی سے سوچا کہ (ارنہہ...... یہی دو لفظ کہنے کے لیے تو تم نے کبھی مجھے کسی کا نہ ہونے دیا اور مجھے زندگی سے کوئی

خوشی کشید نہ کرنے دی۔ تم میرا پیچھا چھوڑ دیتے تو آج میں اپنی ماں کے قریب المرگ جسم میں زبردستی زندگی پھونکنے کی سعی میں ہلکان ہونے کے بجائے کسی کی محبت کی چھاؤں میں اپنے بچے پال رہی ہوتی) یہ سوچ کی تلخی ہی تھی کہ جب وہ عمران کی بات کے جواب میں بولی تو اس کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

”میں نے بھی اپنے دل سے گواہی لی تھی عمران اور میرے دل نے بالکل سچی گواہی دی تھی۔ تم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو...... تم کل بھی قاتل اور دہشت گرد تھے اور آج بھی قاتل اور دہشت گرد ہو۔ کسی دن تم کسی مقابلے میں گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے یا کسی بم دھماکے میں مارے جاؤ گے اور وہ دن میرے لیے یومِ نجات ہوگا۔“ اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ ہر مصلحت کو بھلا کر اس نے بائیس سال سے دل میں پلتی نفرت کا جام سارا کا سارا اس پر انڈیل دیا تھا۔ وہ پہلے کبھی ایسے نہیں بولی تھی اور عمران جو ہمیشہ اسے کچوکے لگانے اور زچ کرنے کے لیے کسی نہ کسی طرح، کسی بھی محفوظ ذریعے سے فون کیا کرتا تھا بالکل شل ہو گیا تھا۔ آج اس نے جانا تھا کہ وہ زارا سے چاہنے کے باوجود کبھی نفرت نہیں کر سکا تھا۔ اس لیے اس کا اظہارِ نفرت اس کے جسم کے ریشے ریشے کو توڑ رہا تھا۔ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا لیکن اس کے دل میں جو درد کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا تھا اسے آگے نہ جانے کہاں تک جانا تھا۔

☆☆☆

”احمد بھائی زخمی حالت میں یہاں لائے گئے ہیں۔ انہیں بہت زیادہ زخم آئے ہیں۔ تمہیں باقی ہر کام چھوڑ کر ان کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ وہ تمہاری کارکردگی سے خوش ہوئے تو ہو سکتا ہے تمہاری سزا میں کچھ تخفیف ہو جائے۔“ سامنے بیٹھا سخت چہرے والا شخص اس سے مخاطب تھا اور اپنے تئیں اسے ایک لالچ بھی دے رہا تھا لیکن اسے اب ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اس زندگی سے نجات کے سوا کوئی خواہش نہیں رکھتی تھی اور جانتی تھی کہ نجات صرف موت میں ہے لیکن وہ خودکشی کر کے نہیں مرنا چاہتی تھی۔ اس نے بہت گناہ کیے تھے اور اب تو سرتاپا گناہ میں لتھڑ چکی تھی اس لیے اب کم از کم خودکشی کا گناہ نہیں کرنا چاہتی تھی کہ سنا تھا خودکشی کرنے والوں کے لیے ربِ تعالیٰ کے ہاں بخشش بھی نہیں ہے۔

”تم سن رہی ہو کہ میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں؟“ اسے خاموش، گم صم کھڑا دیکھ کر اس سخت چہرے والے نے اپنے تاثرات سے بھی زیادہ سخت لہجے میں پوچھا۔ جواب میں اس نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جاؤ تو پھر جا کر اپنی ڈیوٹی کرو۔“ اس بار بولنے والے کے لہجے میں سختی کے ساتھ ساتھ بیزاری بھی تھی۔ وہ بے تاثر سے انداز میں آہستگی سے اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ احمد کہاں ہے۔ اسے رات گئے وہاں لایا گیا تھا۔ اور وہ رات بھر اس ڈاکٹر کی معاونت کرتی رہی تھی جو اسے طبی امداد دے رہا تھا۔ وہاں ہونے والی گفتگو سے اسے علم ہوا تھا کہ ان کے کسی کیمپ پر آرمی نے آپریشن کیا تھا۔ آپریشن اتنا بھرپور تھا کہ وہاں موجود تقریباً سارے لوگ ہلاک یا گرفتار ہو گئے تھے۔ صرف احمد تھا جو وہاں سے شدید زخمی حالت میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ لوگ آپس میں اس کی بہادری اور جرأت کو ڈسکس کر رہے تھے۔ وہ ان کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتا تھا جو اٹھارہ سال کی عمر میں ان کے ساتھ شامل ہوا تھا اور آج بائیس سال بعد بھی اتنا ہی متحرک اور جوشیلا تھا جتنا اپنی جوانی کے دنوں میں ہوا کرتا تھا۔

صنوبر، احمد کے کمرے میں پہنچی تو وہ بستر پر لیٹا سو رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی اٹینڈنٹ موجود نہیں تھا۔ اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کے بارے میں صنوبر کو علم تھا کہ صبح اس کی ماں کی وفات کی خبر آئی تھی اور وہ ماں کے جنازے میں شرکت کرنے اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ دو دن سے پہلے اس کی واپسی کی امید نہیں تھی یعنی دو دن تک صنوبر کو ہی احمد کی مکمل دیکھ بھال کرنی تھی۔ وہ اس کے بستر کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اس کا جائزہ لینے لگی۔ احمد کے بارے میں اس نے جو باتیں سنی تھیں، ان کے حساب سے وہ کم و بیش چالیس سال کی عمر کا تھا لیکن اس نے خود کو اتنا فٹ اور اسمارٹ رکھا ہوا تھا کہ دیکھنے میں تیس بتیس سال سے زیادہ کا نہیں لگ رہا تھا۔ اس چہرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص دہشت گردوں کا ساتھی ہے اور ان کے ساتھ خونی معرکوں میں شامل رہتا ہے۔ کیونکہ اس کے چہرے پر نرمی اور معصومیت تھی۔ اس کے بال قدرے بڑھے ہوئے اور بالکل سیاہ تھے۔ البتہ داڑھی میں کہیں کہیں سفیدی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اس کی مجموعی شخصیت خوب صورت اور متاثر کن تھی۔ صنوبر نے اس کی نبض دیکھنے کے لیے جھک کر اس کی کلائی تھامی تو چونک گئی۔ کلائی کسی انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ اس بار صنوبر نے نوٹ کیا کہ اس کے چہرے پر جو ہلکی سی سرخی چھائی ہوئی ہے، وہ بخار کی شدت کی وجہ

سے ہے اور وہ نیند سے زیادہ غنودگی کی کیفیت میں ہے۔ ایک تربیت یافتہ نرس کی حیثیت سے وہ جانتی تھی کہ ایسی صورت حال میں اسے کیا کرنا چاہیے چنانچہ تیزی سے حرکت میں آگئی۔ سب سے پہلے اس نے احمد کی دوائیں چیک کیں اور فوراً ہی اس کے علم میں آگیا کہ اسے جس اینٹی بائیوٹک کی ضرورت ہے وہ اس کی دواؤں میں شامل نہیں ہے۔ ڈاکٹر صبح گلگت میں روانہ ہوا تھا شاید اس لیے اس دوا کے بارے میں ہدایت دینا بھول گیا تھا۔ صنوبر نے فوراً ہی وہاں اس طرح کے کاموں پر مامور لڑکے کو آواز دے کر اس دوا کا نام لکھ کر دیا۔ اس نے دوا انجکشن کی شکل میں منگوائی تھی اور جانتی تھی کہ کچھ دیر میں دوا اس تک پہنچ جائے گی۔ وہ لوگ اپنی ضرورت کے حساب سے دواؤں اور دیگر ضروری اشیا کا ذخیرہ رکھتے تھے۔ لڑکے کے انجکشن لانے تک وہ بخار کی شدت کم کرنے کے لیے احمد کے ماتھے اور ہاتھ پیروں پر ٹھنڈے پانی سے بھیگی پٹیاں رکھنے لگی۔ پٹیاں رکھنے کا مثبت نتیجہ نکلا اور وہ جو بالکل بے سدھ پڑا ہوا تھا ہلکے ہلکے کسمسانے لگا لیکن آنکھیں بہرحال نہیں کھولیں۔ صنوبر دلجمعی سے اپنے کام میں لگی رہی۔

''امی...... امی کہاں ہیں آپ؟ دیکھیں مجھے کتنا درد ہو رہا ہے۔'' چند منٹ اور گزرے تو اس نے احمد کی دھیمی سی بڑبڑاہٹ سنی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ اتنا بڑا مرد کس معصومیت سے تکلیف میں ماں کو پکار رہا تھا۔ یقیناً اس شخص پر کئی افراد کی زندگیاں جانے کی ذمّے داری عائد ہوتی ہوگی لیکن اس لمحے پتا نہیں کیوں وہ بہت معصوم اور مظلوم محسوس ہو رہا تھا۔

''کہاں درد ہو رہا ہے احمد صاحب، مجھے بتائیں۔'' وہ اس پر جھکی نرمی اور ہمدردی سے اس سے پوچھنے لگی۔ اس کے پکارنے پر احمد کو جیسے کرنٹ لگا اور اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ ان کھلی آنکھوں میں مکمل ہوش مندی کے تاثرات نہیں تھے پھر بھی وہ صنوبر کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموشی سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اپنے ہونٹوں کو حرکت دی اور خوشی و حیرت کی ملی جلی کیفیت میں سرگوشی کی۔

''تم آگئیں زارا! مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ میری حالت کا سن کر تم رہ تھوڑی سکتی تھیں۔'' اس کے الفاظ نے ظاہر کر دیا کہ وہ مکمل ہوش میں نہیں ہے اس لیے صنوبر پر کسی زارا کا گمان کر رہا ہے۔ ''اب آگئی ہو تو چھوڑ کر مت جانا زارا۔ بولو، نہیں چھوڑ کر جاؤ گی نا؟'' بولتے بولتے اس نے اچانک صنوبر کی کلائی تھام لی۔ وہ بیمار تھا اور گولیاں لگنے کے باعث خون کے بے تحاشا بہاؤ نے اسے کمزور کر دیا اس کے باوجود اس کی گرفت میں بڑی سختی تھی۔ اس اچانک افتاد پر صنوبر کوئی ردِعمل ظاہر کر پاتی اس سے قبل ہی وہ لڑکا آگیا جس سے اس نے انجکشن منگوایا تھا۔

''اتنی دیر لگا دی مراد! کب سے تمہیں کہا ہوا تھا۔'' صنوبر کو اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو اس لڑکے پر ہی غصہ کرنے لگی۔

''انجکشن اسٹاک میں ختم ہو گیا تھا اس لیے باہر لینے جانا پڑا تھا۔'' لڑکے نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دے کر انجکشن کا ڈبا تپائی پر رکھا اور خود باہر نکل گیا۔ اس عرصے میں احمد کی گرفت صنوبر کی کلائی پر ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ صنوبر نے آہستہ سے اپنی کلائی اس کی گرفت سے نکالی اور انجکشن تیار کرنے لگی۔ انجکشن لگانے کے لیے اس نے احمد کی آستین اوپر چڑھائی تو بازو پر انگریزی میں کھدا زارا دکھائی دیا۔ وہ یاسیت سے مسکرا دی۔ پتا نہیں کون تھی زارا جسے اس نے اتنی شدت سے یاد رکھا ہوا تھا۔ اف یہ ناکام محبتوں کے تجربے۔ یہ تجربے انسان کے دل کو دل نہیں رہنے دیتے دکھتا، رِستا ٹیسیں مارتا پھوڑا بنا دیتے ہیں۔ خود اس کے دل نے بھی تو ناکام محبت کا زخم سہا تھا۔ قادر سے کی جانے والی وہ ان دیکھی محبت اس کی جان کا روگ بن گئی تھی۔ اس کی باتوں، اس کے نظریات کے ساتھ بہتی ہوئی وہ اپنے گھر والوں، معاشرے اور انسانیت کی مجرم بن چکی تھی اور اب ایسی زندگی گزار رہی تھی کہ اسے خود بھی اپنے آپ سے گھن آتی تھی۔ اسے لگا کہ شاید یہ احمد نامی بندہ بھی ایسے ہی کسی عذاب سے گزر رہا ہے اور اندر سے اسی کی طرح مضطرب ہے۔ دردِ مشترک کے احساس نے اس کے دل میں احمد کے لیے جذبۂ ہمدردی پیدا کیا اور وہ دل و جان سے اس کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

''مجھے ایک گلاس پانی دینا زارا!'' کرسی پر بیٹھی اپنے ہاتھ کے ناخنوں کو گھورتی ہوئی وہ نجانے کس دنیا میں پہنچی ہوئی تھی کہ اس کی آواز پر چونک گئی۔ وہ نیند سے پتا نہیں کب جاگا تھا اور اب اسے پکار رہا تھا۔ اس نے گلاس میں پانی بھرا اور اسے سہارا دے کر بٹھانے کے بعد پانی پلایا۔

''میرا نام صنوبر ہے۔'' پانی پلا کر گلاس واپس رکھتے ہوئے اس نے احمد کو آگاہ کیا۔

''صنوبر بھی اچھا نام ہے لیکن مجھے تمہیں زارا پکارنا اچھا لگتا ہے۔ تم بالکل اسی کی طرح ہو۔'' پانی پینے کے بعد

وہ دوبارہ لیٹا نہیں تھا اور صنوبر کو اشارے سے بتا دیا تھا کہ وہ کچھ دیر بیٹھنا چاہتا ہے۔

''واقعی...... تو پھر مجھے بتایئے کہ زارا کون ہے؟ دو دن سے میں جس ہستی کے نام سے پکاری جا رہی ہوں مجھے اس کے بارے میں کچھ علم تو ہونا چاہیے۔'' اس نے مسکرا کر احمد سے مطالبہ کیا تو وہ بھی دھیرے سے مسکرا دیا اور اسے اشارہ کیا کہ تپائی پر پڑا اس کا والٹ اٹھا کر اسے دے۔ صنوبر نے والٹ اٹھا کر اسے تھمایا۔ اس نے والٹ کھول کر اس میں سے ایک تصویر نکالی۔ تصویر پاسپورٹ سائز تھی اور اس کے رنگ مدھم پڑھ چکے تھے لیکن پلاسٹک کی شفاف کوٹنگ میں نہایت سنبھال کر رکھی گئی تھی۔ تصویر میں سترہ اٹھارہ سال کی جو لڑکی بہت دھیما سا مسکرا رہی تھی، صنوبر کو حیرت انگیز طور پر خود سے مشابہ محسوس ہوئی۔

''یہ تو واقعی میرے جیسی ہے۔'' وہ بے ساختگی سے بول پڑی۔

''یہ نہیں، تم اس کے جیسی ہو۔ جس وقت کی یہ تصویر ہے اس وقت تم اگر پیدا بھی ہوئی ہوگی تو تمہاری عمر ایک آدھ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔''

''اچھا تو مجھے بتائیں نا زارا کے بارے میں۔'' صنوبر نے اصرار کیا۔ اس کے اصرار پر وہ اسے زارا کے بارے میں بتانے لگا اور بتاتے بتاتے اپنی زندگی کی داستان بھی کہہ سنائی۔ وہ داستان جس میں عمران سے احمد بننے کا بیان تھا۔

''اوہ تو یوں آپ ان لوگوں کے جنگل میں پھنس گئے۔'' ساری داستان سن کر اس نے بے ساختگی سے تبصرہ کیا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیا کہا تم نے؟''

''جو کہا سچ کہا۔ یہ لوگ ایسے ہی چالباز ہیں۔ کسی کے دل میں محبت کی آگ جلا کر اور کسی کے دل میں نفرت کا الاؤ بھڑکا کر اسے باقی معاشرے سے کاٹ کر اس طرح اپنا بنا لیتے ہیں کہ پھر آدمی کے پاس واپسی کا راستہ باقی نہیں رہتا۔ یہ انسان نہیں موت کے ہرکارے ہیں جنہیں لوگوں میں موت بانٹنے کے لیے ہم جیسے بے وقوفوں کی تلاش رہتی ہے۔ یہ ہمارے جذبات سے کھیلتے ہیں اور ہماری شخصیت کے کمزور پہلوؤں سے فائدہ اٹھا کر اس طرح ہماری برین واشنگ کرتے ہیں کہ ہم گناہ کو ثواب سمجھ کر انجام دینے لگتے ہیں۔ مجھے دیکھیں...... میں ایک نرس ہوں۔ میرے پیشے کا تقاضا ہے کہ میں لوگوں کی خدمت کروں۔ ان کی زندگیاں بچانے اور ان کی تکلیف کم کرنے کے لیے کام کروں لیکن میں نے ان کے ہاتھوں بے وقوف بن کر کیا کیا؟ میں لوگوں میں موت بانٹتی رہی اور اب کس مقام پر ہوں؟ مجھے لونڈی قرار دے کر ان لوگوں نے میری عزت کی دھجیاں اڑا دی ہیں اور مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ خود کو اس قعرِ مذلت سے نکال سکوں۔'' یہاں دستورِ زباں بندی تھا لیکن اسے بولنے کا موقع ملا تو عمران کے سامنے بولتی چلی گئی۔ شاید اس لیے بھی کہ اطمینان تھا کہ یہ کر ابگڈ نہیں ہوگا اور یہاں کی گئی گفتگو کہیں سنی نہیں جا رہی ہوگی۔

''تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ تمہارے

لیے خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔'' عمران نے اسے ٹوکا۔

''اتنے بڑے بڑے نقصانات سے گزرنے کے بعد مجھے ڈر نہیں لگتا ہے۔ تھوڑی سی احتیاط بس اس لیے کرتی ہوں کہ زندگی ناحق نہیں گنوانا چاہتی، سوچتی ہوں ایک جان ہی تو بچی ہے اسے ایسے ہی کیسے ضائع کردوں، کسی کام میں لگا کر ہی خرچ کروں گی۔'' اب اس کے لہجے میں عجیب آنچ سی تھی۔ عمران اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ وہ زارا جیسی لگتی تھی لیکن زارا نہیں تھی۔ زارا ایک بزدل اور کم ہمت لڑکی تھی جس نے محبت کی ضرور لیکن نبھا نہ سکی۔ صنوبر اپنی محبت کی خاطر آخری حدیں پار کرگئی تھی اور اب جبکہ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اس نے گھاٹے کا سودا کیا تھا تو اپنی اس غلطی کی تلافی کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی تھی عمران نہیں جانتا تھا لیکن اندازہ کرسکتا تھا کہ اس کے ذہن میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور چل رہا ہے جس کے نتائج خطرناک نکل سکتے ہیں لیکن وہ کیا کرسکتا تھا۔ وہ بھی کچھ نہیں کرسکا تھا۔ ماضی میں زارا اس کے کہنے پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی اور حال میں صنوبر اس کے روکنے سے رکنے والی نہیں تھی۔ اُف یہ عورت کی پیچیدہ گتھیاں...... ان گتھیوں میں الجھا مرد کسی کام جوگا نہیں رہتا۔

☆☆☆

''زارا! کیا تم مجھے معاف کرسکتی ہو۔'' آج بڑے دنوں بعد اس نے زارا کو فون کیا تھا اور ہمیشہ سے بالکل مختلف انداز میں اس سے مخاطب تھا۔

''اب یہ کون سا نیا ڈراما ہے؟'' زارا نے بیزاری سے پوچھا۔ وہ اس کا فون کبھی بھی اٹینڈ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ہر بار دھوکا کھا جاتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے فون کی اسکرین پر جو نمبر آرہا تھا وہ دبئی کا تھا۔ اس کی بڑی بہن کل ہی دبئی گئی تھی اور وہ سمجھی تھی کہ باجی کا فون ہے لیکن یہ وہ نکلا تھا اور وہ ہمیشہ ہی ایسا کیا کرتا تھا۔ اس کی کال ہمیشہ مختلف نمبر سے آتی تھی اور یہ نمبر پشاور، کوئٹہ، لاہور، دبئی، مسقط، کینیڈا کسی بھی جگہ کا ہوسکتا تھا۔ پہلے وہ حیران ہوتی تھی کہ عمران کیسے دنیا بھر میں گھومتا پھرتا ہے لیکن اب وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ سارے جدید ٹیکنالوجی کے کرشمے ہیں جو عمران جیسے لوگ خود کو ٹریس ہونے سے بچانے کے لیے کرتے ہیں۔ حالانکہ سچ یہ تھا کہ زارا نے کبھی اسے ٹریس کرنے یا کروانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عمران نے بھلے سے اس کی زندگی برباد کردی تھی لیکن وہ اسے نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ وہ اس کی پکار پر اسے بچانے کے لیے نہیں گئی تھی تو اب اسے پھنسانے کا بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

''میں کوئی ڈراما نہیں کررہا زارا! میں بس تم سے معافی مانگ رہا ہوں' میں جانتا ہوں کہ میں یہ کام بہت تاخیر سے کررہا ہوں لیکن کیا کروں کہ مجھے یہ احساس ہی پہلی بار دلایا گیا ہے کہ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے تمہاری مجبوری کو سمجھنا چاہیے تھا۔ اس وقت میں اپنی ماں کے ساتھ تمہارے سلوک پر طیش میں آگیا تھا۔ تمہارا وہ رویہ آج بھی میرے لیے تکلیف دہ ہے لیکن اگر میں تم سے محبت کا دعوے دار تھا تو مجھے تمہیں معاف کردینا چاہیے تھا۔ کیا ہوا جو تم اپنے رویوں میں ایک عام سی لڑکی نکلی تھیں میں ہی اعلیٰ ظرف بن جاتا۔''

اس کے لہجے میں پچھتاوے بول رہے تھے۔ زارا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ اس کی ناآسودہ اور ویران زندگی کا ذمے دار تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ اس کی زندگی میں آنے والا واحد مرد تھا جس سے وہ کبھی پوری طرح نفرت نہیں کرسکی تھی۔

''کچھ تو بولو زارا۔'' وہ اس کی باتوں کے جواب میں خاموش رہی تو وہ بے چینی سے بولا۔

''میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں عمران......''

اس نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کے لیے ذرا سا توقف کیا پھر بولی۔ ''میں نے تمہاری امی کے ساتھ جان بوجھ کر وہ سلوک کیا تھا۔ اس وقت میں بہت خوف زدہ تھی۔ تمہارے وکیل کے اسسٹنٹ کے ذریعے یہ بات ڈی ایس پی خاور حیات کو پتا چل گئی تھی کہ پرنسپل صاحب کے قتل والے دن تم میرے ساتھ تھے اور تم اپنے گواہ کی حیثیت سے مجھے عدالت میں بلوانا چاہتے ہو۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے تمہارا ساتھ دینے کا سوچا بھی تو وہ مجھے اور میری بہن کو اغوا کروا لے گا اور پھر ہمارے گھر والوں کو ہماری نچی ہوئی لاشیں ہی ملیں گی۔ دنیا کے ڈر سے میں شاید ویسے بھی تمہاری گواہ بننے کو تیار نہیں ہوتی لیکن اس دھمکی کے بعد تو گنجائش ہی نہیں رہی۔ تمہاری امی کو بار بار اصرار سے روکنے کے لیے میں نے جان بوجھ کر ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ وہ دوبارہ میرے پاس آہی نہ سکیں۔'' وہ اتنے سالوں بعد اسے حقیقت سے آگاہ کررہی تھی اور اب حقائق جان کر بھی کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا اس لیے وہ اُداسی سے بولا۔

''جو میرے نصیب میں تھا وہ ہوگیا۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے اتنے سالوں میں کبھی میری مخبری کی کوشش نہیں کی۔ اگر

تم ایسا کر دیتیں تو میری احتیاطی تدابیر کے باوجود خفیہ ایجنسیاں مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکتی تھیں۔''

''ان بیتے سالوں میں بارہا تم سے نفرت محسوس کرنے کے باوجود میں ایسا نہیں کرسکی۔ مجھے احساس ہے کہ آج تم جو کچھ ہو اس میں کہیں نہ کہیں تھوڑا سا کردار میرا بھی ہے۔ میں گواہی دے دیتی تو شاید تم اس چکر سے نکل جاتے۔ میں تمہارے کام نہیں آسکی اس لیے میں نے کبھی تمہیں پھنسانے کی بھی کوشش نہیں کی۔'' زارا نے بہت سادگی و سچائی سے اسے جواب دیا۔ پھر خیال آنے پر پوچھنے لگی۔ ''تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ کون ہے جس کے کہنے پر آج تم مجھ سے ایسی باتیں کررہے ہو؟''

''ہے کوئی جو دیکھنے میں تم جیسی لگتی ہے۔ لیکن تمہارے جیسی نہیں ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا ہے کہ جس سے محبت کرتے ہیں' چاہے وہ رسم محبت نہ بھی نبھائے اس سے انتقام نہیں لیتے۔ یہ تو خود اپنی ہی محبت کی توہین ہوتی ہے اور بے شمار تلخیوں کے باوجود سچ یہ ہے کہ میں کل بھی تم سے محبت کرتا تھا آج بھی تمہیں چاہتا ہوں۔'' عمران نے اعتراف کیا تو زارا کی دائیں آنکھ سے ایک موتی نکل کر رخسار پر بہہ گیا، جواب میں وہ اپنی زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ عمران کو کچھ سننے کی خواہش بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

''اب آپ کے زخم کافی بہتر ہوگئے ہیں۔ کچھ دنوں میں آپ پہلے ہی کی طرح ایکٹیو ہوجائیں گے۔'' عمران کی بینڈیج بدلتے ہوئے صنوبر اس سے کہہ رہی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ مستقل عمران کے ساتھ ہی تھی۔ اس نے کمانڈر سے بات کرکے اسے اپنے لیے مخصوص کروالیا تھا یوں اس کی روحانی اذیت سے جان چھوٹ گئی تھی۔ عمران اس سے بہت عزت سے پیش آتا تھا۔ وہ ان وحشیوں کے ساتھ اتنے سال گزارنے کے باوجود ان جیسا نہیں بنا تھا اور عورت کا احترام کرنا جانتا تھا۔

''تمہاری محنت اور توجہ کا کمال ہے سارا۔ جسے تم جیسی تیمار دار ملے وہ کیسے ٹھیک نہ ہوگا۔'' عمران نے مسکرا کر کہا تو وہ ہنس دی پھر بولی۔

''ڈاکٹر نے آپ کے یہ کمنٹس سنے تو ناراض ہو جائے گا کہ ساری محنت اس نے کی اور کریڈٹ آپ ایک معمولی نرس کو دے رہے ہیں۔''

''وہ نالائق تو مجھے ڈھنگ کی دوا دیے بغیر اپنی ماں کے جنازے میں شرکت کے لیے بھاگ گیا تھا۔ اگر تم نہ ہوتیں تو میں جسم سے گولیاں نکل جانے کے باوجود بخار اور تکلیف سے مرجاتا۔'' عمران نے شگفتگی سے جواب دیا۔

ان چند دنوں میں وہ اور صنوبر آپس میں خاصے بے تکلف ہوگئے تھے۔ انہوں نے آپس میں ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ اپنے اپنے حالات اور احساسات شیئر کیے تھے اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اپنی فطرت و تربیت کے برخلاف وہ غلط جگہ پر، غلط لوگوں کے درمیان ہیں اور اب تک سب کچھ غلط کرتے رہے ہیں۔ اپنے اس غلط کی تلافی کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کا خیال بھی ان کی زبانوں پر آنے لگا تھا۔ صنوبر پُرجوش تھی کہ عمران مکمل صحت یاب ہوجائے تو وہ دونوں مل کر کچھ کر گزریں گے۔ اسے بڑی شدت سے احساس تھا کہ جن لوگوں کے بہکائے میں آکر وہ اپنے تئیں دین کی خدمت کررہی تھی وہ لوگ درحقیقت دشمن دین و دشمن انسانیت تھے اور اصل نیکی ان لوگوں سے وطن کو پاک کرنے میں تھی جو دین کی آڑ میں کفار کے ایجنڈے پر کام کررہے تھے اور ایک مسلمان کو اس کے دوسرے مسلمان بھائی سے لڑانے اور مروانے میں مصروف تھے۔

''بھول چوک تو ہر بندے سے ہوجاتی ہے۔ اصل شکر کا مقام یہ ہے کہ اللہ اپنے بندے کو نہیں بھولتا۔ یہ صرف اللہ ہی کا کرم ہے کہ آپ ٹھیک ہورہے ہیں۔ چند دنوں بعد بینڈیج بھی نہیں کرنی پڑے گی اور زخم مکمل طور پر بھر جائیں گے۔'' ٹیپ کا آخری ٹکڑا کاٹ کر پٹی پر چپکاتے ہوئے صنوبر نے ڈاکٹر کے متعلق اس کے کمنٹس کا جواب دیا تو وہ بس مسکرا دیا۔ صنوبر مرہم پٹی کا سامان سمیٹ کر وہاں سے اٹھ گئی اور کچھ دیر میں ہاتھ دھو کر واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں انار کے رس سے بھرا گلاس تھا۔

''یہ جوس پی لیں۔ انار میں آئرن ہوتا ہے، آپ کے خون کی کمی پوری کرنے میں مدد ملے گی۔'' اس نے گلاس عمران کی طرف بڑھایا۔

''یہ جوس فی الحال ادھر رکھ دو اور پہلے میری بات سنو۔'' عمران نے تپائی پر گلاس رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ اس نے فوراً عمران کے حکم کی تعمیل کی۔

''کل یہاں ایک اہم میٹنگ ہونے والی ہے۔ اس میٹنگ میں کئی اہم کمانڈرز شرکت کے لیے آئیں گے اور اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کریں گے۔ ہمارے لیے ان کی کمر توڑنے کا یہ بہت اہم موقع ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کارروائی کے لیے تیار رہو۔'' وہ بہت دھیمی آواز میں اسے آگاہ کررہا تھا۔ یہ سن کر صنوبر کی آنکھیں جوش سے چمکنے

لگیں لیکن پھر کچھ سوچ کر پریشان ہوگئی اور بولی۔
"لیکن کل...... کل کیسے ہم کچھ کر سکتے ہیں؟ ابھی آپ پوری طرح ٹھیک نہیں ہیں۔ گولی کا زخم اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہوتا، اوپر سے بظاہر یہ ٹھیک لگ رہا ہے لیکن اندر سے ابھی کچا ہوگا۔ بھاگ دوڑ میں زخم کھل بھی سکتا ہے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے ہمیں بہت لمبا سفر کرنا پڑے گا۔"
"تم ان ساری فکروں کو چھوڑ دو اور وہ کرتی جاؤ جو میں تم سے کہوں۔ میں بہت سخت جان ہوں اور ان معاملات کو تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ یاد رکھو کہ جو موقع ہمیں کل مل رہا ہے وہ آئندہ شاید ہی مل سکے۔ ہمیں ہر حال میں اس موقع سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات......؟" وہ دھیمی آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا تو بے ساختہ ہی صنوبر کا سر اثبات میں ہل گیا۔ اسے رضامند پا کر وہ اسے دھیمی آواز میں سمجھانے لگا۔ وہ اس کی ایک ایک بات غور سے سنتی رہی۔
"جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے اچھی طرح یاد رکھنا۔ میں مراد کو بھی سمجھا دوں گا۔ وہ تمہارا بھرپور ساتھ دے گا۔" اس نے آخری جملے ادا کیے تو صنوبر کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیاں ابھریں۔
"کہیں مراد کسی کو بتا تو نہیں دے گا؟" اس نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔
"نہیں، مراد میرا وفادار ہے۔ اصل میں، میں ہی اسے یہاں لایا تھا۔ وہ یتیم لڑکا ہے۔ اس کے باپ کے مرنے کے بعد اس کے چچاؤں نے اس کی زمینوں پر قبضہ کر کے اسے ڈکیتی کے الزام میں پھنسا دیا تھا۔ وہ پولیس سے بچنے کے لیے بھاگتا بھاگتا مجھ سے آٹکرایا اور میں اسے یہاں لے آیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے اس کا حق دلوا کر رہوں گا۔ اس کے راستے کے سارے کانٹے میں صاف کر چکا ہوں۔ میرے ساتھ یہ حادثہ نہ ہوتا تو میں پہلے ہی اسے یہاں سے نکال کر اس کے گھر پہنچا دیتا۔ بہرحال اب وہ اپنے گھر چلا جائے گا اور وہاں کے معاملات سنبھال لے گا۔ اب وہ پہلے جتنا کم عمر اور بزدل لڑکا نہیں رہا ہے جو ذرا ذرا سی بات سے ڈر جاتا تھا۔ اب وہ زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندہ رہنے کا ہنر سیکھ چکا ہے۔" عمران نے اس کے خدشات دور کیے تو وہ بس ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اسے اب بس آنے والے کل کا انتظار تھا۔ کل...... جو اس کے لیے یوم نجات بن کر آنے والا تھا۔

☆☆☆

زارا کانپتی انگلیوں سے عمران کی ہدایت کے مطابق ایک ایک تسمہ باندھتی جا رہی تھی۔ اصل میں وہ ایک خودکش جیکٹ پہننے میں عمران کی مدد کر رہی تھی۔ یہ جیکٹ مراد کے تعاون سے ان تک پہنچی تھی۔ وہ چار سال سے یہاں تھا اور وہ لوگ اس پر اعتماد کرتے تھے اس لیے اس کو اس اڈے کے ہر حصے میں آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ عمران کی ہدایت پر اس نے اسے وہ جیکٹ فراہم کر دی تھی اور اب کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیے صنوبر عمران کو وہ جیکٹ پہنا رہی تھی۔ ایک لڑکی کے ساتھ بند کمرے میں عمران کیا کر رہا تھا اس بات پر کسی کو تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس بات کا ان کے نزدیک صرف ایک ہی مفہوم تھا۔ ان کی اس سوچ کا فائدہ اٹھا کر وہ لوگ آسانی سے اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ عمران نے صنوبر کو بتا دیا تھا کہ فی الحال یہ جیکٹ بے ضرر ہے اور اس وقت ہی خطرناک ثابت ہوگی جب اس میں نصب بم کو ایکٹو کیا جائے گا پھر بھی اسے اس جیکٹ سے خوف محسوس ہو رہا تھا اور وہ اپنی انگلیوں کے ارتعاش پر قابو پانے میں ناکام تھی۔ اس نے شہر کے سب سے بڑے اسپتال میں کام کرتے ہوئے ایسی خودکش جیکٹوں کی تباہ کاریاں دیکھ رکھی تھیں۔ انسانوں کے بکھرے اعضا، کٹے پھٹے جسم، خون کی ندیاں سب اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا اور وہ سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ اگر ذرا سی بھی لغزش ہوگئی تو ان لوگوں کا بھی یہی انجام ہوگا۔ حالات سے دلبرداشتہ ہو کر مرنے کے متعلق سوچنا الگ بات ہے اور موت کو اپنے بالکل قریب محسوس کرنا الگ بات۔ صنوبر بھی اس خودکش جیکٹ کی قربت میں موت کی آہٹیں سن رہی تھی، سو اس کا خوف زدہ ہونا ایک فطری عمل تھا لیکن اسے اس مرحلے سے گزرنا ہی تھا کہ نجات کی واحد صورت بھی یہی نظر آرہی تھی۔ عمران کی ہدایت کے مطابق وہ اسے جیکٹ پہنا چکی تو اس کے کہنے پر وہ بڑی سی چادر بھی اس کے گرد لپیٹ دی جو یہاں مرد عام استعمال کرتے تھے اس لیے عمران اسے اوڑھ کر میٹنگ میں شرکت کرتا تو اس پر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا۔
"اتنی ڈری ہوئی کیوں نظر آرہی ہو خود کو نارمل ظاہر کرو۔ کسی کو ذرا سا بھی شک ہو گیا تو ہمارا سارا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔" اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر عمران نے اسے ٹوکا۔
"میں آپ کے لیے فکرمند ہوں۔ آپ کو یقین ہے نا کہ سب کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا آپ نے سوچا ہے؟" صنوبر

نے اپنی فکر کا اظہار کیا۔
"تم فکر مت کرو۔ سب کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا میں نے سوچا ہے۔" عمران نے اسے یقین دہانی کروائی۔ یہ یقین دہانی کرواتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز چمک تھی جسے صنوبر محسوس نہیں کر سکی اور اس کے الفاظ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے خود کو حوصلہ دینے کی کوشش کرنے لگی۔
"اب تمہیں یہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ مراد کو میں نے ساری ہدایات دے دی ہیں۔ اس کے کہنے پر عمل کرنا۔ وہ تمہارا خیرخواہ ثابت ہوگا۔" عمران نے ایک بار پھر اسے دھیمی آواز میں سمجھایا تو وہ نم آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلانے لگی۔
"بس اب جاؤ۔ تم لوگوں کا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری ہے۔" اس بار عمران نے ذرا مضطرب سے لہجے میں اسے ہدایت دی تو وہ اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر آئی تو مراد بھی اسے روانگی کے لیے تیار نظر آیا۔ وہ عمران کے کمرے میں ہی تھا اور شاید عمران سے کچھ ہدایات لے رہا تھا۔
"اللہ حافظ...... اللہ تمہاری مدد کرے۔" عمران نے صنوبر کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی تو وہ ذرا سا الجھی لیکن کوئی سوال نہیں کر سکی۔ عمران اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور مراد سے مصافحہ کر رہا تھا۔ مراد شاید اس سے معانقہ کرنا چاہتا تھا لیکن عمران کے گریز کی وجہ سے تھم گیا تھا۔ عمران نے صنوبر کو بتایا تھا مراد کو مکمل منصوبے کا علم نہیں ہے اس لیے اس کے معانقہ نہ کرنے پر وہ سمجھ گئی کہ وہ مراد سے خودکش جیکٹ کی اپنے جسم پر موجودگی چھپا رہا ہے۔ ایک بار پھر اسے اپنے ذہن میں کھٹک سی محسوس ہوئی لیکن اب سوال جواب کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے مراد کے ساتھ باہر نکل گئی۔ اس وقت اس نے وہ روایتی برقع پہن رکھا تھا جسے عرف عام میں شٹل کاک کہا جاتا ہے اور جس میں موجود عورت کا ایک بال تک کسی کو نظر نہیں آتا۔ عمران نے کسی کام کے بہانے ان کے یہاں سے نکلنے کا انتظام کیا تھا۔ مراد کے ساتھ اسے بھیجنے کی توجیہ، مراد کو آڑ فراہم کرنا قرار دی گئی تھی۔ تنہا مرد کے مقابلے میں عورت کے ساتھ سفر کرنے والا مرد کم مشکوک سمجھا جاتا ہے سو وہ مراد کے ساتھ جا رہی تھی۔ گاڑی کے اسٹارٹ ہو کر روانہ ہوتے ہوئے اس نے ایک مضطرب سی نظر عام سے نظر آنے والے اس مکان پر ڈالی جس کے تہ خانے سے ایک راستہ بذریعہ سرنگ اس خفیہ اڈے تک جا رہا تھا جہاں وہ اب تک مقیم رہی تھی اور جس کے بارے میں آج ہی اسے علم ہوا تھا ورنہ یہاں لاتے وقت تو اسے مکمل اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ عمران نے اس سے کہا تھا کہ آگے جا کر وہ ان سے آملے گا لیکن نجانے کیوں اسے خوف سا محسوس ہو رہا تھا اور اپنے خوف کی وجہ سے ہی وہ پلٹ پلٹ کر اس جگہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں سے دور اپنے کمرے میں بیٹھے عمران کے ہونٹوں پر حزنیہ سی مسکراہٹ تھی اور زارا کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے وہ اپنے ذہن میں ان جملوں کو ترتیب دے رہا تھا جو وقتِ رخصت اس دنیا میں موجود اپنی اس واحد عزیز ہستی سے کہنا چاہتا تھا۔ ہاں...... اس نے زارا کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

طویل سفر نے صنوبر کی چولیں ہلا دی تھیں۔ سفر سے بھی زیادہ یہ اعصابی تناؤ تھا جس نے اسے تھکا کر چور کر دیا تھا۔ وہ جس گاڑی میں روانہ ہوئے تھے اسے راستے میں ہی چھوڑ دیا تھا اور اس کے بعد بسوں، ویگنوں اور ٹیکسیوں میں سفر کرتے ہوئے اس ہوٹل تک پہنچے تھے جہاں مراد نے میاں بیوی کی حیثیت سے ایک ڈبل بیڈ کمرا کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ہوٹل اچھا تھا اور ہر سہولت کمرے میں ہی موجود تھی۔ وہ پورے دن اور رات کے سفر کے بعد اس ہوٹل تک پہنچے تھے۔ گاڑیوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے حلیوں میں بھی ردوبدل کیا تھا تاکہ انہیں ٹریس نہ کیا جا سکے۔ مراد کو عمران نے اخراجات کے لیے خاصی بھاری رقم دی تھی اس لیے وہ آسانی سے سب کچھ کرتے رہے تھے۔ اصل پریشانی اور فکر بس اس بات کی تھی کہ کہیں کوئی ایسا نشان نہ رہنے پائے کہ کوئی ان کے تعاقب میں ان تک آپہنچے۔ مراد چار سال ان لوگوں کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھ چکا تھا اور عمران نے بھی اسے ڈھیروں ہدایات دے کر روانہ کیا تھا اس لیے وہ ہر قدم پر بہت محتاط رہا تھا اور پُریقین تھا کہ اپنے پیچھے کسی کے آنے کا کوئی امکان چھوڑ کر نہیں آیا ہے۔ یہ ہوٹل پہلی جگہ تھی جہاں وہ باقاعدہ قیام کے لیے رکے تھے۔ وہ بہت تھک چکے تھے اور اب انہیں آرام اور نیند کی ضرورت تھی۔ سونے سے پہلے سفر کی گرد اتارنے کے لیے مراد نے غسل لیا تھا اور اب صنوبر نہا کر باہر نکلی تھی۔ کپڑوں کے علاوہ کچھ ضرورت کی اشیا وہ اپنے ساتھ لے کر نکلے تھے اور کچھ راستے سے خرید لی تھیں اس لیے مسافر ہونے کے باوجود بے سروسامان نہیں تھے۔
"پہلے ناشتا کر لو پھر آرام سے سو جانا۔ ایک کمرے

میں میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا زیادہ محفوظ تھا اس لیے میں نے یہ ڈبل بیڈ روم بک کروایا ہے۔ بہرحال تم میری طرف سے مطمئن رہنا۔'' روم سروس سے منگوایا ہوا ناشتا تناول کرتے ہوئے وہ صنوبر سے مخاطب تھا۔ اس وقت اس کی شخصیت اس مراد سے مختلف لگ رہی تھی جسے صنوبر نے ہمیشہ حکم کے غلام کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بہت نکھرا ہوا اور پُراعتماد شخص لگ رہا تھا۔

''میں نے مرد کو اتنا بھگتا ہے کہ اب مجھے کسی مرد سے ڈرنا بیکار لگتا ہے اس لیے تمہیں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔'' صنوبر نے تلخی سے اس کی بات کا جواب دیا اور ایک سلائس اٹھا کر اس پر مکھن لگانے لگی۔

''میں مردوں کی اس قسم میں سے نہیں ہوں جنہیں تم نے اب تک بھگتا یا ہے اسی لیے عمران بھائی نے تمہاری ذمّے داری مجھے سونپی ہے۔'' نرمی سے اسے جواب دے کر اس نے دیوار پر نصب ایل ای ڈی ٹی وی کو ریموٹ کی مدد سے آن کیا۔

''عمران صاحب کب تک یہاں پہنچیں گے؟'' صنوبر نے اس موضوع پر گفتگو جاری رکھنے کے بجائے اس سے عمران کے متعلق جاننا چاہا۔ عمران نے اس سے یہ تو کہا تھا کہ وہ آگے ان لوگوں سے آملے گا لیکن مقام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ سفر کا سارا پلان مراد کے پاس تھا اور اس نے خود ہی یہ اندازہ لگایا تھا کہ شاید اس پُرسکون ہوٹل میں عمران ان سے آملے۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا عمران بھائی نے تم سے ایسا کوئی پروگرام ڈسکس کیا تھا کہ وہ یہاں آئیں گے؟'' مراد اس کے سوال پر الجھ کر اس سے پوچھنے لگا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ٹیلی ویژن کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی جہاں کچھ جانی پہچانی نشانیاں نظر آرہی تھیں۔ مراد نے جلدی سے ٹی وی کی بند آواز کھولی۔ رپورٹ پیش کی جارہی تھی جس کے مطابق گزشتہ روز شمالی علاقے کے پہاڑوں میں ہونے والے زبردست دھماکوں کے بارے میں نئے انکشافات کیے جارہے تھے۔ دھماکے کل سہ پہر کے وقت ہوئے تھے اور اتنے زبردست تھے کہ لگتا تھا زیرِزمین اسلحے کا کوئی ڈپو دھماکے سے اڑا دیا گیا ہو۔ دھماکوں کا سلسلہ شروع ہونے کے چند سنٹ بعد ہی وہ مکان بھی بم بلاسٹ میں منہدم ہوگیا تھا جس کے تہ خانے سے سرنگ زیرِزمین خفیہ ٹھکانے تک جارہی تھی۔

''یہ...... یہ......'' مراد جیسے حیرت سے گنگ ہوگیا تھا۔ رپورٹ میں بتایا جارہا تھا کہ کچھ دنوں سے مذکورہ مکان سیکیورٹی فورسز کی نظروں میں تھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ وہاں رہنے والے میاں بیوی کے پاس مشکوک افراد کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دھماکوں کے بعد مکان اور دہشت گردوں کے خفیہ ٹھکانے کے درمیان سرنگ کے انکشاف نے تو ہر طرف ہلچل مچا کر رکھ دی تھی۔

''عمران بھائی تو وہیں تھے۔ تو کیا وہ بھی......'' مراد سے اپنا جملہ مکمل نہ کیا جاسکا۔

''نہیں، انہیں کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ انہوں نے کہا تھا وہ اس سے پہلے ہی وہاں سے نکل آئیں گے اس لیے تو میں نے تم سے پوچھا تھا کہ انہوں نے یہاں ملنے کا کہا تھا۔'' زور زور سے نفی میں سر ہلا کر اسے یہ سب بتاتے ہوئے صنوبر خود کو زیادہ پُراعتماد محسوس نہیں کررہی تھی۔

''میرا ان سے ایسا کوئی پروگرام طے نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے صرف اتنی ذمّے داری سونپی تھی کہ تمہیں وہاں سے نکال لاؤں اور کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر تمہیں تمہاری مرضی سے کہیں بھی پہنچانے کا بندوبست کردوں۔'' مراد نے ذرا تیز لہجے میں اسے بتایا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے دھیمے سے بولا۔ ''مجھے تفصیل سے سب بتاؤ۔ عمران بھائی نے مجھ سے وہ خودکش جیکٹ اور ٹائم بم کیوں منگوایا تھا؟''

''انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ جیکٹ پہن کر کمانڈرز کی میٹنگ میں شریک ہوں گے اور میٹنگ کے دوران ٹائم بم وہاں ہال میں رکھ کر کسی بہانے وہاں سے نکل جائیں گے۔ خودکش جیکٹ انہوں نے صرف احتیاطاً پہنی تھی کہ اگر انہیں روکنے کی کوشش کی گئی تو وہ اسے اڑانے کی دھمکی دے کر وہاں سے نکل جائیں گے۔'' صنوبر نے اسے مختصراً عمران کے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''انہوں نے تم سے غلط کہا تھا۔ تم بے وقوف تھیں جو ان کی پلاننگ نہیں سمجھ سکیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ وہ خودکش جیکٹ پہن کر وہاں سے نکلتے اور اسے پہنے پہنے یہاں اتنی دور تک کا سفر طے کرلیتے۔ یہ بہت مشکل تھا صنوبر وہ راستے میں ہی کہیں پکڑ لیے جاتے۔ وہ جیکٹ ایسی بھی نہیں تھی کہ اسے وہ کسی کی مدد کے بغیر پہن یا اتار سکیں۔ میں ان کا سارا منصوبہ سمجھ چکا ہوں۔ انہوں نے وہاں میٹنگ کے دوران خود کو دھماکے سے اڑالیا ہوگا۔ میٹنگ ہال کے ساتھ ہی اسلحے کا ذخیرہ بھی تھا اس لیے وہاں بہت زیادہ تباہی آئی۔ ٹائم بم انہوں نے اس مکان کو اڑانے کے لیے استعمال کیا جہاں

سے خفیہ ٹھکانے تک سرنگ جاتی تھی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو میں نے مکان کے مالک کو ایک پارسل دیتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ یہ احمد بھائی نے دیا ہے اور کہا ہے کہ شام میں پانچ بجے ایک آدمی اس پارسل کو لینے آئے گا۔ انہوں نے ایک کوڈ ورڈ بھی بتایا تھا لیکن وہ سب دھوکا تھا۔ شام کے پانچ بجے کسی کو وہ پارسل لینے نہیں آنا تھا۔ وہ ٹائم بم تھا جو سہ پہر میں ہی پھٹ گیا تھا اور پتا ہے اس سے کیا حاصل ہوا؟ اس سے یہ ہوا کہ وہاں کوئی گواہ باقی نہیں بچا جو کسی کو بتا سکے کہ اس واقعے سے پہلے میں اور تم وہاں سے نکل گئے تھے۔ ہماری آزادی کے لیے عمران بھائی نے بہت بڑی قربانی دی ہے۔'' بولتے بولتے مراد کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور رندھے گلے کی وجہ سے اس کے لیے مزید اپنی بات جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔ صنوبر کو اب مزید کچھ سننے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ اس شخص کے لیے رو رہی تھی جو دنیا سے جاتے جاتے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو اور مراد کو زندگی دان کر گیا تھا۔ اس دھماکے میں جتنے اہم لوگ مارے گئے تھے اور جتنا اہم ٹھکانا ختم ہوا تھا اس سے یقیناً دہشت گردوں کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔

''اب تم بتاؤ کہ یہاں سے آگے کہاں جانا چاہتی ہو؟'' کافی دیر بعد جب صنوبر کے آنسو تھمے تو مراد نے اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ اس سوال کے ساتھ ہی صنوبر کے ذہن میں اپنے پُرسکون گھر اور محبت کرنے والے پیاروں کی تصویریں ابھریں۔ یہ کتنا خوش کن احساس تھا کہ وہ ایک بار پھر اپنے گھر میں اپنے پیاروں کے درمیان موجود ہوگی لیکن اس خوش کن احساس کو وہ صرف یک پل کے لیے ہی محسوس کرسکی اور پھر تیزی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''میں کہیں نہیں جاسکتی۔ میں اس لائق نہیں رہی کہ دوبارہ اپنے گھر والوں کو اپنی شکل دکھا سکوں۔ میں واپس جاؤں گی تو ان لوگوں کے لیے نئے سرے سے بدنامی اور مشکلات کا در کھل جائے گا۔ اداروں کی تحقیق و تفتیش میں انہیں بھی میرے ساتھ گھسٹنا پڑے گا۔ ابھی تو وہ پھر بھی کہیں منہ چھپا کر زندگی گزار لیں گے لیکن میں ساتھ ہوں گی تو ہمیشہ ان پر انگلیاں اٹھتی رہیں گی اس لیے بہتر ہے کہ میں ان کے پاس نہ جاؤں۔''

''پھر...... پھر تم کہاں جاؤ گی؟'' مراد اس کا جواب سن کر پریشان ہوا۔

''تم مجھے کسی دارالامان وغیرہ میں پہنچا دینا۔'' اس نے تجویز پیش کی۔

''نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم ایسی کسی جگہ محفوظ رہ بھی سکو گی یا نہیں اور عمران بھائی مجھے تمہاری حفاظت کی ذمّے داری سونپ کر گئے تھے۔'' مراد نے اس کی تجویز ماننے سے انکار کردیا۔

''لیکن اس کے سوا کوئی حل نہیں ہے۔ اپنے گھر میں کسی صورت نہیں جاؤں گی۔'' صنوبر نے اس پر واضح کردیا۔

''تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔''

''تمہارے گھر......؟'' صنوبر حیران ہوئی۔

''ہاں، میں تم سے نکاح کرکے تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔'' مراد نے اسے مزید حیران کیا۔

''میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے تم ایسا فیصلہ کیسے کرسکتے ہو؟'' صنوبر نے اسے ٹوکا۔

''جو کچھ گزر گیا وہ ماضی کا حصہ بن چکا۔ ماضی میں ہم سب سے ہی گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ دانستہ تھے اور کچھ مجبوراً۔ اب جبکہ کوئی مجبوری نہیں رہی ہے ہم ایک نئی زندگی کی شروعات کرکے خود کو اچھا انسان ثابت کرسکتے ہیں۔ عمران بھائی نے اپنی جان قربان کرکے اپنے گناہوں کا کفارہ بھی ادا کیا ہے۔ بہت سے معصوموں کی زندگیاں بچانے کا انتظام کیا ہے اور ہمیں نئی زندگی شروع کرنے کا موقع بھی دیا ہے تو میں تمہیں اِدھر اُدھر رلنے کے لیے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ بس طے ہوگیا کہ اب ہم ایک ساتھ نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔'' مراد نے فیصلہ سنایا تو صنوبر کے پاس بھی مزید انکار کی گنجائش نہیں رہی۔

☆☆☆

اس بڑے سے کمرے میں مکمل تاریکی اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ صرف سانسوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹیں تھیں جو وہاں متعدد نفوس کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ تاریکی اور سکوت کے دوران گھڑی کی ٹک ٹک شروع ہوئی تو ننھے ننھے دل تیز تیز دھڑکنے لگے اور دل ہی دل میں خاموشی سے کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہوگئی۔ دس، نو، آٹھ، سات...... اور یہ ایک...... آخری ہندسہ ذہنوں میں گونجتے ہی اس تاریک اور پُرسکوت کمرے کا ماحول بدل گیا۔ یکدم ہونے والی تیز روشنی، موسیقی کی آواز اور اوپر سے برستے ننھے ننھے رنگین کاغذ کے پرزوں نے کمرے میں موجود بچوں کو اتنا ایکسائٹڈ کیا کہ ان کے حلق سے خوشی بھری چیخیں نکل

گئیں۔ بچوں کے ساتھ وہاں کچھ بڑے بھی موجود تھے جو ایک سائڈ پر کھڑے بچوں کو نئے سال کے آغاز پر خوش ہوتا دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ یہ بچوں کے والدین اور اسپتال کے عملے کے افراد تھے جو چلڈرن وارڈ میں موجود ان بچوں کو مختلف نوعیت کی تکالیف کے احساس سے دور صرف خوش ہوتا ہوا محسوس کر کے خود بھی خوش تھے۔ کمرے میں خصوصی طور پر ایک میز لگائی گئی تھی جس کے وسط میں ایک بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا۔ کیک پر ویلکم ٹو 2018ء کے الفاظ نمایاں تھے۔ کیک کے ساتھ ہی رنگین و چمک دار کاغذ میں لپٹے چھوٹے چھوٹے گفٹ پیکس رکھے ہوئے تھے جنہیں ان بچوں میں تقسیم کیا جانا تھا لیکن فی الحال بچوں کی توجہ میز اور اس پر رکھی اشیا کے بجائے ان رنگ برنگی غباروں کی طرف تھی جنہیں نئے سال کا آغاز ہوتے ہی صنوبر نے بندشوں سے آزاد کر دیا تھا اور یہ رنگین غبارے کمرے میں اِدھر اُدھر اڑتے بچوں کو اپنی طرف لپکنے پر مجبور کر رہے تھے۔ بچے شور مچاتے ان غباروں کو پکڑنے کے لیے اچھل کود کر رہے تھے۔ صرف گیارہ سالہ ایک بچہ ایسا تھا جو ابھی تک اپنی جگہ متذبذب بیٹھا ہوا تھا۔ صنوبر نے مسکرا کر حوصلہ افزا نظروں سے اس بچے کو دیکھا اور خود اس کے قریب جا کر اسے سہارا دے کر اس کی جگہ سے کھڑا کیا۔ اس بچے کی ٹانگ کا پلاسٹر کب کا کھل چکا تھا لیکن وہ اب بھی خود سے کھڑا ہو کر چلنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ صنوبر کے پیار بھرے اصرار پر اس نے زمین پر قدم رکھ کر کھڑا ہونے کی ہمت کی پھر چند قدموں تک اس کے سہارے چلتا رہا۔ صنوبر کو یقین ہو گیا کہ اب وہ مضبوطی سے زمین پر اپنے قدم جما رہا ہے تو چپکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ لڑکا بغیر سہارے کے آگے بڑھتا ایک غبارے کی طرف لپکا۔ صنوبر کے ہونٹوں پر خوشی سے بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی زندگی میں اب ایسی ہی خوشیاں تھیں۔ وہ مراد کے ساتھ اس کی بیوی کی حیثیت سے اس کے گاؤں آئی تھی تو مراد کو یہاں کے معاملات سنبھالنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ دونوں چچاؤں کی موت کے بعد ان کے کم سن بیٹے زمینوں کے معاملات سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے اور اردگرد کے زمیندار ان کی زمینیں ہڑپ کرنے کے چکر میں تھے۔ مراد نے ان زمینداروں کا دماغ درست کیا اور اپنے چچاؤں کے خاندانوں کو اپنی شفقت کے سائے میں لے لیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ بچے اس کی خاطر اپنے باپ کے سائے سے محروم کیے گئے ہیں اس لیے خود ان کا سہارا بن گیا تھا۔ اپنے غیاب کے سلسلے میں اس نے ایک جھوٹی کہانی سنا کر سب کو مطمئن کر دیا تھا۔ اس پر ڈکیتی کا الزام اس تھانے دار کے تبادلے کے ساتھ ہی مٹ گیا تھا جو چچاؤں کا نمک خوار تھا اور اس کے خلاف کوئی ایف آئی آر کاٹے بغیر اسے ڈرا کر وہاں سے بھگانے میں چچاؤں کی مدد کر رہا تھا۔ اب چونکہ طاقت اور اختیار مراد کے ہاتھ میں تھا اس لیے موجودہ تھانے دار مراد کا دم بھرتا تھا۔ یہ الگ بات کہ مراد اپنے اختیارات کو کسی پر ظلم کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماضی میں جو برا ہو گیا تھا اسے وہیں دفن کر کے اب ایک نئی اور اچھی زندگی گزارنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ زندگی دکھوں سے خالی نہیں تھی لیکن گناہوں سے پاک ضرور تھی۔ مراد کو غم تھا کہ وہ اپنی ماں کو نہیں پا سکا تھا اور وہ اس کی جدائی میں رو رو کر اپنی جان سے چلی گئی تھی۔ صنوبر جیتے جی اپنے گھر والوں سے ہمیشہ کی جدائی کا دکھ سہہ رہی تھی لیکن بہت کچھ تھا جو جینے کا سبب بنا ہوا تھا۔ گاؤں کی چھوٹی سی ڈسپنسری کو اسپتال کے درجے تک پہنچانے کے لیے مراد نے ذاتی کوششیں کی تھیں۔ صنوبر اس اسپتال میں بلامعاوضہ خدمات انجام دیتی تھی اور اب وہ سچ مچ مسیحا تھی جس کی مسکراہٹ لوگوں کی پریشانیاں بانٹ لیتی تھی اور جادو اثر لمس درد سمیٹ لیتا تھا۔ اس اسپتال کی تعمیر کے بعد وہ اور مراد آج کل گاؤں میں ایک انٹرمیڈیٹ کالج کے قیام کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مثبت تعلیم ہی لوگوں کو تاریکی کے غار سے نکال کر روشن ذہن عطا کر سکتی ہے سو وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کے ذہنوں کو روشن کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے ماضی میں بہت سے پچھتاوے تھے اور اب ان کے لیے جینے کی ایک ہی راہ تھی کہ وہ مداوا... کرتے جائیں تاکہ روزِ حشر اپنے معبود کے حضور کھڑے ہوں تو اپنے لیے رحم کی درخواست تو کر سکیں۔ گناہوں کا کفارہ اور مداوا کرتے وہ لوگ زندگی کی شاہراہ پر اسی طرح اپنا سفر طے کر رہے تھے جیسے صنوبر کی نظروں کے سامنے وہ گیارہ سالہ لڑکا چہرے پر خوشی کے تاثرات لیے ایک ایک قدم احتیاط اور مضبوطی سے اٹھاتا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے قدرت نے ٹوٹی ٹانگ کے جڑ جانے کے بعد اسے ایک بار پھر اپنے قدموں پر چلنے کا موقع دیا تھا ویسے ہی ان دونوں کو زندگی عطا کر کے ازالے کا موقع دیا تھا اور وہ پورے دل و جان سے یہ مداوا ادا کرنے کو تیار تھے۔ ہر نیا طلوع ہونے والا سورج ان کے اس عزم کا گواہ تھا۔

